بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سالنامہ

ساقی دہلی

جنوری ۱۹۳۸ء

ایڈیٹر

شاہد احمد بی اے (آنرز) دہلوی

ایک روپیہ چار آنے

چندہ سالانہ
پانچ روپئے
ششماہی تین روپئے فی پرچہ چھ آنے

ممالک غیر سے
بارہ شلنگ
نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۷ سالنامہ ساقی دھلی بابت جنوری ۱۹۳۸ء نمبر (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

خدا کا شکر ہے کہ ساقی اپنی زندگی کے آٹھ سال پورے کرکے اب نویں کی ابتدا کر رہا ہے۔ اس سالگرہ کے موقع پر ساقی کا سالنامہ شائع ہوتا رہا ہے۔ اس سال بھی حسبِ معمول سالنامہ آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ مگر اب کے ناظرین ساقی کو ایک نمایاں فرق نظر آئیگا۔ ساقی میں اب کے غیر متعلق رنگین تصویریں شائع نہیں کی گئیں۔ صرف چند مضامین سے متعلق اور مشہور شخصیتوں کی تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ اس کسر کو ساقی کی ضخامت بڑھا کر پورا کر دیا گیا ہے۔ خوشنما رنگین تصاویر شائع کرنیکی بجائے عُمدہ مضامین کا اضافہ امید ہے کہ ساقی کے خوش ذوق ناظرین میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ مضامین جس پایہ کے یکجا کئے ہیں انکا اندازہ آپ کو جبھی ہوگا جب آپ انہیں مُطالعہ فرمائیں گے۔ اور مقابلہ کرکے دیکھیں گے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انہیں بعض برسوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اور بعض ساری ساری عمر کے مُشاہدے اور مطالعے کا حاصل ہیں۔ اگر علیحدہ علیحدہ ان مضامین پر مختصراً بھی کچھ لکھا جائے تو کئی صفحے درکار ہوں گے۔ یوں بھی ہم خود ان کی تعریف کرکے آپ کا لُطف کیوں کرکرا کریں۔

مندرجہ ذیل حضرات کے ہم شکرگزار ہیں کہ سنہ ۳۷ء میں انہی کی عنایات سے ساقی مُرتب ہوتا رہا:-

مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ جناب ایم۔ اسلم۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ بسمل صادق الخیری دہلوی۔ امین حزیں۔ کوکب شاہجہانپوری۔ نخشب کانپوری۔ فیضی رامپوری۔ سیّد امتیاز علی تاج۔ سیّد ابوطاہر ل۔ احمد۔ بادشاہ حسین۔ پریم پنچاری۔ اختر حسین رائے پوری۔ محترمہ حجاب امتیاز علی۔ اسرار الحق مجاز۔ تابش دہلوی۔ محترمہ خجستہ اختر بیگم سالک جعفری۔ محسن عباس۔ دلفگار۔ ثاقب کانپوری۔ مرزا سیف علی خاں۔ سیّد علی منظور۔ انصار ناصری۔ اشرف صبوحی۔ فضل حق قریشی۔ ماہر القادری۔ کاوش حیدرآبادی۔ ماخی۔ پروفیسر احمد علی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ سیّد علی شاکر۔ محمد محسن عظیم آبادی۔ ن۔ م۔ راشد۔ ممتاز مفتی۔ طاہر قریشی۔ جاں نثار اختر۔ غلام عباس مولوی۔ احمد عباس۔ محترمہ صالحہ عابد حسین۔

ان حضرات کے علاوہ ہم دلی ریڈیو اسٹیشن کے لائق ڈائرکٹر مسٹر زیڈ۔ اے بخاری کے بہت شکرگزار ہیں کہ ہم نے جس مضمون کے شائع کرنیکی اُن سے خواہش ظاہر کی اس کی اجازت انھوں نے بخوشی دیدی۔ اس طرح ساقی کو چند اعلےٰ درجہ کے مضامین پیش کرنیکا موقع ملا ورنہ یہ نایاب مضامین ایک دفعہ نشر ہونے کے بعد ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے۔

آخر میں ہمیں یہ اور عرض کرنا ہے کہ کاغذ کی اس گرانی کے زمانہ میں عُمدہ سفید کاغذ پر پاکیزہ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہونا اور سال بھر میں پندرہ سو صفحے کے منتخب مضامین پیش کرنا ساقی کو روز بروز زیر بار کر رہا ہے۔ اس نقصان کی تلافی کی صرف دو صورتیں ہیں، یا تو ساقی کی سالانہ ضخامت پندرہ سو صفحات سے گھٹا کر ساڑھے سات سو صفحات کر دی جائے۔ یا ساقی کی اشاعت دگنی ہو جائے۔ پہلی صورت ہمیں منظور نہیں اور دوسری صورت ہمارے اختیار کی نہیں۔ اگر ہر خریدار صرف ایک اور خریدار بہم پہنچا دے (جو بہت مُشکل نہیں ہے) تو ساقی کو اپنی مالی حالت سنبھالنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ساقی کو کسی رئیس کی سرپرستی کا فخر حاصل نہیں، کسی ریاست سے ماہانہ امداد ملنے کا شرف اِسے میسّر نہیں، فحش اشتہارات شائع کرنیکی سعادت سے محروم۔ مذہب کے نام پر بھیک مانگنے کا مُستحق نہیں، قوم کا حوالہ دے کر چندہ اُگانے کا اہل نہیں۔ اور سرکار دولت مدار کو تو علم و ادب سے گویا عار ہے۔ لے دیکر مستقل خریدار ہی ساقی کیلئے کچھ کر سکتے ہیں۔ باقی سب خیریت ہے۔

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر اور پانچ روپے چار آنے بذریعہ وی۔ پی ہے۔ اگر خریدار حضرات منی آرڈر سے چندہ بھیجا کریں تو انھیں چار آنے کی کفایت ہو جائیگی۔ کوپن میں نام اور پتہ صاف لکھدیں تو بہت بہتر ہے۔

شاہد

اُردو کی کہاوتیں اور اُنکی کہانیاں

ایں ہم بر سرِ علم۔ فارسی کی ضرب المثل ہے۔ معلوم نہیں ایران میں بنی یا ہندوستان میں۔ مگر بولتے اُردو میں بھی ہیں۔ ترجمہ اسکا ہے یہ بھی جھنڈے پر سہی۔ مطلب یہ کہ جہاں سو ہیں وہاں سوا سو سہی۔ جہاں ہزاروں گناہوں کی پوٹ سر پر ہے۔ ایک گناہ اور سہی۔ قصّہ اِس مثل کا یوں ہے۔ کہ کہیں کی مسجد میں کوئی عالم وعظ فرما رہے اور نیکی و بدی دوزخ کا نقشہ دکھا رہے تھے۔ اسی ذیل میں امانت و خیانت، ایمانداری و بے ایمانی کا مذکور آ گیا۔ مولوی صاحب نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں۔ خوب خوب دادِ تحقیق دی۔ چوری کی ایک ایک کرکے ساری صورتیں بیان کیں۔ ہر ہر پیشہ اور ہنروالوں کے کرتوتوں کو گنوایا۔ اُن کی کھلی ڈھکی چوریوں کو کھول کھول کر دکھایا۔ یونہی ہوتے ہوتے کہیں درزیوں کا ذکر آ گیا۔ جناب نے اُن کے خوب لتّے لئے۔ ایسے بخیے اُدھیڑے کہ کوئی ٹانکا لگا نہ رہنے دیا۔ گاہکوں کی بے اعتباری اور اُس کے نتائج دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی خرابی کو پھیلا پھیلا کر دکھایا۔ عقبیٰ کے عذاب، قیامت کے حساب کتاب سے ڈرایا۔ اور یہاں تک فرمایا کہ یہ درزی چھوٹی بڑی چوریاں جتنی کرتے ہیں۔ دُنیا میں اگر چھپ بھی جائیں۔ قیامت کے دن سب الم نشرح ہو کر رہینگی۔ یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوں گے۔ ایک بڑا سا علم ہر ایک درزی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اُس پر عمر بھر کے چرائے ہوئے کپڑے، حتیٰ کہ ذرا ذرا سی کترنیں بھی، اٹکتے ہوں گے۔ ساری خدائی ان کی چوری کا یہ تماشا دیکھے گی۔ اور درزیوں کی بڑی رسوائی ہوگی۔ جزا و سزا کا وقت آئے گا تو وہی سوئیاں، قینچیاں جن سے چوری کا کپڑا کاٹا اور سی سلا کر خود پہنا۔ بیچا یا اہل و عیال کو پہنایا تھا۔ عذاب و ایذا کا آلہ بنجائیں گے۔ اتفاق ہے۔ اس مجلس وعظ میں کسی طرف کوئی درزی بھی بیٹھا تھا۔ اور ممکن ہے کہ جناب مولوی صاحب نے اُسی کو دیکھ دیکھ کر اپنی تقریر کا یہ پرداز ڈالا ہو۔ اس نے جو یہ چبھتی ہوئی حق لگتی ہوئی باتیں سُنیں۔ دل ہی دل میں بہت کٹا اور اُسی وقت توبہ کی کہ چوری کے پاس نہ جاؤنگا۔ اور بہت دنوں تک وہ اپنے اس عہد پر قائم بھی رہا۔ گاڑھا گزی، ململ لٹھا۔ نینو، نین سُکھ معمولی کپڑوں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے اچھے ریشمی کپڑے، مخمل، اطلس، کامدانی، گلبدن کے تھان کے تھان اُس کی دُکان پر آتے۔ مگر کتر بیونت کے وقت کبھی اس کو اُن میں سے کچھ کتر لینے کا خیال بھی نہ آتا۔ اتفاق کی بات ایک دن ایک گاہک آیا۔ اور ایک بڑھیا سا تھان کپڑے کا لایا۔ دولھا کا جوڑا بننا تھا۔ وہ ناپ تول دے کر اپنی راہ گیا۔ اُستاد تھان لے کر بیٹھے الٹ پلٹ کو دیکھا جی للچایا۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ رال ٹپکنے لگی۔ دل نے کہا، اس میں تو کچھ بچانا ہی چاہیئے۔ ایمان پُکارا، خبردار کیا کرتا ہے۔ توبہ نہیں کر چکا ہے۔ اُستاد نے تھان اُٹھا کر ایک طرف کو رکھدیا۔ مگر کپڑا سی کر دینا تھا جلدی، اسلئے پھر اُٹھایا اور پھر وہی کشمکش شروع ہوئی۔ آخر پُرانی عادت نئی توبہ پر غالب آئی۔ اور اُستاد نے کپڑا بچا لینے کا ڈھب نکال کر فرمایا ایں ہم بر سرِ علم۔ جہاں ہزاروں ٹکڑے کپڑے کے قیامت کے دن علم پر ہوں گے ایک یہ بھی سہی، یہ حکایت خُدا جانے سچی ہے یا جھوٹی۔ مگر یہ بالکل سچ ہے۔ کہ عادت خاص کر بُری عادت موقعہ پا کر یونہی عود کرتی ہے۔ اور یہ مثل ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔

سخن فہمی عالم بالا معلوم، یہ مثل بھی فارسی کی ہے۔ مگر اُردو میں بولی جاتی ہے۔ معنی اس کے یہ ہیں۔ کہ فلاں کی سمجھ بوجھ کا اندازہ ہوگیا۔ کہ کچھ بھی نہیں۔ یہ محض خیال ہی خیال تھا۔ کہ وہ بڑے دانشمند ہیں۔ عقل و تمیز میں بے بدل ہیں۔ مگر ڈھول ہیں۔ پول ہی نکلا۔ کہتے ہیں یہ فقرہ ایک شاعر کی زبان سے نکلا۔ چُست و برمحل تھا۔ ضرب المثل ہوگیا۔ شعرا اپنے آپ کو تلامیذ الرحمٰن کہتے اور سمجھتے آتے ہیں۔ یعنی خُدا کے شاگرد۔ اللہ تعالیٰ سے۔ بے واسطہ غیر فیض پانے والے۔ اسی لئے اُستادوں سے انکی اکثر نہیں بنتی۔ جلدی ہی اُن سے بگڑ بیٹھے۔ یا اُن سے مُنکر ہوجاتے ہیں۔ اور اپنے کلام کو صدائے غیب و نزولِ سروش تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ غرض خود بینی، خود پسندی، تعلی و خود نمائی شاعری کا لازمی خاصّہ ہے۔ سعدی جیسا بے نفس حکیم بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اور شاعری کی ترنگ میں آکر کہہ گیا۔ ؎

گہہ گہہ خیال در سرم آید کہ این منم ؂ ملک عجم گرفتہ بہ تیغ سخنوری

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے۔ کہ میں ہی تو ہوں۔ جس نے شاعری کی تلوار سے سارا ایران فتح کرلیا ہے۔ جب سعدی یہ کہہ گزرے۔ تو پھر اور شعرا کا کیا ذکر ہے۔ بہرحال یہ سچ ہے کہ شاعر عموماً خود پسندی، خود نمائی کے مریض ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کوئی جناب تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ فیضی فیاضی کا قصّہ ہے کہ ایک دن اتفاق سے کہیں سعدی کا یہ شعر زبان سے نکل گیا۔ یا کہیں نظر آگیا ؎

برگ درختان سبز در نظرِ ہوشیار ؂ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

شعر کو پڑھا اور مکرر پڑھا۔ غور کیا نکتہ چیں نگاہ میں نہ جچا۔ از معرفت کردگار کی جگہ معرفت کردگار پسند نہ آیا۔ مُنہ بنایا۔ ناک بھوں چڑھائی۔ معاوضہ کا خیال آیا۔ مقابلہ کا شعر سوچا۔ فکر کی دیر تھی۔ کہ خیال عالم معنی کے عرش پر تھا۔ فوراً شعر ہوا ؎ ہر گیاہے کہ از زمین روید ؂ وحدہٗ لاشریک لہ گوید

سمجھے کہ حضرت قدس سے وحی اُتری ہے۔ بہت پھُولے بہت اترائے۔ تن کر شعر کو با واز پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ اور جھُوم جھُوم کر پڑھا۔ اور اس طرح پڑھا کہ آس پاس کے در و دیوار تک سب گونج اُٹھے، آپ نے تصوّر کرلیا کہ ہر طرف سے صدائے داد و تحسین بلند ہوئی ہے۔ مگر جناب کی تشفی اس سے بھی نہیں ہوئی، چاہتے تھے کہ آسمان سے ملائک داد دیں۔ اور ملا اعلیٰ سے سبحان اللہ اور احسنت کی صدائیں آئیں۔ اسی یقین سے سر اٹھایا۔ کہ داد کی آواز آسمان سے آئے گی ضرور آئیگی۔ اتفاق کی بات آپ کہیں بیٹھے تھے۔ زیر سما، اور فضائے آسمانی میں چیلیں اُڑ رہی تھیں۔ اِدھر سے ان حضرت کا سر نخوت بلند ہوا۔ اُدھر سے کسی چیل نے بیٹ کی، وہ بیٹ سے ان کے مُنہ میں پڑی، بہت جزبز ہوئے، بہت بگڑے کہ خیال کیا تھا اور پیش کیا آیا۔ اسی وقت فوراً فرمایا۔ سخن فہمی عالم بالا معلوم، عالم بالا کی سخن فہمی معلوم ہوگئی۔ ہم سے پوُچھیئے تو خود بینی کی داد خوب ملی۔ "رد میں ردا ہے" اُردو کی مثل ہے۔ پہلے پہل کسی مُلّا کی زبان سے نکلی اور ایسی کوٹھے چڑھی کہ اُردو زبان کی ساری دُنیا میں پھیل گئی۔ قصّہ اسکا یوں ہے کہ کہیں کوئی مُلّا جی رہتے تھے۔ بہت نیک متقی پرہیزگار ہر وقت ہاتھ میں تسبیح، زبان پر قال اللہ اور قال رسول۔ محلہ میں جہاں رہتے تھے۔ کسی کی مُرغیاں بھی پلی ہوئی تھیں، وہ اکثر مُلّا جی کے گھر میں گھُس آتیں۔ کہیں زمین کریدتیں۔ کہیں بیٹ کرتیں۔ برتنوں اور پانی کے گھڑوں کو خراب کرتیں۔ دال چاول جو

کچھ انگنائی میں پائیں بکھیرتیں اور کھا جاتیں۔ مُلّا جی تو دن بھر گھر سے باہر رہتے ہیں۔ ان مُرغیوں کا دُکھ اُٹھانا پڑتا مُلّانی جی کو۔ مگر کہاں تک برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب مُرغیوں سے وہ بہت تنگ آگئیں تو سوچیں ان نامُرادوں کو پکڑ پکڑ کر اور کاٹ کاٹ کر کھانا چاہیئے۔ جب کم ہونے لگیں گی۔ تو ہمسائے آپ بند کر کے رکھیں گے۔ اب جو حسب عادت مُرغیاں دوسرے دن مُلّا جی کے گھر میں آئیں تو مُلّانی جی نے کپڑا ڈال ایک مُرغی کو دبوچ ہی تو لیا۔ اور پھر جھٹ سے اللہ اکبر کہہ کر اُسے ذبح کر ڈالا، چونچ، پنجے پر، در انگنائی میں گڑھا کھود کر دبا ئے۔ کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ اور مُرغی کا گوشت بنا مسالہ پیس جھٹ سے دیگچی پکنے کو چولھے پر چڑھا دی۔ روز مُرغیاں ان کو جلاتی تھیں۔ آج وہ مُرغی بھونے بیٹھیں تو کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ اور ہنڈیا بڑے اہتمام سے پکی۔ شام کو مُلّا جی گھر میں آئے۔ تو گھر میں گوشت کی بُو باس ہی کچھ اور تھی۔ بیوی سے پوچھا۔ کیوں صاحب آج کیا پکا ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ مُرغی، یہ سُنکر مُلّا جی چونکے، اور گھبرا کر بولے۔ ارے کوئی شیخ سدّو کے نام کا تو مُرغا نہیں دے گیا ہے۔ وہ تو حرام اور قطعی حرام ہے۔ بیوی نے کہا۔ ہماری مُرغی بھلا شیخ سدّو کا مُرغا کیوں ہونے لگی ہے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ وہ حرام ہے۔

مُلّا جی:۔ تو پھر یہ مُرغی کہاں سے آئی۔

مُلّانی جی:۔ تو ذرا آہستہ تو بولو۔ محلہ کو سر پر کیوں اُٹھائے لیتے ہو۔ ہمسائے سُنیں گے۔ اُنہیں کی ایک مُرغی میں نے آج پکڑلی تھی۔ اُسی کا آج قورمہ پکا ہے۔

مُلّا جی:۔ ہے ہے۔ توبہ توبہ۔ یہ کیا غضب کیا۔ پرایا مال اور پھر ہمسایہ کا۔ حرام در حرام، بالکل حرام، یہ تم نے کیا کیا ہمسائے کا بڑا حق ہے۔ تم نے بڑا ستم کیا۔

مُلّانی جی:۔ جی ہاں اُنہیں کا تو حق ہے۔ وہی ہمسایہ ہیں۔ ہم تو ان کے گویا ہمسایہ نہیں۔ ہمارا کوئی حق اُن پر کیوں ہونے لگا ہے۔ اُنکا حق ہے کہ اپنی مُرغیاں ہمارے گھر میں چھوڑ جائیں۔ وہ نامُرادیں ہمارا ناک میں دم کردیں۔ مگر ہم دم نہ ماریں۔

مُلّا جی:۔ تم اپنا دروازہ بند رکھو۔

مُلّانی جی:۔ ہاں ہم اپنا دروازہ بند رکھیں۔ وہ اپنی مُرغیاں بند نہ رکھیں۔ ہمارا دروازہ بند ہی رہنے کے لئے بنا ہے۔ اور اُنکی مُرغیاں ہمارے گھر آنے اور ہمیں ستانے کے لئے۔

مُلّا جی:۔ اچھا تم اپنا دروازہ بند نہ رکھو۔ لیکن اُن کی مُرغیاں پکڑ کر اُن کا قورمہ تو نہ پکاؤ۔

مُلّانی جی:۔ ہم نے کون سی اُن کی دس بیس مرغیاں پکڑ کر اُن کا قورمہ پکا کھایا ہے۔ وہ برسوں ہمارے گھر آئیں۔ اور ہمیں ستاتی تھیں۔ کھرسے۔ برتن۔ چٹائیاں۔ چارپائیاں سب خراب اور نجس کرتی تھیں۔ ساری انگنائی میں گڑھے ڈال دئے۔ منوں دال چاول چٹ کر گئیں۔ کیا یہ سب چیزیں ایک دو چار مُرغیوں کے بھی برابر نہیں۔ وہ ہمیں برسوں ستائیں روز ہمارا نقصان کر جائیں۔ محلہ والے بالکل بے گُناہ اور ہم ایک مُرغی پکڑ کر کاٹ لیں تو گُنہگار۔ یہ اچھا انصاف اور خوب مسئلہ ہے۔ اچھا ایسا ہی ہے تو مُرغی نہ کھانا۔ آج چٹنی روٹی ہی سہی۔ ابھی نمک مرچ اور لہسن کی چٹنی پیسے دیتی ہوں۔

مُلّا جی:۔ خوب تم مرغی کا قورمہ کھاؤ۔ اور ہم چٹنی روٹی، اجی مُرغی پرایا مال ہے۔ تو گھی تو اُس میں ہمارے داموں کا پڑا ہے مسالہ ہمارا لگا ہے۔ لکڑیاں ہماری جلی ہیں۔ حرام ہیں اسکی بوٹیاں۔ شوربا بنا ہے ہمارے مال کا وہ ہمارے لئے حلال ہے۔

بس شوربا شوربا ہمیں نکالدو۔ بلکہ اونڈیل دو۔ رہی بوٹیاں سو وہ اپنی ستانے والی مُرغی کی تم چباؤ۔ اب جو مُلّانی جی پیالے میں شوربا اُنڈیلنے بیٹھیں تو مُرغی کی بوٹیاں بھی شوربے کے ساتھ ساتھ آنے لگیں۔ مُلّانی جی نے اُنہیں چمچہ سے روکنا چاہا تو سُرخ سُرخ بُوٹیاں دیکھکر مُلّا جی کا جی للچایا۔ فرمانے لگے بیوی جو بوٹی اپنے آپ رو میں آئی ہے اُسے آنے دو۔ رو میں جو آئے رواہے۔ یہ سُنکر مُلّانی جی کو تو ہنسی آ گئی۔ اور مُرغی کی بُوٹیاں پیالے میں آپڑیں اور مُلّا جی نے شوربا اور بوٹیاں دونوں خوب مزے سے کھائیں۔ اور رو میں رواہے نے کچھ ایسی قبولیت پائی کہ ایک ضرب المثل ہو گئی۔

صحیح یا جھوٹ یہ مسئلہ تو کسی مُلّا نے اپنے لئے نکالا تھا۔ لیکن اب بہت سے ناکردہ گناہ بھی اِس ضرب المثل کی لپیٹ میں آجاتے ہیں ؛

عبدالرحمٰن ؛

کسی کی یاد

سُکوں ہوتا نہیں طائر کو جب اپنے نشیمن میں　　کہ جب ہوتی ہیں آسودہ بہاریں صحنِ گلشن میں
گھٹائیں جھوم کر اُٹھتی ہیں جب مشرق کے گوشوں سے　　کہ جب دلکش مناظر ہوتے ہیں صحرا کے دامن میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

شفق گوں شام کے سائے میں دریا کی روانی میں　　تمنّا رنگ جب بھرتی ہی اُلفت کی کہانی میں
جُدائی سے تمہاری جب فضا تاریک ہوتی ہے　　نظر آتی نہیں رنگینیاں نقشِ جوانی میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

مجھے یہ چاندنی بے کیف سی معلوم ہوتی ہے　　کہ ہر شے بے تمہارے حُسن سے محروم ہوتی ہی
میں بنجاتا ہوں جب اِک پیکرِ یاس غم و حسرت　　کہ جب تخیلِ راحت، دہر سے معدوم ہوتی ہی
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

اضافہ ہوتا ہی میرے جنونِ حشر ساماں میں　　یہ ظالم کوئلیں جب کوکتی ہیں صحنِ بُستاں میں
مجھے جب واقعاتِ عہدِ ماضی یاد آتے ہیں　　تلاطم سا بپا ہوتا ہی جب خوابیدہ ارماں میں
تم اکثر یاد آتے ہو تم اکثر یاد آتے ہو

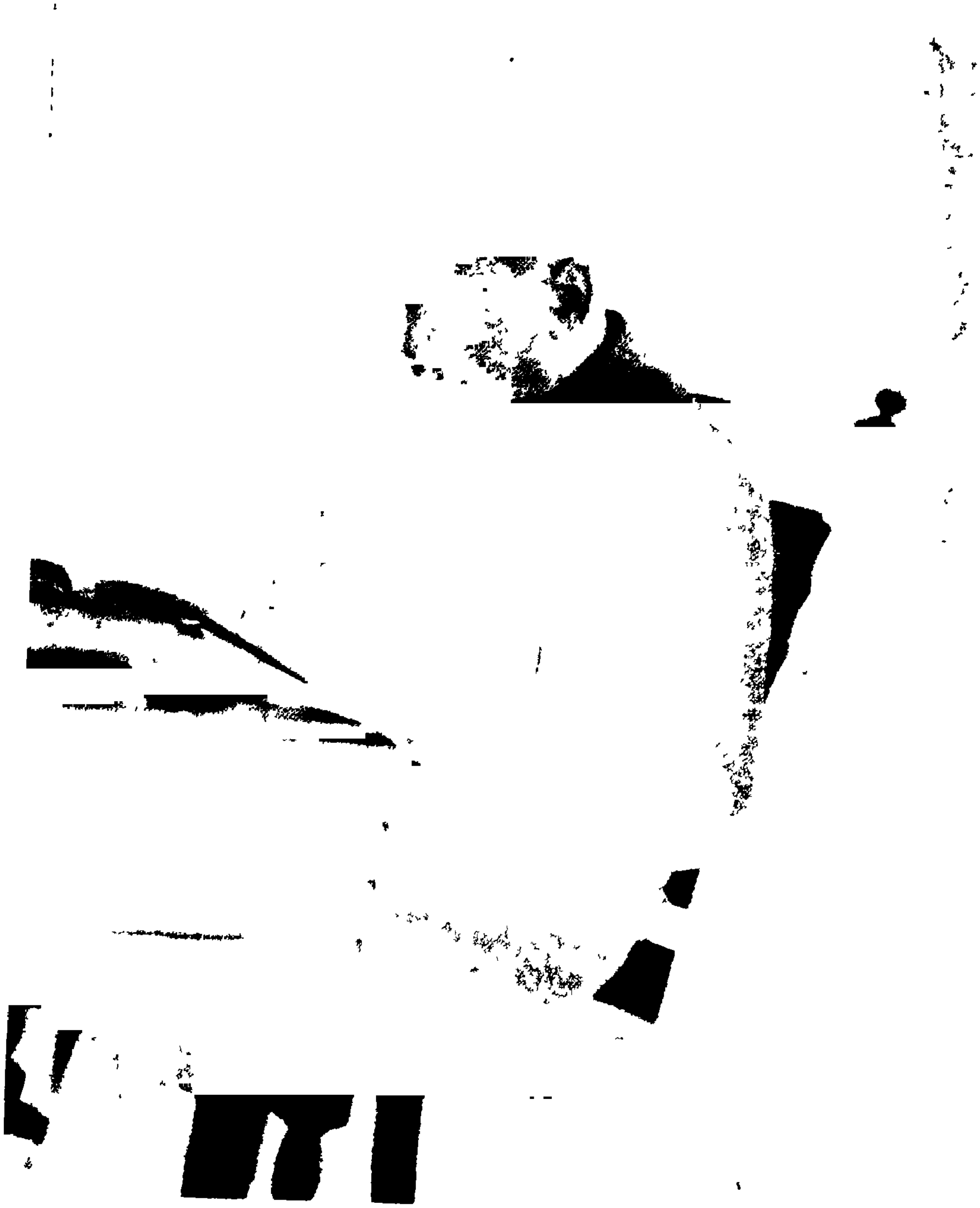
مرے دل کا ہر اک ذرّہ سراپا جوش ہوتا ہی　　کہ جب دریا سکوتِ شام میں خاموش ہوتا ہی
مری وارفتگیٔ شوق کا عالم معاذ اللہ　　مری ہستی کا ہر رُخ مجھ سے خود روپوش ہوتا ہی
وہ اِک تم ہو کہ ایسے وقت مجھکو یاد آتے ہو

ثاقب کانپوری ؛



حاجی سید وحید الدین احمد صاحب بیخود دہلوی

بوڑھا ہوں مگر طبع جواں رکھتا ہوں
صورت نہ سہی حسنِ بیاں رکھتا ہوں
ملتی ہے مجھے داد فصاحت بیخود
میں قلعۂ دہلی کی زباں رکھتا ہوں



مولانا عنایت اللہ دہلوی

شیکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل

میکبتھ

مترجمہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی بی۔اے

(سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد۔دکن)

ڈراما کے اشخاص

ڈنکن۔ بادشاہ اسکاٹستان۔

میلکم۔ ڈونل بین۔ } بادشاہ کے فرزند۔

میکبتھ۔ بینکو۔ } بادشاہ کے سپہ سالار۔

میکڈف۔ لینکس۔ راس۔ منٹیتھ۔ اینگس کاتھنس۔ } اسکاٹستان کے بڑے رئیس۔

فلی نس۔ بینکو کا بیٹا۔

سیورڈ۔ امیرِ نورتھمبرستان انگریزی فوج کا افسرِ اعلیٰ

جوان سیورڈ۔ سیورڈ کا فرزند۔

سیٹن۔ ایک فوجی افسر جو میکبتھ کی خدمت میں حاضر رہتا ہے۔

ایک لڑکا۔ میکڈف کا بیٹا۔

ایک انگریز ڈاکٹر۔

ایک اسکاچ ڈاکٹر۔

ایک سارجنٹ۔

ایک حمّال۔

ایک بُڈھا آدمی۔

لیڈی میکبتھ۔

لیڈی میکڈف۔

خواصیں جو لیڈی میکبتھ کے پاس حاضر رہتی ہیں۔

اُمرا۔ شرفا۔ فوجی سردار۔ سپاہی۔ قاتل۔ مُلازمین اور قاصد۔

ہیکیٹی۔

تین چُڑیلیں۔

کچھ ہوائی صورتیں۔

منظر:۔ اسکاٹستان اور انگلستان۔

میکبتھ

جزوِ اوّل

پہلا منظر:- ایک ویران مقام - آسمان پر بجلی اور گرج ہے - تین جادوگرنیاں سفلی عمل میں مشاق، تقدیر کا حال بتانے والیاں آتی ہیں -

پہلی جادوگرنی:- کہو بہن - اب پھر کب ملنا ہوگا - کیا گرجتے بادل، چمکتی بجلیوں یا برستے مینہ میں ملاقات ہوگی؟

دوسری جادوگرنی:- نہیں نہیں - جب یہ غل غپاڑہ شور شغب ہو لیگا -

تیسری جادوگرنی:- یہ تو سورج چھپنے تک سب ختم ہو جائیگا -

پہلی جادوگرنی:- اچھا ہوا - یہ تو بتاؤ کہاں ملنا ہوگا؟

دوسری جادوگرنی:- اسی کیچڑ پانی جھاڑیوں والی زمین پر -

تیسری جادوگرنی:- ہاں، وہیں تو میکبتھ سے ملنا ہے -

پہلی جادوگرنی:- اری میری ہمزاد کالی کرنجی بلی تو کیوں چیخے جاتی ہے؟ ذرا دم لے، ابھی آتی ہوں -

دوسری جادوگرنی:- اور تو میرے ہمزاد مینڈک تو کیوں اتنا ٹرٹر کرکے مجھے بلائے جاتا ہے؟ ٹھیر، ابھی آئی -

تینوں جادوگرنیاں:- ہمارے نزدیک برائی بھلائی ہے اور بھلائی برائی - آؤ چلو - کہر اور گندی ہوا میں گشت لگائیں -

دوسرا منظر:- فورلیس کے قریب ایک لشکرگاہ -

بادشاہ ڈنکن، اسکے دونوں فرزند میلکم، دونل بین - لی نکس مع چند خادموں کے آتے ہیں - ایک سپاہی کو دیکھتے ہیں کہ زمین پر پڑا ہے - زخموں سے خون جاری ہے -

ڈنکن:- یہ خون میں آلودہ آدمی کیسا پڑا ہے؟ اس کی حالت سے ظاہر ہے کہ آخری بغاوت کا حال وہ خوب کہہ سکیگا -

میلکم:- حضور یہی شخص ہے جسنے ایک وفادار و جاں نثار سپاہی کی طرح مجھے دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہونے سے بچایا تھا - اے بہادر دوست اٹھ اور بادشاہ کی حضور میں بیان کر کہ آخری لڑائی کو تونے کس حال میں چھوڑا تھا -

زخمی سپاہی:- حالت ایسی مشتبہ تھی جیسے دو ڈوبتے آدمی آپس میں لپٹ جائیں، اور ایک دوسرے کو تیرنے نہ دے - باغیوں کے اس بے رحم سرغنے میکڈن ولڈ نے، جسے بغاوت و سرکشی ہی زیب دیتی ہے، دنیا بھر کے شریر اور مفسد اپنے پاس جمع کر لئے ہیں - چنانچہ مغرب کے جزیروں سے ہلکے اور بھاری دونوں قسم کے ہتھیار رکھنے والے سپاہی اس کے پاس چلے آتے ہیں - اور تقدیر اس ناپاک لڑائی پر کچھ ایسی نظر مہر سے متبسم ہے جیسے کوئی بیسوا ہو کہ کبھی اس آشنا کو دیکھکر مسکرا دی، کبھی اس یار کو دیکھکر ہنس پڑی پھر بھی میرے خیال میں باغیوں کی حالت اس وقت کمزور ہو چلی تھی - کیونکہ بہادر میکبتھ نے، جس کی شجاعت میں کسکو کلام ہو سکتا ہے، شکست یا پسپائی کی مطلق پروا نہ کی اور تلوار پھراتا ہوا دشمن میں گھس پڑا - تلوار سے خون کی بھاپ اٹھ رہی تھی اور اسی حال میں دلیری اور جوانمردی کا محبوب بنا دشمن سے رستہ نکالتا ہوا باغیوں کے سرغنے کے سامنے

جا پہونچا۔ بات تک نہ کی اور بلا تامل اُس کی ناف میں تلوار بھونک کر دانتوں تک اُسے چیرتا چلا گیا اور اُس کا سر کاٹ کر فصیل پر جا لٹکایا۔

ڈنکن:- کیوں نہ ہو۔ بڑا بہادر بھائی ہے اور طبیعت کا بھی نہایت شریف ہے۔

زخمی سپاہی:- اب اُس سمت سے جہاں سے سورج اپنی روشنی دُنیا پر پھیلاتا ہے اور سمندر میں سفینہ شکن گرداب اور آسمان پر خوفناک کڑاک بجلیاں نظر آتی ہیں غرض جہاں سے راحت و آرام پانے کی توقع ہو سکتی تھی وہاں سے رنج و اذیت کا سامان پیدا ہوا۔ بادشاہ سلامت غور فرمائیں کہ جونہی عدل و انصاف نے ہمت و مردانگی کے ہتیار لگائے دشمن کے سپاہی جو میدان میں ہر طرف پھیلے تھے اُنہیں اپنی خیر و سلامتی اِسی میں نظر آئی کہ جس قدر جلد ممکن ہو میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن جب چمکتے ہوئے ہتیار اور کمک آن پہونچی تو ناروے کے بادشاہ نے اپنا فائدہ اِسی میں سوچا کہ لڑائی از سرِ نو شروع کر دے۔

ڈنکن:- تو کیا اِس نئے ساز و سامان کو دیکھکر ہماری فوج کے سپہ سالار میکبتھ اور بینکو ڈرے نہیں؟

زخمی سپاہی:- حضور ڈرے تو مگر اس طرح جیسے عقاب چڑیوں یا شیر خرگوش کو دیکھکر ڈرے۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ حضور کے اِن دونوں سرداروں نے دشمن پر وہ دوہری چوٹیں پہونچائی ہیں کہ گویا توپوں میں دو دو مرتبہ مصالح بھر کر داغا جا رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ خون میں نہانا چاہتے ہیں، یا خون و خرابے کی کوئی دوسری یادگار مثل گلگوتھا کے قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ نہیں عرض کر سکتا کہ اُنکا واقعی ارادہ کیا تھا لیکن اب مجھے ضُعف سے غش آ چلا ہے اور میرے زخم مرہم کے مُحتاج ہیں۔

ڈنکن:- تیرا یہ بیان اور تیرے زخم دونوں تیری عزت و شرافت پر گواہی دے رہے ہیں۔ دونوں سے پاسِ عزت اور قومی غیرت ٹپک رہی ہے۔ دیکھو۔ اس کے علاج کیلئے فوراً جراح حاضر کئے جائیں (زخمی سپاہی کو چند آدمی اُٹھا کر باہر لیجاتے ہیں۔)

یہ کون آ رہا ہے؟

میلکم:- حضور۔ یہ راس کا لائق امیر ہے۔

لینکس:- ملاحظہ ہو کہ اس کی نگاہوں سے کس غضب کا اضطراب اور عُجلت پائی جاتی ہے۔ آنکھوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ کوئی عجیب بات کہنے کو ہے۔

(راس آتا ہے)

راس:- خُدائے ذوالجلال بادشاہ کو زندہ سلامت رکھے۔

ڈنکن:- میرے لائق امیر تم کہاں سے آ رہے ہو؟

راس:- جہاں پناہ بندہ فائف سے آتا ہے۔ وہاں ناروے کے جھنڈے اور پھریرے بلند ہو کر آسمان تک کو مُنہ چڑاتے ہیں۔ اور ہماری سرد مزاج رعایا کو بھی ایک آگ کا شُعلہ بنا دیا ہے۔ شاہِ ناروے بذاتِ خود اِس باغی و بدخواہ یعنی امیرِ کاڈور کی پُشت گرمی سے بڑی سختی اور شدّت سے حملہ آور ہوا۔ لیکن ہمارا میکبتھ جو اس وقت لڑائی کی دیبی کا دُولھا بنا ہوا ہے ناروے کی فوجوں کے مقابلے پر اس طرح آیا جیسے فریقین میں ہر فریق دوسرے فریق کا پورا جوڑ اور جواب بن کر آئے۔ مگر میں یہی کہونگا کہ پھر بھی میکبتھ نے ضبط سے کام لیا۔ اور لڑائی کا انجام یہی ہوا کہ ہمیں فتح ہو گئی۔

ڈنکن:- اِس سے بڑھکر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

راس :- اب بادشاہِ ناروے ساؤنیو مصالحت کی گفتگو کرنی چاہتا ہے۔ مگر تا وقتیکہ شنت کلمی کے ٹاپو میں ہمارے مصارفِ جنگ کے لئے دس ہزار ڈولر جمع نہ کر دے ہم اُس کے مُردے دفن نہ ہونے دینگے۔

ڈنکن :- بس اب یہ کاڈور کا امیر ہمارے کسی نفع میں نقصان کا مُوجب نہ ہو سکیگا۔ جاؤ۔ اُسے قتل کا حکم ہماری طرف سے سُنا دو۔ اور اب تک امیرِ کاڈور کا جو خطاب وہ رکھتا تھا اُسے ضبط کر کے یہی خطاب ہم میکبتھ کو عطا کرتے ہیں۔

راس :- فدوی ابھی جا کر حضور کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہے۔

ڈنکن :- جو کچھ کاڈور نے کھو یا ہے وہ میکبتھ کو دیا جاتا ہے۔ (سب چلے جاتے ہیں۔)

تیسرا منظر :- کیچڑ۔ دلدل اور جھاڑیوں والی زمین۔ بادل گرجتا ہے۔ تینوں سفلی عمل کرنے والی جادوگرنیاں نمودار ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی :- بہن تم کہاں تھیں ؟

دوسری جادوگرنی :- کسانوں کے مویشیوں کی جان نکال رہی تھی۔

تیسری جادوگرنی :- اور بہن تم کہاں تھیں ؟

پہلی جادوگرنی :- ایک ملاّح کی جورو گود میں اخروٹ کی گری بھرے پھنکے پر پھنکے مار کر چبائے چلی جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی مجھے بھی دے۔ اسپر وہ موٹی مُسٹنڈی جُرو کہتی کیا ہے "دُور ہو چڑیل"۔ خیر سُنتے تو میں نے سُن لیا۔ مگر میں پہلے سے جانتی ہوں کہ اُس کا مرد جہاز کا ناخُدا بن کر کہیں دُور گیا ہے تو بُوا اُسنو میں بھی چھلنی میں بیٹھکر جادو کے زور سے وہیں پہونچتی ہوں۔ اُس کے جہاز کے پیندے میں دُم کٹے چوہے کی طرح کُتر کُتر کر چھید نہ ڈلے ہوں تو بات نہیں۔

دوسری جادوگرنی :- بہن گھبراتی کیوں ہو، میں بھی بڑے زور کی ہوا چلاؤنگی۔

پہلی جادوگرنی :- ہاں بُوا۔ تم تو مجھ پر ہمیشہ سے مہربان ہو۔

تیسری جادوگرنی :- اور میں بھی اس زور کی آندھی اُٹھاؤنگی کہ جہاز پتّا بنا اُڑتا پھرے۔

پہلی جادوگرنی :- اور میں اپنی طرف سے بھی وہ جھکڑ چلاؤنگی کہ ساری حقیقت کُھل جائے گی اور ناخُدا کی کتاب میں جتنے بندرگاہ لکھے ہونگے اُن میں وہ وہ آندھیاں اور طوفان برپا کرونگی کہ سب حیران رہ جائیں گے۔ اور جتنے ملاّح ہونگے اُن کا خون چوس کر اُنہیں بھوک بنادونگی۔ دن اور رات میں کسی وقت بھی کسی کو نیند نہ آئے گی۔ نو مرتبہ نو اٹھواڑوں تک ہر آدمی تھکا ہارا بیجان رہے گا اور سبکی زبان پر یہی ہوگا کہ "ہائے گرا، ہائے مرا"۔ یہ سچ ہے کہ جہاز غارت نہ ہوگا مگر ہوا کے زور اور موجوں کے تھپیڑوں سے اُس کی وہ گت ہوگی کہ کیا پوچھنا ہے۔ ذرا دیکھو تو میرے پاس یہ کیا چیز ہے۔

دوسری جادوگرنی :- اچھی دکھاؤ، دکھاؤ۔

پہلی جادوگرنی :- ایک مُسافر کا انگوٹھا کُتر لائی ہوں۔ جو کشتی کے سُکّان پر بیٹھا گھر آرہا تھا۔ کشتی ڈانواڈول ہو کر پانی میں ڈوبنے لگی۔

(نقارے اور طبل بجنے کی آواز آتی ہے۔)

تیسری جادوگرنی :- اہا جی۔ ڈھول بجے۔ ڈھول۔ اب تو میکبتھ آتا ہوگا۔

تینوں جادوگرنیاں :- ہم تو سب خُشک و تر کی رکھوالیاں ہیں، اور دُنیا بھر میں گشت کرتی ہیں۔ تین میرے، تین تیرا

تم دونوں کے، یہ سب تو ہونے۔ چلو منتر پورا ہُوا۔
میکبتھ:۔ فتح کے لحاظ سے ایسا اچھا دن اور موسم کے لحاظ سے اتنا بُرا دن کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ارے یہ وحشت زدہ سُوکھی جھُرجھُر صورتیں کس کی ہیں؟ ان کے تن پر پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین کی رہنے والیاں نہیں ہیں مگر یہ کہنا بھی مشکل ہے کیونکہ زمین ہی پر وہ ملی ہیں۔ اری بھیانک صورتو، بتاؤ کیا تم جیتی جاگتی جانیں ہو۔ کیا کوئی آدم زاد تم سے کوئی بات پوچھ سکتا ہے۔ شکلوں سے تمہاری تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم ہماری بات سمجھتی ہو۔

(اتنا سُنتے ہی ہر جادوگرنی اپنی جھُرّیاں
پڑی سردی سے پھٹی ایک ایک اُنگلی اپنے
سُوکھے پپڑیاں جمے ہونٹوں پر رکھتی ہے)

تم ظاہر میں تو عورتیں معلوم ہوتی ہو۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم سب کے مُنہ پر ڈاڑھیاں ہیں۔ اگر بات کر سکتی ہو تو بتاؤ تم کون ہو؟

پہلی جادوگرنی:۔ میکبتھ مُبارکباد۔ امیر گلیمس مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی:۔ میکبتھ مُبارک مُبارک امیر کادور مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی:۔ میکبتھ اب تم بادشاہ ہوجاؤ گے۔ بادشاہی مُبارک ہو۔

بینکو:۔ میکبتھ۔ تم اتنے چونکتے کیوں ہو؟ اگر ان کی کوئی بات بھلی معلوم ہوتی ہے تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میرے شریف ساتھی تم اتنے گُم سُم کیوں ہوگئے۔ کیا واقعی وہم وخیال کے پُتلے بن گئے یا بنتے ہو۔ امیر گلیمس ہونے کی عزّت تو تمہیں اس وقت بھی حاصل تھی۔ اب اس سے بھی بڑھکر یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ امیر کادور بھی ہوجاؤ گے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی مالک تاج وتخت ہونے کی تمہیں اُمید دلائی گئی ہے۔ کچھ سُنا بھی آپنے؟ لیجئے وہ تو کسی خیال میں ایسے محو ہوئے کہ کچھ سُنتے ہی نہیں۔ اری چُڑیلو! مجھ سے تم نے کچھ نہیں کہا۔ زمانے کے کشت زار میں جو بیج ڈالے جاتے ہیں اگر تم انہیں دیکھکر بتا سکتی ہو کہ کونسا تخم جمیگا کونسا نہ جمیگا تو پھر میری قسمت کا حال بھی تو کچھ بتائیں۔ میں تو نہ تمہاری مہربانیوں کا محتاج ہوں اور نہ تمہاری دُشمنی سے ڈرتا ہوں۔ مجھ سے کیوں نہیں کچھ کہتیں؟

پہلی جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

پہلی جادوگرنی:۔ بینکو تم میکبتھ سے کم مگر اُس سے بڑے رہوگے۔

دوسری جادوگرنی:۔ میکبتھ کی طرح خوش مگر اس سے زیادہ خوش تر ہوگے۔

تیسری جادوگرنی:۔ تم سے بادشاہ پیدا ہونگے۔ مگر خود کبھی بادشاہ نہ ہوگے۔

پہلی جادوگرنی:۔ بس میکبتھ اور بینکو دونوں کو مُبارک ہو۔

میکبتھ:۔ اری پہیلیوں میں بات کرنے والیوں ذرا ٹھیرو۔ دم لو۔ صبر کرو۔ کچھ اور باتیں بھی بتاتی جاؤ۔ جب سے میرا باپ سنیل مرا ہے امیر گلیمس تو میں اُسی وقت سے ہوگیا ہوں۔ لیکن امیر کادور میں کیسے ہوسکتا ہوں۔ یہ امیر تو ابھی زندہ ہے اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ بتاؤ کہ یہ عجیب خبریں تمہیں کہاں سے ملیں۔ اور تم کیوں اس اُجاڑ اور ویران زمین پر ہمارا راستہ روک کر ایسی خبریں سُنانے لگیں جن سے آنے والی باتوں پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔ میں

حکم دیتا ہوں کہ میرے ان سوالوں کا جواب دو۔

(جادوگرنیاں سب کی سب ایکدم غائب ہو جاتی ہیں۔)

بینکو:۔ پانی کے بلبلے تو بہت دیکھے ہونگے۔ اس وقت جو کچھ آپنے دیکھاہے یہ مٹی کے بلبلے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غائب ہو کر یہ سب کدھر چلی گئیں۔

میکبتھ:۔ فضا میں غائب ہوگئیں۔ اگرچہ وہ گوشت پوست رکھتی تھیں مگر وہ ایسی تحلیل ہوگئیں جیسے ہوا میں ہمارا سانس ملکر ہوا ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر اور ٹھیرتیں۔

بینکو۔ جو باتیں ان کی زبانی آپکی نسبت سننے میں آئی ہیں کیا ان کا واقعی پیش آنا آپ ممکن سمجھتے ہیں؟ اگر انکے صحیح ثابت ہونے کا آپکو یقین ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اس وقت وہ بوٹی کھاتے ہیں جس کے کھانے سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میکبتھ:۔ بینکو۔ تمہاری اولاد بادشاہ ہوگی۔

بینکو:۔ اور آپ بھی تو بادشاہی کرینگے۔

میکبتھ:۔ اور کادور کا امیر بھی تو سمجھو۔ کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا؟

بینکو:۔ ہاں، یقینی۔ انکے الفاظ یہی تھے۔ یہ کون آرہا ہے؟

(راسس اور اینگس آتے ہیں)

راسس:۔ میکبتھ، بادشاہ سلامت نے تمہاری فتح کا حال سنکر اظہار خوشنودی فرمایا ہے اور جب بغاوت کو فرو کرنے میں بادشاہ نے تمہاری شجاعت و مردانگی کے کام سنے تو اس وقت حیرت و تعریف میں یہ بحث چھڑی کہ حیرت زیادہ ہے یا تمہاری تعریف۔ اس بحث میں خاموش و گنگ رہکر دیگر امور پر غور ہو رہا تھا کہ اسی دن دریافت ہوا کہ بادشاہ ناروے کی زبردست فوجوں میں جتنا کشت و خون ہوا وہ سب تمہارا کام تھا۔ دشمن سے تم مطلق ڈرے نہیں۔ اب بادشاہ کے پاس قاصد پر قاصد اس طرح آنے شروع ہوتے جیسے آسمان سے اولے گریں۔ ہر قاصد جو خبر لاتا تھا تمہاری تعریف میں اس کی زبان خشک ہوتی تھی۔ اور وہ کہتے تھے کہ ملک کو دشمن سے بچانے میں تم نے حیرتناک جاں نثاری سے کام لیا ہے۔ یہ کل خبریں بادشاہ سلامت کے گوش گذار ہوتی تھیں۔

اینگس:۔ اب جہاں پناہ کی طرف سے ہم تمہارا شکریہ ادا کرنے بھیجے گئے ہیں۔ اور اس لئے کہ بادشاہ کی نظر میں تمہاری وقعت کے بڑھنے کا مژدہ تمہیں سنائیں۔ نہ یہ کہ انعام واکرام جو تمہیں ملنے والا ہو وہ تمہیں پیش کریں۔

راسس:۔ جو کثیر انعام آپکو ملنے والا ہے ہمیں حکم ہوا ہے کہ اسی میں سے بطور رقم پیشگی ہم آپکو امیرِ کادور کے لقب سے خطاب کریں۔ اور اے لائق امیر ہم آپکو امیرِ کادور کے خطاب پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور آج سے یہی خطاب آپ کا رہے گا۔

بینکو:۔ تو کیا جو کچھ ان شیطان کی خالاؤں نے کہا تھا وہ سچ نکلا۔

میکبتھ:۔ مگر امیرِ کادور تو ابھی زندہ ہیں۔ انکے لقب سے آپ مجھے کیسے خطاب کرسکتے ہیں۔ کیا مانگے تانگے کا خلعت آپ مجھے پہناتے ہیں؟

اینگس:۔ امیرِ کادور ابھی زندہ ہے مگر سزائے موت کا حکم اس کے بارے میں صادر ہو چکا ہے۔ اب وہ زیادہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کا قصور کیا تھا، یہ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ دو ہی باتیں معلوم ہوتی ہیں، یا تو ناروے کے بادشاہ سے مل گیا تھا یا باغیوں سے سازش کرکے انہیں

خفیہ مدد پہونچائی۔ یا دونوں باتیں کیں۔ بہر کیف مُلک کو تباہ
کرنے میں اُس نے کوئی کسر نہ رکھی۔ مجھے ٹھیک نہیں معلوم
مگر بغاوت کا جُرم اُس پر ثابت ہو چکا ہے اور اس جُرم
کا اقبال بھی اُس نے کر لیا ہے۔ چونکہ جُرم ثابت ہو چکا ہے
بس یہی بات اُسکی تباہی کا سبب ہوئی ہے۔
میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہی) گلیمس اور کاوڈر کا امیر۔ مگر
سب سے بڑی بات بعد کو آتی ہے۔ (راس اور اینگس سے کہتا
ہے) آپکی اِس تکلیف کا بیحد منّت گزار ہوں (بینکو سے)
کیوں کیا اب بھی تمہیں توقع نہیں کہ تمہاری اولاد بادشاہ
ہوگی؟
بینکو:۔ اگر وہ پیش خبری اپنے پورے مفہوم میں دُرست
سمجھی جائے تو پھر آپ کے دل میں تاج و تخت ملنے کی تمنّا
پیدا ہونی لازمی ہو جائیگی کیونکہ امیرِ کاوڈر تو آپ ہو ہی
چکے ہیں۔ یہ بات بھی کچھ عجیب ہوئی ہے۔ لیکن اکثر ایسا
دیکھنے میں آیا ہے کہ اِس قسم کی باتیں انجامِ کار بموجب
نقصان ہوا کرتی ہیں۔ ظلمت و تاریکی کی یہ ذرّیات بظاہر
ہم کو سچّی باتیں بتاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو
سچ دکھا کر بڑی باتوں میں دھوکا دیدیتی ہیں۔ ذرا مہربانی
کر کے ایک بات سُن لیجئے۔
میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہی) دو باتیں جو سچ نکلی ہیں وہ
آخری بات کے سچ نکلنے کا بھی یقین دلاتی ہیں۔ راس اور
اینگس میں آپ دونوں صاحبوں کا بیحد ممنون ہوں (علیحدہ)
یہ خرقِ عادت صورتیں جو ظاہر ہوئی تھیں نحس نہیں
ہو سکتیں اور نہ انہیں سعد کہا جا سکتا ہے۔ اگر نحس ہوتیں
تو کامیابی کی مجھے کیوں اُمید دلاتیں۔ اور ایک سچّی بات
یعنی مجھے امیرِ گلیمس کہہ کر مجھے امیرِ کاوڈر ہو جانے کی
اُمید دلائی۔ لیکن جو خبر اُنہوں نے مجھے دی ہے اگر وہ سعد
ہوتی تو پھر اِس سے میرا دم کیوں فنا ہوا جاتا ہے اور جو شکل
ذہن میں پیدا ہوئی ہے اُس سے بدن کے رونگٹے کیوں
کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اور میرا دل جو خاموش چین سے
اپنی جگہ بیٹھا تھا اب وہ تڑپ تڑپ کر کیوں پسلیوں سے
ٹکریں کھانے لگا۔ اِس خیال سے کہ آئینِ فطرت کے خلاف
کوئی کام کرنا پڑیگا مجھ پر اتنا خوف کیوں طاری ہوا جاتا
ہے۔ جس خوف کا انسان کو فوراً مقابلہ کرنا ہو وہ اِتنا
آزار دہ نہیں ہوتا جتنا کہ وہ خوف جو آئندہ کبھی پیش آنے
والے واقعے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ بادشاہِ وقت
کو قتل کر کے خود بادشاہ بن جاؤں اِس وقت تک
محض ایک خیال ہی خیال ہے جس کے آتے ہی مُلکِ
دل کے نظم و دستور میں فتور پڑ جاتا ہے اور کسی بات کو
اُس کی صحیح شکل میں سوچنا بے سُود و ہوائی تصوّرات سے
مغلوب ہو جاتا ہے اور بجز ایک وہم و خیال کے کوئی
چیز اصلی و حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔
بینکو:۔ واہ واہ۔ دیکھئے تو ہمارے یہ دوست اپنے کسی
خیال میں کس قدر محو و مستغرق معلوم ہو رہے ہیں۔
میکبتھ:۔ اگر بخت و اتفاق مجھے بادشاہی دینگے تو وہی
میرے سر پر تاج بھی رکھیں گے۔ خود مجھے کچھ نہ کرنا
پڑے گا۔
بینکو:۔ نئے نئے خطاب، نئے نئے اعزاز اُسے مل رہے
ہیں۔ مگر نئی پوشاک بدن پر اُس وقت تک ٹھیک نہیں
آتی جب تک کچھ دنوں پہن نہ لی جائے۔
میکبتھ:۔ (علیحدہ) جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہیگا۔
دن یا وقت کیسی ہی مشکلوں اور مصیبتوں کا ہو مگر زمانہ
اُن میں سے گزرتا ہوا اپنا دورہ ہر حال میں پورا کر ہی
لیتا ہے سخت سے سخت مصائب اور آفات بھی ایک نہ ایک

دن ختم ہو ہی جاتے ہیں۔

بینکو۔ لائق میکبتھ، ہم اب تک آپ کے فرمانے سے یہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔

میکبتھ:۔ معاف فرمائیگا۔ میرا یہ کُند و سُست دماغ اس وقت کسی خیال میں محو تھا اور خیال بھی ایسا تھا جس میں کبھی کی بھُولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میرے مہربان شریفو! آپ نے جسقدر تکلیفیں اس وقت میرے لئے گوارا فرمائیں ہیں وہ میرے دل کی کتاب میں نقش رہینگی اور میں اس کے اوراق کھُول کر ہمیشہ پڑھتا رہونگا۔

اب مجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ (بینکو سے کہتا ہے) جو باتیں بخت و اتفاق سے اس وقت پیش آ رہی ہیں اُن پر آئندہ غور کرنا ہے۔ اس بیچ کے زمانے میں ہم تم کسی وقت تنہا بیٹھکر آزادی سے غور کریں گے۔

بینکو:۔ نہایت خوشی سے۔

میکبتھ:۔ اِس وقت جو کچھ گزرا ہے وہی کافی ہے۔ دوستو آؤ چلیں۔ (چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر:۔ فیرس۔ شاہی قصر

باجے بجتے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن اور اُس کے دونوں فرزند میلکم اور ڈونل بین آتے ہیں۔

ڈنکن:۔ کہو امیر کاڈور قتل کر دیا گیا۔ جو لوگ اس کام پر مقرر تھے وہ واپس آ گئے؟

میلکم:۔ حضور، وہ ابھی تک واپس نہیں آئے لیکن ایک شخص سے باتیں ہوئی تھیں جس نے امیر کاڈور کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ موت کے وقت اُس نے اپنے باغی ہونے کا اقبال کیا۔ اور حضور سے عفوِ تقصیر چاہا اور بے انتہا ندامت و پشیمانی ظاہر کی، زندگی میں کوئی بات اتنی لیاقت کی نہ کی تھی جیسے کہ مرتے وقت کی۔ وہ اس طرح مرا گویا جان دینے کا تصور پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ اور جانِ عزیز جو مُستعار رکھتا تھا وہ اس طرح پھینک دی کہ گویا اس چیز کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔

ڈنکن:۔ افسوس دُنیا میں کوئی علم کوئی فن ایسا نہیں جس سے کہ دل کی اندرونی کیفیت چہرے سے معلوم کر لی جائے۔ وہ نہایت نجیب و شریف تھا۔ میں نے اپنے اعتماد و اعتبار کا قصر اُسی پر قائم کر رکھا تھا۔

(میکبتھ، بینکو، راس اور اینگس آتے ہیں)

اے میرے لائق عزیز بھائی۔ احسان فراموشی کا گُناہ اب تک میرے سینے پر بارِ گراں ہو رہا تھا۔ تم مکارمِ خسروانہ کے اس قدر جلد جلد مُستحق ہوتے رہے کہ میں اتنی ہی عُجلت سے تمہاری خدمتوں کا انعام تمہیں نہ دے سکا۔ صرف اتنا اور کہنا ہے کہ جو کچھ صلہ میں دُوں اُس سے کہیں زیادہ کے تم مُستحق ہو۔

میکبتھ:۔ جو کچھ وفاداری اور خدمت گزاری اِس نمک خوار نے کی وہ خود فدوی کی جاں نثاری اور خدمت کا سب سے بڑا صلہ ہے۔ حضور کو ہم جاں نثاروں پر حق حاصل ہے کہ ہم جہاں پناہ کی خدمت بجالاتے رہیں۔ اور حضور ہماری اطاعت گزاری کو بنظرِ التفات و پرورش دیکھیں۔ حضور میں اور ہم میں وہی تعلق ہے جو ماں باپ کو بچوں سے اور آقا کو اپنے مُلازموں سے ہوتا ہے۔ آقا کی جان اور مال، عزت اور نام کے لئے جو خدمتیں ہم پر فرض ہیں اُن پر ہمیشہ عمل رکھنا ہمیں لازم ہے۔

ڈنکن:۔ ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے باغ میں مثل ایک پودے کے لگائیں گے اور خدمت کرتے رہیں گے کہ وہ پروان چڑھے۔ شریف بینکو تم نے بھی اپنے تئیں کچھ کم

یاقت کا آدمی ثابت نہیں کیا۔ تمہاری نیک نامی بھی دوسروں
سے کم نہیں۔ ہم تمہاری پرورش اور ترقی میں بھی مثل ایک
اغبان کے آبیاری کرینگے اور تم ہمیشہ ہمارے دل سے
زدیک رہو گے۔
بینکو:۔ حضور اگر میں پھلا پھولا تو پھل پھول سب حضور
کے ہونگے۔
نکن:۔ اس وقت مسرت و شادمانی نے کچھ ایسا دل پہ
کیا ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھرے چلے آتے
ں۔ اے میرے فرزندو، عزیزو، امیرو اور میرے مقربو!
سنو۔ ہمارا قصد اپنے سب سے بڑے فرزند میلکم کو وارثِ
لطنت بنانے کا ہے اور ایسا ہی انتظام ہمیں کرنا ہوگا۔
آج سے ہم اپنے ولی عہد کو "شہزادۂ کمبرستان" کے
خطاب کیا کریں گے۔ اور ہم صرف اُسے ہی عزت نہیں
ینگے بلکہ اپنے دربار کے دیگر اعیان دا کابر کو بھی جو اپنے
حسن لیاقت سے اس وقت ہمارے آسمانِ اقبال کے
تارے ہیں مُوردِ عنایات و نوازشات کرتے رہینگے۔
ہم میکبتھ کے قصرِ انورنس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں
م اپنے اس عزیز کے اور بھی مرہونِ منت ہوں۔
یکبتھ:۔ اب اُس مصروفیت کا وقت آیا جو حضور کے
نہیں بلکہ اپنے حصولِ سعادت کے لئے ہوگا۔ میں خود
درین کر یہ مژدہ اپنی بیوی کے پاس پہونچاؤنگا کہ
ر تشریف لا رہے ہیں۔ اب فدوی رخصت چاہتا ہے۔
ں:۔ اچھا میرے نہایت لائق امیرِ کادور۔
یکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہے) واہ واہ۔ یہ شہزادۂ کمبرستان
ہیں ایک اور ٹھوکر ہوگئی۔ اب یا تو میرا خاتمہ ہوا یا
حملانگ میں دوسری پار پہونچا۔ میلکم کا وارثِ سلطنت
بنا میرے حق میں سدِّ راہ ہوگا۔ آسمان کے ستارو۔

اپنی روشنیاں گُل کر دو، تاکہ تمہارا نور میری سیاہ کاریوں
اور گہری خواہشوں کو نہ دیکھ سکے۔ اس ہاتھ کو دیکھنے
سے تو میری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ سوچا ہے
وہی ہونے دو۔ جب وہ ہو چکیگا تو یہی آنکھیں اُسے
دیکھکر سہم جائیں گی۔
ڈنکن:۔ بینکو، جو کچھ تم اُس کی نسبت کہتے ہو وہ بالکل
دُرست ہے۔ وہ حقیقت میں ایسا ہی بہادر ہے جیسا کہ
تمہارا بیان۔ اس کی تعریفیں تو میرے لئے ایک ضیافت
ہوتی ہیں۔ اچھا آؤ۔ اب اس کے پیچھے چلیں جو ہماری
خاطر و مدارات کا سامان کرنے آگے گیا ہے میکبتھ
مجھے بیحد عزیز ہے۔

پانچواں منظر:۔ میکبتھ کا قصرِ انورنس
لیڈی میکبتھ ایک خط پڑھتی اسٹیج پر
آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ "جس دن لڑائی میں فتح ہوئی اُسی دن اُن
سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ
انسان سے کہیں بڑھکر اُنہیں ہر بات کا علم رہتا ہے۔
جب ارادہ ہوا کہ کچھ اور پوچھوں تو وہ سب ہوا ہوگئیں۔
میں ابھی اسی عالمِ حیرت میں تھا کہ بادشاہ کے قاصد آئے
اور اُنھوں نے مجھے امیرِ کادور کے لقب سے خطاب کیا۔
اور یہی وہ لقب تھا جسے اُن تینوں جادوگرنیوں نے
پکار کر مجھے سلام کیا تھا۔ اور وہ بات بھی جو آئندہ
پیش آنے والی ہے کہی تھی۔ بلکہ اُنہوں نے تو یہاں تک
کہا تھا کہ مُبارک ہو اُسے جو بادشاہ ہونے والا ہے۔
اے میری شریکِ عزت و ناموس یہ کُل باتیں میں تیرے
علم میں لے آیا ہوں تاکہ تو بھی اس خوشی میں شریک رہے
اور جو بزرگی اور عزت مجھے ملنے والی ہے اُس سے بے خبر رہکر

خوشی سے محروم نہ رہے۔ یہ کُل باتیں دل میں مخفی رکھنا۔ اچھا خُدا کو سونپا"

لیڈی میکبتھ:۔ امیرِ گلیمس تو تم پہلے ہی تھے، اب امیرِ کادور بھی ہو گئے۔ اور جس بات کا تم سے آخیر میں وعدہ کیا گیا ہے وہ بھی ہو جاؤ گے۔ مگر میں تمہاری طبیعت سے ڈرتی ہوں تم میں انسانی ہمدردی اور محبت کا شیر یادرا اتنا ہے کہ تم کوئی فریب تر راستہ اِس مقصد کے لئے نہ نکال سکو گے۔ بزرگی نہیں نصیب ہونیوالی ہے۔ حُبِ جاہ و دولت تم رکھتے ہی ہو مگر جو چیز حاصل کرنی چاہو گے اُسے ایمانداری سے حاصل کرنے کی نیّت رکھو گے۔ دغا و فریب دینا گوارا نہ کرو گے مگر اے امیرِ گلیمس تم دغا و فریب ہی سے اپنی مراد کو پہنچ سکتے ہو۔ اور وہ آواز بھی یہی کہتی ہے جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ تم اس پر عمل کرنے سے ڈرو نہیں اور اسکے ساتھ ہی تم یہ بھی نہ چاہو گے کہ وہ چیز تمہیں نہ ملے۔ یہاں جلد آؤ کہ میں اپنی ہمّت و عزم کا جوش و خروش تمہارے کانوں میں بھر دوں اور اپنی دلیر زبان سے تمہاری جسارت و ہمّت کو بڑھا کر تمہارے دل سے وہ تذبذب دُور کر دوں جس میں باوجودیکہ خرقِ عادت ذرائع اور تقدیر تمہارے سر پر تاجِ شاہی رکھنا چاہتی ہے، تم اس وقت مبتلا ہو۔

(ایک قاصد آتا ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

قاصد:۔ بادشاہ سلامت آج شب کو یہاں قیام فرمائینگے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کچھ دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو۔ کیا تمہارا آقا میکبتھ بادشاہ سلامت کے ہمراہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انتظام کی غرض سے وہ مجھے پہلے اطلاع کر دیتا۔

قاصد:۔ یہ حضور نے بجا فرمایا۔ ہمارے آقا امیرِ گلیمس بھی آ رہے ہیں۔ لیکن ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے جلدی کی اور اُن سب سے پہلے وہ یہاں پہونچ گیا۔ وہ اتنا دوڑتا ہوا آیا ہے کہ دَم پھول کر اُس کی نوبت مرنے کو پہونچی ہے۔ چنانچہ بجز اسکے اُس کے مُنہ سے کچھ نہ نکلا کہ "بادشاہ سلامت آ رہے ہیں" اس کے سوا اور کوئی پوری بات وہ نہ کہہ سکا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا جو آدمی آیا ہے اُسے تکلیف نہ ہو۔ اُس کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ جو خبر وہ لایا ہے وہ اچھی ہے۔ (قاصد چلا جاتا ہے)

ظُلمت و نحوست کا شبرنگ پرندہ کریہ آواز میں چیخ رہا ہے کہ ڈنکن کی اجل اُسے یہاں لا رہی ہے۔ چیختے چیختے اُس کا گلا بیٹھ چلا ہے۔ اے خبیث روحو۔ جو انسان کے دل میں کُشت و خُون کے خیالات حلول کرتی ہو عورت کی شریف و نیک فطرت مجھ سے دُور کر دو۔ ظُلم و سفاکی سر سے پاؤں تک مجھ میں بھر دو۔ اور قلب کے وہ تمام راستے مسدود کر دو جن سے ندامت یا پشیمانی داخل ہو کر رنج و افسوس پیدا کرتی ہیں کہ کہیں وہ خونی مقصد سے مجھے باز نہ رکھیں۔ اور جب تک مقصد پورا نہ ہو میری فطرت کو چین سے نہ بیٹھنے دو۔ اور اے خونِ ناحق کے کار پردازو، میری چھاتیوں میں دُودھ کی جگہ زہر بھر دو۔ تم وہ ہو جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ دُنیا کی تمام شرارتوں میں تم برُوں کے معاون و مددگار ہوتے ہو۔ اے اندھیری رات تو جہنّم کے دُخانی پردوں میں چھپی بیٹھی رہ تاکہ نوکِ خنجر بھی اپنے لگائے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے۔ اور اس شبِ تیرہ و تار میں فرشتے بھی آسمان سے جھانک کر آواز نہ لگا سکیں:۔ خبردار خبردار۔!

(میکبتھ اندر آتا ہے)

اے امیرِ گلیمس اور اے امیرِ والاشان کادور اور ان سے

بھی بالا تر جو کچھ آئندہ ہونے والے ہو، تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے خطوں نے حالتِ لاعلمی سے نکال کر ایک آن میں مستقبل کا سارا نقشہ میری نظر کے سامنے پیش کر دیا۔

میکبتھ:۔ پیاری بیوی۔ آج شب کو بادشاہ ڈنکن یہاں آنے والے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ واپسی کب ہوگی؟

میکبتھ:۔ کل واپس ہونے کا ارادہ ظاہر فرماتے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ سورج وہ کل کبھی نہ لائیگا۔ میرے امیر آپ کا چہرہ تو ایک کتاب بنا ہوا ہے کہ جس کا جی چاہے دل بہلانے کو نہایت عجیب غریب حالات اس میں پڑھ لے۔ اب دوسروں کو آپ ایسے ہی نظر آئیں جیسے کہ زمانہ کے اور لوگ نظر آتے ہیں۔ اور موقع چاہتا ہے کہ آنکھوں سے ہاتھوں سے زبان سے اطمینان و مسرت ظاہر ہوتی رہے۔ ایک معصوم پھول بن کر در پردہ مارِ قاتل بنجایئے۔ وہ جو آرہا ہے اُس کے لئے ضروری سامان بہت کچھ کرنا ہے، اور آج شب کو جو کچھ ہونے والا ہو وہ میرے سپرد کر دیجئے۔ اور یہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ آنے والے لیل و نہار ہیں آپکو بادشاہ بناکر سب کا مالک کر دیگا۔

میکبتھ:۔ اِس معاملہ خاص میں پھر کسی وقت ضروری گفت گو ہوگی۔

لیڈی میکبتھ:۔ چہرہ صاف رکھئے۔ اس کے متغیر رکھنے سے لوگ سمجھیں گے کہ کوئی خوف طاری ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

چھٹا منظر:۔ میکبتھ کے قصر کے سامنے۔

شہنائی بجانے والے اور ملازم ہاتھوں میں مشعلیں لئے ساتھ ہیں۔ ڈنکن، میلکم، ڈونل بین، بینکو، لی نکس، میکڈف، راس، اینگس، اور بہت سے ملازم ساتھ آتے ہیں۔

ڈنکن:۔ دیکھو وہ ہماری عزیز اور مہربان میزبان آرہی ہیں۔ ہمارے ساتھ اظہارِ خلوص و محبّت میں بعض وقت بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ اِسے خلوص و محبّت سمجھکر ہم آپ کے شکر گذار ہوتے ہیں اور اس بات کا سبق دیتے ہیں کہ خدا سے آپ اپنی ان تکلیفوں کا اجرِ نیک حاصل کریں اور اس طرح جو تکلیفیں آپ نے اُٹھائی ہیں اُن کے لئے آپ ہمارے بھی شُکر گُزار رہوں۔

لیڈی میکبتھ:۔ حضور ہم اپنی خدمتوں کو دُو دُو مرتبہ ادا کر کے اگر اُن کو دوچند بھی کر دیں تب بھی وہ اس اعزاز و اکرام کے مقابلے میں بے حقیقت ہونگی جو حضور والا نے ہمارے خاندان کو بخشا ہے۔ پُرانا اعزاز و وقار پہ جو لُطف و کرم اب اضافہ ہوا ہے اس کے لئے ہم ہمیشہ حضور کے دُعا گو رہیں گے۔

ڈنکن:۔ امیر کاڈور کہاں ہیں؟ میں تو اُن کے پیچھے جیسے تازی کتا ہرن کے پیچھے دوڑتا ہے دوڑتا ہوا آیا ہوں کہ پہلے پہونچ کر خود اُن کا استقبال کروں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ میری خاطر و مدارات کے لئے حاضر ہوں میں اُن کی خاطر و مدارات کے لئے حاضر رہوں۔ شہسواری میں اُن کا مثل نہیں۔ پھر اُن کا خلوص و ارادت ہمارے ساتھ ایسا ہے کہ تیز مہمیز لگاکر اُنہیں یہاں لا رہا ہے۔ اے عزیز و مہربان میزبان آج شب کو ہم آپ کے مہمان رہیں گے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ہم حضور کے خادم اور ہمارے خادم بھی حضور ہی کے نمک خوار ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ سب حضور کا دیا ہے، اور جو کچھ حضور کا ہو وہ سب حاضر ہے۔

ڈنکن :- اپنا ہاتھ دیجئے اور ہمیں ہمارے میزبان کے پاس لے چلیئے۔ ہم کو اُن سے بڑی محبت ہی اور ہم اپنے مکارم شاہی سے ہمیشہ ان کو سرافراز کرتے رہیں گے۔ اچھا اب اجازت ہو، اے میری عزیز و مہربان میزبان۔

(چلے جاتے ہیں)

ساتواں منظر :- میکبتھ کا قصر

شہنائی بجانیوالے۔ چند مشعلچی۔ ایک کاہدار اور بہت سے نوکر قابیں رکابیاں چمچے وغیرہ وغیرہ لئے ہوئے اسٹیج پر سے گزرتے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ :- جو کچھ ہونا ہے جب تک نہ ہو جائیگا چین نصیب نہ ہوگا۔ اچھا ہے اگر وہ جلد ہو جائے اور اس کے نتیجے بھی ظہور میں آجائیں، اور اُس کی موت کے بعد بادشاہی کا ملنا بھی قطعی ہو جائے۔ تو پھر قتل کے سوا دوسرا کیا مقصود ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ قصد پورا ہو گیا تو پھر یہ کُل قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس، جب اس زندگی کے ساحل سے کُود کر ہم آنے والی زندگی میں قدم رکھینگے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ اس قسم کے معاملات میں جو چیز اصلی اور حقیقی ہوتی ہے وہ نہیں ملا کرتی۔ ہم جو یہاں خُون اور قتل کی تدبیریں کرتے ہیں اور وہ چل بھی جاتی ہیں تو پھر وہی تدبیریں ہم پر پلٹ پڑتی ہیں، یہ بادشاہ بڑا ہی عادل و مُنصف مزاج ہے اور اسکا عدل و انصاف بھی اس درجہ ہے کہ اگر کوئی زہر کا پیالہ بھی اس کے لئے تیار کرے تو وہ تیار کرنے والے ہی کے لبوں کے لائق ہوتا ہے۔ وہ ہم پر دوگونہ اعتبار و اعتماد کرکے ہمارے قصر میں آیا ہے۔ اوّل تو میں اُس کا قرابت مند، دوسرے اُس کی رعیت۔ یہ دونوں باتیں اُس کے خلاف ہیں کہ میں اُس کی جان کا خواہاں ہوں۔ پھر اِس سے بھی بڑھکر یہ کہ میں اُسکا میزبان ہوں اور وہ میرا مہمان ہے۔ میرا فرض تو یہ ہے کہ اگر کسی کو کینہ پر آمادہ پاؤں تو اُس پر دروازہ بند کردوں، نہ یہ کہ خود خنجر ہاتھ میں لیکر اُسے قتل کرنے اُٹھوں۔ علاوہ اس کے یہ بادشاہ نہایت نیک اور حلیم الطبع ہے اور باوجود ایسا عالی مرتبہ ہونیکے ایسا صاف باطن اور مُنصف ہے کہ اس کی نیکیاں فرشتہ بن کر اُس کی حامی اور مددگار ہو جائینگی۔ اور اگر اسے قتل کردیا تو پھر اس کی یہی نیکیاں نقارۂ خُدا بن کر میرے اِس جُرم کا تمام دُنیا میں ڈھنڈورا پیٹتی رہینگی اور رحم اور افسوس ایک نوزائیدہ برہنہ بچے کی طرح اس نقارے کی آواز پر سوار ہوکر ہمارا یہ گُناہ اطراف عالم میں مُشتہر کریگا۔ اور آسمان پر ملائکہ اپنے مرکبوں پر سوار ہوکر جو کسی کو نظر نہ آئیں گے فضا میں گشت لگاکر ہمارے اِس ظُلم و بے دردی کے کام کو تمام دُنیا کی نظروں کو پیش کرینگے۔ اور یہ کُل فضا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق ہو جائیگی۔ اپنے توسن عزم کو آگے بڑھانے کے لئے میرے پاس کوئی مہمیز نہیں ہے۔ جاہ و مرتبہ کی طمع اُچک کر اس توسن پر سوار ہونا چاہتی ہے مگر بجائے نشست پر آنے کے دوسری طرف گرتی نظر آتی ہے۔

(لیڈی میکبتھ آتی ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

لیڈی میکبتھ :- بادشاہ خاصہ تناول فرما چکے ہیں۔ تم کیوں باہر نکل آئے۔

میکبتھ :- کیا مجھے وہ پُوچھتے تھے؟

لیڈی میکبتھ :- ہاں دریافت تو کرتے تھے۔

میکبتھ:۔ جو بات سوچی تھی میں اب اُس میں کچھ نہ کرونگا۔ ابھی ابھی تو مجھے بادشاہ نے اعزاز بخشا ہے اور ہر شخص میری نسبت اعلیٰ درجہ کی رائے رکھتا ہے۔ اب اور بھی ترقی اور تعریف کی اُمید ہے۔ اُس خیال کو ذہن سے جسقدر جلد ممکن ہو دُور کر دو۔

لیڈی میکبتھ:۔ جس وقت تاج و تخت کی آرزو ہوئی تھی اُس وقت کیا کچھ پی رکھی تھی، یا وہ آرزو پیدا ہوتے ہی سو گئی تھی اور جب جاگی تو دیکھتی کیا ہے کہ صورت زرد ہے اور طبیعت پر نامردی اور بُزدلی چھائی ہے۔ آج سے میں تمہاری محبت و اُلفت کو بھی ایسا ہی سمجھونگی۔ افسوس، جیسے مضبوط ہاتھ پاؤں کے تھے ویسے ہی دل کے نہ نکلے۔ دل کا ارمان نکالنے سے ڈرتے ہو۔ جسے زندگی کا زیور سمجھ رہے تھے یا تو اُسے واقعی حاصل کرنا چاہتے ہو یا خود دل میں ذلیل اور بُزدل رہنا پسند کرتے ہو۔ یہ کہنا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور اُسے بغیر انجام دیئے دل میں اُس کی حسرت بھی رکھنا تو وہی مثل ہوئی کہ "بلّی کا کھانے کو جی تو چاہتا ہے مگر ڈرتی ہے کہ پاؤں گیلے ہو جائیں گے۔"

میکبتھ:۔ بیوی۔ خُدا کے لئے خاموش رہو۔ جو بات مرد کو زیب دیتی ہے وہ سب کچھ میں کر سکتا ہوں اور اُسکے لئے اتنا تیار ہوں کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

لیڈی میکبتھ:۔ وہ کون موذی بدخواہ تھا جس نے تمہیں اپنے اس مقصد کو مجھ پر ظاہر کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ جس وقت تم نے ایسا قصد ظاہر کیا تھا اُس وقت تمہارے مرد ہونے میں کسکو شُبہ ہو سکتا تھا لیکن جسقدر مرد تم اُس وقت تھے اُس سے بھی زیادہ مرد اُس وقت ہو گے جبکہ اپنی مُراد حاصل کر لو گے۔ اُس وقت مقام اور وقت تجویز نہ ہوا تھا۔ اِس وقت دونوں چیزیں موجود ہیں، بلکہ وقت اور مقام نے خود اپنے تئیں پیش کر دیا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ ہو لیا تو تم ہمت ہارنے لگے۔ میں نے اپنے بچوں کو دُودھ پلایا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ دُودھ پیتے بچے کی مامتا ماں کو بہت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ شیرخوار میری گود میں پڑا ہنستا بھی ہوتا تو دُودھ اُس کے مُنہ سے چھڑا کر اِس زور سے اُسے زمین پر پٹختی کہ اُس کا بھیجا نکل پڑتا۔ بشرطیکہ میں نے بھی اِس کام پر ایسی ہی قسم کھائی ہوتی جیسے کہ تم نے کھائی تھی۔

میکبتھ:۔ اگر ناکام رہے؟

لیڈی میکبتھ:۔ بس یہی ہوگا کہ ناکام رہیں گے۔ لیکن جو ارادہ کیا تھا اُس پر تو ثابت قدم اور اپنی ہمت پر قائم رہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ناکام رہیں۔ ڈنکن دن بھر کے سفر سے تھکا ماندہ ہو رہا ہے۔ پڑتے ہی غافل سو جائیگا۔ وہ ملازم جو اُس کے قریب ہونگے اُن کو میں شراب پلا کر اتنا مدہوش کر دونگی کہ اُن کا حافظہ جو دماغ کا سردار ہے محض ایک ابخرہ رہ جائے گا۔ اور دماغ کے جس خانے میں عقل رہتی ہے وہاں حافظہ کا عمل نہ ہو۔ جب یہ دونوں آدمی نیند میں غافل اور نشے میں بیہوش مُردوں کی طرح پڑے ہونگے تو پھر وہ کیا چیز ہے جو تم باہر آکر ڈنکن کے حق میں، جس حال میں کوئی اُس کا محافظ نہ ہو، نہیں کر سکتے۔ پھر انہی دونوں ملازموں کو قتل سے مُتہم کرنا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا۔

میکبتھ:۔ بیوی تم تو ایسی ہو کہ سوائے بہادر مرد بچوں کے تم سے دوسرا پیدا نہ ہو۔ تمہاری طبیعت تو بہت ہی دلیر اور نڈر واقع ہوئی ہے۔ اگر تم نے اِن دونوں ملازموں کے

چھوکروں کو جو بادشاہ کے خوابگاہ میں سوتے ہونگے خُون سے
رنگ بھی دیا اور ارتکابِ قتل بھی انہی کے خنجر سے کر ڈالا تو کیا کوئی
اس بات کا یقین کریگا کہ ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ پھر سوائے اس کے اور کس بات کا یقین کیا
جاسکے گا۔ ہم خود تو اس موقع پر وہ وہ شور و غل، فریاد و فغاں
کرینگے کہ ہم پر کسی کو شُبہ نہ گزریگا۔

میکبتھ:۔ اچھا! میں نے قصد کرلیا۔ اور اب جسم کے کُل اعضاء
کو اس سخت کام کیلئے آمادہ کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور
جتنا وقت باقی ہو اُسمیں مہمانوں کی خاطر و تواضع میں مصرُوف رہو۔
جھُوٹا دل جو کچھ اندر رکھتا ہے جھُوٹا چہرہ اُسے چھپا سکتا ہے۔

جُزوِ ثانی

پہلا منظر:۔ میکبتھ کے قلعۂ انورنس کا صحن۔
بینکو اور اُسکا فرزند فلی انس باپ کے آگے
مشعل لئے چلتا ہے۔

بینکو:۔ برخوردار، ذرا بتاؤ تو رات کتنی گئی ہوگی؟

فلی انس:۔ چاند چھپ چُکا ہو۔ گھنٹہ میں نے سُنا نہیں۔

بینکو:۔ چاند تو آج بارہ بجے غروب ہوتا تھا۔

فلی انس:۔ میرے خیال میں تو رات زیادہ گئی ہے۔

بینکو:۔ ٹھیرو۔ میری تلوار تم اپنے پاس رکھو۔ آسمان نے
بھی کفایت شعاری پر کمر باندھی ہے۔ اپنی کل روشنیاں
گُل کردی ہیں۔ مشعل تو تمہارے پاس موجود ہی، دوسرے
ہاتھ میں یہ تلوار بھی رکھو۔ میرے دل پر کچھ ایسی غم کی
گھٹا چھائی ہے کہ کسی طرح آنکھ نہیں جھپکتی۔ اسے رحمتِ
باری کے فرشتو، مجھے بُرے اور موذی خیالات سے
جو فطرتِ عالمِ خواب میں دکھایا کرتی ہو اپنی پناہ میں رکھو۔
فلی انس ذرا تلوار مجھے دینا۔ کون ہے؟

(میکبتھ آتا ہے۔ ایک نوکر مشعل لئے ساتھ ہو)

میکبتھ:۔ میں ہوں تمہارا دوست۔

بینکو:۔ ہائیں۔ کیا ابھی تک سوئے نہیں۔ بادشاہ سلامت
تو خوابگاہ میں استراحت فرمانے چلے گئے ہیں۔ آج تو وہ
بیحد خوش تھے اور تم سب کو بڑی بڑی رقمیں عطا کی
ہیں۔ تمہاری بیوی کو "میری بڑی مہربان میزبان" کہکر
تحفے میں یہ الماس دیا ہے۔ غرض ہر چیز سے بیحد مطمئن
اور خوش نظر آتے تھے۔

میکبتھ:۔ کیا عرض کروں۔ آقا کی تشریف آوری پر افسوس
ہے دل کے ارمان نہ نکل سکے۔ اگر پہلے سے اطلاع ہو
جاتی تو انتظام میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوتی۔

بینکو:۔ نہیں۔ کُل باتیں نہایت خیر و خوبی سے ہوگئیں۔ ہاں
رات کو میں نے خواب میں اُن تینوں تقدیر بتانے والیوں
کو دیکھا۔ تمہاری نسبت جو باتیں اُنہوں نے کہی تھیں اُن
میں کچھ تو سچ نکلیں۔

میکبتھ:۔ مجھے تو اُن کا اب کچھ خیال تک نہیں ہو۔ لیکن
ذرا اس کام سے فراغت پالوں تو پھر اس امرِ خاص میں
دل کی باتیں کہنے کیلئے آپ کچھ وقت ضرور دینگے۔

بینکو:۔ جب مرضی ہو میں حاضر ہوں۔

میکبتھ:۔ اگر آپ نے میری رائے سے اتفاق کیا تو پھر جب
کبھی وہ بات ہوئی پھر عزت و دولت آپکے سامنے ہاتھ
باندھے کھڑی ہوگی۔

بینکو:۔ آپ سمجھ لیں کہ زیادہ عزت کی مجھے ہوس نہیں جو

عزّت اس وقت رکھتا ہوں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔ اپنا دل پاک صاف اور بادشاہ کی اطاعت و وفاداری میں مضبوط رکھنا میرا بڑا مقصد ہے۔ اگر ان چیزوں میں فرق نہ آئے تو میں آپکا مشورہ سُننے کو تیار ہوں۔

میکبتھ :۔ اچھا شب بخیر۔ خُدا حافظ۔

بینکو :۔ شُکریہ۔ رات زیادہ آئی۔ اب آپ آرام فرمائیں۔

(بینکو اور فلی نس چلے جاتے ہیں۔)

میکبتھ :۔ (نوکر سے) جاؤ۔ ذرا بیگم صاحبہ سے کہدو کہ جب پینے کی دوا تیار ہو جائے تو گھنٹی بجا دیں (نوکر چلا جاتا ہے) ارے میری آنکھوں کے سامنے یہ کیا ہے؟ یہ تو خنجر معلوم ہو رہا ہے۔ اِس کا قبضہ میرے ہاتھ کی طرف ہے۔ آ خنجر تجھے پکڑ لوں۔ ہائیں تو ہاتھ میں نہیں آیا۔ مگر نظر اب تک آرہا ہے۔ کیا تو واقعی کوئی چیز نہیں ہے، صرف موت کا ایک تصوّر ہے جسے ادراک اور واہمہ دونوں محسوس کر رہے ہیں۔ یا تو محض وہم اور ایک بے سُود خیال ہے جو میرے مزاج کی حدّت و حرارت کی پیدا کی ہوئی ایک شکل ہے۔ میں ابھی تک تجھے دیکھ رہا ہوں۔ تیری صورت شکل تو بعینہٖ ایسی ہے جیسے اُس خنجر کی جسے میں اب نیام سے نکالتا ہوں۔ تُو تو مجھے وہ راستہ بتاتا ہے جسپر میں اب چلنے والا ہوں۔ اور تُو اُسی وضع کا خنجر ہے جس سے میں اب کام لینے والا ہوں۔ کیا میری بصارت کو باقی حواس نے احمق بنا رکھا ہے۔ اور اِنہی باقی حواس نے یہ شکل میرے سامنے پیدا کر کے اُسکا مجھے یقین دلا رکھا ہے۔ میں ابھی تک تجھے دیکھ رہا ہوں، اور اب تو تیری دھار اور قبضے پر خُون کے قطرے بھی نظر آتے ہیں جو پہلے نہ تھے۔ نہیں، خنجر و نجر کچھ نہیں ہے۔ یہ محض خُون کرنے کا قصد ہے جو خنجر بن کر آنکھوں میں گھس بیٹھا ہے۔ کائنات میں اِس وقت نصف دُنیا سے زیادہ مر چکی ہے اور فتنہ و فساد کے خواب پردوں کے پیچھے نیند کے ماتوں کو نظر آرہے ہیں۔ جادو اور سحر جن کی صورتیں زرد ہو رہی ہیں ہیکیٹی کے دربار میں نذریں پیش کرنے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ اور قتل و خُوں ریزی کا گرگ سیاہ فام جو پاسبانی کرتا تھا جب اپنا پہر ختم کر کے کُتّے کی طرح بھونکتا ہے تو وہ خُونِ ناحق کے ارادے کو پیدا کرتا ہے اور تارکوان سفاک کی مثال شہوت پرستی کے جوش میں تیز قدم اُٹھاتا ایک خبیث رُوح کی طرح اپنے شکار کی طرف اُڑا چلا جاتا ہے۔ لیکن میرے قدم جس طرف بھی اُٹھتے ہیں ہر سنگ راہ زبانِ حال سے کہکر میرا نشان بتاتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ مگر میں نے اس خوف و خطر کی فضا سے وہ وقت علیحدہ کر لیا ہے جو قتل کے لئے مُناسب ہے۔ جب تک وہ زندہ ہے مجھ پر خوف طاری رہیگا۔ حدّتِ کارکردگی میں جو الفاظ زبان پر آتے ہیں وہ سفاک و سرد مہر ہوتے ہیں۔ اب میں جاتا ہوں اور اُمید ہے کہ یہ کام جلد ختم ہو جائیگا (ایک گھنٹی کی آواز سُنتا ہے) گھنٹی بج رہی ہے جو اس کام کے لئے اشارہ کرتی ہے۔ ڈنکن تو اِس آواز کو نہ سُنیو۔ کیونکہ یہ تیری موت کا گھنٹہ بجا ہے جو تجھے جنّت یا دوزخ میں طلب کرتا ہے۔

دوسرا منظر :۔ مقام وہی ہے۔

لیڈی میکبتھ آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ :۔ جس چیز سے میں نے اُنہیں بیہوش کیا ہے اُس نے میری ہمت بڑھا دی ہے۔ جس چیز نے اُنہیں ٹھنڈا کیا اُسی نے مجھے آگ بنایا ہے۔ سُنو خاموش۔ یہ موت کا جرس بجانے والا اُلّو ہے جس کی منحوس آواز کانوں میں آرہی ہے۔ رات کا رُخصتی سلام اِس سے بدتر اور کیا ہوگا۔

میکبتھ قتل کے قصد سے اب خوابگاہ کے دروازے تک پہنچا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور دونوں ملازم خراٹوں کی آواز سے گویا آقا کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے تو شراب میں ایک دوا ایسی ملا کر انہیں دی ہے کہ موت اور زندگی دونوں اُن پر باہم دست و گریباں رہیں۔ اِس سے مجھے مطلب نہیں کہ وہ زندہ رہیں یا مر جائیں۔

میکبتھ:۔ (میکبتھ کی آواز اندر سے کہتی سُنائی دیتی ہے) وہاں کون ہے۔ بتاؤ؟

لیڈی میکبتھ:۔ خوف ہے کہ جاگ ہو گئی اور وہ بات نہ ہو سکی جس کا اقدام ارتکاب سے کہیں زیادہ روح فرسا ہے۔ سُنو! میں نے ان کے دونوں خنجر درست کر کے اُنکے پاس رکھدیئے تھے۔ کہیں میکبتھ انہیں بھُول تو نہیں گیا۔ جب میں نے ڈنکن کو دیکھا ہے تو کیا اُس کی صورت مجھے اپنے باپ کی صورت نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کام میں اپنے ہاتھوں کر دکھاتی۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

شوہر!

میکبتھ:۔ میں نے وہ کام ختم کر دیا۔ کیا تم نے آواز نہیں سُنی؟

لیڈی میکبتھ:۔ ہاں میں نے اُلّو اور جھینگر کی تیز آواز سُنی تھی۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔

میکبتھ:۔ کب؟

لیڈی میکبتھ:۔ اب۔

میکبتھ:۔ اچھا اُس وقت جب خوابگاہ کی سیڑھیاں اُترتا تھا؟ سُنو کس کی آواز ہے۔ پاس کے کمرے میں کون سوتا ہے؟

لیڈی میکبتھ:۔ ڈونل بین سوتا ہے۔

میکبتھ:۔ (اپنے ہاتھوں کو دیکھکر) یہ داغ قتل کے نشان ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ اِنکو قتل کے نشان کہنا حماقت ہے۔

میکبتھ:۔ دونوں ملازم جو وہاں سوتے تھے اُن میں سے ایک نیند میں ہنسا، اور دوسرا چیخا کہ "خُون ہو رہا ہے"! پھر دونوں جاگ اُٹھے۔ مَیں کھڑا اُن کی باتیں سُنتا رہا۔ پھر دونوں نے کوئی دُعا پڑھی اور سو گئے۔

لیڈی میکبتھ:۔ دونوں پاس پاس سو رہے تھے۔

میکبتھ:۔ ایک نے کہا "خدا ہم پر رحم کرے" دوسرے نے کہا "آمین"۔ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مجھ قاتل کے ہاتھ اُنہوں نے دیکھ لئے ہیں۔ اور جب میں نے انہیں "خُدا رحم کرے" کہتے سُنا تو میں نے بھی آمین کہنا چاہا مگر میرے مُنہ سے کچھ نہ نکلا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اسکا اِتنا خیال نہ کرو۔

میکبتھ:۔ مگر "آمین" کیوں مُنہ سے نہ نکلی۔ مجھے تو خُدا سے رحم طلب کرنے کی اُس وقت بہت ضرورت تھی۔ مگر "آمین" حلق میں اٹک کر رہگئی۔

لیڈی میکبتھ:۔ ان باتوں کو اِس طرح سوچنے کی ضرورت نہیں، ورنہ ہم دونوں دیوانے ہو جائیں گے۔

میکبتھ:۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے ایک آواز یہ کہتے سُنی تھی کہ "بس اب تجھ پر نیند حرام ہوئی"۔ میکبتھ نے ایک سوتے ہے گناہ کو جس کی نیند معصوم تھی قتل کیا ہے۔ نیند بھی وہ جو دن بھر کے افکار و آلام کے اُلجھے سُوت کو سُلجھا دیتی ہے۔ جو دن بھر کی زندگی کی موت ہے۔ محنت و مشقت کے بعد کا غسل ہے جو تازگی بخشتا ہے۔ زندگی کی ضیافت میں سب سے مقوی غذا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کیا مطلب ہے؟

میکبتھ:۔ وہ آواز برابر یہی کہتی رہی "اب تجھ پر نیند حرام ہوئی"۔ "اب تو سو نہیں سکتا"! سارے گھر بھر میں یہی آواز گونجتی تھی۔ "گلیمس نے سوتے کا خون کیا ہے" کا دور کو اب نیند نہیں آئے گی"! "میکبتھ کو اب نیند کبھی نہ آئیگی"۔

لیڈی میکبتھ:۔ وہ کون تھا جو یہ کہتا تھا۔ آپ ایک مریض ودماغ کی طرح اس طرح خیال کرکے اپنی قوت زائل نہ کریں اور جاکر اپنے ہاتھ کے اِن داغوں کو جو خون کرنے پر گواہی دیتے ہیں پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ دونوں خنجر وہاں سے کون اُٹھا لایا۔ جاؤ اور ان کو وہیں جاکر رکھدو۔ اور دونوں ملازموں کے چہروں پر خون لگا دو۔

میکبتھ:۔ اب میں وہاں ہرگز نہ جاؤنگا۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اب اُس سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔ اُس چیز کو پھر دیکھنا میری قدرت سے باہر ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ پست ہمت ہوگئے۔ خنجر مجھے دو سوتا اور مرا تو مثل ایک بیجان تصویر کے ہوتا ہے شیطان کی تصویر میں رنگ بھر کر اگر بیچا بنالی جائے تو بچے البتہ اُس سے ڈرتے ہیں۔ اگر لاش سے اب تک خون جاری ہے تو نوکروں کے منہ پر خون مل دونگی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ قاتل وہی ہیں۔ (لیڈی میکبتھ خوابگاہ میں جاتی ہے۔ اندر سے کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے۔)

میکبتھ:۔ یہ آواز کدھر سے آئی۔ یہ میری کیا حالت ہے کہ ہر آواز پر چونک پڑتا ہوں۔ ہر آواز مجھے کیوں اس قدر خوفزدہ کردیتی ہے۔ ارے میرے اِن ہاتھوں کو کیا ہوا؟ انہیں دیکھنے سے تو میری آنکھیں نکلی پڑتی ہیں۔ تمام سمندروں کا پانی بھی اِن داغوں کو چھڑانے میں کافی نہیں ہوسکتا۔ اور دھویا بھی تو وسیع سمندروں کا کل پانی لالہ رنگ ہوکر اُس کی سبزی کو سُرخی بنا دیگا۔

(لیڈی میکبتھ پھر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ میرے ہاتھ تم جیسے ہوگئے۔ لیکن دل تم جیسا کمزور نہیں۔ (اندر سے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے) یہ آواز تو جنوبی دروازے سے آتی سُنتی ہوں۔ آؤ ہم دونوں اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ تھوڑا سا پانی اِن خون کے داغوں کو دھو دیگا۔ دیکھا، یہ کل معاملہ کیسا آسان نکلا۔ تمہاری طبیعت پاستے استقلال پر نہ رہی۔ (پھر وہی کھٹ کھٹ سُنائی دیتی ہے) سُنو۔ (پھر کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے) سُنو! پھر وہی آواز آرہی ہے۔ آؤ جلدی سے کچھ اُلٹے سیدھے کپڑے پہن لیں تاکہ ضرورت ہو تو باہر نکل سکیں۔ یہ نہ معلوم ہو کہ ہم جاگ رہے تھے۔ کیوں کس خیال میں محو ہوکر گم سُم سے ہوئے جاتے ہو؟

میکبتھ:۔ کاش کہ ہر چیز کا علم ذہن سے دُور ہو جائے اور طبیعت پر اتنی غفلت طاری ہو جائے کہ جو کچھ کیا ہے اُس کی یاد دل میں مطلق نہ رہے (کھٹ کھٹ ہوتی ہے) ڈنکن اِس کھٹ کھٹ سے تو کب جاگنے والا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا کہ زندہ ہوتا اور جاگ اُٹھتا۔

تیسرا منظر:۔ ایک دربان آتا ہے۔

(اندر پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔)

دربان:۔ یہ کیسی عجیب کھٹ کھٹ ہے۔ اگر کوئی دوزخ کا دربان بھی ہوتا تو قفل میں کنجی ڈال کر کسے برابر پھرلتے جاتا۔ ارے موذی کھٹکھٹائے جا۔ شیطان کا نام لیکر پوچھتا ہوں کہ بتا تو کون ہے؟ کیا تو کوئی کسان ہے جس نے ارزانی کے انتظار میں بیقرار ہوکر اپنے تئیں پھانسی دے لی ہے۔

میرے پاس بہت سے رُومال ہونے چاہئیں کہ پسینہ پونچھتا رہوں
اندر (پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹکھٹائے جا۔ تجھے ابلیس
کی قسم بتا کہ تو کون ہے؟ واللہ۔ کہیں اُن میں سے تُو نہیں ہے
جو سرکشی اور بغاوت کرکے کہتے ہیں کہ ہم تو خُدا کے حُکم سے
دشمن بنے تھے۔ اور جن کا ہر فریق دوسرے فریق کے خلاف
شہادت دینے کو تیار رہتا ہے۔ یہ وہ ہیں جو کفر و بدعت
خُدا کی راہ میں کرتے ہیں۔ لیکن جب خُدا کے سامنے حاضر
ہوتے ہیں تو اپنی اِس حرکت کا جواز ثابت نہیں کر سکتے۔ آ،
اے کافر باغی اندر آ۔ (پھر کھٹکا ہوتا ہے) کھٹ کھٹ کئے
جا۔ یہ کون ہے؟ واللہ، یہ تو کوئی انگریز خیاط معلوم ہوتا
ہے جو فرانسیسی کپڑا چُرانے کی سزا میں دوزخ میں ڈالا گیا
ہے۔ وہاں آگ کی کیا کمی ہے۔ خوب اپنی استری گرم کرتا رہ۔
(پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹ کھٹ کئے جا، چُپ نہ بیٹھیو۔
آخر تو ہے کون؟ یہ جگہ تو اتنی ٹھنڈی ہے کہ دوزخ نہیں
بن سکتی۔ اب میں شیطان کے گھر کی دربانی ختم کرتا ہوں۔ اور
اُن لوگوں کو اندر بلائے لیتا ہوں جو اپنے پیشے کے ذوق و
شوق میں گُناہ کی طرف راغب ہو کر دوزخ کا راستہ دیکھتے
ہیں۔ (پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔) اچھا لو۔ ابھی لو۔ دربان
کو دُعائیں دیتے رہنا (دروازہ کھول دیتا ہے)

(میکڈف اور لینکس اندر آتے ہیں۔)

میکڈف:۔ کہو دوست، کیا بہت دیر کرکے سوئے تھے۔ بڑی دیر میں اُٹھے۔

دربان:۔ بخدا، حضور ہم دو بجے رات تک تو شراب ہی پیتے رہے۔

میکڈف:۔ کیا بادشاہ سلامت بیدار ہو گئے ہیں؟

(میکبتھ باہر آتا ہے)

لینکس:۔ شریف میکبتھ کو سلام۔

میکبتھ:۔ دونوں صاحبوں کو سلام۔

میکڈف:۔ اے لائق امیر بتایئے بادشاہ سلامت بیدار ہوئے یا ابھی آرام فرماتے ہیں؟

میکبتھ:۔ نہیں، ابھی تک بیدار نہیں ہوئے۔

میکڈف:۔ کل حُکم دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر حاضر ہونا مجھے کسی قدر دیر ہو گئی۔ وقت یاد نہ رہا۔

میکبتھ:۔ میں آپکو خوابگاہ تک لئے چلتا ہوں۔

میکڈف:۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تکلیف آپکے لئے موجب مسرت ہے، مگر تکلیف ہونے میں کیا شُبہ ہے۔

میکبتھ:۔ جس تکلیف میں مسرت ہو وہ تکلیف نہیں رہتی۔

لینکس:۔ کیا بادشاہ سلامت کا قصد آج ہی یہاں سے مراجعت کا ہے؟

میکبتھ:۔ ہاں فرماتے تو ہی تھے۔

لینکس:۔ رات نہایت طوفانی تھی۔ جس کمرے میں ہم تھے طوفان کے زور سے آتشدانوں کے دُخان کش اُوپر سے نیچے آن پڑے۔ سُنا ہے کہ رونے پیٹنے کا غل، مرنیوالوں کی چیخیں بھی سُنائی دی تھیں۔ کہیں آگ لگنے کا شور تھا، کہیں اور آفات کے برپا ہونے کا غل گریہ اور ہیبتناک آوازوں میں لوگوں نے اِس طرح سُنا جیسے کہ اکثر پُر آشوب زمانوں میں سُنا جاتا ہے۔ ظُلمت کا پرندہ رات بھر برابر چیختا رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمین کو لرزہ بخار چڑھا تھا۔ کئی بار زلزلہ بھی آیا۔

میکبتھ:۔ حقیقت میں رات بڑی اندھیاؤ کی بھیانک اور خوفناک تھی۔

لینکس:۔ میری یاد میں، گو زیادہ عُمر نہیں رکھتا، ایسی خوفناک رات پہلے نہ آئی تھی۔

(میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:۔ ارے غضب! ارے ستم! ارے مصیبت! زبان پر

دل میں ایسا خیال کب گزر سکتا تھا کہ یہ کچھ ہو جائیگا۔ جو کچھ ہوا ہے زبان کو یارا نہیں کہ کہہ سکے۔

لینکس: کیوں خیر تو ہے، کیا ہوا؟

میکڈف:۔ مصائب و آفات نے اپنا کمال دکھا یا۔ بڑا ایسا خون ہوا ہے جو دین و ایمان سب کو غارت کر دیتا ہے۔ اس قتل نے اُس بادشاہ کو اُس کے گھر سے نکالا ہے جو خود خُدا نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ وہ گھر تو رہ گیا مگر اس کی جان خانہ ویران ہوئی۔

میکبتھ:۔ کیا کہہ رہے ہو، جان کیسی؟

لینکس:۔ کیا تمہارا مطلب بادشاہ سلامت سے ہے؟

میکڈف:۔ آؤ کمرے میں چلکر اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔ اندھے ہو جاؤ۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، جو ہوا ہے خود جاکر دیکھ لو۔ اور پھر خود ہی کہو کہ کیا ہوا ہے۔ (بینکو اور لینکس اندر جاتے ہیں۔) جگاؤ، جگاؤ۔ قلعہ کا گجر بجاؤ۔ قتل ہوا ہے۔ دغا اور فریب، سرکشی اور بغاوت برپا ہوئی ہے۔ دونل بین، میلکم، نیند سے ہوشیار ہو۔ نیند تو موت کی شکل رکھتی ہے۔ اب خود آکر موت کو دیکھ لو۔ اُٹھو۔ قیامت آگئی، اور اُسے دیکھ لو۔ میلکم اور بینکو اِس طرح اُٹھو جیسے کوئی قبر سے اُٹھے۔ روحوں کو بیدار کرو کہ وہ بھی اس ہولناک منظر کو دیکھیں۔ گھنٹہ بجاؤ۔ (قلعہ کا گجر سبکو خبردار کرنیکو بجتا ہے)

(لیڈی میکبتھ اندر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ یہ گجر کیسا سوتے آدمیوں کو جگا کر بلا رہا ہے۔ کہو۔ کچھ بتاؤ۔

میکڈف:۔ اے نیک دل خاتون۔ جو کچھ کہنا ہے وہ آپکے سُننے کی بات نہیں۔ عورت کے کان میں قتل کی خبر سُنانا خود اس عورت کا خون کرنا ہوگا۔

(بینکو آتا ہے۔)

بینکو، بینکو، ہمارا بادشاہ قتل ہو گیا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اے غضب! کیا ہمارے گھر میں ایسا ہوا۔

بینکو:۔ یہ سانحہ تو کہیں بھی پیش آتا ظلم و سفاکی میں کم نہ ہوتا۔ میکڈف خُدا کے لئے جو کچھ کہتے ہو کہ ہوا اُسے کہو کہ نہیں ہوا۔

(میکبتھ اور لینکس کمرے میں جاتے ہیں)

میکبتھ:۔ کاش اِس وقوعے سے ایک گھنٹے پہلے میں مر گیا ہوتا۔ تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرتا وہ اچھا ہوتا۔ بس اس وقت سے زندگی میں کچھ نہ رہا۔ دُنیا کی سب چیزیں بازیگری ہیں۔ خیر و برکت، نام و شہرت آج دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ ہائے شراب لُنڈھ گئی۔ تلچھٹ رہ گئی۔ اب اُس کی تعریفیں آسمان کے گنبد میں گونجیں گی۔

(میلکم اور دونل بین آتے ہیں۔)

میلکم:۔ کیا ہوا، کیا ہوا؟

میکبتھ:۔ زندہ ہو اور پوچھتے ہو کہ کیا ہوا۔ زندگی کا منبع خون کا وہ سرچشمہ بہتے بہتے بند ہو گیا۔ اور اس کی تمام شاخیں اور رگیں مسدود ہوئے۔

میکڈف:۔ آپکے والد بزرگوار یعنی بادشاہ ڈنکن کو کسی نے قتل کر دیا۔

میلکم:۔ کس نے ایسا کیا؟

لینکس:۔ وہ ملازم معلوم ہوتے ہیں جو خوابگاہ میں بادشاہ کے قریب سوتے تھے۔ اُن کے ہاتھ اور چہرے سب خون میں آلودہ تھے، اور یہی کیفیت ان کے خنجروں کی تھی۔ خنجروں کا خون اُنہوں نے اپنے سرہانے کے تکیوں سے پونچھا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور بدحواس تھے۔ کسی جان کا بھروسا اُن پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میکبتھ:۔ پھر بھی مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کیوں حالت غیظ و غضب

...سے انہیں قتل کر دیا۔

بلینوٹ:- ... بہت کیوں ایسا کیا؟

میکبتھ:- خیال کیجئے، انسان کیسے آن واحد میں حیرت زدہ، معتدل اور غضبناک رہ سکتا تھا۔ خیر خواہ بھی ہوتا اور بے پروا بھی۔ کوئی شخص بھی جسے اپنے بادشاہ سے تعلق تھا ایسے وقت میں عقل سے، جو تامل و غور کی ہدایت کرتی، کام لے سکتا تھا۔ ایک طرف ڈنکن اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اُس کی چاندی کی مثل چمکتی جلد پر زخموں کے گرد خون کے ہالے تھے۔ اس کے زخم صرف ایک شخص کے زخم نہ تھے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ کل کائنات میں شگاف دیئے گئے ہیں تاکہ غارت گری اُن کی راہ سے اندر گھسے۔ دوسری طرف دونوں قاتل خون میں رنگے، خنجر خون میں آلودہ پڑے تھے۔ اس حالت میں کون ایسا تھا جس کے دل میں بادشاہ کی محبت ہوتی اور اس میں اتنی ہمت نہ ہوتی کہ اپنی محبت کا ثبوت دے۔

لیڈی میکبتھ:- ارے رحم کرو۔ کوئی مجھے یہاں سے اُٹھا کر لے چلو۔ مجھ سے یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔

میکڈف:- لوگو! لیڈی میکبتھ کی حالت کو دیکھنا چاہیئے۔

میلکم:- (دونل بین سے علیحدہ کہتا ہے) ہم یہاں کیوں خاموش کھڑے ہیں۔ اس قتل کا اثر تو ہم پر پڑتا ہے۔

دونل بین:- (میلکم سے علیحدہ کہتا ہے) ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ قتل تو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ خود ہماری جان معرض خطر میں ہے۔ ممکن ہے کوئی ہمیں گرفتار کر کے قتل کر دے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے کہیں چلے جائیں۔ باپ کی موت پر ہمارے آنسو ابھی تک نہیں نکلے ہیں۔

میلکم:- اور نہ ہمارے رنج و الم کو حرکت ہوئی ہے۔

بلینکو:- لیڈی میکبتھ کا حال تو دیکھئے۔ (لوگ لیڈی میکبتھ کو اُٹھا کر لیجاتے ہیں۔)

اس وقت ہم سب سردی میں کھڑے ہیں۔ بہتر ہے کہ کپڑے پہن کر اور ہتھیار لگا کر اس واقعے پر غور کرنے کے لئے جمع ہوں اور دیگر حالات متعلقہ تحقیق کریں۔ اس وقت خوف اور طرح طرح کے شکوک نے ہم پر لرزہ ڈال رکھا ہے۔ انصاف خُدا کے ہاتھ ہے۔ اور میں اس بغاوت اور جو بدگمانیاں اُس نے پیدا کی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔

میکڈف:- اور یہی حال میرا ہے۔

سب ملکر:- اور یہی کیفیت ہم سب کی ہے۔

میکبتھ:- ہمیں چاہیئے کہ درستی سے لباس پہن کر بڑے کمرے میں یکجا ہوں (سب چلے جاتے ہیں، سوائے میلکم اور دونل بین کے)

میلکم:- تم کیا کرو گے؟ میں تو اس مجمع میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ ایسا رنج و الم جس کی اصلیت نہ ہو ایک جھوٹے آدمی کے لئے آسان کام ہوتا ہے۔ میں تو انگلستان جاتا ہوں۔

دونل بین:- میں آئرستان جاتا ہوں۔ جب ہم دونوں جُدا جُدا مقام پر ہونگے تو ہمیں زیادہ حفاظت میسّر رہے گی۔ جہاں اس وقت ہم ہیں وہاں تو ہر شخص کا تبسم بھی خنجر بُرّاں معلوم ہو رہا ہے۔ خون کا رشتہ جتنا قریب ہو اتنا ہی خون ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ قتل و غارت کا تیر جو چھوڑا گیا ہے ابھی تک اپنے ہدف پر نہیں پہونچا ہے۔ بہتر طریقہ یہی ہے اس نشانے سے ہم ہٹ جائیں۔ آر۔ بسی سے رخصت ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ جہاں کسی کے دل میں خُدا کا

خوف اور رحم باقی نہ ہو تو پھر دیاں سے خفیہ طور پر نکل جانا ہی بہتر ہے۔ اُنہیں کسی کی چوری نہیں۔ (چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر۔ میکبتھ کے قصر سے باہر

راس اور ایک بڈھا آدمی آتا ہے۔

بُڈھا:۔ زمانے کے دَور میں تین بیسی دس برس زندہ رہکر بڑے بڑے سخت حادثے اور عجیب عجیب واقعات نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن شب گزشتہ کے واقعات نے سبکو مات کر دیا۔

راس:۔ اے مردِ نیک و معمّر آسمان و زمین کے درمیان انسان کے ہاتھوں جو جو خون خرابے آپکی زندگی میں پیش آتے وہ تو آپکی نظر سے گزرے ہی ہونگے، مگر آج کچھ کیفیت عجیب ہے۔ خیال کیجئے تو وقت دن کا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ راہ گیروں کو پریشان کرنے کے لئے ظلمت نے رات کی روشنیاں گل کر دی ہیں۔ یا پھر تاریکی نے دن کی روشنی کو شرمندہ کرنے کیلئے روئے زمین پر اندھیرا ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ وقت ایسا تھا کہ سورج کی روشنی پھیل جاتی۔

بُڈھا:۔ یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو اور جو قتل کیا گیا ہے یہ سب اُمور خلاف قدرت و فطرت ہیں۔ گذشتہ دوشنبہ کو ایک شکرہ جسے اپنی بلند پروازی پر ناز تھا اُس کا تعاقب ایک مُوش خور اُلّو نے کیا اور شکرے کو پکڑ کر مار ڈالا۔

راس:۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ بادشاہ ڈنکن کے گھوڑے جن کے برابر حسین و سُبک رَو جانور دُنیا میں نہ ہونگے وہ سب وحشی اور دیوانے ہوگئے۔ اصطبل توڑ کر باہر نکل آئے۔ اُچھلنا کودنا ہنہنانا شروع کیا۔ کسی کا حکم نہ مانا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نسل آدم کے دُشمن بنکر سب سے لڑنے کو نکلے ہیں۔

بُڈھا:۔ ابھی مجھ سے کسی نے کہا ہو کہ یہ گھوڑے ایک دوسرے کو مار کر کھا رہے ہیں۔

راس:۔ بالکل صحیح ہے۔ میری حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے بھی اُنھوں نے یہی کیا۔

(میکدف اندر آتا ہے)

کہیئے کیا حال ہے؟

میکدف:۔ کیوں کیا تمہیں نہیں معلوم؟

راس:۔ کچھ پتہ چلا کہ قاتل کون تھا؟

میکدف:۔ اُنہی کو سمجھیئے جنہیں میکبتھ نے قتل کر دیا۔

راس:۔ خُدارا فرمایئے کہ اِس فریب و دغا سے کیا بھلائی نکلی؟

میکدف:۔ سُنا گیا ہے کہ میلکم اور ڈونل بین کو اسی کام کیلئے روپیہ دیا گیا تھا۔ یہ دونوں بادشاہ آنجہانی کے فرزند ہیں، اور اب کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں یا پھر اُنکو کسی نے غائب کر دیا ہے، اِس وجہ سے اِن دونوں شہزادوں پر لوگوں کو زیادہ شُبہ گزرنے لگا ہے۔

راس:۔ یہ خیال بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ مگر لالچ اور طمع بُری بلا ہے۔ یہ تو اُنہیں بھی نگلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو دُنیا میں اُنہیں لائے تھے۔ تو اب گمان غالب یہی ہے کہ بادشاہی میکبتھ کو مل جائیگی۔

میکدف:۔ بادشاہی پر وہ نامزد ہو بھی گیا ہے اور شہر اسکون میں تاجپوشی کیلئے گیا ہے۔

راس:۔ ڈنکن کا جنازہ کہاں لے گئے؟

میکدف:۔ اُسے تو کولمی کل میں لے گئے ہیں جہاں اُسکے بزرگوں کا گورستان ان کی ہڈیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

راس:۔ کیا آپکا قصد بھی جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے

اِسکون جانے کا ہے؟

میکڈف:- نہیں بھائی، میں تو اپنے علاقے فائف کو جارہا ہوں۔

راس:- لیکن مجھے تو اسکون جانا ہے۔

میکڈف:- اچھا ہے، تاجپوشی کے جلسے میں شریک ہوسکو گے تو۔ خدا حافظ۔ اور وہاں یہ بھی دیکھنا کہ بدن پر پرانی پوشاک ہی ٹھیک آئی ہو، یا یہ نیا لباس بھی چست ہوتا ہے۔

راس:- (بڈھے سے) خدا حافظ۔

بڈھا:- خدا تم پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ اور اُن پر بھی جو بُرائی میں بھلائی پیدا کرتے ہیں، اور اُن پر بھی جو ہمارے دوستوں کے دشمن ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

جُزوِ ثالث

پہلا منظر:- فورس۔ شاہی محل

بینکو داخل ہوتا ہے۔

بینکو:- میکبتھ گلیمس اور کاڈور کا امیر تو ہو ہی گیا تھا۔ اب اُن جادوگرنیوں کی پیشینگوئی کے مطابق بادشاہ بھی ہوگیا۔ مجھے خوف ہو کہ تُو نے یہ بادشاہی دغا اور فریب سے حاصل کی ہے۔ مگر ان جادوگرنیوں نے تجھ سے یہ بھی تو کہا تھا کہ تیری اولاد میں بادشاہی نہ جائیگی بلکہ میں بینکو ایک بڑے سلسلے کا مورثِ اعلیٰ ہونگا۔ اگر ان جادوگرنیوں کی باتیں جیسے تیرے حق میں صحیح نکل کر درخشندہ و تاباں ہوئیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میرے حق میں وہ کیوں صحیح نہ ثابت ہوں۔ اور میرے دل میں اپنی اولاد کے بادشاہ ہونے کی آرزو پیدا نہ ہو۔ لیکن خاموش، اب کچھ نہ کہو۔

(گانے بجانے کی آواز آتی ہے۔ میکبتھ بادشاہ اور لیڈی میکبتھ ملکہ بنکر آتے ہیں۔ سردار لینکس، راس، اور دیگر اُمرائے دربار بیگمات، ملازمین اور خدام داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ:- لیجئے۔ ہمارے یہ معزز و مقتدر مہمان تشریف لاتے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- اگر کہیں انکو بلاوا دینا بھول جاتے تو ہماری اِس ضیافت میں کچھ رونق ہی نہ ہوتی۔

میکبتھ:- بینکو۔ آج شب کو ہمارے ہاں ضیافت ہے۔ پس آپ سے درخواست ہو کہ آپ ضرور شریک ہوں۔

بینکو:- درخواست نہیں۔ شاہِ عالیجاہ حضور تو شرکت کے لئے حکم فرما سکتے ہیں۔ پھر میرا حاضر ہونا فرضِ منصب ہوگا۔ وابستگانِ دولت کا تعلق تو حضور کے ساتھ وہ ہو جو ہمیشہ قائم رہے گا۔

میکبتھ:- کیا تیسرے پہر آپ گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔

بینکو:- حضور۔

میکبتھ:- ہمیں آپ سے ایک خاص امر میں مشورہ کرنا ہو۔ آج کی مجلس میں وہ اہم مسئلہ بڑی کامیابی سے پیش ہوچکا ہے، مگر کل پھر اس پر گفتگو ہوگی۔ کیا آپ کو بہت دُور جانا ہے؟

بینکو:- حضور۔ فاصلہ اتنا ہی ہے کہ اگر اس وقت روانگی ہو تو ضیافت کے وقت تک طے ہو جائے۔ اگر گھوڑا تیز نہ چلا تو پھر فدوی گھڑی دو گھڑی رات گئے یہاں پہونچیگا۔

میکبتھ:- مگر ضیافت میں بہرکیف آپکا شریک ہونا ضروری ہو۔

بینکو:- کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ تعمیلِ ارشاد میں فرق آئے۔

میکبتھ:- سُننے میں آیا ہے کہ ہمارے یہ دونوں برادر زادے باپ کے قاتل انگلستان اور آیرستان میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے ہیں۔ اور باپ کے قتل کا جُرم جو اُنسے سرزد ہوا ہے اُس کا اقبال نہیں کرتے۔ اور جب کبھی تقریر کرتے ہیں تو سُننے والوں کے سامنے عجیب غریب من گھڑت قصّے بیان کرتے ہیں۔ بس اب اسپر بعد کو گفتگو ہوگی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور آج ہی شب کو ضیافت کے وقت پھر ملاقات ہوگی۔ خُدا آپکو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا فلی انس بھی آپ کے ساتھ ہی جا رہا ہے؟

بینکو:- حضور، وقت کم رہگیا ہے۔ شام تک جلد واپس آنا ہے اجازت چاہتا ہوں۔

میکبتھ:- خُدا سے امید ہے کہ آپکے گھوڑے تیز رَو اور چال کے سچے ہونگے، اور اب آپکی روانگی پر خُدا سے دُعا کرتا ہوں۔

(بینکو چلا جاتا ہے۔)

ہر شخص کو اپنے وقت کا مالک رہنا چاہیئے۔ میں بھی ضیافت کے وقت تک آزاد ہوں۔ اور اس خیال سے کہ ضیافت بہترین طریقے پر انجام پائے اُس وقت تک میں بشاش اور ہنستا رہونگا۔ (سوائے میکبتھ کے سب چلے جاتے ہیں۔ چند خادم حاضر رہتے ہیں) خادم اِدھر آؤ، اور سُنو، جو دو آدمی آتے ہیں جب تک ہم حکم دیں اُنھیں ٹھیرائے رکھو۔

خادم:- حضور، وہ محل کے باہر حاضر رہینگے۔

میکبتھ:- اچھا، اُنھیں یہاں حاضر کرو۔

(خادم باہر جاتا ہے۔)

حالت اس وقت خیر و سلامتی کی نہیں ہے۔ اس بینکو کے خوف سے دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ اس کی اولاد اس وقت سرآرائے سلطنت ہے جس سے خوف کرنا لازمی ہے۔ تہوّر و مردانگی کے ساتھ عقل بھی اس کے عزم و ہمت کی ہادی و رہنما ہے۔ بجز اس بینکو کے کوئی دوسرا نہیں جس کے زندہ رہنے سے مجھے خوف ہو سکتا ہو۔ اس کے کوکبِ اقبال کے سامنے میرا ستارہ اس طرح محجوب ہو جاتا ہے جیسے اگلے وقتوں میں انطونی کا ستارہ قیصر (اغسطس) کے ستارے کے سامنے بے نُور ہوگیا تھا۔ جب وہ تینوں جادوگرنیاں اُس ویران مقام پر نظر آئی تھیں اور جب اُنھوں نے بادشاہ کہہ کر مجھے مُبارکباد دی تھی تو بینکو کیسا بگڑا تھا۔ اور کیسی ڈانٹ بتا کر اُن سے پُوچھا تھا کہ وہ اسکی نسبت بھی کوئی اچھی خبر دیں۔ چُنانچہ اُنھوں نے بینکو کو بھی یہ کہکر مُبارکباد دی کہ وہ ایک سلسلۂ شاہی کا مُورثِ اعلیٰ ہوگا۔ غرض یہ تقدیر کی بانچنے والیاں میرے سر پر ایک تاج بے ثمر اور میرے ہاتھ میں ایک عصائے بے سُود رکھکر چلی گئیں تاکہ یہی چیزیں وہ لوگ جو میرے صلب سے نہ ہوں مجھ سے چھین لیں۔ اور میری اولاد میں کوئی وارثِ تاج و تخت نہ ہو۔ گویا بینکو کی اولاد کے لئے میں نے اپنی طبیعت کو غارت کیا اور انہی کے لئے میں نے ڈنکن کا خون کیا۔ انہی کے لئے اپنے قلب میں سکون و اطمینان کی جگہ بغض و عناد کو جگہ دی۔ تو کیا میں نے انہی کے لئے اپنے روح کے گوہرِ ازلی کو شیطان ملعون کے حوالے کیا ہے۔ تاکہ بینکو کی اولاد بادشاہ ہوکر حکومت کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اے تقدیر اب میدان میں اُتر اور میرے لئے جان پر بازی لگا کر لڑ۔ کوئی ہے؟

(خادم اندر آتا ہے۔ اسکے ساتھ دو قاتل ہیں۔)

اچھا خادم۔ جب تک کہ ہم آواز دیں تم دروازے کے پاس کھڑے رہو (قاتلوں سے کہتا ہے) کیا تم ہی سے کل اس معاملے میں گفتگو ہوئی تھی۔

پہلا قاتل:۔ حضور کل ہی ارشاد ہوا تھا۔

میکبتھ:۔ پھر جو کچھ ہم نے کہا تھا اس پر تم نے غور کیا۔ تمہیں معلوم رہنا چاہیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے گزشتہ زمانے سے تمہیں اتنا محتاج و مفلوک الحال کر رکھا ہے۔ اور تم اس غلط خیال میں ہو کہ تمہاری خستہ حالی کا باعث ہم ہیں۔ نہیں، ہم واقعی اس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں۔ اور پچھلی مرتبہ جو گفتگو ہوئی تھی اس میں ہم نے اس بات کو نہایت واضح اور صاف طریقے پر تمہارے سامنے بیان کر دیا تھا۔ اور تم کو سمجھا بھی دیا تھا کہ کس طرح ہم پر کوئی گرفت پا کر وہ ہماری مخالفت کے درپے رہنا چاہتا ہے، اور وہ کون سے وسائل اور کون سے لوگ ہیں جن کو کام میں لا کر وہ ہمیں غارت و تباہ کرنے پر آمادہ ہے۔ ایک نادان بھی جس میں عقل نہ ہو دیکھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا بینکو کا ہے۔

پہلا قاتل:۔ یہ کل حال تو حضور ہی نے ہم پر کھولا تھا۔

میکبتھ:۔ اور اب اسکا تذکرہ بھی تم ہی سے چاہتا ہوں۔ اور یہی بات تم سے دوسری ملاقات کی وجہ ہوئی۔ کیا تمہاری طبیعت میں صبر اتنا غالب ہے کہ تم اپنی اسی حالت میں رہنا گوارا کر سکتے ہو۔ کیا تمہاری مذہبی تعلیم اتنی ہے کہ تم اُسے ایک نیک بخت اور پارسا شخص سمجھ کر اُس کی خیر و سلامتی کی دُعا مانگو۔ جس کے ظلم و ستم سے تم قبر تک پہونچ گئے ہو اور جس نے تمہیں مفلس و فاقہ کش بنا دیا ہے۔

پہلا قاتل:۔ حضور انسان تو ہم بھی ہیں۔

میکبتھ:۔ ہاں فہرستوں میں تو تم آدمی ہی لکھے جاتے ہو مگر شمار تمہارا کتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں چاہے شکاری ہوں چاہے تازی؛ چاہے جھبرے چاہے پلّے۔ چاہے وہ ہوں جو شکار کے لئے پانی میں کود پڑتے ہیں۔ یا بھیڑیے اور کتے کی مخلوط نسل سے ہوں۔ مگر بہرکیف سب کو کتا ہی کہا جاتا ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ خصلت و عادت جو فطرت سے تمہیں عطا ہوئی ہے مثلاً تیز رفتاری یا سُست چال۔ تیزی گھر کی چوکیداری میں ہوشیاری یا کوئی اور خصوصیت کا لحاظ کر کے تم میں تمیز کی جاتی ہو۔ بہرحال تمہیں کہتے کتا ہی ہیں۔ پس اس قسم کی خصوصیتوں میں اگر تمہیں امتیاز حاصل ہے اور اس فہرست میں تم کوئی درجہ رکھتے ہو، اور انسان کی بدترین قسم سے نہیں ہو تو کہو تاکہ میں خفیہ طور پر تمہارے کان میں وہ بات ڈالوں جس سے تمہارا دُشمن دُنیا ہی سے چل بسے۔ اور یہ کام وہ ہوگا کہ اگر تم نے اُسے بخوبی انجام دیا تو ہمارے دل میں تمہاری جگہ ہوگی اور ہم تم سے ہمیشہ مہربانی و محبّت سے پیش آیا کرینگے۔ اس وقت تو اُس کی زندگی نے تمہیں اپنی جان ہی سے اتنا بیزار کر رکھا ہے کہ اگر وہ مارا گیا تو تمہیں چین اور آرام نصیب ہو جائیگا۔

پہلا قاتل:۔ حضور میں نے دُنیا میں وہ وہ صدمے اُٹھائے اور ایسی ایسی چوٹیں کھائی ہیں کہ ہر وقت دل جلا بھُنا رہتا ہے۔ اور کسی کو نقصان پہونچانے میں مطلق تامل یا دریغ نہیں ہوتا۔

دوسرا قاتل:۔ اور حضور میں دوسرا شخص ہوں جس نے ناکامیاں سہتے سہتے اور تقدیر سے ہر وقت کشمکش میں رہتے رہتے اپنا دل ایسا پتھر کر لیا ہے کہ کسی بات پر جان جانے یا رہنے کی مطلق پروا نہیں رہتی۔

میکبتھ:۔ تم دونوں کو اِس بات کا علم ہے کہ بینکو تمہارا دشمن ہے۔

دونوں قاتل:۔ حضور بجا فرماتے ہیں۔

میکبتھ:۔ اور یہی حال اُس کا ہمارے ساتھ ہے اور پھر یہ دشمن جاں ہم سے اتنا قریب ہے کہ اُس کے زندہ رہنے سے ہمیں کسی نہ کسی طور پر نقصان پہونچنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو بلا تکلف علی الاعلان یہ کہہ کر کہ یہی ہماری مرضی ہے اُسے اپنی نظروں سے دُور کردیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اُس کے بھی دوست ہیں اور ہمارے بھی۔ اور اُن کی دوستی و محبّت کو ہم ترک نہیں کرسکتے۔ اگر ہم نے اپنے ہاتھ سے اُسے قتل کردیا تو پھر ہمیں اُس کی موت پر اظہارِ افسوس کرنا پڑیگا۔ اور یہی بڑی وجہ ہے کہ ہم نے اس کام میں تم سے مدد چاہی ہے تاکہ کُل معاملہ عام نظروں سے چُھپا رہے۔ کیونکہ چند وجوہ ایسے ہی سخت ہیں۔

دونوں قاتل:۔ جو کچھ حکم حضور دے رہے ہیں حسب الارشاد ہم اُسے بجا لائیں گے۔

پہلا قاتل:۔ اِسمیں چاہے ہماری جانیں ہی......

میکبتھ:۔ اِس کام میں تمہاری خوشی اور رضامندی تمہارے چہروں سے ظاہر ہے۔ بس اِس کام کو اسی وقت انجام دو۔ وہ مقام جہاں تمہیں اُس کی تاک میں بیٹھنا ہوگا ہم بتائیں گے۔ اور جو کچھ بھی اُس کی نقل و حرکت کے متعلق جاسوسوں سے معلوم ہوتا رہے گا اُس سے تمہیں مُطلع کریں گے۔ اور ٹھیک وہ وقت بھی تمہیں بتادیا جائیگا جس وقت یہ کام کرنا ہوگا۔ یعنی آج ہی رات کو یہ مرحلہ طے ہوجانا چاہیئے۔ موقع یہاں سے قریب ہے۔ مگر دیکھو ہماری طرف سے کسی بات کا ہونا ہرگز ظاہر نہو۔ اور ہم اِس امر سے بالکل پاک صاف رہیں۔ اور دیکھو کوئی کسر کسی بات میں رہ نہ جائے۔ فلی انس اُس کا بیٹا بھی اُس کے ہمراہ ہوگا۔ اُس کا عدم میں پہونچنا بھی ہمارے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ اُس کے باپ کا۔ جو حال اُس کے باپ کا ہو وہی اُس کا بھی ہو۔ اور ایک ہی وقت میں دونوں کا کام تمام کیا جائے۔ اچھا اب تم دونوں باہم مشورہ کرلو۔ میں ابھی پھر آتا ہوں۔

دونوں قاتل:۔ حضورِ والا۔ ہم ارادہ کرچکے ہیں۔

میکبتھ:۔ اچھا ذرا باہر ٹھیرو۔ میں پھر تمہیں ابھی بلاؤنگا۔

(قاتل چلے جاتے ہیں)

بینکو تیرا کام تو تمام ہوا۔ اگر جسم سے نکل کر تیری رُوح جنّت کی تلاش میں روانہ ہو تو یہ روانگی آج ہی پیش آجانی چاہیئے۔

دوسرا منظر:۔ میکبتھ کا قصر۔

لیڈی میکبتھ اور ایک مُلازم اندر آتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کیا بینکو دربار سے چلا گیا؟

مُلازم:۔ حضور۔ مگر شب کو پھر واپس آئیگا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا، بادشاہ کے پاس جاکر کہو کہ میں تخلیئے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

مُلازم:۔ بہت بہتر۔ ابھی جاکر عرض کرتا ہوں۔

(مُلازم چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ حاصل کچھ نہ ہوا۔ کھویا سب کچھ۔ جب ہماری کوئی خواہش ناقابلِ اطمینان طور پر پوری ہوتی ہے تو وہ ہمیں غارت کرنے میں اتنی آزاردہ نہیں ہوتی جسقدر کہ اُس کے بعد کا خوف دلمیں طرح طرح کے وہم پیدا کرکے ہماری مسرتوں کو خاک میں ملاتا رہتا ہے۔

(میکبتھ آتا ہے)

فرمایئے آقا، آپ، تنہ اکیلے اکیلے کیوں رہنے لگے؟ اس سے آپکے ملنے والوں میں عجیب عجیب شکوک آپکی نسبت پیدا ہونے ہیں۔ اور وہ شکوک ایسے ہوتے ہیں جنہیں اب تک قطعی معدوم ہوجانا چاہیئے تھا۔ انہی شکوک کی وجہ سے وہ آپکی طرف سے بدگمان ہوتے ہیں۔ جو چیز لاعلاج ہوچکی ہو پھر اُس کا تدارک عبث ہی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہولیا۔

میکبتھ :- سانپ چوٹ تو کھا گیا مگر مرا نہیں۔ جہاں زخم اچھا ہوا پھر جیسا تھا ویسا ہی ہوجائیگا۔ اور جو زہر اس میں پہلے تھا پھر اُس کے پیدا ہوجانے کا خطرہ قائم رہیگا، یعنی روٹی کھانے جب بیٹھیں تو ڈرتے رہیں اور جب سوئیں تو نیند میں وہ ہیبت ناک خواب نظر آئیں کہ تن بدن پر رزہ پڑجائے۔ بہتر ہوتا کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں درہم برہم ہوجائیں۔ اور کاش ہم بھی اُنہی رفتگان عدم میں جا پہونچتے جنہیں ہم نے اپنے اطمینان کے لئے عالم بالا میں آسودہ کردیا ہے۔ بجائے اس کے کہ زندہ رہکر حالت اضطراب و پریشانی میں رہیں۔ اور سخت سے سخت تکلیفیں اور عذاب اُٹھائیں۔ دُنیا کی مکروہات و آلام سے قطعی آزاد ہوجانے پر ڈنکن اپنی قبر میں آرام سے سوتا ہے۔ اب نہ بغاوتیں نہ بلوے، نہ تلوار نہ زہر، نہ خانہ جنگی نہ دشمن کی سرکشی یا ایسی ہی اور خرابیاں اُس کی نیند اُچاٹ کرسکتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ :- پیارے شوہر ان خیالات کو دل میں راہ نہ دیجئے۔ آپ اپنی یہ پریشان نظریں دُور کریں۔ آج تو مہمان آئے ہیں۔ اُن کے سامنے خوش اور خنداں پیشانی رہیئے۔

میکبتھ :- ہاں پیاری بیوی، ایسا ہی ہوگا۔ تم بھی خوش و بشاش رہو۔ بینکو کی خاطر و تواضع میں کمی نہ ہو۔ نظر اور زبان دونوں سے اُس کی مدارات بہت کرنا۔ کیونکہ غصب دولت میں اپنی اس نئی شان کے داغوں کو خوشامد اور خوش اخلاقی سے دھونا اِس وقت ہمارے لئے محفوظ ترین طریقہ ہوگا۔ اور چہرے کے پردے میں دل کے اصلی خیالات کو چھپائے رکھنا بھی ضروری ہے۔

لیڈی میکبتھ :- ان سب باتوں کو تو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔

میکبتھ :- پیاری بیوی، اس کلیجے میں تو سانپ اور بچھو بھرے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بینکو اور فلی انس ابھی تک جیتے بیٹھے ہیں۔

لیڈی میکبتھ :- تو کیا خُدا کی بنائی ہوئی ان صورتوں کو خدا کی طرح ہمیشگی حاصل ہے؟

میکبتھ :- ہاں، بس اتنا ہی تو اطمینان ہی کہ اُنپر حملہ کرکے اُنہیں غارت کیا جاسکتا ہے۔ بس اب خوش رہو۔ شام ہونے دو۔ جس وقت شپرک پُرانی عمارتوں، چھتوں چھجوں اور برجوں میں اپنے آشیانوں سے نکل کر ہوا میں اُڑیں اور جب تک کہ بڑا جھینگر اپنے سخت خول سے پر نکالکر اندھیرے میں دور سے زفیل دیتا سُنائی دے، پھر اُس وقت ایک کام ایسا کیا جائیگا جو خوفناک ہوگا۔

لیڈی میکبتھ :- اچھا پھر کیا کرنا ہوگا؟

میکبتھ :- جو کچھ اِس وقت سوچا ہی جب تک وہ نہ ہولے کوئی بات کسی پر ظاہر نہ ہو۔ بینکو کی تعریف و توصیف میں مصروف رہکر اور کوئی بات مُنہ سے نہ نکلے۔ آ، اے اندھیری رات جلد آ۔ اور اس واجب الرحم دن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے۔ اور اپنے خونی ہاتھوں سے جو کسی کو نظر نہ آئیں اُن مجبوریوں کو دُور کردے جنہوں نے تیرا رنگ زرد کر رکھا ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور کوّے جنگل کا رُخ کرکے اپنے

آشیانوں کی طرف اُڑنے لگے ہیں۔ دن بھر کی چلتی پھرتی صورتیں کسل مند ہوکر نیند کی ماتی ہوچلی ہیں، اور رات کی سیاہ بلائیں درندوں کو شکار کے لئے جگا رہی ہیں۔ تم میری اِن باتوں کو حیرت سے سُنتی ہو گی۔ لیکن خاموش رہو، کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ جن باتوں کی ابتدا خراب ہوتی ہے انہیں وہ خرابیاں پیدا ہوکر انہیں خوب پکّا اور مضبوط کر دیتی ہیں۔

تیسرا منظر:۔ محل کے قریب ایک باغ۔

تین قاتل آتے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ تم سے کس نے ہمارا شریک بننے کو کہا ہے؟

تیسرا قاتل:۔ میکبتھ نے حکم دیا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ ہماری اتنی بے اعتباری اُسے نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اس کام کے لئے اُس نے ہر قسم کی ہدایت ہمیں خود کر دی تھی۔ اور بتا دیا تھا کہ کن طریقوں سے یہ کام ٹھیک طور پر انجام دیا جائے۔

پہلا قاتل:۔ اچھا اب آ گئے ہو تو ساتھ رہو۔ پچھم کی طرف ابھی تک روشنی کی ایک تحریر باقی ہے۔ اور وقت ایسا ہے کہ اگر کسی مسافر کو منزل پر پہونچنے میں دیر معلوم ہوتی ہو گی تو وہ جلدی کرکے کسی سرائے میں پہونچنا چاہتا ہوگا۔ اور لو وہ چیز بھی قریب آتی جاتی ہے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سُنو۔ گھوڑوں کے قدموں کی آواز آنے لگی ہے۔

بینکو:۔ (کی آواز اندر سے آتی ہے) ارے کوئی ہے ہمیں روشنی دکھاؤ۔

دوسرا قاتل:۔ یہ آواز تو یقینی اُسی کی ہے۔ اور جتنے مہمان بُلائے گئے تھے وہ تو محل کے صحن میں پہونچ چکے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ گھوڑے تو سڑک سڑک محل تک جاتے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سڑک سے جانے میں تقریباً ایک میل کا پھیر پڑتا ہے۔ بینکو تو اکثر یہیں گھوڑے سے اُتر کر باقی فاصلہ پیادہ پا طے کرتا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ روشنی، روشنی۔

تیسرا قاتل:۔ ہاں، یہی ہے، یہی ہے۔

پہلا قاتل:۔ ٹھیرو۔ کون ہے۔

(بینکو اور فلی انس ایک مشعل لئے آتے دکھائی دیتے ہیں۔)

بینکو:۔ آج رات کو مینہ آتا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا قاتل:۔ برسنے دیجئے۔

(بینکو پر حملہ کیا جاتا ہے)

بینکو:۔ ارے دغا۔ فریب۔ پیارے فلی انس بھاگ بھاگ بھاگ۔ تجھے میرا انتقام لینا ہوگا۔ ارے غلام بے ایمان

(بینکو مر جاتا ہے۔ فلی انس فرار ہوتا ہے)

تیسرا قاتل:۔ روشنی کس نے بجھا دی؟

پہلا قاتل:۔ یہی تھا جسے بتایا گیا تھا۔

تیسرا قاتل:۔ ایک گرا ہے مگر اِسکا بیٹا نکل گیا۔

دوسرا قاتل:۔ تو پھر یہ سمجھو کہ شکار کا بہتر نصف ہاتھ سے نکل گیا۔

پہلا قاتل:۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اب یہاں سے چلو۔ اور بتاؤ کہ کتنا کام ہوا اور کتنا رہ گیا (چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر:۔ محل کا ایک بڑا کمرہ۔ ضیافت کا سامان آراستہ ہے۔ میکبتھ، لیڈی میکبتھ، راس، لینکس، دربار کے اُمرا اور خدام موجود ہیں۔

میکبتھ:۔ آپ سب اپنے اپنے درجے اور مرتبے سے خود واقف ہیں۔ اُسی کے مطابق تشریف رکھیئے۔ آپکا قدم رنجہ فرمانا ہمارا

موجب مسرت ہے۔

اُمرا:۔ بادشاہِ ذیجاہ کے ہم سب منت گزار ہیں۔

میکبتھ:۔ ہم تو سب ملے جُلے بیٹھکر آپکی میزبانی کریں گے، اور ہماری ملکہ باضابطہ طریقے پر فریضۂ میزبانی ادا کریگی۔ وہ ابھی آنے والی ہیں۔ ہم سب ملکر اُنکو مُبارکباد دینگے۔

لیڈی میکبتھ:۔ میری طرف سے آپ حاضرین کو مُبارکباد دیں۔ اُن کے یہاں تک تکلیف فرمانے پر تو میری زبان سے نہیں بلکہ دل سے تشکّر و امتنان ظاہر ہو رہا ہے۔

میکبتھ:۔ دیکھیے وہ بھی تہِ دل سے آپکا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ دونوں پلڑے برابر ہوئے۔ اس لئے میں سبکے بیچ میں بیٹھتا ہوں۔

(دروازے سے پہلا قاتل اندر آتا ہے)

سب خوش رہو۔ کاسۂ شراب کو میز کے گرد ہر مہمان کے سامنے لاؤ۔ (دروازے کے قریب آکر قاتل سے کہتا ہے) تیرے چہرے پر خون لگا ہے۔

قاتل:۔ غالباً بینکو کا خون ہوگا۔

میکبتھ:۔ اُس کا خون تیرے چہرے پر باہر اتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے کہ اگر وہ جسکا خون تیرے چہرے پر ہے اندر ہوتا تو اتنا اچھا نہ معلوم ہوتا۔ کہو اُسے ختم کر دیا؟

قاتل:۔ حضور ہاں گلا کاٹ دیا۔ اور اُسے یہاں تک آنے کی تکلیف سے بچا دیا۔

میکبتھ:۔ کیا بات ہے۔ تُو تو گلا کاٹنے والوں میں سب کا اُستاد ہے۔ مگر وہ بھی جس نے فلی انس کا گلا کاٹا ہوگا تجھ سے کم نہ ہوگا۔ اگر اُس کا گلا کاٹنے والا بھی تو ہی ہے تو پھر تیرے مثل دوسرا قاتل دُنیا میں نہ نکلیگا۔

قاتل:۔ حضور پُر نور۔ فلی انس بھاگ گیا۔

میکبتھ:۔ تو پھر مجھ پر وہی حالت عود کرگئی جو پہلے تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سنگ مرمر کا ایک سالم ٹکڑا ہوتا جس میں کہیں بال تک نہ ہوتا اور چٹان کی طرح مضبوط ہوتا۔ پھر میں ایسا آزاد ہوتا جیسے ہوا جو ہمارے چاروں طرف بہتی ہے۔ اب میں ہر طرف سے بندھا جکڑا زنجیروں میں کسا ہوں۔ اب پھر طرح طرح کے شکوک اور طرح طرح کے خوف دل میں اپنا گزر کرتے رہیں گے۔ لیکن جو کچھ ہو بینکو کی طرف سے تو اب اطمینان ہو گیا۔

قاتل:۔ حضور۔ اُس کی لاش اب تک خندق میں پڑی ہے۔ اُس کے سر پر بیس زخم ہمارے خنجر کے ہیں اور وہ سب اتنے کاری ہیں کہ اگر اُس میں سے ایک بھی پہونچتا تو جان باقی رہنی ممکن نہ تھی۔

میکبتھ:۔ اس تکلیف کا شکریہ۔ پُرانا سانپ تو مارا گیا مگر سنپولیا نکل گیا۔ اور کیا عجب ہو کہ وقت آنے پر اس سے اور سانپ پیدا ہوتے رہیں، گو اس وقت اس میں اس کی قابلیت نہیں۔ اچھا اب جاؤ۔ کل کسی وقت کل واقعات تفصیل سے سُنیں گے۔ (قاتل چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ بادشاہ، میرے آقا، آپ نہ خود خوش نظر آتے ہیں اور نہ مہمانوں کو خوش کرتے ہیں۔ ضیافت کے وقت میزبان کی طرف سے لُطف و مدارات، خاطر و تواضع کا نہ ہونا ایسا ہے جیسے ضیافت نہ ہوئی، قیمت دے کر لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ ضیافت میں میزبان کی طرف سے خاطرداری اور خوش خلقی کا ظاہر ہونا لوازماتِ میزبانی سے ہے۔ ورنہ کھانا تو سب اپنے گھر بھی کھاتے ہیں۔ مگر تپاک و مدارا کھانے میں چاشنی کا کام دیتا ہے بغیر اسکے ضیافت ایک بیکار شے ہے۔

میکبتھ:۔ اے میری پیاری رفیق۔ بھُول چُوک میں بات کی یاد دلانے والی بیوی۔ ہاضمہ درست ہو تو اشتہا بھی ہوتی ہے۔

تندرستی کیلئے دونوں ضروری ہیں۔

لینکس :۔ حضور تشریف رکھیں۔

(بینکو کی رُوح داخل ہوتی ہے اور میکبتھ کی
کُرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

میکبتھ :۔ آج مُلک کے تمام اکابر اور شُرفا ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ کاش اس وقت شریف بینکو بھی موجود ہوتا۔ اُس کے نہ آنے کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وعدہ خلافی کی۔ دوسرے سوءِ اتفاق۔ سوءِ اتفاق پر اتنا افسوس نہیں جس قدر کہ وعدہ خلافی کی شکایت ہے۔

لینکس :۔ حضور، بینکو کی غیر حاضری اُسے وعدہ شکن قرار دیتی ہے۔ اب حضور یہاں رونق افروز ہوکر ہمیں شرفِ حضوری بخشیں۔

میکبتھ :۔ لیکن میز کے گرد تو سب مہمان بیٹھے ہیں۔ میرے لئے جگہ کہاں ہے؟

لینکس :۔ حضور کے لئے یہ جگہ ہے۔

میکبتھ :۔ کہاں؟

لینکس :۔ حضور یہاں۔ وہ کیا چیز ہے جس سے حضور کی حالت متغیر ہوئی جاتی ہے؟

میکبتھ :۔ تم میں سے کس نے یہ کام کیا ہے؟

اُمراء :۔ کیا کام۔ حضور کا کیا مطلب ہے؟

میکبتھ :۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ تم کیوں اپنے سر کی خون آلودہ لٹیں میری طرف جھٹکتے ہو؟

راس :۔ حاضرین اُٹھیئے۔ بادشاہ سلامت کا مزاج نادرست ہے۔

لیڈی میکبتھ :۔ میرے معزز مہمانو۔ بادشاہ کو اکثر اس قسم کا دورہ اُٹھا کرتا ہے۔ بلکہ ابتدائے جوانی سے یہی حال ہے۔ آپ سب صاحب اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔ یہ دورہ صرف تھوڑی دیر رہتا ہے۔ اگر آپ صاحبوں میں سے کسی نے ان کی طرف زیادہ توجّہ کی تو دورہ سخت ہوجائیگا اور انہیں سخت تکلیف پہونچے گی۔ آپ سب کھانے میں مصروف رہیں اُنکا خیال نہ کریں۔

(میکبتھ سے علیحدہ کہتی ہے) آپ بھی کیا آدمی ہیں۔

میکبتھ :۔ ہاں آدمی ہوں اور بڑا بہادر ہوں۔ اور اُس چیز سے آنکھیں ملا سکتا ہوں جسے شیطان بھی دیکھکر ڈر جائے۔

لیڈی میکبتھ :۔ ارے غضب۔ یہ تو خوف وہیم کی ایسی ہی کوئی صورت ہے جیسے کہ وہ خنجر تھا جسے ہوا میں دیکھا تھا۔ اور میکبتھ اُسے دیکھتا ہوا ڈنکن کے خواب گاہ تک گیا تھا۔ یہ دفعتاً چونکنا، جھجکنا کسی اصلی خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ خوف تو اس قسم کا ہے جیسے جاڑے کی رات میں کوئی بڑھیا اپنی دادی نانی کی کہی ہوئی کہانی سُنائے اور سُننے والے چونک چونک پڑیں۔ شرم شرم۔ ایسے بُرے بُرے چہرے کیوں بناتے ہو۔ سب کچھ کہنے سُننے کے بعد بھی تم اُسی کُرسی کی طرف دیکھے جاتے ہو۔

میکبتھ :۔ اچھی، ذرا ادھر دیکھو، اور دیکھکر بتاؤ کہ یہ کون ہے۔ میں تیری کب پروا کرتا ہوں۔ چاہے تو سر ہلانے چاہے گردن۔ چاہے بات کرنی چاہے چاہے چُپ رہے۔ ہم دشمن کو قتل کرکے اُسے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ اگر تہ خانوں میں رکھے تابوتوں سے بھی مُردے نکل آئیں تو پھر قبریں بیکار ہیں۔ مُردے آسمان کے نیچے رکھدیئے جایا کریں تاکہ چیل کوّے اُنہیں نوش کریں۔

(رُوح چلی جاتی ہے)

لیڈی میکبتھ :۔ کیا اس حماقت نے آپکو بالکل ہی نامرد و بُزدل بنادیا۔

میکبتھ:۔ جب میں یہاں کھڑا تھا تو میں نے اُسے دیکھا تھا۔

لیڈی میکبتھ:۔ دل میں شرمندہ تو ہوتے نہیں، زبان چلی جاتی ہے۔

میکبتھ:۔ اگلے وقتوں میں بھی آدمیوں کے خون ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین نے دُنیا سے ظلم و ستم دُور کر کے امن و سلامتی پیدا کی تھی۔ اسکے بعد بھی ایسے ایسے قتل و خون ہوئے جنکو سُنکر کان بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا کہ جہاں دماغ معطل ہوا آدمی مر کر قصہ ختم کر دیتا تھا۔ لیکن اب تو یہ حال ہو کہ مر کر بھی جی اُٹھتے ہیں۔ سر میں بیس بیس زخم ہوتے ہیں جن میں سے ہر زخم مُہلک ہوتا ہو، پھر بھی وہ ہمیں ہماری کرسیوں سے اُٹھا دیتے ہیں۔ یہ قتل و خون تو کچھ عجیب طرح کے قتل و خون ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ میرے آقا۔ ضیافت میں آپکے مہمان آپ کی عدم موجودگی سے سخت پریشان ہیں۔

میکبتھ:۔ خوب یاد دلایا۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ میرے عزیز و لائق دوستو! میری وجہ سے آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ یہ عجیب مرض مجھے مدت سے لاحق ہو گیا ہو۔ جو لوگ واقف ہیں اُن کے لئے مجھے اِس حال میں دیکھنا ایک معمولی بات ہو۔ آیئے، میں اب سب کے ساتھ بیٹھکر سب کے لئے خلوص و محبت کا جامِ شراب پیتا ہوں۔ اور یہ جام اپنے دوست بینکو کے لئے ہے جسے ہم اِس وقت یاد کرتے ہیں۔ کاش وہ یہاں ہوتا۔ سب کے لئے اور اُس کی یاد میں یہ جامِ صحت پیتا ہوں، اور کُل مہمانوں کے حق میں دُعائے خیر کرتا ہوں۔

اُمراء:۔ ہم حضور کے خُدامِ جاں نثار ہیں۔

(بینکو کی رُوح پھر اندر آتی ہے۔)

میکبتھ:۔ دُور ہو بدبخت میری نظر سے دُور رہ۔ کاش زمین تیرا مُردہ ڈھک دیتی۔ تیری ہڈیوں میں اب گُودا نہیں۔ تیرا خُون سرد ہو چکا ہے۔ تیری آنکھوں میں زندگی کا نُور نہیں، پھر کیوں گھُورے جاتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ معزز حاضرین۔ اِس حال کو معمولی چیز سمجھئے۔ اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ اس سے بزم لُطف و مسرت مکدر ہو جاتی ہے۔

میکبتھ:۔ انسان جس بات کی ہمت کر سکتا ہے میں بھی ہمت و ارادہ کر سکتا ہوں۔ اس میں چاہے روس کے جنگلوں کا کوئی خونخوار ریچھ یا گرگستان کا کوئی شیر یا کوئی اور چیز مہیب شکل اختیار کیوں نہ کرے بلکہ وہ شکل بھی جو اِس وقت میری نظر کے سامنے ہو میرے اعصاب میں مطلق ضُعف پیدا نہیں کر سکتی۔ یا اگر تو پھر زندہ ہو کر تلوار ہاتھ میں لئے صحرا میں کسی تنہا جگہ مجھ سے لڑنے آئے اور پھر میرے ہاتھ میں لرزہ پیدا ہو تو سمجھ لے کہ میں مرد نہیں۔ بلکہ ایک کمزور لڑکی کا دودھ پیتا بچہ ہوں۔ اے ہیبت ناک رُوح یہاں سے چلی جا۔ اے ڈرانے والی خیالی صورت دُور ہو۔

(رُوح چلی جاتی ہے۔)

اب چلی گئی تو میں پھر آدمی کی جُون میں آ گیا۔ مہاجو! آپ خاموش بیٹھے رہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ آپ نے اِس وقت کا لُطف تو کرکرا کر دیا۔ اور اِس مُبارک مجمع کو اس طرح پراگندہ کیا کہ ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔

میکبتھ:۔ کیا ایسی صورتیں دُنیا میں موجود ہیں جو موسم بہار کے ایک بادل کی طرح ہمارے سر سے گزر جائیں اور ہمیں کچھ تعجب نہ ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا جری اور دلیر ہوں لیکن دیکھتا ہوں کہ ہم سب کے چہروں پر سُرخی ہو اور میرا صورت پر زردی کھنڈی ہے۔

راس:۔ آقا کِس کی صورتوں سے آپکا مطلب ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ خدا کے لئے کچھ نہ بولو۔ دیکھتے نہیں کہ بات کرنے سے اُن کی حالت اور بگڑتی ہے۔ سوال کرنے سے اور زیادہ غصّہ بڑھتا ہے۔ اچھا، اب خدا حافظ۔ رُخصت ہونے میں درجے اور مرتبے کا خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ جملہ مُعززین یکلخت رُخصت ہوں۔

لینکس:۔ آداب بجالاتا ہوں۔ خُدا حضور کو صحت تندرستی بخشے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

لیڈی میکبتھ:۔ میں بھی سب کے لئے دُعا کرتی ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔ میکبتھ اور لیڈی میکبتھ رہ جاتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ وہ تو خُون مانگتی ہے خُون کا بدلہ خُون ہی ہوا کرتا ہے۔ سُنا گیا ہے کہ پتھر بھی جُنبش میں آتے ہیں اور درختوں کو قوتِ گویائی ملی ہے۔ اور اُن آیندہ کی خبریں کہنے والے لوگوں نے جو دُنیا میں اشیا کے تعلقات سے واقف ہیں بلکہ زاغ و زغن نے بھی ایسے قاتل کا پتہ بتادیا ہے جسنے اپنے جُرم کو غایت درجے پوشیدہ رکھا تھا۔ رات کا وقت ہی۔ کیا بجا ہوگا؟

لیڈی میکبتھ:۔ صبح ہونے کو ہے۔ مگر یہ بتانا مُشکل ہی کہ ابھی رات باقی ہی یا صبح ہوگئی۔

میکبتھ:۔ یہ تم نے کیا کہا تھا کہ میکڈف جشن تاجپوشی میں شرکت سے انکار کرتا ہے؟

لیڈی میکبتھ:۔ کیا آپ نے اُسے مدعو کیا تھا؟

میکبتھ:۔ اتفاق سے میرے کان میں یہ بات پڑگئی ہے۔ میں نے تو اُس کے گھر میں اپنا ایک جاسوس لگا رکھا ہے۔ کل میں میکڈف کو طلب کرونگا۔ اور اگر وقت مِلا تو جنگل کی اُن جادوگرنیوں سے بھی مُلاقات کرونگا تاکہ اُن سے کچھ اور حالات دریافت کروں۔ اب میں نے مُصمّم ارادہ کرلیا ہے کہ بدترین ذرائع سے بدترین خبریں اپنے متعلق دریافت کرنے کی کوشش میں رہوں اور اپنے ذاتی نفع کے سامنے دوسرے کی کچھ حقیقت نہ سمجھوں۔ میں تو اِس وقت خُون کے دریا میں سر تک ڈوبا ہوا ہوں۔ کِس طرح تیر کر دوسرے کنارے پہونچ سکتا ہوں۔ واپس جانا بھی اب اتنا ہی دشوار ہے جسقدر کہ یہاں تک پہونچنا دشوار تھا۔ میرے دماغ میں تو اس وقت عجیب عجیب خیالات سمائے ہیں اور سر دست وہی کرنا پڑیگا جو بے سوچے سمجھے دل میں آئیگا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اب تمہیں نیند نہیں آتی؟ افسوس اُس چیز سے تم محروم ہوگئے جو ہر ذی حیات کے لئے موجبِ راحت ہوتی ہے۔

میکبتھ:۔ اچھا آؤ چلکر سو رہیں۔ میری تکلیفیں خود میری طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور میرا خوف وہ ہی جو پہلے جُرم پر پیدا ہوکر آیندہ جرائم کے لئے دل کو سخت پتھر کردیتا ہے۔ ابھی تو ہمیں جرائم میں مُبتدی سمجھو۔

(سب چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:۔ کیچڑ پانی اور جھاڑیوں والی زمین۔ گرجتے بادل میں تینوں جادوگرنیاں ہیکیٹی کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی:۔ اے ساحروں اور بلّیات کی سردار ہیکیٹی آج تو کیوں خفا معلوم ہوتی ہے؟

ہیکیٹی:۔ خفا ہونے کی وجہ کافی ہے۔ اری چڑیلوں تم بڑی گستاخ اور بے باک ہوچلی ہو۔ تم نے میکبتھ کے ساتھ خود ہی بات چیت کی اور موت زیست کی باتیں چیستان بناکر اُس سے کہیں۔ اور میں جو تم سبکی سردار ہوں اور جسکا کام دُنیا پر طرح طرح کی بلائیں اور آفتیں نازل کرنا ہی اُسے

خبر تک نہ تھی کہ میں بھی اس کام میں شریک ہوتی۔ اور اپنے فن و مہارت کا پورا کمال دکھاتی۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ جو کچھ تم نے کیا ایک ایسے شخص کے لئے کیا جو خود غرض اور مغلوب الغضب آدمی تھا اور صرف اپنا مطلب نکالنا چاہتا تھا۔ ہمارے سحر اور طلسم کی اُسے خبر نہ تھی۔ جاؤ دور ہو۔ اور کل صبح اکیرون کے غار کے قریب مجھ سے ملو وہاں میکبتھ کی تقدیر کا حال معلوم کرو گی۔ سحر اور طلسم کے کُل ظروف اپنے ساتھ لانا۔ جادو اور سحر کا کُل سامان جنتر منتر یا جسقدر چیزیں ایسے موقع پر درکار ہوتی ہیں ساتھ ہوں۔ اب میں فضا میں گشت لگانے نکلتی ہوں۔ اور آج کی رات نہایت پُرہیبت اور مُہلک معاملات میں بسر کرنے والی ہوں۔ اور آج ہی دوپہر سے پہلے یہ کام کرنا ہے کہ کُرۂ ماہتاب کے کنارے بخارات کا ایک عظیم الشان قطرہ نیچے کو جُھکا دکھائی دیتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زمین پر گرنے سے پہلے اُسے لپک لوں۔ اور پھر ان بخارات کو جادو کے زور سے مُقطّر کر کے اُن سے وہ روحیں پیدا کروں جو اپنی دہشت سے میکبتھ کو خود غارت ہونے کی طرف مائل کریں۔ پھر وہ تقدیر کو بُرا نہ سمجھے گا۔ موت کی اُسے پروا نہ ہوگی۔ اور اپنی توقعات ایسی چیزوں پر قائم کریگا جو عقل، مروّت اور خوف سے بالاتر ہونگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا یہ کمزور خیال کہ وہ ہر طرح پر محفوظ ہے اور احتیاط غیر ضروری ہے جیسا ہلاک کرنے والا ہے دوسری چیز نہیں۔

(باجے اور ساز بجتے ہیں اور ایک گیت کے گانے کی آوازیں اندر سے آتی ہیں)

سُنو، مجھے کوئی بلا رہا ہے۔ دیکھو وہ میری ہمزاد کہر کے بادل پر بیٹھی میرا انتظار کرتی ہے۔

پہلی جادوگرنی:۔ آؤ بہنوں جلدی کریں۔ ہیکٹی بھی تھوڑی دیر میں پھر آتی ہوگی۔

چھٹا منظر:۔ فورس۔ لینکس اور ایک امیر آتا ہے۔

لینکس:۔ میری گزشتہ تقریروں پر تو آپنے غور کیا ہوگا اور اُنکا اصل مفہوم آپکے خیال میں آگیا ہوگا۔ مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ حالات کچھ عجیب و غریب شکل میں ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن کی موت پر میکبتھ کو کیا کچھ افسوس اور رنج نہ ہوا ہوگا۔ واللہ ڈنکن کیا قتل ہوا دُنیا کا بادشاہ مارا گیا۔ اور یہ بہادر بینکو پیادہ پا ہونے کی وجہ سے ضیافت میں دیر کر پہونچا۔ اور اگر آپ چاہیں تو فلی انس کی نسبت بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنے باپ کا قاتل ہے۔ کیونکہ وہ بھی موقع قتل سے فرار ہوا ہے۔ انسان کو چلنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے کیونکہ لوگوں کے دماغ اس خیال سے خالی نہیں رہ سکتے کہ میلکم اور دونل بین کی یہ کس درجہ ناشائستگی تھی کہ انہوں نے اپنے معزز و محترم باپ کو قتل کر ڈالا۔ یہ بڑی ہی نالائقی کی حرکت تھی۔ اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میکبتھ کو اس حادثہ سے کس درجہ صدمہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ اُن دو آدمیوں کو جو ڈنکن کے خوابگاہ میں سوتے تھے قتل کی خبر سُنتے ہی کس طرح میکبتھ نے رنج اور غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ دونوں آدمی شراب کے نشے اور نیند کے خُمار میں چُور تھے۔ خیال فرمائیں کہ یہ کام میکبتھ نے کیسی شرافت کا کیا۔ اور پھر اس کام میں عقل و ہوشیاری کو بھی کچھ کم ملحوظ نہ رکھا۔ کیونکہ اگر وہ دونوں آدمی سب کے سامنے اس قتل سے انکار کرتے تو پھر سُننے والے جو دل رکھتے تھے کیسے اس انکار پر اپنی طبیعتوں پر ضبط رکھ سکتے۔

بس مجھے یہی کہنا ہے کہ جتنے کام میکبتھ نے کئے بڑی صفائی اور خوبی سے کئے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر آج کو ڈنکن کے فرزند میکبتھ کی قفل کُنجی میں ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ باپ کا قتل کرنا کیا چیز ہوتا ہے۔ مگر خُدا کو ایسا منظور نہ ہوا۔ اور فلی انس بھی ایسی ہی مصیبت میں گرفتار ہوتا۔ لیکن ہمیں زبان نہ کھولنی چاہیئے کیونکہ میکڈف اپنی صاف گوئی کے باعث ضیافت میں شرکت کے انکار کی وجہ سے معتوب ہو رہا ہے۔ کچھ آپکو معلوم ہے کہ آجکل وہ ہے کہاں؟

امیر:۔ ڈنکن کا فرزند جسکے حقوقِ سلطنت پر اس وقت اس ظالم کا قبضہ ہے، آجکل شاہِ انگلستان کے دربار میں رہتا ہے۔ اور وہاں کا بادشاہ ایڈورڈ اس کی بہت خاطر و مُدارات کرتا ہے۔ تقدیر کی اِس گردش نے ان دونوں شہزادوں کی عزت و بُزرگی میں کسی قِسم کی کمی نہیں آنے دی۔ میکڈف بھی وہیں چلا گیا ہے اور وہاں جانے کی غرض یہ ہے کہ فوراً بادشاہ ایڈورڈ سے اِس بات کی تحریک کرے کہ وہ بادشاہ کمبرستان اور جنگجو بادشاہ سیورڈ کی مدد سے اگر خدا کی مدد بھی شاملِ حال رہے تو مُلک کی حالت دُرست کرادے۔ اور پھر ہم اِس قابل ہو جائیں کہ ہمارے دسترخوان پر کھانے کو روٹی میسر اور رات کو چین سے سونا نصیب ہو اور جب ہمارے ہاں ضیافتیں ہوں تو آنے والے مہمان قاتل کی چھُریوں اور خنجروں سے محفوظ رہیں اپنے بادشاہ کے جان و دل سے مُطیع رہکر اُس سے انعام و اکرام کے بطریقِ جائز متوقع رہیں، جس کے حاصل ہونے کی اِس وقت حسرت سے آرزومند ہیں۔ یہی باتیں ہیں جنہوں نے ظالم میکبتھ کی اِس درجہ غضبناک کر رکھا ہے کہ وہ لڑائی کے قصد سے تیاریاں کر رہا ہے۔

لینکس:۔ کیا میکبتھ نے میکڈف کو اپنے جشنِ تاجپوشی کے جلسے میں مدعو کیا تھا؟

امیر:۔ جی ہاں۔ مگر میکڈف نے شرکت سے صاف انکار کر دیا اور کہدیا کہ "مجھے افسوس ہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا" قاصد اتنا سُنکر پلٹا اور کہنے لگا کہ جب ایسا جواب دیکر مجھے واپس کیا جاتا ہے تو اُس کا خمیازہ میکڈف کو اُٹھانا پڑیگا"

لینکس:۔ یہ بات تو ایسی ہے جس سے میکڈف ہوشیار رہیگا۔ اور میکبتھ سے وہ اتنا ہی دُور دُور رہیگا جسقدر کہ عقل اُسکی رہنمائی کریگی۔ اے کاش کوئی مبارک فرشتہ اُڑکر انگلستان پہونچتا اور اُس ملک کو ہمارے حال کی خبر کر دیتا کہ وہ کسطرح ایک ظالم و جابر کے ظلم و تشدد سے ہلاکت کے قریب پہونچا ہے۔ خُدا کی رحمت اُس پر جلد سے جلد نازل ہو۔

امیر:۔ میں بھی میکڈف کے حق میں دُعا کرتا ہوں۔

(چلے جاتے ہیں)

جُزو رابع

پہلا منظر:۔ ایک تاریک غار۔ غار کے بیچوں بیچ ایک دیگ آگ پر چڑھی جوش کھاتی ہے۔ آسمان پر بادل گرجتا ہے تینوں جادوگرنیاں آتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی: چتکبری بلی تین مرتبہ میاؤں میاؤں کر چکی ہے۔

دوسری جادوگرنی: جھاڑی کے چوہے نے تین دفعہ دانت نکوسے ہیں۔

تیسری جادوگرنی: دوزخ کے پرندے بھی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ "ہاں وقت یہی ہے۔ وقت یہی ہے"

پہلی جادوگرنی: آؤ آؤ ابلتی دیگ کے گرد چکر لگائیں اور زہر بھری آنتیں اس میں ڈالدیں۔ زہریلا مینڈک جو ایکتیس دنوں اور راتوں پتھر کے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا زہر پھیلاتا رہا ہے سب سے پہلے اسے اس جادو کی دیگ میں ڈالکر جوش دو۔

سب جادوگرنیاں: دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقت۔ آگ جلتی رہے، دیگ ابلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی: کیچڑ دلدل کے سانپ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیگ میں جوش دو۔ پانی کی آنکھ، مینڈک کی ران، چمگادڑ کے روئیں، کتے کی جیب، اژدہے کی دوشاخہ زبان، چھپکلی کی ٹانگ، الو کے پر دیگ میں ڈال کر ابالو، تاکہ دوہری دوہری بلائیں نازل ہوں۔ اور دوزخ کا یہ قلیہ خوب پکے۔ اور خوب بلبلے اٹھیں۔

سب ملکر: دوہری دوہری محنت دوہری دوہری مشقت، آگ جلتی رہے دیگ ابلتی رہے۔

تیسری جادوگرنی: اژدہے کے فلس۔ بھیڑیئے کے دانت، چڑیل کا مردہ، ہلوک کی مسموم جڑ جو اندھیری رات میں کھودی گئی ہو، بکرے کا پتا، کفر بکنے والے یہودی کا جگر، سدا بہار درخت کی شاخیں جو چاند گرہن میں چاندی کی طرح چمکتی ہوں، ترک کی ناک، حبشی کے ہونٹ، کسی بدکار عورت کے حرامی بچے کی انگلیاں جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ اور سڑک کے کنارے کسی نالی میں پیدا ہوا ہو، یہ سب دیگ میں ڈالدو تاکہ شوربا خوب گاڑھا ہو جائے۔ اور اس میں ایک شیر کی اوجھڑی اور ملاؤ تاکہ سب ضروری مصالحے دیگ میں پڑ جائیں۔

سب ملکر: دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقت، آگ جلتی رہے۔ دیگ ابلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی: دیگ میں جو کچھ پکا ہے اسے بندر کے خون سے ٹھنڈا کرو۔ تو پھر ہمارا جادو پکا اور پورا ہو۔

(ہیکیٹی جادوگرنیوں کی سردار آتی ہے)

ہیکیٹی: میں تمہاری اس محنت و تندہی پر شاباش کہتی ہوں اور تمہاری اس تکلیف کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اور اس محنت کی مزد میں ہم سب شریک رہیں گے۔ اور اب اس دیگ کے گرد سب چڑیلیں پریوں کی طرح چکر باندھ کر ناچیں اور گائیں۔ تاکہ جو کچھ تم نے دیگ میں ڈالا ہے اس پر جادو اپنا عمل کرے۔

(ساز بجنے کے ساتھ گانے کی آواز آتی ہے کالے کالے منہ والی روحیں نظر آتی ہیں وغیرہ وغیرہ)

(ہیکیٹی چلی جاتی ہے)

دوسری جادوگرنی: میرے ہاتھ کے انگوٹھے کھجا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خبیث چیز ادھر آ رہی ہے دروازہ جو کھٹکھٹائے اسپر قفل کنڈیاں فورًا کھل جائیں۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

میکبتھ: اری تم کلموہی، آنکھ مچولی کھیلتی آدھی رات کی چڑیلو، کہو تمہارا کیا حال ہے اور کس کام میں مصروف ہو؟

سب ملکر: ہمارا کام وہ ہے جسکا کوئی نام نہیں۔

میکبتھ: جس کام میں بھی تم مصروف ہو اس کی قسم دیکر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دو۔ اس میں چاہے تمہیں چاردانگ عالم سے ہوائیں چلاکر، طوفان اٹھاکر

گر جاؤں ہی کو کیوں نہ ڈھانا پڑے، اور چاہے سمندر پران طوفانوں سے بلا خیز موجیں اُٹھا کر جتنے جہاز اُس پر چلتے ہوں اُنہیں غرق ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چاہے کھیتوں میں اناج بھرے خوشے ٹوٹ جائیں، یا جنگل میں درخت گر جائیں! اور خواہ سر بفلک قلعوں کے اُونچے اُونچے دروازے اُن کے دربانوں کے سروں ہی پر کیوں نہ گر پڑیں، اور چاہے مُرتفع میناروں اور بلند اہرام کے سر جُھک کر اُن کے قدموں ہی سے کیوں نہ جا لگیں۔ اور خواہ فطرت کے کُل جاندار شدّتِ بارش سے اِس طرح غارت ہی کیوں نہ ہو جائیں جس پر غارت گری کا دل بھی شرمندہ ہو۔ غرض یہ جو کچھ بھی ہو مگر جو کچھ میں پُوچھوں اُس کا جواب دو۔

پہلی جادوگرنی:۔ کہو کیا پُوچھتے ہو؟

دوسری جادوگرنی:۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔

تیسری جادوگرنی:۔ جو کچھ پوچھوگے اُسکا جواب دیا جائیگا۔

سب کہتی ہیں:۔ جو کچھ پُوچھنا ہے پُوچھو تاکہ ہم سے یا ہماری ہمزاد روحوں کی زبان سے اپنے سوالوں کا جواب سُنو۔

میکبتھ:۔ اپنی ہمزاد روحوں کو بلاؤ تاکہ میں اُنہیں دیکھوں۔

پہلی جادوگرنی:۔ سُورنی کا خُون دیگ میں ڈالو۔ اور سُورنی بھی وہ ہو جسنے اپنے ایک جھول کے پورے نو بچّوں کو کھایا ہو۔ اور وہ چربی آگ میں ڈالو جو خُونی مجرم کی پھانسی میں لٹک کر جھونکے کھانے سے تختے پر جم جاتی ہے۔

سب ملکر:۔ چھوٹی بڑی ہمزاد روحو سب حاضر ہو۔

(گرج ہوتی ہے۔ پہلی صورت جو نظر آتی ہے وہ ایک چہرہ ہے جسکے سر پر خود رکھا ہے)

میکبتھ:۔ اے نامعلوم طاقت بتا ...

پہلی جادوگرنی:۔ تمہارے دل میں جو کچھ ہے اُسکا حال اسے معلوم ہے۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود کچھ نہ بولو۔

پہلی صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ، میکڈف سے ہوشیار رہ۔ فائف کے امیر سے ہوشیار رہ۔ بس میں کہہ چکا۔ اب مجھے جانے دو۔

(وہ چہرہ غائب ہو جاتا ہے)

میکبتھ:۔ جو کچھ بھی ہو میں تیری اس ہدایت کا ممنون ہوا۔ جس بات سے میں خود ڈرتا تھا اُسے تُونے خوب پہچانا۔ لیکن ایک بات اور بتا دے۔

پہلی جادوگرنی:۔ ہم اُسے کسی بات کا حکم نہیں دے سکتے۔ تو یہ دوسری صورت نمودار ہوئی جو پہلی سے زیادہ قوّت رکھتی ہے۔

(گرج ہوتی ہے۔ خُون میں لتھڑا ہوا ایک بچّہ نظر آتا ہے۔)

دوسری صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ،

میکبتھ:۔ اگر میرے تین کان ہوتے تو بھی میں تیری بات سُن لیتا۔

دوسری صورت:۔ اے خُونی قاتل۔ بڑی ہمت والے جوانمرد جا نبا ز انسان کی طاقت پر تُو حقارت کی ہنسی ہنسا کر۔ کیونکہ کوئی آدمی جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے میکبتھ کو ضرر نہیں پہونچا سکتا۔

(صورت غائب ہو جاتی ہے)

میکبتھ:۔ ذرا ٹھہر۔ میکڈف جتنے دن چاہے زندہ رہے، مجھے اب اُس کا کیا ڈر۔ پھر بھی میں اِس یقین کو پُختہ کر لونگا اور تقدیر کو اِس امر میں ضامن بنانے کے لئے کہتا ہوں کہ میکڈف کو میں زندہ نہ چھوڑونگا۔ تاکہ اس زرد رُو خوف کی جو ہر وقت دل میں رہتا ہے تسکین کر دوں اور خواہ کتنی ہی کڑک اور گرج ہو میں آرام کی نیند سونا ہوں۔

(گرج ہوتی ہے۔ تیسری صورت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت ایک بچے کی ہے جس کے سر پر تاج
رکھا ہے۔ اسکے ہاتھ میں ایک درخت ہے۔)

یہ صورت کس کی ہے جو ایک بادشاہ کے فرزند کی شکل میں نمودار ہوئی ہے اور سر پر تاج رکھے ہے۔

سب جادوگرنیاں:۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود کچھ نہ بولو۔

تیسری صورت:۔ شیر کی طرح دل مضبوط رکھ۔ بے پروا اور مغرور رہ۔ کسی طرح کی فکر یا حفاظت کی ضرورت نہیں۔ خواہ کوئی کچھ کہے۔ کیسا ہی غصہ اور طیش دلائے۔ تیرے خلاف خواہ کیسی ہی سازشیں ہوں مگر کوئی تجھے اُس وقت تک مغلوب نہ کرسکیگا۔ جب تک کہ برنام کا جنگل حرکت میں آکر ڈنسی نین کی پہاڑی پر تیرے مقابلے میں نہ آئیگا۔ (صورت غائب ہوجاتی ہے۔)

میکبتھ:۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ ایسا کون ہے جو ایک جنگل کو نقل مکان پر مجبور کرے۔ اور جنگل کے درختوں کو حکم دے جن کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں کہ تم دوسری جگہ جاؤ۔ یہ فالیں سب نیک ہیں۔ میرے خلاف بغاوت اُس وقت تک سر نہ اُٹھا سکے گی جب تک کہ برنام کا جنگل اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ میکبتھ جس بلند درجے پر اس وقت ہے جب تک فطرت اُسے زندہ رکھے گی اسی درجے اور منزلت پر قائم رہے گا۔ اور اسی حالت میں اُس وقت تک جیئے گا جب تک کہ موت کا آنا اس کی قسمت میں لکھا ہوگا لیکن ایک بات ایسی ہے جس پر اب تک دل دھڑکتا ہے۔ بتاؤ اگر بتا ناممکن ہو کہ کیا بینکو کی اولاد اس مُلک میں کبھی صاحب حکومت ہوگی؟

سب جادوگرنیاں:۔ بس اب زیادہ کچھ سوال نہ کرو۔

میکبتھ:۔ جب تک یہ نہ بتاؤگی مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔ اگر تم نے نہ بتایا تو خدا کا غضب تم پر نازل ہوگا۔ بس اتنا ہی مجھے اور پوچھنا ہے۔ ارے یہ دیگ کیسی زمین میں دھنسی جاتی ہے۔ یہ شور وغل کیسا ہے؟

(باجے بجتے ہیں)

پہلی جادوگرنی:۔ دکھادو۔

دوسری جادوگرنی:۔ دکھادو۔

تیسری جادوگرنی:۔ دکھادو۔

سب ملکر:۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرو اور اس کے دل کو رنج پہونچاؤ۔ پرچھائیوں، آؤ اور اپنی صورت دکھاکر چلی جاؤ۔

(آٹھ بادشاہوں کی صورتیں نظر آتی ہیں
اور آخری صورت کے ہاتھ میں ایک آئینہ
ہے۔ بینکو کی روح پیچھے پیچھے آرہی ہے۔)

میکبتھ:۔ تُو تو بینکو کی روح معلوم ہوتی ہے۔ دُور ہو۔ یہ سروں کے تاج میری آنکھوں کو جلائے ڈالتے ہیں جس پیشانی پر تاج ہے اس کے بال پہلی صورت کی شکل ہیں۔ اور تیسری صورت پہلی صورت سے مُشابہ ہے۔ ارے ناپاک جادوگرنیوں، چڑیلوں تم نے مجھے یہ صورتیں کیوں دکھائی ہیں۔ لو چوتھی صورت بھی نظر آنے لگی۔ آنکھوں حلقوں سے نکل پڑو۔ کیا بادشاہوں کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ لو اور صورت نظر آئی۔ یہ ساتویں ہے۔ میں اب اور زیادہ کچھ نہ دیکھونگا۔ اِس پر بھی آٹھویں صورت اور دکھائی دینے لگی۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ ہے اور آئینہ میں یکے بعد دیگرے بہت سی صورتیں نظر آرہی ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیکھتا ہوں کہ اُن کے ہاتھ میں دو دو گُرے اور تین تین عصاءِ سلطنت ہیں۔ یہ منظر

نہایت ہولناک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کُل باتیں صحیح نکلنے والی ہیں۔ کیونکہ خُون آلودہ بینکو میری طرف دیکھ دیکھکر مُسکراتا ہے اور اشارے سے بتاتا ہے کہ گویا یہ سب اُس کی اولاد ہیں۔ کیا واقعی یہی ہونے والا ہے؟

پہلی جادوگرنی:۔ ہاں جناب واقعی یہی ہونے والا ہے۔ لیکن میکبتھ آپ اتنے خوفزدہ کیوں کھڑے ہیں؟ بہنو آؤ! ہم ان کا دل خوش کریں۔ اور ہم اپنی مسرت کا بہترین سازوسامان اُنکے سامنے پیش کریں۔ میں اپنا جادو ہوا پر چلاتی ہوں جس سے بڑی مہیب آواز فضا میں پیدا ہوگی۔ اور تم سب ناچتی کودتی چکر لگاتی رہو تاکہ بادشاہ وقت ہم پر مہربان ہوکر کہے کہ ہم سب نے اپنی خدمتیں بڑی خیروخوبی سے ادا کیں۔ (ساز بجتے ہیں جادوگرنیاں رقص کرتی مع ہیکیٹی کے غائب ہوجاتی ہیں)

میکبتھ:۔ ارے تم کہاں گئیں۔ کیا سب غائب ہوگئیں۔ یہ بُرا دن تو وہ ہے جو جنتریوں میں نحس وملعون لکھا جائے۔ ارے باہر کوئی ہے؟ اگر ہو تو اندر آئے۔

(لینکس اندر آتا ہے)

لینکس:۔ حضور کیا ارشاد ہے؟

میکبتھ:۔ کیا تم نے ان جادوگرنیوں کو جاتے دیکھا ہے؟

لینکس:۔ نہیں حضور۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

میکبتھ:۔ کیا وہ تمہارے پاس سے نہیں گزریں؟

لینکس:۔ نہیں مطلق نہیں۔

میکبتھ:۔ کاش جس ہوا میں سے وہ گزریں وہاں وبا اپنا گزر کرے اور وہاں ان سب کو غارت کردے جو اُنکی باتوں پر یقین کریں۔ لینکس میں نے ابھی ابھی ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سُنی تھی۔

لینکس:۔ حضور۔ ایک نہیں کئی آدمی خبر لائے ہیں کہ میکڈف انگلستان بھاگ گیا ہے۔

میکبتھ:۔ کیا بھاگ کر انگلستان پہونچا ہے۔

لینکس:۔ حضور واقعہ صحیح ہے۔

میکبتھ:۔ اُس کے فرار ہونے کے قصد پر اُس وقت تک گرفت نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اپنے عمل سے اپنے فرار ہونے کی غایت ثابت نہ کرے۔ اس وقت سے جو خیال پہلے دل میں آئیگا وہی میرا پہلا کام ہوگا۔ اور اپنے قصد کو عمل میں لانے کے لئے خیال کا آنا اور اُس پر عمل کا ہوجانا ایک بات ہوگی۔ میں میکڈف کے قلعہ پر اچانک حملہ کرونگا۔ اُس کی ریاست پر اپنا قبضہ جماؤنگا۔ اُس کی بیوی بچّوں کو تلوار کی دھار سے کاٹ ڈالوں گا اور اُن سب بدنصیبوں کو بھی تہ تیغ کرونگا جو اُس کی نسل سے ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اِسے کسی احمق کی ڈینگ نہ سمجھنا۔ جب تک انہیں غارت نہ کرلونگا دل ٹھنڈا نہ ہوگا۔

دوسرا منظر:۔ مقام فائف۔

لیڈی میکڈف اندر آتی ہے۔ اُسکا کمسن لڑکا ساتھ ہے۔ راس بھی موجود ہے۔

لیڈی میکڈف:۔ اُس نے خطا کیا کی تھی کہ مُلک سے بھاگنا پڑا۔

راس:۔ خاتون آپ صبر کریں۔

لیڈی میکڈف:۔ مگر میکڈف نے تو صبر نہیں کیا۔ اُسکا بھاگنا تو ایک قسم کی دیوانگی سمجھنا چاہیئے۔ گو کسی دغا یا فریب سے ہمارے کان آشنا نہ ہوں۔ لیکن خوف وہ بد بلا ہے کہ بے گناہوں کو بھی دغاباز اور فریبی بنا دیتا ہے۔

راس:۔ آپکو علم نہیں کہ اُسکا فرار ہونا ایک ہوشیاری کی بات ہے۔ خوف اُس کی وجہ نہیں۔

لیڈی میکڈف:۔ واہ یہ بھی کیا عقل کی بات تھی کہ بیوی

بچوں کو تنہا چھوڑکر خود چلا گیا۔ اپنا سارا گھر بار وہیں چھوڑا جہاں سے خود فرار ہوا اُسے ہم سے محبت نہیں اُس کے دل کو وہ لگاؤ ہمارے ساتھ نہیں جو ایک قدرتی بات ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا پرندہ بھی جبکہ اُس کے آشیانے میں بچے ہوتے ہیں جب کوئی قریب آتا ہو تو وہ اُس سے لڑتا ہے۔ یہ محض خوف تھا جس کی وجہ سے وہ بھاگا ہے۔ عقل یا محبت کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔ اِسکا فرار ہونا بالکل عقل و مصلحت کے خلاف تھا۔

راس:- میری نہایت عزیز بہن۔ اپنی طبیعت کو سنبھالے رکھو تمہارا شوہر نہایت عاقل و ہوشیار، موقع و محل کو پہچاننے والا ہے۔ اِس سے زیادہ میں کچھ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ زمانہ بُرا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم نے کیا کیا جو ہم باغی و سرکش سمجھے جاتے ہیں۔ اِس افواہ کا ہمیں ضرور یقین ہے کہ ہماری حالت خوف وبیم کی ہی۔ ہمارا حال تو یہ ہو رہا ہے جیسے سمندر کی پُرشور اور طوفانی موجوں پر کوئی چیز اِدھر کی اُدھر ماری ماری پھرے۔ اِس وقت میں تم سے رُخصت چاہتا ہوں۔ چند روز کے بعد میں پھر یہاں آؤنگا۔ اُس وقت تک جو بُری حالت آجکل ہے یا تو یہ نہ رہے گی یا پھر پہلا سا زمانہ امن و سلامتی کا آجائیگا۔ پیاری بہن خُدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

لیڈی میکدف:- یہ بچہ تو باپ کے ہوتے سوتے بن باپ کا ہو گیا۔

راس:- بہن تمہاری اِن باتوں سے تو مجھے رونا چلا آتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے سامنے رو کر میں اپنے کو کمزور ثابت کروں اور تمہارے دل کو بھی رنج پہونچاؤں۔ لو، میں جاتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

لیڈی میکدف:- (بیٹے سے) بیٹا تیرا باپ تو مر گیا۔ تو کیونکر جیئے گا۔

بیٹا:- اماں اس طرح جیونگا جس طرح چڑیاں درختوں میں جیتی ہیں۔

لیڈی میکدف:- کیا کیڑے مکوڑے کھا کر جیئے گا۔

بیٹا:- جو چڑیوں کو کھانے کو ملتا ہو وہی کھا کر جیونگا۔

لیڈی میکدف:- خدا کرے کہ تجھے خوف نہ کسی جال کا ہو اور نہ پھندے کا۔

بیٹا:- اماں مجھے اِن چیزوں کا ڈر کیوں ہو؟ غریب چڑیوں کو کون پکڑتا ہے۔ اماں تم کہتی تو ہو کہ میرا باپ مر گیا مگر یہ بات نہیں ہے۔

لیڈی میکدف:- بیٹا تیرا باپ تو مر چکا۔ اب تو اپنا باپ بن۔

بیٹا:- میں اپنا باپ بنوں تو کیا آپ اپنی شوہر بنینگی؟

لیڈی میکدف:- بازار میں بیسیوں بکتے ہیں کہیں سے خرید لاؤنگی۔

بیٹا:- تو پھر کیا بیچنے کو اُسے خریدیں گی؟

لیڈی میکدف:- بیٹا۔ تُو تو بڑی دل سے اُتار کر باتیں کرنے لگا ہے۔ اتنی سمجھ تیرے لئے بہت ہی۔

بیٹا:- کیوں اماں۔ کیا میرا باپ بادشاہ سے باغی ہو گیا ہے؟

لیڈی میکدف:- ہاں یہ بالکل سچ ہے۔

بیٹا:- اماں۔ باغی کسکو کہتے ہیں؟

لیڈی میکدف:- بیٹا۔ جو قسم کھا کر کسی بات کا وعدہ کرے اور پھر وعدہ خلافی کرے۔

بیٹا:- تو کیا جتنے باغی ہوتے ہیں وہ یہی کرتے ہیں؟

لیڈی میکدف:- کوئی جو ایسا کرے وہ باغی گنا جاتا ہی۔ اور بغاوت کی سزا پھانسی ہوتی ہے۔

بیٹا:- تو کیا جتنے آدمی قسمیں کھا کر وعدہ کرتے ہیں اور پھر وعدہ خلافی کرتے ہیں ان سبکو پھانسی دی جاتی ہے؟
لیڈی میکڈف:- ہاں سب کو۔
بیٹا:- انہیں پھانسی کون دیتا ہے؟
لیڈی میکڈف:- وہ لوگ جو ایماندار ہوتے ہیں۔ سچے ہوتے ہیں۔
بیٹا:- تو کیا قسمیں کھا کر وعدہ کرنے والے، اور پھر وعدہ خلافی کرنے والے سب بیوقوف ہوتے ہیں۔ کیونکہ جھوٹوں کی تو وہ کثرت ہے کہ وہ سچوں کو مار کر بیڑا کر دیں یا پھانسی پر چڑھا دیں۔
لیڈی میکڈف:- بچے خدا تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ باپ نہ ہوگا تو خود اپنا باپ بن کر تو کیا کر لیگا۔
بیٹا:- اگر وہ مرگیا ہے تو تم اُس کے لئے روئیگی اور اگر نہ روئیں تو پھر میرے لئے ایک نیا باپ جلد موجود ہو جائیگا۔
لیڈی میکڈف:- اے چھوٹی سی جان، تو کیسی باتیں کرتا ہے۔

(ایک قاصد آتا ہے)

قاصد:- معزز خاتون۔ خدا آپکو اپنی امان میں رکھے۔ آپ مجھے نہیں جانتیں مگر میں حضور کے جاہ و منصب سے واقف ہوں۔ اِس میں مطلق شبہ نہیں کہ آپکو عنقریب کوئی سخت خطرہ پیش آنے والا ہے۔ اگر آپ ایک سیدھے سادے آدمی کا مشورہ مانیں تو کوئی صورت ایسی پیدا کیجئے کہ آپ یہاں کسی کو نہ ملیں اور آپ اپنے بچوں سمیت یہاں سے چلی جائیں۔ آپ یہ تصور نہ کریں کہ محض ڈرانے کے لئے میں اپنے تئیں ایک وحشی نالائق ثابت کرنا چاہتا ہوں نہیں جو ظلم و ستم آپ پر ٹوٹنے والا ہے وہ آپکے بہت قریب پہونچ گیا ہے۔ خدا آپکو اپنی پناہ میں رکھے۔ میں زیادہ نہیں ٹھیر سکتا۔　　(چلا جاتا ہے)

لیڈی میکڈف:- بھاگ کر کہاں جاؤں۔ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے مگر اب خیال آتا ہے کہ میں اُس خاکدانِ ہستی میں ہوں جہاں دوسروں کو نقصان پہونچانا قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے اور بھلائی کرنا بسا اوقات خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ایک عورت کی طرح میرا اپنی حمایت میں یہ کہنا کہ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے ایک افسوسناک بات ہے۔

(قاتل اندر آتے ہیں)

یہ کون لوگ ہیں؟
پہلا قاتل:- تمہارا شوہر کہاں ہے؟
لیڈی میکڈف:- خدا سے اُمید ہے کہ وہ ایسی جگہ نہ ہوگا جہاں تم جیسے خبیث اور ناپاک آدمی اُسے پا جائیں۔
پہلا قاتل:- وہ باغی ہے۔
بیٹا:- اے کن کٹے بدمعاش تو جھوٹ بولتا ہے۔
پہلا قاتل:- ارے تخم (اتنا کہہ کر بچے کے چھری مارتا ہے) جو ابھی دغا اور فریب کا پورا پودا بھی نہیں بنا ہے۔
بیٹا:- اماں اس نے مجھے مار ڈالا۔ (مر جاتا ہے)

(لیڈی میکڈف چیختی ہوئی کہ اسے مار ڈالا، خون ہوگیا، بھاگتی ہے۔ قاتل اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں)

تیسرا منظر:- انگلستان۔ شاہی قصر کے سامنے میلکم اور میکڈف آتے ہیں۔

میلکم:- آؤ کہیں سایہ میں بیٹھکر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں شاید رونے سے کچھ دل ہلکا ہو جائے۔
میکڈف:- نہیں، ہمیں اپنے غارت شدہ مُلک کی لاش پر بہادروں کی طرح دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ کوئی صبح ایسی نہیں ہوتی کہ رانڈوں کی چیخیں، یتیموں کی آہ و زاری

ہر طرح کے آزار و آلام کی صدائیں زمین سے اٹھکر آسمان پر نہ گونجتی ہوں کہ ہمارے ملک والے کسی طرح جاگیں، اور آسمان پر بھی وہی آہ و فغاں پیدا ہو جو زمین پر ہے۔

میلکم:۔ جن باتوں کا یقین ہوتا ہے اُن پر رونا آتا ہے میں کیا کیا سُنوں اور کس کس بات کا یقین کروں۔ میں تو کسی مرض کی دوا نہیں رہا، اور اگر وقت مساعد ہوا تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ جو کچھ آپ نے بیان کیا ممکن ہے کہ وہ سب درست ہو۔ یہ ظالم وسفاک جس کا نام لیتے زبان پر چھالے پڑتے ہیں، جو پہلے کبھی ایماندار اور سچا آدمی سمجھا جاتا تھا اور جسے آپ بھی پسند کرتے تھے ابھی تک اُس نے آپکو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ میں نوجوان ناتجربہ کار ہوں۔ ممکن ہے اسی وجہ سے آپ فائدے میں رہیں اور یہ بات آپکی ہوشیاری اور دانشمندی پر دلیل ہوگی کہ ایک معصوم بھیڑ کو ایک خبیث دیو پر جبکہ وہ حالتِ قہر و غضب میں ہو آپ قربانی کر ڈالیں۔

میکڈف:۔ میں مکّار یا فریب دینے والا آدمی نہیں ہوں۔

میلکم:۔ مگر میکبتھ سے فرمان حاصل کرکے تو ایک نیک اور اچھی طبیعت بھی بدل سکتی ہے۔ مجھے معاف فرمائیگا۔ جو کچھ آپ واقعی ہیں میں آپکو ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ فرشتوں کی شکلیں بڑی نورانی اور تابندہ ہوتی ہیں۔ مگر ان میں بھی جو بڑی چمکتی اور پاکیزہ صورتیں رکھتے تھے عرش سے نیچے جہنم میں گرائے گئے تھے۔ سچ ہے، ہر چیز اپنا ظاہر اچھا دکھا کر نیکی اور معصومیت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

میکڈف:۔ افسوس، میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

میلکم:۔ غالباً آپکی اُمیدیں بھی وہیں غارت ہوئی ہیں جہاں میرے شکوک خاک میں ملے پڑے ہیں۔ یہ تو فرمائیے کہ ایسے پُر آشوب زمانے میں آپ اپنے بیوی بچوں کو تنہا چھوڑ کر، اور اُن پیاروں سے جو محبت و اُلفت کی گرہ میں بندھے تھے، بغیر ملے کیسے چلے آئے۔ آپ سے التجا ہے کہ میرے ان شکوک کو آپ ہرگز اپنی توہین خیال نہ فرمائیں اِن سے صرف اپنی ذاتی حفاظت منظور ہے۔ میرا خیال جیسا کچھ بھی ہو مگر جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسمیں کلام نہیں۔

میکڈف:۔ اے میرے مفلوک و مظلوم ملک زخمی پڑا رہ۔ اور اپنے زخموں سے خون بہنے دے اور جو کچھ جور و جفا تجھ پر ہو اُس کی بنیادیں اور گہری کرے تاکہ کوئی بھلائی تیری خرابیوں کی ترقی میں مزاحم نہ ہو سکے۔ جسقدر ظلم و ستم تجھ پر ٹوٹیں انہیں سہے جا۔ میکبتھ کا استحقاقِ حکمرانی اور پختہ ہو گیا۔ آقا خدا حافظ۔ بندہ رخصت چاہتا ہے۔ میں وہ خبیث مکار نہیں ہوں جیسا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ تمام ملک اُس ظالم شیطان کے پنجۂ غضب میں ہے۔ اور اسپر طرّہ یہ ہے کہ بلادِ مشرق بھی اُسکی مدد پر تلے ہیں۔

میلکم:۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا وہ آپ سے خائف یا بدگمان ہو کر نہیں کہا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اس ظالم وجفاکار کے جُوئے کے نیچے دب کر ملک مر رہا ہے۔ اُس کے لبوں پر آہ و فغاں اور اُس کے زخموں سے خون جاری ہے۔ اور اُس کے اُن زخموں کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اُن پر اور چرکے دیئے جاتے ہیں۔ یہ کل باتیں مجھے معلوم ہیں۔ اور ممکن ہے کہ میری حق رسانی کے لئے کوئی ہاتھ اُٹھے۔ اِس ملک کے لائق بادشاہ نے مجھے کئی ہزار فوج دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن باوجود اسکے جب میکبتھ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہوگا اور میری تلوار اُسکا سر تن سے جدا کرتی ہوگی اُس وقت بھی

ہمارے مُفلس اور آفت رسیدہ مُلک کو اپنی آفات و مصائب کا سامنا ہوگا جو سابق میں برپا رہے ہیں۔ اُس کا بادشاہ جو کوئی بھی وہ ہوگا۔ اِس کے حق میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتا رہے گا۔

میکڈف:۔ وہ بادشاہ کون ہوگا؟

میلکم:۔ اگر مُجھی کو سمجھیئے تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کیسی کیسی سخت بُرائیاں مُوجود ہیں۔ اور جب وہ کُھلیں گی تو آپ میرے مقابلے سیاہ رُو میکبتھ کو بھی برف سے زیادہ اُجلا اور پاکیزہ کہیں گے۔ اور میرے عیوب کے مقابلے میں اُسے ایک بّرہ مسکین کی طرح معصوم و بے گناہ سمجھنے لگیں گے۔

میکڈف:۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ شیاطینِ جہنّم میں بھی کوئی شیطان میکبتھ سے بُرائیوں میں بڑھا ہوا نہ نکلے گا۔

میلکم:۔ میں جانتا ہوں کہ میکبتھ خُون کا پیاسا عیش پرست، حریص، جُھوٹا، مکّار اور دغا باز ہے۔ مغلوب الغضب ہے، کینہ توز ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جو اُس نے نہ کیا ہو، لیکن مجھ میں ہوائے نفس اور شہوانیت اِس شدّت سے ہے کہ اُس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر بادشاہ ہونگی صورت میں کسی نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو پھر میری زیادتی اور ظُلم کی کوئی حد نہ رہے گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے شخص کی جگہ میکبتھ ہی صاحبِ تخت و تاج رہے۔

میکڈف:۔ جس شخص میں شہوانیت اور لذّت پرستی کی شدّت ہو وہ فطرت میں ایک قسم کا ظلم ہوتا ہے۔ یہ وہ بلا ہے جس کی وجہ سے بہت سے تخت نشینوں کو اپنے تخت خالی کرنے پڑے ہیں اور اکثر تاجداروں پر زوال آیا ہے۔ مگر باوجود اسکے جو چیز آپکی ہے اس کے لینے کے لئے آپ دوڑیں۔ لذائذِ شہوانی سے آپ تخلیہ میں لُطف اندوز ہو سکتے ہیں، یا ظاہر کر سکتے ہیں کہ اِن چیزوں سے آپکی طبیعت سرد ہے۔ یا آپ یقین دلا سکتے ہیں کہ ان چیزوں میں آپ اعتدال پسند کرتے ہیں۔

میلکم:۔ علاوہ اِس کے میری خبیث طبیعت میں حرصِ مال و طمعِ زر اِس شدّت سے ہے کہ اگر مجھے بادشاہی ملی تو میں اعیانِ مُلک کو انکی زمینوں اور املاک پر دستِ تصرّف دراز کرنے کے لئے قتل کرا دونگا۔ کسی کے مال پر نظر رہے گی، کسی کی جایئداد پر، اور جسقدر زیادہ مال لوگوں کا ضبط کرونگا اتنی ہی اشتہا اس بات کی تیز ہوتی جائے گی۔ اپنے خیر خواہوں اور جاں نثاروں کے ساتھ طرح طرح کے جھگڑے اور نزاع پیدا کرکے انکی دولت و مال پر تصرّف کی غرض سے اُنہیں تباہ و برباد کرتا رہونگا۔

میکڈف:۔ جوانی کے ولولے موسمِ بہار کی طرح دیرپا نہیں ہوتے۔ طمعِ زر اور حرصِ دولت البتہ طبیعت میں ہمیشہ کو جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ یہی زر و دولت کی طمع اکثر بادشاہوں کی مَوت کا سبب ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے مُلک میں ہر چیز کی وہ کثرت ہے کہ جتنا اور جیسا آپ حاصل کرنا چاہینگے آپکو ملے گا۔ آپکی طبیعت میں بادشاہی کے وہ قُدرتی جوہر موجود ہیں کہ یہ کُل باتیں جو آپ اپنی نسبت فرما رہے ہیں گوارا کر لی جائیں گی۔

میلکم:۔ لیکن مجھ میں بادشاہ بننے کی قابلیتیں نہیں ہیں۔ مثلاً انصاف، حق پسندی، اعتدال، مستقل مزاجی، فیاضی، ثابت قدمی، ترحّم، انکسار، التفات، درگزر، صبر، ہمّت، اِن خوبیوں کا مُجھ میں پتہ نہیں، بلکہ ہر گُناہ ہر مذموم فعل

کی مختلف شاخوں کو مختلف طریقوں سے انجام دینے میں میں بڑا مشتاق ہوں۔ اگر کہیں میں صاحب حکومت ہو گیا تو یگانگی و یکجہتی کی شراب شیریں کو جہنم میں پھینک کر دنیا کا حفظ و امن میں ایک شور بے ہنگام پیدا کر دونگا۔ اور دنیا سے موافقت و اتحاد قطعاً مفقود ہو جائیں گے۔

میکڈف :۔ اے بدنصیب وطن، بدنصیب ملک۔

میلکم :۔ اگر مجھ جیسا شخص جیسے کہ میں نے اپنا حال بیان کیا ہے بادشاہی کرنے کے قابل ہے کی سمجھ میں آتا ہو تو فرمایئے کہ میں تو وہی ہوں جیسا کہ میں نے بیان کیا۔

میکڈف :۔ ایسا شخص حکومت کرنے کے قابل تو کجا وہ تو زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ افسوس، اے مصیبت زدہ قوم جس پر ایک غیر مستحق شخص بادشاہ و سابق کو قتل کر کے مسلط ہو گیا ہو گیا۔ تجھے کبھی اچھے دن دیکھنے نصیب ہونگے۔ جس حالت میں کہ تخت و تاج کا صحیح وارث خود اپنی زبان سے اپنے تئیں نالائق اور مجرم قرار دے رہا ہو اور اپنے خاندان اور اپنی نسل کو داغ لگا رہا ہے۔ آپکا باپ بادشاہوں میں ولی تھا۔ اور ملکہ آپکی ماں جس کے بطن سے آپ پیدا ہوئے ہیں کوئی دن زندگی کا ایسا نہ تھا کہ خدا کی جناب میں سربسجود نہ رہی ہوں۔ گویا زندگی میں ہر آن یہی سمجھتی رہیں کہ موت نزدیک ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ جو عیب آپنے اپنی طبیعت کے بیان کئے ہیں وہ مجھے وطن سے بے وطن کرتے ہیں۔ اور اس قلب مضطر میں جس قدر توقعات پیدا ہوئی تھیں وہ سب خاک میں مل جاتی ہیں۔

میلکم :۔ تمہارے اس شریفانہ سچائی اور صفائی کے جذبے نے میرے دل کے تمام تاریک شکوک رفع کر دیئے۔ اور میرے خیالات تمہاری غیرت اور صدق طبیعت سے متفق ہو گئے۔ اس زمانے میں میکبتھ نے بہت سی تدبیریں کیں کہ مجھے کسی طرح اپنے دام میں پھنسا لے۔ پس عقل نے ہوشیار کیا کہ کسی کی بات کا جلد یقین نہ کروں، لیکن اب خدا جو ہم سب کے سر پر ہے جو کچھ مجھ میں اور تم میں پیش آئیگا اُس کا نگراں رہیگا۔ اور اب جو کچھ ہدایت کرو گے اُسپر چلنا اپنا فرض سمجھونگا۔ میں نے اپنی جتنی برائیاں بیان کی ہیں وہ غلط تھیں اور جو داغ دھبے میں نے اپنے چلن اور طریقے پر لگائے تھے انہیں واپس لیتا ہوں۔ یہ جتنی باتیں میں نے اپنی نسبت کہی تھیں وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ نہ مجھے ابھی تک کسی سے عشق ہوا ہے اور نہ میں نے کبھی اپنے عہد کو توڑا ہے۔ جو چیز میری تھی اس کی طمع بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی۔ آج تک کبھی اپنے قول سے پھرا نہیں۔ میں تو ایک شیطان کو بھی دوسرے شیطان کے حوالے دھوکا دیکر نہیں کر سکتا۔ اور نہ ایسے کسی کام پر خوش ہو سکتا ہوں۔ پہلا جھوٹ جو آج تک کبھی بولا تھا وہ یہی اپنی نسبت تھا۔ جو کچھ میں حقیقت میں ہوں وہ تمہارے اور اپنے مصیبت زدہ ملک کی بہتری چاہنے کے لئے ہوں۔ اور اسی ملک میں تمہارے آنے سے کچھ پہلے سیورڈ دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہونے کو تیار ہو چکا ہے۔ اب ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں اور خدا سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہمیں فتح بھی اسی طرح حاصل ہو جیسے کہ ہمارا نزاع حق بجانب ہے۔ تم خاموش کیوں ہو؟

میکڈف :۔ ایسی مبارک اور نامبارک باتوں نے ایکدم سے پیش ہو کر مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے۔ کیسے ان متضاد باتوں میں مصالحت پیدا کروں۔

(ایک طبیب آتا ہے)

میلکم :۔ اچھا اب پھر باتیں ہونگی۔ طبیب کیا بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں؟

طبیب :۔ جی ہاں۔ بہت سے سخت مریض اُنکے انتظار میں

بڑی دیر سے کھڑے ہیں۔ علاج کرنا طبیب کا کام ہوتا ہے لیکن ہمارے بادشاہ کے ہاتھ میں خدا نے کچھ ایسی شفا دے رکھی ہے کہ جہاں انھوں نے ہاتھ لگایا مریض فوراً تندرست ہوگیا۔

میلکم:۔ طبیب میں آپکا شکر گذار ہوا۔ (طبیب چلا جاتا ہے)

میکدف:۔ وہ کونسا مرض ہے جسکا بادشاہ علاج کرتا ہے؟

میلکم:۔ کنٹھ مالا ایک سخت بیماری ہے۔ بادشاہ کو اسکے علاج میں قدرت بدرجہ کمال حاصل ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں میں نے اکثر بادشاہ کو اس بیماری سے مریضوں کو اچھا کرتے دیکھا ہے۔ ہر مریض کے لئے پہلے خدا سے دعا مانگتا ہے۔ وہ خود بڑا خدا رسیدہ ہے۔ دور دور سے لوگ سوجے پھوڑے گردن کے گرد زخموں میں لدے ایسے آتے ہیں جنہیں دیکھا تک نہیں جاتا۔ اور بڑے بڑے جراح بھی جن کے علاج سے عاجز ہوتے ہیں بادشاہ کے پاس آتے ہی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مریض کی گردن میں وہ ایک سونے کی مہر لٹکا دیتا ہے اور لٹکاتے وقت خدا سے دعا مانگتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہی علاج اُس نے آنے والے بادشاہوں کو بھی بتا دیا ہے اور آیندہ کے حالات بتانے کی قدرت بھی خدا کی طرف سے اُسے ملی تھی۔ علاوہ اس کے اور طرح طرح کی برکتیں اور حسنات اس کے تخت کے گرد پیش موجود رہتے تھے جن سے بادشاہ کی نیکیاں ظاہر ہوتی تھیں۔

میکدف:۔ دیکھئے یہ کون آرہا ہے؟

میلکم:۔ آدمی تو ہمارا ہموطن معلوم ہوتا ہے مگر میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

(راس آتا ہے)

میکدف:۔ میرے شریف بھائی آؤ۔ تم نیک قدم ہو۔

میلکم:۔ اچھا۔ اب میں نے انہیں پہچانا۔ خدایا وہ چیزیں دور کردے جو ہموطن کو ہموطن سے اجنبی رکھتی ہے۔

راس:۔ آمین۔

میکدف:۔ کہو ہمارا مُلک وہیں ہے جہاں تھا؟

راس:۔ افسوس صد افسوس۔ اب تو وہ بدنصیب مُلک خود اپنے تیئں پہچاننے سے ڈرتا ہے۔ اب ہم اُسے اپنی ماں نہیں کہہ سکتے۔ اگر اپنی قبر کہیں تو زیبا ہے۔ جہاں ٹھہر کس کا یہ حال ہو کہ کچھ اپنی خبر تک نہ ہو، جہاں کوئی صورت بھی ایسی نہیں جس کے چہرے پر ہنسی ہو، جہاں فضا میں بجز نالہ وزاری یا درد و اذیت کی چیخوں کے دوسری آواز نہ سُنائی دیتی ہو اور سوائے اِن چیزوں کے دوسری چیز نہو، اور اب ان کی بھی کسی کو پروا نہ رہی ہو، اور حال یہ ہوگیا ہو کہ شدید رنج والم میں بھی زخموں میں راحت سبکو محسوس ہونے لگی ہو۔ مُردہ دفن ہوتے وقت گرجا کا گھنٹہ جب بجتا ہے تو کوئی اتنا پوچھنے والا نہیں ہوتا کہ کون مرا ہے۔ اور شریفوں کی زندگی کا خاتمہ اُس وقت ہوتا ہے کہ اُن کی ٹوپیوں کے پھول مرنا تو کیسا مُرجھاتے تک نہیں۔ تو پھر ایسے مُلک کو اپنی قبر نہ کہیں تو کیا کہیں؟

میکدف:۔ اے عزیز، جو کچھ تم کہتے ہو سب سچ ہے۔

میلکم:۔ کوئی غمگین خبر جو حال میں پیش آئی ہو وہ کہو۔

راس:۔ حالت تو یہ ہے کہ واقعہ کے ایک گھنٹہ بعد بھی اگر کوئی بُری خبر سُنائی جاتی ہے تو سُننے والا کہتا ہے کہ کیسی پُرانی خبر سُناتے ہو۔ وہاں تو منٹ منٹ پر سخت دردانگیز حادثے پیش آتے رہتے ہیں۔

میکدف:۔ میری بیوی کیسی ہے؟

راس:۔ اچھی ہے۔

میکدف:۔ اور میرے بچے؟

راس :- وہ بھی سب اچھے ہیں۔

میکدف :- ظالم میکبتھ نے اب تک اُنکے امن و امان کو غارت نہیں کیا ؟

راس :- جب وہاں سے چلا ہوں تو سب صحیح سلامت تھے۔

میکدف :- دیکھو صحیح بات کہتے ہوتے نہ ہچکچاؤ۔

راس :- جب میں یہاں وہ خبریں لیکر آرہا تھا جو مجھ پر گراں گزر رہی تھیں تو اُس وقت افواہ سُنی تھی کہ بڑے بڑے لائق آدمیوں نے میکبتھ سے بغاوت کر دی ہے۔ اس خبر کا یقین اس وجہ سے اور ہوا کہ میں نے اس ظالم بادشاہ کی فوجوں کو بغاوت کو مٹانے کے لئے کوچ کرتے دیکھا۔ میلکم، اب وقت مدد کرنے کا ہے۔ آپ کی ایک نگاہ سے ہزاروں سپاہ جمع ہو جائے گی عورتیں تک آجکل کی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے سپاہی بن کر لڑنے کو تیار ہو جائینگی۔

میلکم :- ہم آپکے چین و آرام کیلئے وہیں جا رہے ہیں۔ مہربان بادشاہِ انگلستان نے ہمیں سیورڈ اور دس ہزار فوج مستعار دی ہے۔ سیورڈ سے زیادہ پُرانا اور اعلیٰ درجے کا سپاہی عیسوی دُنیا میں نہیں ہے۔

راس :- کاش ایسا ہوتا کہ میں اس اچھی خبر کے بدلے میں کوئی خوشخبری سُناتا۔ مگر جو وحشتناک خبر میں سُنانے لایا ہوں وہ تو ایسی ہے کہ کسی صحرائے لق ودق میں اُس کا سُنانا بہتر ہوتا کسی انسان کے کان تک وہ نہ پہونچے۔

میکدف :- کیا وہ خبر کسی ملکی معاملے سے متعلق ہے یا کسی شخص خاص کے درد و الم سے ؟

راس :- ہمارے ملک میں تو کوئی نیک شخص ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی تکلیف، کوئی نہ کوئی آزار نہ پہونچا ہو۔

میکدف :- اگر وہ خبر مجھ سے متعلق ہے تو مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ فوراً کہو کہ وہ کیا ہے۔

راس :- میری زبان سے اپنے کانوں کو متنفر نہ کرو جو کچھ میں کہونگا وہ ایسی درد انگیز آواز ہوگی جو تمہارے کانوں نے کبھی نہ سُنی ہوگی۔

میکدف :- اچھا میں سمجھ گیا۔

راس :- تمہارے محل پر اچانک حملہ کیا گیا اور بڑی بے رحمی سے تمہارے بیوی بچوں کو قتل کر دیا گیا۔ جس طریقے سے اُنہیں ہلاک کیا گیا اور جس طرح ان معصوم غزالوں کو ذبح کیا اُس کا بیان کرنا تمہاری موت کا بُلانا ہے۔

میلکم :- خُدا ہم پر رحم کرے۔ میکدف کیوں اپنی ٹوپی کھینچکر آنکھوں پر لاتے ہو؟ رنج میں چُپ نہ رہو۔ مُنہ سے بولو، کیونکہ بات نہ کرنے سے رنج اندر ہی اندر دل سے کہتا ہے کہ ٹوٹ جا۔

میکدف :- کیا میرے بچے بھی قتل کر دیئے گئے ؟

راس :- ہاں، بیوی بچے، نوکر چاکر، جو کوئی بھی ملا اُسے زندہ نہیں چھوڑا۔

میکدف :- افسوس میں وہاں نہ تھا۔ میری بیوی بھی قتل کر دی گئی ؟

راس :- ہاں۔

میلکم :- میکدف صبر کرو۔ ہمیں انتقام کی تدبیریں سوچنے دو تاکہ تسکین اور اس درد کا کوئی درماں ہو۔

میکدف :- میکبتھ بچے نہیں رکھتا۔ کیا میرے سب بچے مار ڈالے گئے۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ وہ سب قتل ہو گئے۔ اے جہنم کے گِدھ، تو نے سبکو ایک ہی جھپٹے میں ختم کر دیا۔ میرے پیارے بچوں اور اُنکی ماں کو بھی۔

میلکم :- میکدف مرد بن کر بات کرو۔

میکڈف:- بہتر ہے۔ مگر ایک مرد ہی کی طرح میں اس دردناک خبر سے متاثر بھی رہونگا۔ اس وقت تو یہی یاد آرہا ہے کہ اُنسے عزیز تر دوسری کوئی چیز نہ رکھتا تھا۔ کیا خدا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر بھی اُنکی جان نہ بچائی۔ اے گنہگار میکڈف اُن کی ہلاکت کا باعث تو ہوا۔ اُن کا کچھ قصور نہ تھا۔ جو کچھ قصور تھا وہ میرا تھا۔ خدا اُن پر اپنی رحمت کرے۔

میلکم:- اس رنج فرسا خبر کو اپنی تلوار کیلئے سان رکھنے کا پتھر بناؤ۔ اور اپنے اس رنج کو غصّے اور قہر میں تبدیل کرو۔ اس غم کو سوچ سوچکر دل میں جذب نہ ہونے دو۔

میکڈف:- نہیں۔ عورتوں کی طرح میں بھی اس صدمے پر آنکھوں سے آنسو بہاسکتا ہوں اور اپنی زبان سے بہت کچھ نوحہ کرسکتا ہوں۔ پر اے خدائے رحیم وکریم اس انتظار کے وقت کو کم کردے۔ اور اُس ظالم شیطان سے مجھے دوچار کرکے اُسے میری تلوار کی زد میں لے آ۔ اگر میرے ہاتھ سے وہ بچ جائے تو پھر خدا اُس کے گناہ بھی معاف کردے۔

میلکم:- ہاں، یہ بات تم نے مردانگی کی کہی۔ آؤ بادشاہ کے پاس چلیں۔ فوجیں کوچ کرنے کو تیار ہیں۔ صرف بادشاہ سے رخصت ہونا باقی ہے۔ میکبتھ کی حالت اب یہ ہے کہ ہم اُسے ہلاکر زیر و زبر کردیں۔ آسمان پر فرشتے بھی ہمارے لئے ہتیار باندھ رہے ہیں۔ میکڈف ہمت نہ ہارو۔ لمبی راتیں بھی جب تڑکا ہوتا ہے تو انسان کے غمزدہ دل کو خوش کردیتی ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جزوِ خامس

پہلا منظر:- ڈنسی نین محل میں عقب کا ایک کمرہ۔ ایک طبیب اور اُسکے ہمراہ ایک شریف زادی خواص آتی ہے۔

طبیب:- میں نے دو رات برابر آپکے ساتھ جاگ کر مریضہ کی کیفیت دیکھی ہے۔ مگر آپ نے جو حالت بیان کی تھی وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ فرمایئے کہ آپ نے مریضہ کو آخری مرتبہ کب چلتے پھرتے دیکھا تھا؟

شریف زادی:- اُس زمانے میں جبکہ بادشاہ سلامت میدانِ جنگ کو تشریف لے گئے تھے۔ جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ ملکہ سلامت اپنی پلنگڑی پر سے اٹھی ہیں۔ شب خوابی کی عبا جلد گلے میں ڈال المار ی کے پاس پہونچتی ہیں۔ الماری کھول کر اُسمیں سے کاغذ نکالا۔ کاغذ کو موڑ کر اُس پر کچھ لکھا۔ پھر پڑھا۔ پھر اُسے بند کرکے لفافے پر مُہر لگائی۔ اور جب یہ سب کچھ ہولیا تو پھر فوراً اپنی پلنگڑی پر جا لیٹیں۔ مگر اس کُل زمانے میں وہ غافل سورہی تھیں۔

طبیب:- مگر یہ حالت تو قلب میں سخت اختلال و اضطراب کی ہوگی کہ حالتِ خواب میں جو راحت میسّر ہوتی ہے وہ بھی نصیب ہے اور عالمِ بیداری کے کام کاج بھی جاری ہیں۔ کیا آپ نے اس حالتِ خواب میں علاوہ چلنے پھرنے کام کاج کرنے کے کچھ باتیں کرتے بھی سُنا تھا؟

شریف زادی:- جناب والا جو کچھ کہتے انہیں سُنا وہ ملکہ سلامت کی عدم موجودگی میں کسی کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔

طبیب:- لیکن آپ مجھے تو بتا سکتی ہیں- اور مناسب بھی یہی ہو کہ آپ مجھ سے جو کچھ سُنا ہو وہ کہہ دیں-

شریف زادی:- وہ باتیں نہ میں آپکو اور نہ کسی اور سے کہہ سکتی ہوں- کیونکہ جو کچھ میں کہونگی اُسپر گواہی یا شہادت دینے والا کوئی نہ ہوگا- دیکھئے وہ ملکہ سلامت خود تشریف لا رہی ہیں-

(لیڈی میکبتھ ہاتھ میں شمع لئے آتی ہے)

بس یہی وضع جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ہمیشہ رہتی ہے- مگر وہ غافل سو رہی ہیں- اُدھر چھُپ کر کھڑے ہو جائیے اور غور سے دیکھتے رہیئے-

طبیب:- یہ جلتی ہوئی شمع انہیں کیسے مل گئی-

شریف زادی:- روشنی ہر وقت پاس رکھی جاتی ہے- یہی حکم ہے-

طبیب:- دیکھئے تو آنکھیں کھُلی ہیں-

شریف زادی:- یہ بالکل درست ہے- لیکن وہ دیکھتی کچھ نہیں-

طبیب:- یہ اس وقت کیا کر رہی ہیں- دیکھئے تو اپنے ہاتھوں کو کس طرح بار بار ملتی ہیں-

شریف زادی:- یہ تو کچھ عادت سی ہو گئی ہے- معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ دھو رہی ہیں- میں نے دیکھا ہے کہ پاؤ پاؤ گھنٹے تک برابر یہی کرتی رہتی ہیں-

لیڈی میکبتھ:- ابھی یہ داغ موجود ہے-

طبیب:- سنو کچھ کہہ رہی ہیں- بہتر ہے کہ وہ جو کچھ کہیں اُسے لکھ لوں- تاکہ آئندہ حافظے کو اس سے پوری مدد ملے-

لیڈی میکبتھ:- ارے کمبخت داغ تو چھوٹتا کیوں نہیں ہٹ جا دفعہ ہو- ایک، دو- اب تو اُس بات کا وقت آ گیا- دوزخ، تجھ سے تو دم گھٹا جاتا ہے- آقا، شرم و غیرت کیا ہوئی؟ سپاہی ہو کر ڈرتے ہو- ڈرنے کا کیا موقع ہے- کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کس نے کیا جبکہ کوئی ہمارے اختیارات پر معترض نہیں ہو سکتا- یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس بُڈھے میں اتنا خون ہوگا-

طبیب:- سُنتی ہو کیا فرما رہی ہیں-

لیڈی میکبتھ:- امیر فائف کی ایک بیوی بھی تو تھی- وہ کہاں گئی- ارے کیا ہاتھوں کے یہ داغ دھبے کبھی نہ چھوٹینگے؟ جانے دیجئے آقا- ایسا خیال نہ کیجئے- آپکے اس طرح چونک چونک پڑنے ہی نے تو یہ ساری خرابی پیدا کی ہے-

طبیب:- جاؤ بھی- تمہیں تو وہ سب حال معلوم ہے جو معلوم نہ ہونا چاہیئے تھا- مجھے تو ان کل باتوں کا یقین ہے- لیکن جو علم اُسے ہے وہ خدا ہی کو معلوم ہے-

لیڈی میکبتھ:- سونگھو تو- ان داغوں میں سے تو خون کی بُو ابھی تک آ رہی ہے اور ایسی سخت ہے کہ عرب کے تمام عطریات بھی اُسے خوشبو نہیں بنا سکتے- ہائے ہائے-

طبیب:- دیکھو تو اس آہ میں کیسا درد ہے- معلوم ہوتا ہے کہ دل پر کوئی بڑا بوجھ ہے-

شریف زادی:- میں تو کبھی ایسا دل سینے میں رکھنا پسند نہ کرونگی جس سے جان، عزت و حرمت سب ہی کو آزار پہونچے-

طبیب:- ہاں ہاں، بالکل درست کہتی ہو-

شریف زادی:- خدا ہی ہے کہ یہ مرض دور ہو-

طبیب:- اس مرض کا علاج میرے قابو کی بات نہیں- ایسے مریض میں نے دیکھے ہیں جو حالت خواب میں چلتے پھرتے تھے- مگر جب موت آئی تو اپنے بستر پر سکون اور خاموشی کی حالت میں مرے-

لیڈی میکبتھ:- ہاتھ دھولو۔ شب خوابی کی عبا پہنو۔ اتنے زرد نہ معلوم ہو۔ پھر یہی کہتی ہوں کہ بینکو دفن ہوچکا ہے۔ وہ قبر سے باہر نہیں نکل سکتا۔

طبیب:- ظاہر ہے۔

لیڈی میکبتھ:- چلو سو رہیں۔ دروازہ کون کھٹ کھٹا رہا ہے؟ آؤ آؤ۔ ہاتھ میں ہاتھ دو۔ جو کچھ ہوا وہ اَن ہوا نہیں ہوسکتا۔ چلو سو رہیں۔ سو رہیں۔ (چلی جاتی ہے)

طبیب:- کیا یہ اب اپنے خوابگاہ میں جاکر سو رہینگی؟

شریف زادی:- ہاں فوراً۔

طبیب:- باہر بڑی بڑی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ انسان جب اپنی فطرت کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے بعد بھی وہ خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو فطرت کے خلاف ہوتی ہیں طبیعتیں جو گناہوں میں آلودہ ہوچکی ہیں وہ اپنے دل کا پوشیدہ حال اُن بے جان اور بہرے تکیوں سے بھی کہتی ہیں جو سر کے نیچے ہوتے ہیں۔ ملکہ سلامت کو طبیب کی اتنی ضرورت نہیں ہے جس قدر کہ کسی روحانی ہادی و مُصلح کی وہ محتاج معلوم ہوتی ہیں۔ اے خدا۔ تو ہم سب کے گناہوں کو معاف کر۔ ملکہ کی خبر رکھو۔ اسکی تکلیفوں کو دور کرنے کی کوشش میں رہو۔ اور برابر اُس پر نظر رکھو۔ اچھا شب بخیر۔ میں جاتا ہوں۔ ملکہ کا حال دیکھکر میرا دل ایسا پریشان اور میری نظر ایسی حیرت زدہ ہوئی کہ خیال سب کچھ کرسکتا ہوں مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شریف زادی:- اے نیک طبیب میرا اسلام بھی قبول ہو۔

(چلی جاتی ہے)

دوسرا منظر:- ڈنسی نین کے قریب ایک موقع۔

منٹیتھ، کائیتھ نس، اینگس، لینکس، اور سپاہی دکھائی دیتے ہیں۔ طبل و علم نظر آتے ہیں۔

منٹیتھ:- انگریزی فوجیں قریب آگئی ہیں اور وہ سب میلکم اور اُس کے نانا سیورڈ اور میکڈف کی سرکردگی میں ہیں۔ اور ان سب کے دلوں میں آتش انتقام مشتعل ہے اور انتقام کی وجہ بھی ذاتی ہے۔ بس کشت و خون اس کثرت سے ہوگا کہ جو مر گئے ہیں وہ بھی لڑنے اور خون کرنے کو جی اُٹھیں گے۔

کائیتھ نس:- کیا خبر ہے کہ ڈونل بین بھی اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہو۔

لینکس:- ڈونل بین یقینی اپنے بھائی میلکم کے ساتھ نہیں ہے۔ اُس کے کُل ہمراہیوں کی فہرست میرے پاس موجود ہے۔ اس میں سیورڈ کا فرزند اور بہت سے لڑکے ہیں جنکے مُنہ پر ڈاڑھیاں تک نہیں نکلی ہیں، بالکل نوجوان ہیں۔ لڑائی کے شوق میں ساتھ ہوگئے ہیں۔

منٹیتھ:- کہو میکبتھ کس حال میں ہے؟

کائیتھ نس:- ڈنسی نین کا قلعہ اُس نے خوب مضبوط کرلیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور جنہیں اُس سے کم نفرت ہے اُن کا قول ہے کہ اُسکی کُل حرکتیں محض غیظ و غضب کا ایک جوش و ولولہ ہیں۔ اور اس کا بھی انہیں یقین ہے کہ اُس کی اِس عداوت و مخاصمت کی کوئی وجہ بھی ایسی معقول نہیں ہے کہ اُس کے ساتھی اُس کا ساتھ دینے میں کسی قاعدے یا ضابطے سے مجبور ہوں۔

اینگس:- یہ تو فرمائیے کہ خفیہ قتل و خون کے جو داغ اُسکے ہاتھوں پر لگے ہیں اُن سے بھی وہ کچھ متاثر ہے یا نہیں۔ اسکے خلاف جو بغاوتیں ہو رہی ہیں اُنہی سے ظاہر ہے کہ

اُس کی عہد شکنی پر سب اُسے مطعون کر رہے ہیں۔ جن پر وہ حکم چلاتا ہے وہ دل سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ حکم ہے پابند ہوتے ہیں۔ اب تو بادشاہی کرنا اُسے ایسا ہی نازیبا و بدنما ہے جیسے ایک قوی ہیکل دیو کی پوشاک ایک پستہ قد سارق کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی اور بدنما معلوم ہو۔

منٹیتھ:۔ اُسے الزام دینا مشکل ہے۔ جو کچھ قصور ہے وہ اس کے جنون و وحشت زدہ حواس کا ہے جو اُس سے دیوانگی کی حرکتیں سرزد کراتے ہیں، اور اس کے ذمہ دار اُس کے وہی گناہ ہیں جن کا خیال بار بار دل میں آکر اُسے ستاتا ہے۔

کاتھنس:۔ اچھا۔ اب ہم اُس کی اطاعت ترک کرتے ہیں اور اُس شخص کے مطیع ہو کر آگے بڑھتے ہیں، جو فی الحقیقت ہماری اطاعت گزاری کا مستحق ہے اور اپنے بیمار اور نیم جاں ملک اور وطن کی دوا کرتے ہیں۔ اور اُسے تندرست کرنے کے لئے اس دوا میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ ملانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

لینکس:۔ ایک ایک قطرہ ہی نہیں بلکہ جس قدر خون اس درماں کے لئے درکار ہو سب بہانے کو تیار ہیں۔ تاکہ اس گلشن شاہی کے پھول کو طراوت پہونچے اور اس سے خس و خاشاک دُور ہوں۔ بس اب ہم برنام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

دوسرا منظر:۔ قلعہ ڈنسی نین میں قصر کا ایک کمرہ۔ میکبتھ، طبیب اور ملازمین آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ بس اب کوئی خبر ہمارے پاس نہ لائی جائے۔ ان بدخواہوں کو بھاگ کر دشمن سے ملجانے دو۔ مجھے کوئی وجہ خوف اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ پہونچ جائے۔ کیا یہ لڑکا میلکم عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ چند روحوں نے جن پر انسان کے کل حالات روشن ہوتے ہیں مجھ سے کہا ہے کہ "میکبتھ ڈر نہیں، کوئی شخص جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے تجھے گزند نہیں پہونچا سکتا۔" پس اے میرے دغا باز سردارو امیرو، تم جب چاہے بھاگ کر میرے دشمنوں یعنی ان بسیار خوار انگریزوں سے جا ملو۔ میری طبیعت جو مجھ پر قابو رکھتی ہے اور جو دل سینے میں رکھتا ہوں اُس میں شک یا خوف کی کبھی گنجائش نہ ہوگی۔

(ایک نوکر آتا ہے)

شیطان تجھے اُلٹے قدم یہاں سے پلٹا دے۔ اے زرد رُو احمق، یہ اُلو کی سی صورت تونے کیوں بنائی ہے؟

نوکر:۔ دس ہزار سپاہ آرہی ہے۔

میکبتھ:۔ اے بے وقوف سپاہ نہ ہوگی۔ چیختی چلاتی بطخیں ہونگی۔

نوکر:۔ نہیں حضور، سپاہی ہیں۔

میکبتھ:۔ بدبخت جاکر اپنے چہرے کو زخمی کرکے اس سے خون نکال تاکہ زردی کی جگہ سرخی پیدا ہو۔ اے بزدل احمق بکتا کیا ہے؟ سپاہی کیسے، خوف سے تجھ پر تو وہ زردی کھنڈی ہے کہ تو مر کیوں نہیں جاتا۔ اے خوفزدہ نامراد بکتا کیا ہے۔ سپاہی کیسے۔ کیسے سپاہی؟

نوکر:۔ حضور انگریزی فوجیں آن پہونچی ہیں۔

میکبتھ:۔ دُور ہو خبیث۔ (نوکر چلا جاتا ہے)

اے علمدار سیٹن تو سنتا ہے۔ یہ معرکہ جو پیش آنے والا ہے یا تو مجھے کرسی حکومت پر مستقل یا تخت سے معزول کردیگا۔ بہت دن جی لیا۔ اب تو بہار زندگی ختم ہوکر خزاں آچلی ہے۔ ہرے پتے زرد ہو چلے ہیں جو چیزیں عالم ضعیفی میں ساتھ ہونی چاہیئے نہیں مثلاً عزت، محبت،

دوسروں کی اطاعت، دوستوں اور ہواخواہوں کے گروہ،
اب ان کا متوقع ہونا عبث ہے۔ ان کی جگہ لعنت و ملامت،
وہ بھی بلند آواز سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا
ہے۔ محض ظاہری طور پر لوگوں سے عزت کے جملے اپنی
نسبت سنتا ہوں مگر وہ سب اس لئے ہوتے ہیں کہ
اگر ہمت ہو تو ان کی نفی کر کے غریبوں کا دل خوش
کر دیا جائے۔ ارے سیٹن سنتا ہے؟

(سیٹن اندر آتا ہے)

سیٹن:۔ حضور کیا حکم ہے؟

میکبتھ:۔ کہو کچھ اور خبر آئی؟

سیٹن:۔ جو خبریں اب تک سننے میں آئی ہیں وہ سب
درست ہیں۔

میکبتھ:۔ تو پھر میں لڑونگا۔ اور لڑونگا بھی اس وقت تک
کہ ہڈیوں پر سے گوشت قیمہ بنا کر کھرچ لیا جائے۔ زرہ بکتر
مجھے دو۔

سیٹن:۔ حضور، ابھی اسکی ضرورت نہیں۔

میکبتھ:۔ نہیں نہیں۔ ہتیار زرہ بکتر ابھی لگانا چاہتا
ہوں۔ کچھ سوار ادھر ادھر دشمن کا کھوج لگانے دوڑاؤ۔
جن کی زبان پر خوف کی کوئی علامت ہو انہیں فوراً
پھانسی چڑھا دو۔ میرے ہتیار زرہ بکتر مجھے دو۔
اے طبیب مریضہ کا کیا حال ہے؟

طبیب:۔ حضور مرض اتنا سخت نہیں ہے جس قدر کہ خیالات
پریشان کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ نیند نہ آنے کی ہے۔

میکبتھ:۔ پھر اس کا علاج کر کے مریضہ کو تندرست کر دو۔
کیا کسی بیمار دماغ و طبیعت کا علاج نہیں کر سکتے؟ اگر
کسی رنج نے طبیعت میں گھر کر لیا ہے تو حافظہ سے اسکا
تنقیہ کر دو۔ دماغ میں جو تکلیفیں اور اذیتیں نقش ہو چکی
ہیں انہیں مٹا دو۔ مفرح دواؤں سے خفیہ طور پر اسکے
قلب کو صاف کر دو۔ جس میں خطرناک اور فاسد مواد نے
جمع ہو کر دل پر ایک بوجھ پیدا کر دیا ہے۔

طبیب:۔ حضور یہ مرض تو ایسا ہے کہ خود مریض اپنا
علاج کر سکتا ہے۔

میکبتھ:۔ پھر تو آپ اپنی دوا دارو، علاج معالجے سبکو
کتوں کے سامنے ڈالدیں۔ میں کچھ علاج نہیں چاہتا۔ سیٹن
ادھر آ۔ مجھے زرہ بکتر پہنا۔ اور میرا نیزہ مجھے دے۔ باہر
کی خبر رکھ۔ طبیب تم سنتے ہو؟ ملک کے تمام امیروں اور
سرداروں نے مجھ سے سرکشی اختیار کی ہے۔ ملکہ کے
مرض کی تشخیص اچھی طرح کرو۔ اور بیماری دفع کر کے پھر اسے
توانا و تندرست کر دو۔ پھر تمہاری تعریفوں میں میری
آواز آسمان تک گونجیگی۔ اور جب آواز وہاں سے پلٹیگی
تو بھی تمہاری تعریف اس سے پیدا ہوگی۔ مرض کو کسی طرح
دور کر دو۔ راوند دو، سنا دو، غرض جو دوا مرض کو
مٹا دے وہی دو۔ کاش یہ انگریز جلد یہاں سے چلے
جاتے۔ تم نے بھی کچھ ان کا حال سنا ہے؟

طبیب:۔ حضور کی تیاریاں دیکھکر کچھ معلوم تو ہوا ہے۔

میکبتھ:۔ ہاں یہیں سب چیزیں لے آؤ۔ میں غارتگری یا
موت سے ڈرتا نہیں ہوں۔ جب تک مجھے کچھ خوف نہیں ہے
کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ آ جائے۔

(سب چلے جاتے ہیں صرف طبیب رہجاتا ہے)

طبیب:۔ کاش اس قلعہ سے میں صحیح سلامت نکل جاتا۔ اب
کسی قسم کے فائدے کا خیال مجھے یہاں نہ لائے گا۔

(چلا جاتا ہے)

چوتھا منظر:۔ ڈنسی نین کے قریب ایک
میدان۔ سامنے جنگل کھڑا ہے۔ میلکم، بڈھا سیورڈ

اور اُس کا فرزند، میکدف، منٹیتھ، کا یتھ نس
اینگس، لینکس، راس، اور بہت سے سپاہی
آتے ہیں۔ طبل و علم کے ساتھ کوچ کرتے نظر آتے ہیں۔

میلکم:۔ دوستو، عزیزو۔ وہ دن قریب آرہا ہے کہ لوگوں کے گھروں میں امن و عافیت کا دور دورہ ہو۔

منٹیتھ:۔ اس میں اب کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

سیورڈ:۔ اس جنگل کا کیا نام ہے؟

منٹیتھ:۔ اسے برنام کا جنگل کہتے ہیں۔

میلکم:۔ ہر سپاہی درخت کی ایک ایک شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لے۔ اس سے لشکر کی پوری تعداد دشمن کو نہ معلوم ہو سکیگی۔ اور اگر اس کا کچھ اندازہ بیان بھی کیا جائیگا تو اس میں غلطی ہوگی۔

سپاہی:۔ حضور، ہم یہی کرتے ہیں۔

سیورڈ:۔ جہاں تک خبر ملی ہے یہی ہے کہ ظالم میکبتھ جسے اپنے اُوپر بہت کچھ بھروسا ہے ابھی تک قلعہ ڈنسی نین میں ہے اور وہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہم قلعہ کا محاصرہ کرلیں۔ محصور ہوکر وہ ہمارا مقابلہ کریگا۔

میلکم:۔ اس کی تمام اُمیدوں کا حصر اسی پر ہے۔ کیونکہ جب کبھی کوئی اچھا موقع اس کے فائدے کا آیا اس کے ساتھیوں نے اُس سے بغاوت کی۔ اور کوئی شخص بھی اس کے ساتھ اس وقت ایسا نہیں ہے جسے قطعاً مجبور ہوکر اُسکا ساتھ نہ دینا پڑا ہو۔ اور ان کے دل بھی اس سے پھرے ہوے ہیں۔

میکدف:۔ اپنی شکایتوں کو بدستور قائم رکھکر لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور بڑے جفاکش بہادر آزمودہ کار سپاہیوں کی طرح کام کرنا چاہیئے۔

سیورڈ:۔ لڑائی کے تصفیہ کا وقت قریب آرہا ہے۔ اُس وقت ہم کہیں گے کہ کہاں تک ہمیں فتح ہوئی اور کس حد تک شکست ہوئی۔ قیاسات تو محض ایسی توقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مشتبہ ہوتے ہیں۔ تلوار کے ہاتھ البتہ کہیں کہیں بتا دینگے کہ اس لڑائی کی اصلی و حقیقی وجہ کیا ہے۔

(سب مارچ کرتے چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:۔ قلعہ ڈنسی نین میں میکبتھ۔
سیٹن اور سپاہی طبل اور جھنڈے لئے
آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ باہر والی فصیل پر ہمارے جھنڈے اور پھریرے نصب کرو۔ غل یہی ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ لیکن ہمارے اس قلعہ کے بُرج اور فصیلیں ایسی مستحکم و مضبوط ہیں کہ دشمن کے اس محاصرے پر وہ خندہ زن رہینگی۔ قلعہ کے گرد دشمن کی فوجیں پڑی رہیں حتیٰ کہ فاقے اور وبائیں اُن کا کام تمام کردیں۔ دشمن کی طاقت تو اُنہی لوگوں نے بڑھائی ہے جو کبھی ہمارا دم بھرتے تھے۔ ورنہ ہم دشمن سے کھلے میدان تیغ آزمائی کرتے۔ اور اُنہیں مار بھگا دیتے۔

(اندر سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

سیٹن یہ آواز کیسی ہے؟

سیٹن:۔ حضور عورتوں کے رونے کی آواز ہے۔

(باہر جاتا ہے)

میکبتھ:۔ مجھے تو اب خوف و بیم کا حس تک نہیں رہا۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر رات کے وقت کسی کے چیخنے کی آواز سنتا تھا تو سر تا قدم لرز جاتا تھا۔ اور جب کوئی خوف اور ہیبت کا قصہ سنتا تھا تو بدن کے تمام رونگٹے اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے کہ گویا اُن میں جان ہے لیکن اب تو خونی خیالات کے ساتھ خوف و خطر کی اتنی چیزیں مجھ میں بھر گئی ہیں کہ کسی بات پر بھی نہیں چونکتا۔

(سیٹن پھر اندر آتا ہے)

کہو وہ کس کی چیخ تھی ؟

سیٹن:۔ حضور، ملکہ سلامت گزر گئیں۔

میکبتھ:۔ ایک نہ ایک دن تو موت آنی ہی تھی۔ امروز کے بعد فردا، پھر فردا اور فردا، اور اسی طرح دن پر دن گزرتے چلے جائینگے حتیٰ کہ موت کا مقررہ وقت آ پہونچیگا۔ اور جو دن گزر رہے ہیں وہ ہر احمق کو قبر کی خاک اور تاریکی تک پہونچانے کے لئے روشنی دکھا رہے تھے۔ بجھ، بجھ۔ اے زندگی کی مختصر شمع گل ہو جا۔ یہ زندگی تو ایک چلتی پھرتی پرچھائیں ہے۔ اس تماشا گاہ میں ایک تماشا گر کی طرح غم و غصہ دکھا کر ایسی غائب ہوتی ہے کہ پھر نظر نہیں آتی۔ یہ زندگی تو کسی بے وقوف کی کہی ہوئی کہانی ہے جس میں بہت کچھ شور و شغب، رنج و غم ہے مگر حاصل کچھ نہیں۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد تو کچھ کہنے آیا ہے۔ بس جو کچھ کہنا ہے جلدی کہدے۔

قاصد:۔ حضور۔ مجھے صرف وہی کہنا ہے جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے۔

میکبتھ:۔ جو کچھ بھی ہو، مُنہ سے تو پھوٹ۔

قاصد:۔ حضور، میں پہاڑی پر کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ برنام کی طرف میری نظر تھی کہ یکایک میں نے اس جنگل کو حرکت کرتے دیکھا۔

میکبتھ:۔ جھوٹے، کاذب، غلام، کیا بکتا ہے ؟

قاصد:۔ حضور کا عتاب میرے سر آنکھوں پر، مگر واقعہ یہی ہے جو عرض کیا۔ تین میل سے حضور دیکھ سکتے کہ برنام کا جنگل اس طرف جنبش میں ہے۔ سارا جنگل چلتے درختوں کا ایک جھنڈ سا معلوم ہو رہا ہے۔

میکبتھ:۔ اگر تو جھوٹا نکلا تو پاس سے پاس درخت پر تجھے زندہ لٹکا دونگا تاکہ فاقوں سے سوکھکر تیرا دم نکل جائے۔ اور اگر تو سچا ہے تو پھر اگر تو میرے ساتھ ایسا ہی کرے گا تو مجھے مطلق پروا نہ ہوگی۔ اب تو ہمت ٹوٹ سی چلی ہے۔ اُن جادوگرنیوں نے کہا تھا کہ جب تک برنام کا جنگل ڈلسی نین تک نہ آئے موت سے نہ ڈر۔ اُس وقت ان کے کہنے کا یقین آگیا تھا مگر اب تو اس میں شبہ معلوم ہوتا ہے۔ برنام کا جنگل تو اب ڈلسی نین کی طرف آ رہا ہے۔ ہتیار لگاؤ۔ ہتیار لگاؤ۔ یہاں سے چلو۔ اگر یہ قاصد جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے تو پھر یہاں سے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اب تو میں اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ کُل کائنات درہم برہم ہو جائے اور میں بھی اُسی میں دب کر مروں۔ فوراً گجر بجاؤ۔ طوفانو اُٹھو۔ غارتگری تو اپنا کمال دکھا۔ کم سے کم ہم ہتیار باندھے تو مریں۔ (سب چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر:۔ ڈلسی نین۔ طبل و علم لئے آدمی قلعہ کے سامنے آتے ہیں۔ میلکم، سیورڈ۔ میکڈف وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان کا لشکر ساتھ ہے ہر سپاہی کے ہاتھ میں درخت کی ایک ایک شاخ ہے۔

میلکم:۔ اب ہم کافی طور پر قلعہ کے پاس آگئے ہیں سپاہیو۔ اپنے ہاتھوں کا بوجھ پھینک کر دشمن پر اپنی پوری تعداد ظاہر کر دو۔ سیورڈ مع اپنے بہادر اور شریف فرزند کے پہلا حملہ شروع کرتا ہے۔ باقی جو کچھ ہونے والا ہے اُسے ہم اور میکڈف اپنے اپنے درجے کے مطابق دیکھ لینگے۔

سیورڈ:۔ اچھا خدا حافظ۔ آج شب کو ہم اس ظالم کی قوت کا اندازہ کرکے اس سے تیغ آزمائی کرتے ہیں اگر کچھ نہ

کر سکے تو پھر شکست میں کلام نہیں۔

میکڈف:۔ جس قدر نفیر ساتھ ہیں ایکدم پھونکے جائیں۔ اور یہی چیزیں خون اور موت کی پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

(چلے جاتے ہیں۔)

ساتواں منظر:۔ میدان جنگ کا ایک موقع۔

گجر بج رہے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:۔ مجھے تو دشمنوں نے گویا ایک ستون سے باندھ دیا ہے۔ کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ بہرکیف ایک خرس وحشی کی طرح مجھے تو لڑنا ہے۔ وہ کون ہے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ سوائے ایسے شخص کے مجھے کسی دوسرے کا خوف نہیں۔

سیورڈ:۔ تمہارا کیا نام ہے؟

میکبتھ:۔ سنکر ڈر جاؤ گے۔

سیورڈ کا فرزند:۔ نہیں نام بتاؤ۔ ہمیں پروا نہیں چاہے وہ جلتی ہوئی چیزوں میں دوزخ ہی سے تپتا ہوا کیوں نہ نکلا ہو۔

میکبتھ:۔ سنو۔ میرا نام میکبتھ ہے۔

سیورڈ کا فرزند:۔ اس سے زیادہ قابل نفرین نام تو شیطان کی زبان پر بھی نہیں آسکتا۔

میکبتھ:۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس سے زیادہ ہیبت ناک نام تو شیطان بھی نہ لے سکتا تھا۔

سیورڈ کا فرزند:۔ ارے خونی ظالم تو جھوٹا ہے اور اس تلوار سے تیرا جھوٹ کھولے دیتا ہوں۔

(دونوں لڑتے ہیں اور سیورڈ کا فرزند مارا جاتا ہے)

میکبتھ:۔ عورت کا جنا تھا نا۔ میں تو اُن لوگوں کی تلواروں پر ہنستا اور اُن لوگوں کو نظر تحقیر سے دیکھتا ہوں جو عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ (چلا جاتا ہے۔)

(گجر بجتے ہیں۔ میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:۔ غل اُدھر ہو رہا تھا۔ ارے جہنمی ظالم، سامنے آکر اپنی صورت دکھا۔ اگر تو مارا گیا مگر میری تلوار سے قتل نہ ہوا تو میرے بیوی بچوں کا خون بھوت بن کر مجھے لپٹیگا۔ میں غریب اُجرت لیکر لڑنے والوں کو نہیں مارنا چاہتا۔ میکبتھ یا تو تو میرے مقابل آ۔ ورنہ میں اپنی تلوار بغیر اُس کی دھار کو کُند کئے نیام میں رکھے لیتا ہوں جہاں اس وقت شور ہو رہا ہے وہیں وہ ملے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا بہادر مارا گیا ہے۔ مجھے تو میکبتھ کی تلاش ہے۔ بس تقدیر۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بج رہے ہیں۔)

(میلکم اور بڈھا سیورڈ آتا ہے۔)

سیورڈ:۔ میلکم، آپ اِدھر آئیں۔ قلعہ آہستہ آہستہ فتح ہو رہا ہے۔ میکبتھ کے آدمی دونوں طرف سے لڑتے ہیں۔ کچھ ہماری طرف ہوگئے ہیں اور کچھ اُس کی طرف ہیں۔ شریف والیان مُلک بڑی جوانمردی سے دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آج کا دن ہماری فتح کا ہے۔ اور اب کچھ زیادہ کام باقی نہیں ہے۔

میلکم:۔ لڑائی میں فریق مخالف کے لوگ بھی ہمارا ساتھ دیکر لڑائی میں مصروف ہیں۔

سیورڈ:۔ آپ قلعہ میں داخل ہوں۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

آٹھواں منظر:۔ میدان جنگ کا دوسرا حصہ۔

میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:۔ میں خود کیوں ایک رومانی بے وقوف کی طرح تلوار مار کر خودکشی کروں۔ جب تک کہ آدمی میری تلوار سے

قتل ہونے کیلئے موجود ہوں۔

(میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:۔ اے دوزخ کے خونی کتے۔ سامنے آ۔ سامنے۔

میکبتھ:۔ میں تجھ سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں لیکن اب تو بھی آ۔ سامنے آ۔ میرے سر پر تیرے بیوی بچوں کا خون سوار ہے۔

میکڈف:۔ میں منہ سے بولنا نہیں چاہتا۔ اس وقت تلوار میری زبان ہے۔ اے خونی خبیث، زبان کا یارا نہیں کہ تجھے کوئی نام دے سکے۔ (دونوں لڑتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ بے فائدہ محنت کرتا ہے۔ مجھ پر تلوار چلا کر زخمی کرنے کا قصد ایسا ہی بے سود ہے جیسے ہوا کو تلوار سے زخمی کرنا۔ تلوار اُن پر چلا جو مغلوب ہو سکیں۔ میری جان تو ایک طلسم نے محفوظ کر رکھی ہے۔ اور کوئی اسے نہیں لے سکتا بجز اُس کے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا ہو۔

میکڈف:۔ لعنت ہو تجھ پر۔ اپنی جان اور اس کے طلسم کی طرف سے مایوس ہو جا۔ شیطان جس کا تو ہمیشہ سے تابع رہا ہے وہی تجھے بتائیگا کہ میکڈف عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا بلکہ شگاف دیکر رحم مادر سے قبل از وقت دُنیا میں لایا گیا تھا۔

میکبتھ:۔ لعنت ہو اُس زبان پر جس نے مجھے یہ بتایا تھا۔ کیونکہ اب میری ساری جوانمردی اور دلیری بزدلی میں منتقل ہوئی جاتی ہے۔ ان شعبدہ باز چڑیلوں کا اب کوئی یقین نہ کرے جو ایک ہی بات کو دو دو مطلبوں سے کہتی ہیں۔ اور جب ان کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ان وعدوں کو وہ توڑ دیتی ہیں۔ میکڈف اب میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔

میکڈف:۔ تو پھر اے نامراد بزدل ہار مان اور دُنیا کی نظروں میں ایک عجیب تماشا بنکر زندہ رہ۔ اور ہم تجھے ایک پنجرے میں بند کر کے اس طرح رکھیں گے جس طرح ایک وحشی درندے کو رکھا جاتا ہے اور پنجرے پر ایک رنگین تختی لگا کر اُس پر لکھیں گے کہ "جسے ایک ظالم و سفاک خونی کو دیکھنا ہو وہ اسے دیکھے"۔

میکبتھ:۔ میں ہار ہرگز نہ مانونگا۔ اس لئے زندہ نہ رہونگا کہ میلکم کے قدم چوما کروں، اور اس کے ہواخواہوں کے منہ سے لعنت ملامت سنا کروں۔ چاہے برنام کا جنگل ڈنسی نین ہی تک کیوں نہ آ جائے اور تو جو عورت کے بطن سے نہیں ہے میرے مقابل ہو مگر میں تلوار سے آخری آزمائش کرونگا۔ لے میں اپنی سپر سے اپنے تئیں ڈھکے لیتا ہوں۔ میکڈف اب تلوار چلا۔ اور لعنت ہو اُس پر جو کہے کہ "بس کر"۔

(لڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

(بھاگڑ، باجوں کی آواز، طبل و علم کے ساتھ میلکم، بڈھا سیورڈ، راس، لینکس، اینگس، کاتھنس اور بہت سے سپاہی آتے ہیں۔)

میلکم:۔ خدا سے چاہتا ہوں کہ جو دوست اس وقت نظر نہیں آتے وہ زندہ سلامت یہاں تک آ جائیں۔

سیورڈ:۔ بعض ان میں ضرور کام آئے ہونگے۔ پھر بھی معلوم ہو رہا ہے کہ فتح ہمکو بہت کم نقصان کے ساتھ نصیب ہوگئی ہے۔

میلکم:۔ میکڈف اور آپکا فرزند نظر نہیں آتا۔

راس:۔ سیورڈ آپکے فرزند نے سپاہی کا قرضہ ادا کر دیا۔ (یعنی وہ کام آ گیا) اور آخری دم تک بڑی جوانمردی سے لڑتا رہا۔

سیورڈ:۔ تو کیا وہ لڑائی میں مارا گیا؟

راس:۔ حضور، ہاں۔ اس کی لاش ہم لڑائی کے میدان سے

اُٹھا لاتے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے فرزند کا غم اس کی خوبیوں اور اوصاف کے حساب سے کیا تو پھر آپ کے غم کی اِنتہا نہ ہوگی۔

سیورڈ:۔ زخم سامنے آئے تھے یا پُشت کی طرف؟

راس:۔ حضور زخم سب سامنے کے رُخ تھے۔

سیورڈ:۔ تو پھر وہ خُدا کا سپاہی تھا اور خدا ہی کے ساتھ وہ رہگیا۔ اگر میرے اتنے فرزند ہوتے جتنے کہ سر پر بال ہیں تب بھی اِس سے بہتر موت میں ان کے لئے نہیں چاہ سکتا تھا۔ غرض اس طرح اس کی موت کا گھنٹہ بج چُکا۔

میلکم:۔ نہیں۔ میدان جنگ میں کام آنا اُسے کہیں زیادہ تعزیت کا مستحق کرتا ہے۔ میں اسکا پورا انتظام کرونگا۔

سیورڈ:۔ نہیں۔ لڑائی میں اسکا مارا جانا کافی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جوانمردی کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اور اس طرح دُنیا میں جینے کا حساب اُس نے بے باق کیا۔ بس وہ خدا کی حضور امن وسلامتی کے ساتھ زندہ وشاد ہے۔ اور دیکھو یہ اور اچھی خبر آرہی ہے۔

(میکڈف میکبتھ کا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لئے آتا ہے)

میکڈف:۔ مُبارک ہو میلکم! اب آپ بادشاہ ہیں۔ مُبارک ہو۔ دیکھئے اس ظالم وسفاک کا سر نیزے پر ہے، اور اب خلقت ایک جفا کار کے ظلم وستم سے آزاد ہوئی۔ اِس وقت سلطنت کے بڑے بڑے وزیر ہمارے حضور کے گرد حلقہ کئے ہیں، جن کے دلوں میں حضور کی وہی ثنا وصفت ہے جو میری زبان پر ہے۔ اور میں دِلی مسترت کے ساتھ بآوازِ بلند کہتا ہوں کہ اے بادشاہ تجھے تخت مُبارک ہو۔

میلکم:۔ ہمیں انتظار میں زیادہ وقت صرف کرنا منظور نہیں۔ حاضرین کو ان کی محبت اور قدر دانی کا صلہ دیکر اظہارِ خوشنودی واحسانمندی کرکے اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اے میرے عزیزو اور مُلک کے رئیسو، میں آپ کو "نواب" کا خطاب دیتا ہوں، اور یہ عزت سب سے پہلے آپکو اس مُلک کی سلطنت میں عطا کی جاتی ہے اور مزید لُطف وکرم جو منظور ہوگا وہ آئندہ عمل میں آئیگا۔ مثلاً جو لوگ میکبتھ کے ظلم وستم اور اس کے دغا وفریب سے بچنے کیلئے مُلک چھوڑکر چلے گئے ہیں وہ پھر وطن میں واپس بلائے جائیں اور اِس ظالم قصائی اور شیطان ملکہ کے جس قدر کارکُن ہیں وہ حاضر کئے جائیں، اِس ملکہ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاک کیا۔ غرض یہ اور کُل ایسے ہی امور جو خُدا کے فضل وکرم سے ہمارے لئے ضروری ہونگے وہ اپنے اپنے طریقے وقت اور مقام کا لحاظ کرکے ہم انجام دینگے۔ بس ہم سبکے اور ہر شخص کے فرداً فرداً منّت گزار ہیں اور سبکو اپنی تاجپوشی کے جلسے میں جو شہر اسکون میں ہوگا مدعو کرتے ہیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

ختم شُد

عنایت اللہ دہلوی

سلامبو:۔ شُہرۂ آفاق فرانسیسی انشا پرداز گستنو فلا بیئر کا شہ پارہ جس میں قرطاجنۂ قدیم کی مٹی ہوئی تہذیب اس طرح از سرِ نو الفاظ میں تعبیر کی گئی ہے کہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ سلامبو اور ماتو کی محبت کی کہانی اسقدر حسرتناک ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔ ضخامت (۵۰۰) صفحے قیمت تین روپے علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُکڈپو۔ دہلی۔

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
ہو سکے تو درد سہنے دیجئے
دیجئے اتنی اجازت دیکھ لیں
حالِ دل چاہے نہ کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
خونِ دل آنکھوں سے بہنے دیجئے
لطف آ جائے اگر سنئے تو بھی
داستاں رنگیں ہے کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بے بسی سے اشک بہنے دیجئے
ہم علاجِ درد کے قائل نہیں
داستانِ درد کہنے دیجئے

درد کی دنیا میں رہنے دیجئے
بحرِ بے پایاں میں بہنے دیجئے
منہ میں جو آیا کہا اب ہم کو بھی
دردِ دل آنکھوں سے کہنے دیجئے

امینِ حزیں سیالکوٹی

یادِ ایامِ عشرتِ فانی

میری کالج کی زندگی

یہ دلّی ہے۔ یہ دلّی کا ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اور یہ دہلی کا پُرانا رہنے والا فرحت اللہ بیگ ہے۔ بہت دنوں کے بعد دہلی آیا ہوں۔ خداوند ریڈیو نے اپنی عنایت سے مجھے آپ کو مخاطب کرنے کا موقعہ دیا۔ مگر غضب یہ کیا کہ تقریر کے لئے صرف پندرہ ہی منٹ دیئے۔ اس لئے میرے مضمون کے حق میں رمضان کی عید گویا بقر عید ہوگئی۔ آخر یہ سوجھی کہ سری پائے الگ کرکے صرف دھڑ کا کچھ حصّہ ملاحظہ میں گذران دوں۔ مضمون ایسا لیتا ہوں کہ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ اور مرتے دم تک رہیگی۔ اور اُس زمانہ کے واقعات بیان کرتا ہوں جب دہلی ہماری تھی اور ہم دہلی کے تھے۔

یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے زمانۂ طالبعلمی کو اچھا سمجھتا ہے۔ میں بھی اسی فطرتِ انسانی سے مجبور ہوں اور آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ کالج کی زندگی کا جو مزا ہمارے زمانہ میں تھا۔ وہ اب نہیں رہا۔ پڑھائی، لکھائی پہلے بھی ہوتی تھی۔ اور اب بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے ایک جماعت میں گنتی کے چند طالبعلم ہوتے تھے۔ اور اب پڑھنے والوں کی زیادتی مدرسہ اور کالج کے بڑے بڑے کمروں کو سُکیڑ کر چھوٹا کر دیتی ہے۔ پہلے مدرسہ اور کالج میں اتنے طالبعلم ہوتے تھے کہ اُستاد اور پروفیسر نہ صرف ان کی ترقی تعلیم کو دیکھ سکتے تھے بلکہ انکے ساتھ میل جول رکھ کر ان کے عادات و اطوار کو بھی درست کر سکتے تھے۔ اور اب؟ اب طالبعلم اور اُستاد ایسے سیّارے ہوگئے ہیں کہ انکا ایک دوسرے کے پاس سے گزرنا ہی مشکل ہے اور خدانخواستہ پاس سے گزر بھی جائیں تو انکے ٹکرا جانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

میں نے مشن کالج دہلی میں تعلیم پائی ہے۔ پہلے اس کالج کے پرنسپل مسٹر رائٹ تھے۔ مگر خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ باوجود بے انتہا شریف اور ہمدرد شخص ہونے کے دہلی والے ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اُنہوں نے اس کالج اور خاصکر کالج کے فیلڈ کے لئے جو کچھ کیا وہ مشن کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان کا انتقال کچھ ایک دفعہ ہی ہوگیا اور ان کی جگہ مسٹر ہیبرٹ ویر پرنسپل ہوئے۔ اور مسٹر ڈے انگریزی کے پروفیسر ہو کر ولایت سے آئے۔ اگر کسی کو دیکھنا ہو کہ ہم ہندوستانی محبت کے کتنے بھوکے ہیں تو وہ مسٹر ڈے کے حالات دیکھے۔ راستے کے بچے جنہوں نے شاید انکی شکل بھی پوری طرح نہ دیکھی ہوگی۔ ان کے نام کو اس طرح جوشِ دلی سے لیتے تھے گویا مسٹر ڈے اُن کے بڑے پُرانے دوست ہیں۔ جو انگریز ان دہلی کے بچوں کے سامنے سے گزرا اور مسٹر ڈے ہوگیا۔ ان کو پڑھانے میں کوئی خاص مہارت نہ تھی۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی محبت اور ان کا برتاؤ لڑکوں کو خود شوق سے پڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اس کا وہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شاید اچھے سے اچھا پروفیسر بھی وہ نتیجہ پیدا نہ کرسکے۔ حضرات۔ محبت کی مار بڑی سخت مار ہوتی ہے۔ جو کام محبت سے نکل سکتا ہے وہ سر مغزنی سے نہیں نکل سکتا۔

مسٹر ڈے میں دوسری خاص قوت تقریر کی تھی۔ وہ اپنے زورِ بیان سے اپنے دلی منشا کو دلوں میں اُتار دیتے تھے۔ ان کو اپنی اس قوت پر ناز بھی تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ میں (Orator) ہوں (Speaker) نہیں ہوں۔ اور کیوں نہ ہوں آخر میں آئرلینڈ کا رہنے والا ہوں۔

مسٹر ڈے کی تیسری خصوصیت اُن کا شوقِ تعلیم جسمانی تھا۔ وہ کیمبرج کے مشہور کھلاڑی تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کشتی رانی غرض بہت کھیلوں میں انعام پا چکے تھے۔ وہ ہم کو بھی اپنا ہی جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کھیل نہ ہوگا جس میں وہ شریک نہ ہوتے ہوں۔ ان کے جوش کا یہ حال تھا کہ ریل میں کالج کی ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری۔ وہ فٹ بال لیکر اُترے اور پلیٹ فارم ہی پر کھیل شروع کر دیا۔ مسافر ہیں کہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ نئے مسافروں کو گاڑی تک جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ سودا بیچنے والے پریشان ہیں۔ گارڈ سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہا ہے۔ لیکن یہاں برابر دنادن ہو رہی ہے۔ کالج کے کمروں میں مسٹر ڈے ضرور پروفیسر بنے رہتے تھے۔ اور بڑا رعب داب دکھاتے تھے۔ مگر فیلڈ میں آئے اور اس طرح رل مل گئے گویا وہ بھی ایک طالبعلم ہیں۔ وہ کپتان کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کوئی لڑکا بھی کیا کرے گا۔

ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیبرٹ ویر تھے۔ یقین مانیئے کہ ان سے سب کا دم نکلتا تھا۔ وہ زبان سے نہیں پڑھاتے تھے آنکھوں سے پڑھاتے تھے۔ آپ سمجھے کہ آنکھوں سے پڑھانے کا کیا مطلب ہے۔ حضرات۔ وہ حضرت مسمریزم جانتے تھے۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ خدا کی پناہ۔ جہاں کسی دن کوئی تیار ہو کر نہیں آیا اور انھوں نے ذرا گھورا۔ بس سمجھ لیجئے کہ اس لڑکے کا تو خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اس کے بعد مجال نہ تھی کہ وہ صاحب آئندہ تیار ہوئے بغیر کمرہ میں قدم رکھیں۔

ہے یہ۔ کہ عام طور پر انسان کا وزن دو۔ پونے دو من ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لمبان اور چوڑان کے لحاظ سے اس وزن کی تقسیم انسانی جسم میں مختلف طریقہ سے ہو جاتی ہے۔ بعض چوڑے ہوتے ہیں تو لمبان کم ہو جاتی ہے۔ اور بعض لمبے ہوتے ہیں تو چوڑان گھٹ جاتی ہے۔ چونکہ مسٹر ہیبرٹ ویر کی چوڑان کچھ تھی ہی نہیں۔ اس لئے اندازہ کر لیجئے کہ ان کی لمبان کیا ہوگی، تمام دُنیا میں پیدل پھر آئے تھے۔ اور ہے بھی یہ۔ کہ اتنی لمبی ٹانگیں ہونے پر دُنیا کا چکر کاٹ آنا کیا بڑی بات ہے۔ ایک دفعہ اُن کی تیز رفتاری سے ہم بھی مار کھا چکے ہیں۔ ہوا یہ۔ کہ ہماری فال سٹاف سوسائٹی کی (Excursion) ہوئی۔ قرار پایا تغلق آباد چلو۔ سوسائٹی کے سارے ممبر ایک دن پہلے ہی چلدیئے۔ رہ گئے کون کہ میں اور مسٹر غلام یزدانی (یہ وہی حضرت ہیں جو حیدر آباد کے ناظم آثارِ قدیمہ ہیں۔ اور اپنے فن کے ماہر مانے جاتے ہیں) تو ہاں۔ ہم دونوں میں ٹھیری کہ رات کے تین بجے نکل چلو۔ صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچ جائیں گے۔ وہاں ناشتہ کرینگے۔ وہاں سے نکل کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ میں تغلق آباد پہنچ جانا کیا بڑی بات ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سردی اس بلا کی پڑ رہی تھی کہ خدا کی پناہ مگر ہم اُس زمانہ میں دہلی والے تھے۔ اس سردی کو بھلا کب خاطر میں لاتے۔ دلّی سے نکلے اور رات کے تین ہی بجے نکلے۔ موٹے موٹے اوور کوٹ پہنے۔ کانوں سے گلوبند لپیٹے۔ کوٹ کی جیبوں میں چبینا بھرا۔ اور چل میرے بھیّا قطب کو۔ شہر میں تو کچھ ایسی سردی معلوم نہیں ہوئی۔ مگر اجمیری دروازے سے نکل کر مزا آ گیا۔ کان تو خیر چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑ گنج سے نکلتے نکلتے ناک غائب ہو گئی۔ وہاں سے ذرا سرپٹ بھاگے۔ اور خدا خدا کر کے منصور کے مقبرے

پہنچ گئے مقبرے کے سامنے گاڑیبان گاڑیاں کھولے الاؤ جلائے مزے سے بیٹھے حقے اُڑا رہے تھے۔ ہم دونوں بھی انہی میں دھنس گئے۔ ان لوگوں کے اصرار سے حقے کے دو چار دم لگائے۔ جب کہیں جاکر ذرا سر دی دبی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا۔ اور صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچنا تھا۔ اس لئے پھر اُٹھے اور جبینا اُڑاتے آگے بڑھے۔ کچھ کچھ صبح ہو رہی تھی، کہ قطب کی لاٹ کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھی ابھی آرام خاص میں ہیں۔ طبیعت گرمائی ہوئی تھی۔ صلاح ہوئی کہ بڑھے چلو اور سب سے پہلے تغلق آباد پہنچ جاؤ۔ یہ خیال آنا تھا کہ اسپر عمل ہونے لگا۔ کوئی ساڑھے سات بجے ہوں گے کہ ہم دونوں نے یہ مہم بھی سر کر لی۔ نو بجے کے قریب ہمارے سب ساتھی بھی آ گئے۔ سہ پہر تک سب تغلق کی قبر پر اُودھم مچاتے رہے۔ کوئی چار بجے ہوں گے کہ مسٹر ہیبرٹ ویر نے کہا کہ مجھے آج ۶ بجے ایک ضروری کام ہے۔ میں تو جاتا ہوں۔ کوئی میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ اس فقرہ میں لفظ "سکتا" بہت طعن کا لفظ تھا۔ ہم دونوں کیا دبنے والے تھے۔ ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ اُس اللہ کے بندہ نے قلعہ سے نکلتے ہی جو لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تو میرا اور میاں غلام یزدانی کا نشار ہو گیا۔ ہم دونوں بھاگتے تھے مگر وہ حضرت ہم سے دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ پسینہ ناک سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں جواب دے گئے۔ آخر بھاگتے دوڑتے اُچھلتے کودتے کالکاجی تک آ ہی گئے۔ یہاں صاحب نے فرمایا "میں جاتا ہوں۔ تمہاری وجہ سے میری منزل کھوٹی ہوتی ہے۔ اب تک تو میں دہلی کے قریب پہنچ چکا ہوتا۔" ہم نے کہا "بسم اللہ کیجئے۔ اب ہم میں چلنے کا دم نہیں ہے۔" وہ تو یہ کہہ روانہ ہوئے، اور ہم نے کنوئیں کے پاس آ کر اوور کوٹ اُتارے۔ پانی پیا۔ ذرا دم لیا۔ جب کہیں جاکر اوسان دُرست ہوئے۔

ہمارے فارسی کے پروفیسر مولوی شاہجہاں تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔ فارسی بہت اچھی تھی۔ پڑھاتے بہت اچھی طرح تھے۔ لیکن تھے "دہلی والے" جانتے تھے کہ ان لوگوں کو ذرا شہ دی اور یہ ہتّے سے گئے۔ محبت کرتے تھے اور سب کو اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر کسی کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اُس زمانے میں شیشے پر پھول پتے بنانے کا شوق مجھے ہوا۔ شیشے پر میں نے ایک تصویر بنائی تھی۔ وہ ان کو بہت پسند آئی۔ کہنے لگے "فرحت ہم کو بھی کوئی چیز بنا کر لادے۔ تیری یادگار رہے گی۔ مگر بھئی تصویر نہ بنانا۔ کوئی شعر لکھ دینا۔" دوسرے یا تیسرے دن میں ایک گلاس بناکر لے گیا۔ اُسپر حافظ کا یہ شعر لکھا تھا ؂

مئے دوسالہ و معشوق چاردہ سالہ ٭ ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

مولوی صاحب نے گلاس دیکھا۔ بہت پسند کیا۔ اس کے بعد جو شعر پڑھا۔ تو بس بگڑ ہی تو گئے۔ کہنے لگے "واہ میاں صاحبزادے اپنے دادا کے برابر اُستاد کی اچھی قدر کی ہے۔ میرے لئے تجھے یہ شعر لکھتے شرم نہیں آئی۔ ذرا مجھ ستر برس کے بڈھے کو دیکھ اور اس شعر کو دیکھ۔ صاحب بہادروں کی صحبت میں رہ کر یہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا......" اور کیا کیا کہا۔ بس یہ نہ پوچھو۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ شعر لکھ دیا تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں سُنکر جب غور کیا تو اُس وقت معلوم ہوا کہ لاحول ولا قوۃ کیا بیہودگی ہوئی ہے۔

میں بی۔ اے کے ابتدائی سال میں تھا کہ "بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" یعنی مشن کالج میں ایک ایسا شخص آیا جس پر نہ صرف

مشن کالج بلکہ تمام ہندوستان کو فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کون کہ ریورنڈ سی۔ ایف۔ اینڈ روز۔ انھوں نے آتے ہی کالج کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور بتادیا کہ دُنیا میں خودداری بھی ایک چیز ہے۔

ان کے زمانے کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر میں کہنے بیٹھوں تو دنوں میں ختم نہ ہوں۔ وقت کم ہے اس لئے ایک واقعہ سُن لیجئے۔ ہوا یہ کہ ہم لاہور جارہے تھے۔ دوسرے روز یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں کرکٹ میچ کھیلنا تھا مسٹر اینڈ روز بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے زبردستی انکو سیکنڈ کلاس میں بٹھایا تاکہ ہماری آزادی میں کھنڈت نہ پڑے۔ انٹر کی صرف ایک ہی گاڑی تھی۔ ساری کی ساری پر ہم ۱۳۔۱۴ لڑکوں نے قبضہ کرلیا۔ خوب پھیل پھیل کر لیٹے۔ ایک درجے میں ہم ۳ لڑکے تھے۔ میں۔ بلند اقبال اور حسین مرزا۔ کوئی ایک بجے رات کو گاڑی بھٹنڈہ پہنچی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ انگریزی باجہ بج رہا ہے۔ اور ایک زبردست برات سوار ہونے کو پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ بلند اقبال نے حسین مرزا سے کہا "مرزا ذرا دروازہ روک کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کو آنے نہ دینا" چونکہ ہمارا ہی درجہ بالکل سامنے تھا۔ اس لئے اسی پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سخت حملہ ہوا۔ مگر حسین مرزا کیا ماننے والی اسامی تھا۔ اُس نے دروازے کو اپنے بھر نہ کھلنے دیا۔ اسی کشمکش میں کسی نے اسکو گالی دیدی۔ گالی کا دینا تھا کہ حسین مرزا قلانچ مار بھوکے شیر کی طرح اُس گالی دینے والے پر جا پڑا۔ اس کا اس طرح گرنا اور سب لڑکوں کا درجے کھول کھول کر کے باہر نکلنا! خوب چلی۔ مگر لڑکوں کے مقابلے میں بھلا یہ برات والے کیا ٹک سکتے تھے آخر بھاگے اور "مُلا کی دوڑ مسیت" پر عمل کر کے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ وہ صاحب بہادر چند سپاہیوں کو لیکر گاڑی کی طرف آئے اور آتے ہی گڑبڑ مچادی۔ پولیس والوں کو حکم دیا کہ سب لڑکوں کو گاڑی سے اُتار دو۔ اِدھر پولیس والوں سے ہماری چل رہی تھی اُدھر مسٹر اینڈروز گاڑی سے اُترے۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے آئے۔ اسٹیشن ماسٹر کے گلے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا اور کہا "چلے جاؤ یہ میری ٹیم ہے" اسٹیشن ماسٹر صاحب چکرائے کہ یہ کون حضرت ہیں۔ جو مجھ وردی پہنے ہوئے افیسر سے بھی اس گستاخی کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ انھوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر بلند اقبال سے پوچھا جب انکو معلوم ہوا کہ یہ مسٹر اینڈروز ہیں تو وہ اپنے سپاہیوں کو لے رخصت ہوئے۔ وہ تو اُدھر گئے اور اِدھر مسٹر اینڈروز نے پلیٹ فارم پر غصہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ وہ ٹہل ہی رہے تھے کہ ایک بڑے میاں نے مجھ سے آکر کہا "میاں ہمارے پاس انٹر کے ٹکٹ ہیں۔ ہم تھرڈ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دولھا کو اپنے پاس انٹر میں بٹھالو" میں نے کہا "کیا ہرج ہے۔ ہماری تمہاری خدانخواستہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ زبردستی اس وقت بات بڑھ گئی" اُن بڑے میاں نے دولھا میاں کو بُلا ہمارے درجہ میں بٹھادیا۔ ہم نے بھی اس کے لئے اپنا پورا بنچ خالی کردیا۔ دولھا میاں کو وہاں بیٹھے کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ مسٹر اینڈروز ٹہلتے ہوتے ہمارے درجہ کی طرف آئے جُھک کر کیا دیکھتے ہیں کہ دولھا میاں نہایت ٹھاٹھ سے ایک بنچ پر بلا شرکت غیرے قابض۔ ہنسکر ذرا اُونچی آواز میں کہا "شریروں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد تم اس کی گندی کردگے" شادی والوں میں بعض لوگ انگریزی جانتے تھے۔ وہ ہمارے سر ہوگئے۔ کہ دولھا کو اُتار دو۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ مسٹر اینڈروز نے بھی ہماری تائید کی اور کہا کہ لڑکے کو

بیٹھا رہنے دو۔ میں نے صرف اس وجہ سے دخل دیا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر اپنا زور دکھانے آیا تھا۔ اگر سیدھی طرح کہتا تو میں خود جگہ دلا دیتا۔ مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ آخر دولھا کو ہمارے درجہ سے اُتار تھرڈ کلاس میں ٹھونس دیا۔

مسٹر اینڈ روز کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کی خودداری کو صدمہ پہنچایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل عہدہ داروں سے صاف نہیں ہے۔ اگر ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے تو ہندوستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ وہ اب سیاسیات میں پڑ گئے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نقطۂ نظر اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی ان سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ کرے گا۔

مسٹر اینڈ روز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ بہہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی اِن میموریم کا پڑھانا ان کے ذمہ تھا۔ ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں ایک صفحہ کی جو افتتاحی نظم ہے اس کو انھوں نے سو دن میں پورا کیا تھا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان کر کے۔ اور حضرت امام غزالی ابن عربی۔ مولانا روم اور گیتا کے حوالے دے کر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے۔ تو آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان باتوں میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چیں ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی شخصوں کو دیکھا ہے۔ ایک مسٹر اینڈ روز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حماسہ۔ معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ ان دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرنے کے لئے نہیں تھا۔ عالم بنانے کے لئے تھا۔ اور ان سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دُنیا میں ان دونوں کی عزت اِنکی علمیت کی وجہ سے ہو نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔

الغرض ہمارے تین طرح کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ہیبرٹ ویبر کہتے تھے کہ دماغی ترقی کرنے کے لئے "پڑھو۔ پڑھو۔ اور پڑھو" مسٹر ڈےؔ کہتے تھے کہ جسمانی ترقی کے لئے "کھیلو۔ کھیلو۔ اور کھیلو" اور مسٹر اینڈ روز فرماتے تھے کہ اپنی عزت قایم کرنے کے لئے "لڑو۔ لڑو۔ اور لڑو"

عرض کہاں تک سناؤں وقت کم اور داستان بڑی ہے اسلئے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک پڑھانے والے پڑھنے والوں سے محبت کا برتاؤ نہ کریں گے جب تک اُنکی خودداری کو قائم نہ کریں گے جب تک ان کے اطوار اور عادات کا خیال نہ رکھیں گے۔ اور انکی جسمانی ترقی کو بھی تعلیم کا ایک جزو نہ سمجھیں گے اسوقت تک کبھی یہ نہ کہا جائیگا کہ اُنھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام دیا۔ اور جب تک پڑھنے والے ان پڑھانے والوں کی محبت کی قدر نہ کرینگے۔ جب تک اپنی دماغی تعلیم کے ساتھ اپنی صحت جسمانی کا خیال نہ رکھیں گے اور جبتک یہ نہ سمجھیں گے کہ خودداری بھی ایک بڑا جوہر انسانی ہے اسوقت تک نہ دُنیا میں کبھی انکی قدر ہوگی اور نہ یہ کہا جا سکے گا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

(بہ اجازت ڈائریکٹر صاحب دلّی ریڈیو اسٹیشن دہلی) — مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

بی ہمسائی

بحسنِ خلق توان کرد صید اہلِ نظر ؎ بہ بند و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

یہ وہی بی ہمسائی ہیں جنہوں نے مولوی افراسیاب بیگ کے ہاں بدیع الزماں اور ان کی بیوی کی کیچلی بدلنے کی خبر پہنچائی تھی جس دن سے سرتاج بانو بدیع الزماں کے ہاں بیاہی آئی تھی۔ اور شادی کے موقع پر بی ہمسائی کی بات تک بھی نہ پوچھی گئی تھی۔ اُسی دن سے بی ہمسائی خفا ہوگئی تھیں اور زیادہ خفگی کا باعث انکے بے تکے چال چلن ہوئے تھے۔ یہاں نری بی ہمسائی ہی نفرت کرنے والی نہ تھیں بلکہ سارا محلہ خفا سا ہوگیا تھا۔ یہ زیادہ تر ان لوگوں کی بے پردگی کی وجہ تھی۔ محلہ میں جو لوگ آباد تھے وہ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ اور پرانے رسم و رواج کے پابند تھے۔ ان کی نظر میں بے پردگی۔ چوری اور دوسرے بے حیائی کے کاموں سے بھی زیادہ ناقابلِ معافی گناہ تھا خیر ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو تو بی ہمسائی کا قصّہ کہنا ہے۔ بی ہمسائی کے مکان کی ایک طرف کی دیوار بدیع الزماں کے مکان سے ملحق تھی۔ کوٹھے پر سے دیوار پر کھڑے ہوکر ان کے مکان کا اچھا خاصہ حصّہ نظر آتا تھا۔ بی ہمسائی کے گھر میں چار آدمی تھے اور ایک شیر خوار بچّہ۔ دو میاں بیوی، اور ماں بہن۔ میاں چھتریوں کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ دُکان نئی سڑک پر تھی۔ روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ کما لیتے تھے۔ اس میں گھر کا خرچ بمشکل چلتا تھا۔ مکان اور دُکان کا کرایہ نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ بی ہمسائی پہلے تو بدیع الزماں کے گھر میں آیا جایا کرتی تھیں۔ اور دیوار پر کھڑے ہوکر بھی بات چیت کرتی تھیں۔ مگر وحید الزماں کی شادی کے بعد سے اُنہوں نے ملنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ یہ کبھی ان کی پیسے دھیلے کی شرمندہ نہ تھیں۔ ہاں حصّہ بقدر حسبِ حیثیت دونوں طرف سے جاری تھا۔ اب بھی کبھی وہ دیوار پر کھڑی ہو جاتی تھیں اور ان کے گھر میں جھانکتی تھیں اور بُرے بُرے مُنہ بنایا کرتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ خصوصاً سرتاج بانو پر جب نظر پڑتی تھی تو بہت چراغ پا ہوتی تھیں۔ مگر اِدھر سے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تھا اور انکی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بی ہمسائی حسبِ معمول دیوار پر کھڑی گھریاں گھونٹ رہی تھیں، ان کی پُشت پر جو دیوار تھی اس پر بندر آن بیٹھا جب انہوں نے ادھر مُنہ اٹھا کر دیکھا تو اس کمبخت نے دانت نکال کر خیں کی اور ان کی طرف جھپکا۔ بی ہمسائی کے تو آتے اوسان جاتے رہے۔ بے تحاشا زینہ کی طرف بھاگی پاؤں میں ایک بر کے پائنچہ کا پاجامہ تھا وہ اُلجھا اور یہ دھڑام سے ساری سیڑھیوں پر سے لڑکتی ہوئی نیچے جا پڑیں، سر دہلیز سے ٹکرا کر پھوٹ گیا اور خون جاری ہوگیا۔ انھوں نے ہائے ویلا کا شور مچایا۔ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر والے دوڑے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے۔ لیجا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ علاج معالجہ کی فکر کی۔ مگر ان کا رونا پیٹنا نہ تھمنا تھا نہ تھما۔ اتنا پیٹیں کہ باہر گلی والے جمع ہوگئے۔ یہ کہہ کہہ کر روتی تھیں۔ "ہائے میں مرگئی۔ میرا دم نکل گیا میرا سر پھوٹ گیا۔ ہائے کوئی خدا کا بندہ جا کر ننھے کے باپ کو خبر کر دے۔ مرتے وقت میری صورت تو دیکھ لیں" ایک لڑکے نے باہر سے جو یہ سُنا تو یہ سمجھا کہ واقعی بی ہمسائی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ان کے میاں کی دُکان جانتا تھا۔ سرپٹ اُدھر دوڑ پڑا۔

اب یہاں کا قصّہ یہاں چھوڑیئے اور سرتاج بانو کی طرف متوجہ ہوئیے۔ جب سرتاج بانو نے یہ غُل غپاڑہ سُنا تو بے چین

ہوگئی۔ ماما سے کہا کہ جلدی جا اور بی ہمسائی کی خبر لا۔ اس نے آکر کہا۔ ہمسائی کوٹھے پر سے گر پڑی ہیں اُن کا سر پھٹ گیا ہے خون بہہ رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی سرتاج بانو بیتاب ہوگئیں۔ وحید الزماں سے کہا ڈارلنگ تم ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو اور کہدو کہ اس کام کے متعلق سامان لے کر فوراً آجائیں موٹر بھیجدو۔ میں ہمسائی کے ہاں جاتی ہوں اور ان کی خبر لیتی ہوں۔ یہ یوڈی کولون کی بوتل ہاتھ میں کپڑا کوٹن وول ساتھ لے ہمسائی کے گھر جا پہونچیں۔ وہاں سب کے سب ششدر رہ گئے کہنے لگی رونے پیٹنے سے کچھ فائدہ نہیں میں نے ڈاکٹر کو موٹر بھیجی ہے وہ ابھی آتے ہونگے۔ اتنے میں ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں۔ جلدی سے روئی نکال پانی میں بھگوئی اور زخم کو دھویا۔ پھر یوڈی کولون میں روئی بھگو کر زخم کو خوب صاف کیا اور روئی وہاں رکھدی۔ کسکر کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ خون اسی وقت رُک گیا۔ زخم کچھ گہرا نہ تھا۔ بالکل سطحی تھا۔ خود ان لوگوں کے پاس بیٹھی رہی تسلی تشفی کرتی جاتی تھی اور ایک ہاتھ سے مریضہ کو پنکھا جھلتی جاتی تھی۔

اب بی ہمسائی کے میاں کا حال سُنیئے۔ میاں دُکان پر ٹوپی اُتارے بے فکر بیٹھے ہتوڑی ہاتھ میں لے دھڑا دھڑ جھٹر یونکی مرمّت کر رہے ہیں۔ اتنے میں لڑکے نے آن کر ایک بھیانک آواز میں یہ کہا۔ میاں کیا بیٹھے ہو تمہاری بیوی تو کوٹھے پر سے گر پڑیں سر پھٹ گیا اور مر گئیں۔ بھلا ان کو یہ سُننے کی کہاں تاب تھی۔ بے چین ہو گئے، ہتوڑی ہاتھ کی ہاتھ ہی میں رہی اور ٹوپی اپنی جگہ۔ جوتی بھی پاؤں میں نہیں ڈالی۔ سیدھے دوڑتے ہوئے گھر کی طرف ہولئے۔ سر برہنہ ہیں ہاتھ میں ہتوڑی ہے اور ہاتھ اوپر کو اُٹھا ہوا ہے۔ اور یہ بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سر کے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ عجب تماشا نظر آتا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں ہے۔ بیوی کے غم میں بیتاب ہیں۔ مُنہ اُٹھا ہوا ہے۔ سینہ نکلا ہوا ہے اور بھاگ رہے ہیں۔ راستہ میں بیچ سڑک پر دو سانڈ لڑ رہے تھے۔ آدمیوں کی سڑک کے دونوں طرف بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر سے بچکر گذرنا ناممکن تھا۔ لوگ لاکھ روکتے رہے مگر ان کو اپنے آپے کی بھی خبر نہ تھی۔ بلا تامل بجاروں کے بیچ میں گھس گئے۔ ایک سانڈ کے ریلے میں آکر دُور جا پڑے ہتوڑی جو ہاتھ میں تھی وہ کھٹاک سے ماتھے پر جا لگی اور خون بہنے لگا۔ کیوں نہ ہو جب لیلیٰ کے فصد کھلی تھی تو مجنوں کے اپنے آپ خون جاری ہوگیا تھا۔ یہ کوئی مجنوں سے کم تھوڑی ہیں۔ لوگ ہزار روکتے رہے اور خون پوچھنا چاہا۔ مگر ان پر تو بیوی کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ پھر دوڑ پڑے، خون میں کُرتہ کیا پاجامہ تک تر ہوگیا۔ مگر کسی طرح گھر لے لیا۔ گھر میں جو گھُسے تو بیوی اچھی خاصی بھلی چنگی۔ زندہ سلامت پلنگ پر پڑی ہوئی ہنس رہی تھیں۔ میاں نے جو یہ حال دیکھا تو ان میں جان آگئی۔ مگر بیوی نے میاں کو جو خون میں نہایا ہوا پایا تو چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ بی ہمسائی کی مرہم پٹی کر چکے تھے اور ان کی بابت سرتاج بانو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ یہ ماجرا دیکھکر ڈاکٹر صاحب اور سرتاج بانو پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا بُجھا کر گھر والوں کا رونا پیٹنا بند کرایا اور بی ہمسائی کے میاں کی مرہم پٹی کر کے ان کو دوسری چارپائی پر ڈالدیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُن کا زخم بھی کچھ شدید نہ تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب یہاں سے روانہ ہونے لگے۔ بی ہمسائی کو ان کے دینے لینے کی فکر ہوئی۔ گھر میں ٹکا نہ تھا۔ سرتاج بانو سمجھ گئیں۔ ان سے کہا۔ یہ تو ہمارے گھر کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو دینے لینے کا خیال نہ کرنا۔ یہ پہلے ہی سے گھر کی حالت دیکھ جان گئی تھیں کہ وہ سب بہت مغلوک الحال ہیں اُسنے

خیال کیا کہ جب گھر کا کماؤ بیمار پڑا ہوا ہے تو یہ کہاں سے خرچ چلائیں گے۔ یہ سوچکر گھر آئی اور پچاس روپے کے نوٹ لیکر پھر جا پہنچی اور چپکے سے بی ہمسائی کے ہاتھ میں دیدئے۔ وہ انکار بھی کرتی رہیں مگر اُس نے ان کو سمجھا دیا اور کہہ دیا کہ روپیہ واپس کرنے کی فکر نہ کرنا۔ اب بی ہمسائی سمجھیں کہ جس لڑکی سے یہ نفرت کرتی تھیں۔ وہ کس اعلیٰ خوخصلت کی ہے۔ اور وقت پڑے پر کس طرح غریبوں کے کام آتی ہے۔ اب ان کی ساری نفرت محبت میں مبدّل ہوگئی۔ تھوڑے دنوں میں دونوں میاں بیوی بھلے چنگے ہوگئے اور بی ہمسائی سرتاج بانو کے پاس آنے جانے لگیں۔ سرتاج بانو نے ان کی فلاکت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ ایک دن ان سے بہت احتیاط سے کہ ان کو ناگوار نہ گزرے ان کے گھر کا حال دریافت کرنے لگیں۔ بی ہمسائی نے کہا۔ بیوی کیا پوچھتی ہو۔ بڑی مصیبت سے گزران ہوتی ہے۔ ہم چار دم ہیں اور ایک کمانے والا۔ کماتے کماتے ہارا جاتا ہے مگر پوری نہیں پڑتی۔ خیر خدا کا شکر ہے دال روٹی کھا لیتے ہیں اور بُرے بھلے حال تن ڈھک جاتا ہے۔ مگر میری نند سیانی ہوگئی ہے۔ اُس کی شادی کا ہم سب کو بڑا فکر ہے نسبتیں جگہ جگہ سے آتی ہیں۔ مگر ہم ٹال دیتے ہیں۔ شادی کریں تو کیونکر کریں۔ آخر چار برتن اور چار جوڑے تو ہونے چاہئیں۔ عمر بھر کنبے قبیلے والوں کا کھایا ہے۔ چار آدمیوں کے ہاتھ بھی دُھلانے پڑیں گے۔ اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو یہ کنواری بیاہی جائے۔ رات دن اِسی فکر میں ہمارا خون خشک ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ سرتاج بانو چپکی بیٹھی سُنا کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمسائی سے پُوچھا تو یہ پوچھا کہ کیا تمہارے میاں کو کچھ لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ اس نے جواب دیا کچھ تھوڑی بہت اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں مگر انگریزی کا حرف بھی نہیں جانتے۔ یہ باتیں کرکے بی ہمسائی رُخصت ہوئیں۔ سرتاج بانو اسی وقت بدیع الزماں کے پاس گئیں۔ اور کہا کہ ابّا جان بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے پڑوس میں لوگ فقر و فاقہ میں گزران کریں اور ہم پیٹ بھر کے روٹی کھائیں اور اُن کی کچھ بھی فکر نہ کریں۔ کیا خدائے تعالیٰ کی نعمت کا اسی طرح شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بدیع الزماں بولے کہ دُلہن آخر بات کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کے پڑوس میں جو بی ہمسائی رہتی ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے کو بھی نہیں ہے۔ بولے آخر میں کیا کروں۔ جو کہو میں اُن کے واسطے کرنے کو موجود ہوں۔ سرتاج بانو نے کہا۔ آپ کے ہاں بیسیوں منشی ٹھیکہ داری کے کام میں نوکر ہیں۔ آپ ان کو بھی نوکر رکھ لیجئے۔ کہنے لگے وہاں تو لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ یہ بولی وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کام چلا دیں گے۔ بدیع الزماں نے کہا۔ دُلہن مجھے ایک آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ بلا لو ابھی نوکر رکھے لیتا ہوں۔ اُس نے ماما کو بھیج اُسی وقت ہمسائی کے میاں کو بلا لیا اور بدیع الزماں نے تھوڑا بہت پوچھ گچھ کر ان کو پچاس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ ہمسائی نے جب یہ سُنا تو خوشی کے مارے پھُولی نہ سمائی اور عمر بھر کے واسطے اِس لڑکی کی ممنونِ احسان ہوگئی اور دُعائیں دیتی رہا کی۔ اِس طرح سرتاج بانو کے ہاتھ سے ایک غریب خاندان کے دلدّر پار ہوگئے۔

خواجہ عبدالمجید دہلوی

رفتارِ زمانہ:۔ خواجہ عبدالمجید صاحب کے ایسے ہی چھ دلکش افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ بجائے خود مکمل اور سلسلہ کی دلچسپ کڑی بھی ہے۔ زبان دلّی کی ٹکسالی اور نتھری ستھری ہے۔ آٹھ آنہ قیمت ہے۔ نو آنے کے ٹکٹ بھیج کر ساقی بکڈپو۔ دہلی سے طلب کیجئے۔

ترقی پسند مصنفین

پنڈت جواہرلال نہرو نے ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ترقی پسند ادب پر حسب ذیل تقریر کی تھی۔

ادب پر رائے دینے کا مجھے حق تو نہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مجھ سے بھی کم حق رکھنے والے لوگ رائے دیتے رہتے ہیں تو مجھے بھی جرأت ہوتی ہے کچھ کہنے کی۔ مجھے دو تین کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے لیکن میرے پاس ان کاموں کیلئے اب وقت نہیں ہے۔ بڑی طاقت زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوتی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کیلئے لکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہر شخص دے سکتا ہے ان کو بار بار دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سُن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ رہ کیوں رہے ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی کا؟ زندگی کا مقصد ایک ہے اور وہ یہی ہے کہ اس کی تصویر میں دیکھئے یہ بات کہ جانے الگ الگ ہیں، جو لوگ دَسل ہوتے ہیں ڈاکٹر ہوتے ہیں، پروفیسر ہوتے ہیں یہ سب الگ الگ ہیں یا کہ زندگی کی تصویر ایک مکمل تصویر ہے اور یہ سب اس کے حصے ہیں؟ اگر یہ سب تصویر کے جزو ہیں تو ان کو زندگی کی تصویر سے ملا ہونا چاہئے۔ اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو زندگی کی تصویر سے الگ ہو کر ڈھونڈنا چاہیں گے تو ہم بھٹکتے رہیں گے۔ اور کوئی سیدھا راستہ مل سکے گا

تم کیوں لکھتے ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روٹی کھانے کو۔ جواب صحیح ہے۔ اور بہت سے لوگ یہی کہیں گے لیکن یہ جواب کوئی بنیادی جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ جواب یوں دیں گے کہ ہم صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ کچھ بھی ہو مگر اسی لئے لکھتے ہیں یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ہم لکھتے ہیں تاکہ لوگوں کی طبیعت بہلائیں۔ طبیعت بہلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو مصیبت میں پھنسا ہو کچھ دیر کیلئے اس کو بھلاوے میں ڈال دیں اس کے دل سے درد و دُکھ تھوڑی دیر کیلئے نکال لیں۔ جب پڑھنے والا ایسے ادیب کی چیز کو پڑھتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور کچھ دیر کیلئے اپنی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے، گویا ایسے ادب کا دوسرا نام بھُلاوا ہے۔ جب ہم موجودہ پریشانیوں سے بہت گھبرا جاتے ہیں تو سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر کیلئے دُنیا کو بھول جاتے ہیں اور ہمارا تھکا ماندہ دماغ بہل جاتا ہے۔ ایسا بھی ادب ہوتا ہے لیکن یہ کچھ بڑا کارنامہ نہیں ہے معقول آدمی کا کام ہے کہ وہ زور زبردستی دیکھے۔ ایسا ادب بہت جلد ختم ہو جاتا ہے جیسے سینما میں ہم تماشہ دیکھنے میں اس وقت بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس وقت کہانی پوچھے تو بتا بھی دیں گے۔ لیکن دس روز کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والے کے لئے جب تک کوئی بڑی بات کوئی نئی بات نہ ہو پڑھنے والے کے دل پر کوئی گہرا اثر نہیں کر سکتی۔ دُنیا میں بہت سے لکھنے والے گذرے ہیں۔ لیکن ان کی وہی کتابیں باقی رہیں جن میں کوئی بڑا مسئلہ تھا جن میں دُنیا کے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اب میں پھر اسی سوال کو دُہراؤں گا کہ آپ کے سامنے دُنیا کی تصویر کیا ہے؟ اگر وہ ایک مکمل تصویر ہے تو وہ کیسی ہے؟ آپ کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ کہاں لیجانا چاہتے ہیں؟ یہ تصویر اگر صاف ہے اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں اور پڑھنے والے کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں تو اس کی لکھی ہوئی چیز زیادہ اچھی ہوگی۔ انسان کا دماغ موجودہ دُنیا سے نکل کر پرواز کرتا ہے۔ اس کے عجیب و غریب خیالات۔ اس کی عجیب عجیب خواہشیں اس کو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتی ہیں۔ جو آجکل کی دُنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ اور جہاں وہ تمام مسئلے حل ہوتے ہیں جو اس دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ ان کا تخیل عجب چیز ہے وہ اس دماغی دُنیا کو رنگ دیکر ایک مکمل تصویر بنادیتا ہے۔ اور آدمی بے چین ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ جائے۔

انسان میں سوچنے کی قابلیت تو زیادہ لیکن کرنے کی کم ہے۔ اس لئے بہت سے لکھنے والے دماغی دُنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اسی میں گھرے بیٹھے ہیں۔ لیکن ان کو نہ وہاں پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی دماغی دُنیا ایک خانے میں رہتی ہے۔ اور واقعی دُنیا دوسرے خانے میں۔

زیادہ ہمت ور لکھنے والے ان دونوں دُنیاؤں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دُنیا وہ نہیں ہے جو اُن کے دماغ میں ہے یعنی وہ نہیں کر سکتے جو اُن کے دماغ میں ہے تو اُن کے دماغ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے؟ اگر پہنچ سکتے ہیں تو اس کا کیا راستہ ہے؟

یہ سوال پہلے زمانہ کے لکھنے والوں کے ذہن میں بھی اٹھا۔ لیکن ان کو دماغی دُنیا تک پہونچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس وقت انھوں نے اپنی کتابوں کو خیالی دُنیا "یوٹوپیا" (Utopia) بنایا۔ یعنی اگر کرنے کی طاقت ہوتی تو ہم ایسا ایسا کرتے، ایسی ایسی دُنیا بساتے۔ ان دُنیاؤں کو بسانے کے لئے کبھی الدین کا چراغ نکالا اور کبھی اُڑن کھٹولا تیار کیا۔ یہ لوگ مجبوراً اصلی دُنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اور خیالی دُنیا میں زندگی بسر کرتے رہے۔

لیکن اب دُنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس دماغی دُنیا تک پہونچنے کی صورتیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً پہلے کے لکھنے والوں کو نظر آتا تھا کہ غریبی اور امیری کی تفریق ہمیشہ رہنے والی ہے کیونکہ دُنیا میں اتنی دولت ہی نہیں تھی جو اس تفریق کے دُور کرنے کی کوشش کرنے تک ذہن پہونچتا۔ لیکن اب سائنس، صنعت و حرفت اور اسباب نقل و حرکت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ مصیبتیں دُور ہو سکتی ہیں، اور ایسی دُنیا بنا سکتے ہیں جہاں ہر انسان کو ترقی کے یکساں موقعے مل سکیں۔ جب ایسی کوشش ہو سکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے، کیوں ایسی صورتیں نہ نکالیں جو دماغی دُنیا کو موجودہ دُنیا کے قریب لے آئیں۔ اب ہم ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں پُل بنا سکتے ہیں۔ ہم اس اچھی دُنیا تک کیوں نہیں پہونچتے۔ وہاں تک پہونچنے میں زیادہ تر لوگوں کا قائل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے وہاں تک نہیں جا سکتے۔ اور زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو وہاں جانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ انھوں نے ابھی اس دُنیا کو محسوس نہیں کیا ہے۔۔

ہم دماغی دُنیا تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ دُنیا کا نہیں۔ مجموعی طاقت ہمارے پاس ہے کہ ہم وہاں تک پہونچ سکیں، سماج کے ہاتھ اتنے پھیل سکتے ہیں کہ وہ دُنیا ہمارے قبضے میں آ جائے۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ ترقی پسند مصنف وہ ہے جو اس ہونے والی دُنیا اس "نوزائیدہ دُنیا تک پہونچ گیا ہے" اب اس دُنیا کو واقعی دُنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے چاہتا ہے کہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ وہاں تک کھینچ لے جائے۔

موجودہ دُنیا کو اس خیالی دُنیا تک لیجانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں مثلاً سیاسی حضرات ہیں انکی بھی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن سیاسی حضرات اور اسی قسم کی کوشش کرنے والے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ دے نہیں سکتے۔ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑی بڑی باتوں کو روزمرہ کی چھوٹی باتوں کے جنگل سے الگ کر کے سماج کو دکھا سکتا ہے۔

مثلاً آج کل ایک سوال اُردو ہندی کا ہے، یہ جھگڑا ایسا ہے جس نے ملک کی نگاہوں کو پھنسا لیا ہے۔ لوگ بڑی باتوں کو بھول کر اس میں رہ گئے ہیں۔ اگر اس سوال کے حل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو نئے نئے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات اس قدر برانگیختہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس پر صفائی سے غور نہیں کر سکتے اگر کوئی اس کو حل کرنا چاہتا ہے تو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی چالبازی ہے۔

ادیب کی پہونچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاستداں کی نہیں، اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لیکر وہ خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دُنیا تک پہونچ جاتے ہیں۔ جب لوگ دماغی طور پر وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہونچنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں ہے تو میں اس کو آرٹسٹ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر اسکی انفرادیت ایسی ہے کہ وہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ہلاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے، اس کی اکیلی طاقت سماج کو آگے نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں قوم کی طاقت آ جاتی ہے اور وہ دُنیا کو ہلا دیتی ہے۔ گذشتہ دَور میں جتنے بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہوئے ہیں شیکسپیر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے دَور کے سماج کے نمائندہ تھے۔

آجکل کی دُنیا میں انفرادیت دبائی جا رہی ہے۔ اس زمانہ میں انفرادیت ترقی نہیں پا سکتی۔ کیونکہ ہر ایک کو ترقی کرنے کے موقعے نہیں میسر آتے۔ جب کھانا پینا، رہنا سہنا میسر نہیں، تعلیم نہیں، سوچنے کیلئے وقت نہیں تو انفرادیت کیسے ترقی پائیگی۔

پچھلی دُنیا میں پھر بھی ان لوگوں کو موقع حاصل تھا جو روپیہ رکھتے تھے اور اختیارات رکھتے تھے لیکن اب زمانہ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں خیالات کی ترقی کا اور انفرادیت کی ترقی کا موقع ہے غلط ہے۔

لکھنے والا کیوں لکھتا ہے، اس لئے کہ اس کے دماغ میں ایک دُنیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا تک پہونچ ہو سکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اوروں کو بھی یہ دُنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل باندھا جائے۔ زمانہ کے شاہکار اسی طرح کے پُل ہوتے ہیں۔ پہلے تو پڑھنے والے حسرت سے خیالی دُنیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر اُدھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص نعرے دُہرانے لگتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ایک زبردست خیال پیدا کر دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کیلئے یہ دُنیا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات۔ اور نہ کوئی خاص پیغام؛ ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔

ہندوستان کی انجمن ترقی پسند کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اور انھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں حالانکہ ان کاموں کو ناپا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ انقلاب فرانس میں والٹیر کے ایسے ادیبوں کا بڑا دخل ہے، اس کا اثر انقلاب کے بعد سو برس تک باقی رہا۔

آنیوالے انقلاب کیلئے ملک کو تیار کرنا، اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلہ کو حل کیجئے ان کو راستہ بتلائیے۔ لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جانا چاہیئے نہ کہ منطق کے ذریعہ آپ کی بات ان کے دل میں اُتر جانا چاہیئے۔ آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے وہ آدمی کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر منطق اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں اسی لئے انجمن ترقی پسند کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے۔ اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

جواہر لال نہرو

دامنِ بہار

کارپردازانِ قدرت نے اپنے چولے بدل ڈالے۔ درخت سرسبز ہوئے۔ کونپلیں پھوٹیں، شگوفے کھلے اور دامانِ بہار پر قدرت نے ایسے گل بوٹے کھینچے کہ چپہ چپہ آئینہ حسن بن گیا۔

زمین کی گود سے پھل پھول اُبل پڑے۔ سبزۂ نوخیز مستانہ وار انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا۔ اور اپنے چاروں طرف زنگاری رنگ کی گلریزی دیکھکر خوشی سے جھومنے لگا۔

شفاف ندیاں چپ چپ کرتی پھولوں کے گلدستے اُچھالتی۔ اِٹھلاتی بہنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما پرند پھولوں کی پنکھڑیاں اپنی ننھی ننھی سی چونچوں میں لئے ایک دوسرے سے گل بازیاں کرنے لگے۔ جو کلی آنکھ کھولتی ہے اپنے آپ کو پھولوں بنی دولت سے مالامال پا کر بے اختیار ہنس پڑتی ہے، غنچے غنچے کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ گذرگاہیں تک معطر ہیں اور خوشبو کے قافلے لدے پھندے ہواؤں کے کندھوں پر سوار جھکتے مہکاتے اُڑے چلے جاتے ہیں۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

سچی کہانی

وہ شوقِ ناشکیب کی گستاخ دستیاں
اُٹھنا وہ درمیان سے پردہ حجاب کا
وہ حسنِ شرمگیں کی ادائے سپردگی
وہ ارتعاشِ کیف لبِ کامیاب کا
ارماں بھرے دلوں کی وہ خاموش گفتگو
وہ ہمد گرفتارِ علاجِ اضطراب کا
وہ چاندنی سی چاکِ گریباں سے ضوفگن
وہ نوشِ لب میں کیفِ بہشتی شراب کا
چھایا ہوا حواس پہ وہ کیفِ بےخودی
تکمیلِ ہر ہوس وہ تقاضا شباب کا

سب واقعات ہیں مگر اللہ رے انقلاب
اب ان پہ ہے گماں کسی رنگین خواب کا

پریم پجاری

جنازہ

(۱)

جنوری کی ایک سرد رات، باہر آسمان پر بادل ایک خاموش استقلال سے مسلط تھے۔ چمن کے سوکھے پتے دریچے کے باہر خنک ہوا سے رہ رہ کر بے قرار رہتے اور شور مچا رہے تھے۔ ایسے وقت میں میں اپنی چینی نشست گاہ میں ایک اونچے برقی لیمپ کے نارنجی رنگ کے نیچے ایک مخملی آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی اور "بغداد ٹائمز" کے بڑے بڑے صفحے کھولے مختلف عنوانوں پر نظر ڈال رہی اور بیرونی دنیا کے وحشت خیز اثر کو مطالعہ کی دلچسپی میں محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے آتشدان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں۔

اتنے میں میری بوڑھی قدیم حبشن زونا شن اندر آئی اور میری رفاقت کیلئے ایک چھوٹی سی میز پر قہوہ کا سامان رکھ کر آہستہ سے پھر باہر چلی گئی۔ رفتہ رفتہ برآمدے سے اس کی نقرئی چوڑیوں کی جھنجھناہٹ اور عمر خیام کے اشعار کی گنگناہٹ بند ہو گئی۔ خاموشی جس میں عناصر کی بے چینی کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی دمبدم ایک بوجھ کی طرح روح پر بیٹھی جا رہی اور دل میں طرح طرح کے اوہام و وساوس بیدار کر رہی تھی۔

یکلخت دروازے پر ایک محتاط دستک نے مجھے چونکا دیا۔ آپ جانتے ہیں میں ایک بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور عام مشرقی لڑکیوں کی طرح بیحد اوہام پرست، یہی وجہ ہے کہ میں اخبار ہاتھ سے دور پھینک کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس ویران اور وحشت ناک رات میں ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کیا شے دروازے کو اس ڈھنگ سے کھٹکھٹا سکتی تھی۔ میں گھبرا کر نشست گاہ سے باہر نکل آئی اور دروازہ کی طرف نظر اٹھائی۔ اس کے شیشوں میں سے ایک دہکتے ہوئے سگار کو دیکھ کر میرا اثر دور رفع ہو گیا۔ کسی ان دیکھے وقت محتاط دستک کے ساتھ سگار کا نظر آ جانا سب کا سب صرف بوڑھے ڈاکٹر گار کی آمد کی علامات تھیں۔ میں ایک روحانی اطمینان سے دروازے کی طرف لپکی اور چٹخنی کھول دی۔

"سلام شوق ڈاکٹر!" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "کیا شہر میں امراض کی بہت کثرت ہے جو آپ عید کا چاند بن گئے ہیں"

ڈاکٹر اپنے چسٹر پر سے مفلر اتارتا ہوا بولا "ڈاکٹر کبھی اپنے وقت کا مختار نہیں ہوتا بیٹی روحی!"

"روحی" میرا افسانوی نام ہے۔ میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی "آپ کی اس بے اختیاری نے اس وقت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس طوفانی رات کی تنہائی سے گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ آیئے اندر آیئے۔ آگ دہک رہی ہے۔ قہوہ تیار ہے۔ سگاروں کا ذخیرہ آپ کی جیب میں موجود ہی ہوگا۔ بس اس کے سوا اور کس بات کی کسر رہ گئی؟ کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر مجھے اپنے قصے سنائیں کہ آپ کی ان دنوں کی ساری غیر حاضری کی کسر نکل جائے۔"

ڈاکٹر گار ایک لذت اندوزی کی آہ کے ساتھ آتشدان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ آگ کی طرف بڑھا کر بولا "میں کیا قصے سناؤں بیٹی، ڈاکٹر — بہر بوڑھا — تم سناؤ اپنی سیاحت کے افسانے۔"

میں ہنس پڑی "کئی دنوں سے میرے سر میں درد ہے ڈاکٹر۔ میرے صنوبری (ہوائی جہاز کا نام) کی تباہی کا حال تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ اس حادثہ نے میرے دماغ پر برا اثر ڈالا طبیعت متوحش سی رہنے لگی ہے۔ مہینوں سے کوئی چیز نہیں لکھی، کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی۔" یہ کہہ کر میں نے قہوہ دان اٹھا لیا اور ڈاکٹر کیلئے قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے بولی "آپ کے پاس قصے کہانیوں کی کمی ہے؟ یوں کہئے کہ ان دنوں انھیں بیان کرنے کیلئے آپ کو وقت نہیں ملتا ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس نئی کہانیوں کی کمی نہیں، انسان کی عمر جب بڑھ جاتی ہے تو مختلف تجربات اس کی زندگی کو بجائے خود ایک طویل داستان بنا دیتے ہیں۔ مگر مجھے تامل ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ قصے تم نوجوانوں کے دل کو کیا لبھا سکتے ہیں۔ کہ ان واقعات میں محبت اور افسانے کی رنگینیاں ہوتی ہیں نہ حسن اور شوخی کی دلفریبیاں۔"

میں بولی "بس آپ انھیں کو بیان کیجئے۔"

بھاپ اڑاتی ہوئی قہوہ کی پیالیاں ہاتھ میں لے کر ہم نے

سر کرسیوں کی پشت سے لگا دیتے۔

آتشدان میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر شرارے نکال رہی تھیں۔ باہر چھت پر بارش کی دھیمی دھیمی ٹپ ٹپ شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی سمندر پر بادلوں کے گرجنے کی خوفناک آواز آتی تھی۔

ڈاکٹر شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولا "تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنے ایک تازہ مریض کی کہانی سناؤں جو پرسوں شام میرے پاس لایا گیا اور آج صبح ———"

"ضرور ———" میں اشتیاق سے اس کا منہ تکنے لگی۔

(۲)

ڈاکٹر گار نے قہوہ کا ایک گھونٹ لیکر کہا "پرسوں ایک عجیب کیس میرے پاس آیا تو جی۔ بوڑھے احمد کو جانتی ہو؟ ——— گاؤں کی مسجد کا مجاور ہے۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے وہ اس کا بھی نگران تھا۔"

"میں نے تو کبھی اس شخص کا نام نہیں سنا۔"

ڈاکٹر کہنے لگا "اس کی موت کی وجہ نہایت عجیب ہے پرسوں صبح وہ میرے پاس بیہوش لایا گیا۔ اور آج صبح اس غریب کا انتقال ہو گیا۔"

"خدا غریق رحمت کرے" میں نے کہا "کیا ہوا تھا ڈاکٹر اسے؟"

"تم جانتی ہو کہ آجکل دیہات میں وبا بہت شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دن کے وقت سڑکوں پر میت برداروں کے ہجوم گذرتے نظر آتے ہیں۔ بازار میں جدھر نظر ڈالو اُدھر دو چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رات آتی ہے تو دن سے زیادہ خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لوگوں کی خاموش ٹولیاں لالٹین لئے ہوئے قبرستان کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بوڑھا مجاور پرسوں رات کی سرگذشت اس طرح بیان کر رہا تھا:-

"دن بھر لوگوں کی تجہیز تکفین میں لگا رہتا تھا۔ پرسوں رات تھک کر مسجد کے صحن کے ایک کونے میں پڑ رہا۔ دفعتہً کچھ آواز آئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لالٹین لئے ہوئے مسجد کے صحن میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جنازہ ہوگا۔ رات اندھیری تھی۔ دُور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جنازہ کی نماز ختم بھی نہ کی تھی کہ بوندا باندی ہونی شروع ہوئی۔ تب میں نے اُن سے کہا کہ اب دفنانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل ہے میت کو یہاں رکھ دیجئے میں سرہانے کلام مجید پڑھوں گا۔ صبح جب مینہ تھم جائے تو واپس آکر لاش کو دفنا دیجئے گا۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں کہ رات میں میں تنہا لاش کے سرہانے کتاب مقدس پڑھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جو مجھے خوفزدہ کرتا۔

غرض ان لوگوں نے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ اور مجھے کلام مجید پڑھنے کی تاکید کرتے مسجد کے صحن کے دروازے سے باہر سے لگا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دروازہ ان لوگوں نے باہر سے لگا دیا ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کتاب کھول کر جنازے کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رات بھیانک تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف کاجل کی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی دُور سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خوف کے مارے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھ پر اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں گذرا تھا جیسا اُس شب گذرا۔ ہولناک اور جان لیوا۔

تھوڑی دیر تو میں کتاب مقدس پڑھتا رہا۔ پھر یکایک میری نظر سامنے کو اٹھی اور میری روح کانپ گئی ——— میں نے دیکھا جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ دل کو سمجھایا ——— ممکن ہے ہوا کا جھونکا ہو۔ یہ کہتا ہوا میں پھر کتاب مقدس پڑھنے لگا مگر قدرتی طور پر میری نگاہ بار بار اٹھتی تھی۔ چادر برابر متحرک تھی۔ میں نے سمجھا شاید کوئی بلی جنازہ میں گھس گئی ہے۔ باوجود اس یقین کے میں جنازہ کے قریب نہ جا سکا۔ ایک نامعلوم خوف دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی عمر میں کبھی نہیں ڈرا۔ یہ پہلا ہی موقع تھا۔ اور پہلا ہی حادثہ! ——— کچھ دیر بعد یہ حالت ہو گئی کہ چادر کا کونہ زور زور سے ہلنے لگا۔ جیسے کوئی جھنجھوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا میرا اٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہوئی چادر سرک گئی اور پھر ——— ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یک لخت لاش جنازے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو لمحے کھڑے رہے ——— میں اُس کے

صحن آسودہ چہرے کو تک رہا تھا ـــ وہ میرے لرزتے ہوئے جسم کو ـــ پھر منہ جنازے سے زمین پر کود پڑا ـ

یہ دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں ـــ میں دروازے کی طرف بھاگا تاکہ سڑک پر نکل بھاگوں ـ مگر وہاں جا کر دیکھا تو دروازہ بند پایا ـ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اندر صرف ہم دونوں مقید ہیں ـ قدموں کی آہٹ پاکر میں نے مڑکر دیکھا تو وہ میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا اور چونکہ اس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ آہستہ آہستہ کودتا ہوا میرے پیچھے چلا آرہا تھا ـ

صحن میں امرود کا ایک درخت تھا میں اس کی طرف بھاگا مگر ـــ شاید اس میں بھی تیزی آگئی تھی ـ وہ میرے تعاقب میں تیزی سے کودتا ہوا آرہا تھا ـ تھوڑی دیر بعد یہ حالت تھی کہ ہم دونوں مسجد کے صحن کا چکر لگا رہے تھے ـ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے خوف نے میری تمام طاقتیں سلب کر لی تھیں ـ میں نہ بھاگ سکتا تھا نہ درخت پر چڑھ سکتا تھا ! ڈاکٹر صاحب ! میری حالت مُردے سے بدتر تھی ـ میں پاگل ہو رہا تھا ـ مسجد کے صحن کی ہر دیوار کے قریب جا کر اُسے پھاندنے کی کوشش کرتا ـ اور جب لاش میرے قریب آجاتی تو میں چیخ مار کر وہاں سے بھاگ نکلتا !

اسی وقت دفعۃً مجھے خیال آیا کہ پیچھے کنویں کے قریب کی دیوار کچھ گر پڑی ہے ـ اس کو پھاندنا نسبتاً آسان ہوگا ـ میں پچھلے حصے میں جہاں دیوار کی چند اینٹیں گر پڑی ہیں بھاگ آیا اور اپنی پوری قوت اور کوشش سے دیوار پر سے پھاند گیا ـ میں ہانپ رہا تھا ـ اسی عالم میں پلٹ کر دیکھا تو لاش میرے تعاقب میں نہایت تیزی سے چلی آرہی تھی ـ آخر اس نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی مگر اینٹوں میں کفن اُلجھ گیا ـ اور مُردہ جسم دیوار پر نصف اِدھر نصف اُدھر لٹکنے لگا ـ اب وہ بے جان معلوم ہو رہا تھا ـ میں باہر سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا پہونچا ـــ"

بس بیٹی صبح آنے جانے والوں نے مسجد کی ٹوٹی ہوئی دیوار پہ ایک لاش کو لٹکتا ہوا دیکھا اور مجاور کو انھوں نے دیوار کے نیچے بے ہوش پایا ـ

مجاور کا بھائی اُسے اٹھا کر میرے پاس لایا ـ وہ تیز بخار میں پھنکا جا رہا تھا ـ اور بے ہوش تھا ـ کل رات کے تین بجے اس نے مجھے اپنی داستان سنائی اور آج صبح چل بسا ـ صبح دس بجے کے قریب وہ لاش دفن کی گئی ـ اور دوسرے دن صبح دس بجے مجاور کی لاش بھی سپردِ خاک کر دی گئی ـ

میں دم بخود ہو کر سن رہی تھی ـ باہر آندھی زوروں پر تھی ـ آتشدان کی لکڑیاں ختم ہو چکی تھیں ـ مینٹل پیس پر رکھا ہوا کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا ـ

جب ڈاکٹر قصہ ختم کر چکا تو میں لرزتی ہوئی اٹھی اور اُسکے پہلو میں جا بیٹھی ـــ

حجاب امتیاز علی

افسون سحر

مری چشم مشتاق سے کیوں نہاں ہے — ہر اک بزم میں جب تری داستاں ہے
کہاں دیکھیے مجھ کو لیجائے وحشت — قفس اِس طرف ہے اُدھر آشیاں ہے
اب آباد کر چاہے برباد کر دے — مرا دل نہیں یہ ترا آستاں ہے
نہ پوچھو مآلِ غمِ سوزِ فرقت — کہ صورت سے میری حقیقت عیاں ہے
عجب بسملوں کا ترے حال دیکھا — نہ ہے زخم کوئی نہ کوئی نشاں ہے
پلا ایک ہی جام للہ ساقی — بہت تشنہ لب یہ ترا خستہ حال ہے
چلو سے کے بل ہمسفیرو! خبردار!!! — نہیں کچھ یہ فردوس کوئے بتاں ہے

مجھے ہوش آیا تو اے سحر دیکھا
نہ بانگِ جرس ہے نہ وہ کارواں ہے

مقصود حسن نیر
(رسالپوری)

بزمِ شوق

ذرّوں میں حسنِ مہرِ درخشاں لئے ہوئے
فطرت ہے ایک جلوۂ عریاں لئے ہوئے

نرگس ہے کیفِ دیدۂ خوباں لئے ہوئے
سنبل ہے بوئے گیسوئے جاناں لئے ہوئے

آشفتگیِ قلب کا امکاں لئے ہوئے
آئی بہار حسن کا طوفاں لئے ہوئے

کلیاں چٹک کے دیتی ہیں پیغامِ رنگ و بو
پھولوں کی آڑ میں رخِ تاباں لئے ہوئے

شبنم لٹا رہی ہے بہارِ رخِ گہر
صدہا ہزار انجمِ رخشاں لئے ہوئے

موسم نکھار رہا ہے نقابِ رخِ بہار
ذرّے ابھر رہے ہیں گلستاں لئے ہوئے

نازاں ہے برگِ گل بمتاعِ جنونِ شوق
دامن میں چاک چاکِ گریباں لئے ہوئے

کرنوں میں گندھ رہے ہیں گہرہائے آبدار
شبنم جو اُڑ رہی ہے گلستاں لئے ہوئے

ہر شاخِ نخل طوبیٰ و سدرہ کی ہم نشیں
ہر نخلِ باغ، شوکتِ رضواں لئے ہوئے

موتی پروتے آتے ہیں نسرین و نسترن
آرائشِ بہارِ گلستاں لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ گل پہ مئے رنگ و بو لئے
جامِ شراب، بادۂ غلطاں لئے ہوئے

بادِ نسیم آتی ہے مستی سے چور چور
جھونکوں میں روحِ نرگس و ریحاں لئے ہوئے

شاخیں لچکتی ہیں کہ مچلتی ہیں شوخیاں
کیفِ شباب جشن کا ساماں لئے ہوئے

کلیوں میں کمسنی کی لطافت بسی ہوئی
دوشیزگی، شباب کا عنواں لئے ہوئے

پھوٹی ہیں بوئے بادۂ صافی کی شورشیں
کیفیتِ شراب کا ساماں لئے ہوئے

ہر گل ہے محوِ رقص برنگِ نسیمِ صبح
کیفیتِ تصورِ جاناں لئے ہوئے

سامانِ حشرِ شوق، بہ آہنگِ برہمی
لائی بہار مژدۂ باراں لئے ہوئے

موجوں میں کمسنی کی لطافت بہ ہر ادا
دریا تمام شوخیِ ارماں لئے ہوئے

آتا ہے آئینہ برنگِ شبابِ حسن
جوش و خروشِ طفلِ ناداں لئے ہوئے

ہونٹوں پہ اک تبسمِ رخشاں لئے ہوئے
آنکھوں میں سحرِ چشمِ غزالاں لئے ہوئے

آتا ہے کوئی بزمِ تخیل میں بے حجاب
رعبِ جمال و شوکتِ تاباں لئے ہوئے

ہر جنبشِ نظر سے ٹپکتا ہے کیفِ عشق
ہر لغزشِ خرام، گلستاں لئے ہوئے

غمزہ ہر ایک جانِ تمنا بنا ہوا
ہر اک ادا شکوہِ سلیماں لئے ہوئے

تقویٰ گداز کفرِ جوانی کی شورشیں
آشفتگیِ شوق کا ارماں لئے ہوئے

جھلکی شبابِ حسن کی دنیائے کیف بار
جنبش نظر کی فتنۂ دوراں لئے ہوئے

فرحت یہ بزمِ شوق ہے سونی ترے بغیر
افسردگیِ شمعِ شبستاں لئے ہوئے

فرحت کانپوری

"فنِ فسانہ"

ذیل کے چار مضمون "فنِ فسانہ" کے سلسلہ میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے اگست ستمبر میں براڈکاسٹ ہوئے تھے۔ یہ عنوانات خود ریڈیو اسٹیشن کے تجویز کردہ ہیں۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ ان تقریروں کو از سرِ نو ڈھال کر اور ضروری عنوانات پر چند مضمون اور لکھ کر اسکو کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ اسی دوران میں مکرمی ایڈیٹر صاحب ساقی کی طرف سے مطالبہ ہو گیا، اور ان کی تعمیل ارشاد میں یہ "تقریریں" اپنی اصلی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ بشرطِ مہلت انکو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائیگا۔

لطیف الدین احمد

افسانے کا پلاٹ

فنِ فسانہ کے تحت آج میری گفتگو کا موضوع افسانے کا پلاٹ ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں اصل موضوع کے متعلق کچھ کہوں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح افراد کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے مزاج بھی مختلف و مخصوص ہوتے ہیں۔ اور ہر قوم کا ادب اُس قوم کے مزاج کے سانچے میں ڈھلتا، اور خود اپنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ادیب و انشا پرداز دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے میں اُس حد کو پہچاننا نہیں چاہتے جس حد تک کہ ہماری زبان و ادب کا مزاج استفادے کی اجازت دے سکتا ہے۔ اور آنکھ بند کر کے انگریزی ادب کے اصول اختیار اور انکی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ روش، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادب کو اپنی ذات میں مکمل ہو جانیکے درجے تک پہنچنے میں کوئی مدد نہ دیگی۔

میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ادیب اصولِ فن کے مرتب و مدون کرنے میں اندھی تقلید کو چھوڑ کر اپنے ادب کے مزاج کے مطابق ہی اس کے اصول بھی مرتب کریں۔ اس پہلو پر توجہ دلانے کی ضرورت مجھے اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ حال ہی میں فنِ فسانہ کے متعلق اُردو کی ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ اس فن کے متعلق اس کتاب کے اندر سب کچھ ہے۔

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مختصر قصّوں میں قصے کا پلاٹ اور اُن کے افراد جب تک نہایت ڈرامائی نہ ہوں قصّہ بے لطف رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ صاحب کتاب نے طویل ناول اور مختصر افسانے کے ٹکنیک اور اصول میں کوئی بین فرق بھی قائم نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک اندھی تقلید اسی کا نام ہے۔

مغربی ممالک میں طویل ناولوں کا آغاز اُس وقت ہوا جب کلیسا نے ڈراما کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ چنانچہ ڈراما کے اصول و عناصر بادنیٰ تغیر ناول میں بھی برقرار رہے۔ لیکن جہاں تک مختصر فسانے کا تعلق ہے خود یورپ میں اُسے ناول سے جُدا

ایک شے مانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ڈراما یا ناول کے اصول وعناصر مختصر فسانے میں جوں کے توں کیونکر روا رکھے جاسکتے ہیں؟ مختصر فسانہ آج ایک نہایت ترقی یافتہ اور مستقل بالذات صنفِ ادب ہے۔ اس لئے اُس میں ڈراما اور ناول کی تمام خصوصیات کھپ بھی کب سکتی ہیں۔ اس کی ایک زبردست دلیل تو یہ ہے کہ ناول کے برخلاف مختصر افسانے میں ایک ہی کردار پیش کیا جاتا ہے، اور اگر کردار متعدد بھی ہوں تب بھی ان کی تعداد چند افراد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی۔ ایسی صورت میں اس کے اندر نہ تو پلاٹ کی با فیدگی کا کمال دکھانا ممکن ہوسکتا ہے اور نہ ڈرامائی کشاکش پیش کرسکنے کا موقعہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈرامائی انداز کیلئے مبالغہ ایک لازمی چیز ہے۔ مگر آج جبکہ صناعت کا یہ نظریہ عالمگیر ہوتا جاتا ہے کہ اُسے زندگی کے مطابق ہونا چاہیئے تو ایسی صورت میں صناعت، اور بالخصوص صناعت ادب، مبالغے کو کیونکر برداشت کرسکتی ہے۔ ہم اس حقیقت سے خالی الذہن نہیں کہ خود زندگی میں تصادم موجود ہے، اور اس تصادم ہی کا دوسرا نام ڈرامائی انداز بھی ہے، لیکن زندگی کا یہ تصادم جو ہمیں قدم قدم پر پیش آتا ہے، مبالغہ کے بغیر بھی اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ اُس میں دلچسپی پیدا ہوسکے۔

آج بیسویں صدی کی ——— ترقی یافتہ ذہنیت واقعیت نگاری (——— realism) کا مطالبہ کرتی اور صناعتِ ادب کو آورد و تصنع سے بالکل پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ اس ذہانت کا فیصلہ تو یہ ہے کہ وہ ادب پارے جن میں ڈرامائی سرعتِ واقعات پیش کی جاتے ہیں امتیاز سے عاری ہیں، رومانیت ناقابلِ التفات ہے، اور فسانے کے پلاٹ کا دروبست ایک طفلانہ حرکت ہے، اور ہم اگر چاہیں تو بادنٰے تامل اندازہ بھی کرسکتے ہیں کہ اُس ادب میں جس کا مقصود قاری کو اس کے لبطون سے متعارف کردینا یا آسان لفظوں میں انسان کو اسکی اپنی آتما کو پہچنوا دینا ہو، ڈراما کے مفروضات و مسلمات کی پیروی کرنا اس ادب کے حصولِ مقصد کے یقیناً خلاف ہوگا۔

ہر ملک وقوم کے عصری ادب میں نہ صرف مختصر فسانوں بلکہ طویل ناولوں کا بھی موضوع ومقصد انسانی نفسیات کا تجزیہ وتحلیل قرار پاگیا ہے، اس لئے اکثر وبیشتر، اور اعلیٰ درجے کے فسانے ڈرامائی اصول کی پابندی سے معرا پائے جاتے ہیں، مگر ان کی دلچسپی واثر آفرینی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مغربی ادیبوں نے پلاٹ کی جس قدر تعریفیں قائم کی ہیں اُن کا نچوڑ یہ ہوسکتا ہے کہ افرادِ قصہ کو جو واقعات پیش آئیں اور اُن سے جو افعال سرزد ہوں، جن کو دلچسپ بھی ہونا چاہیئے، مجموعی حیثیت سے پلاٹ کہلا ئینگے۔ یہ تعریف اپنی جگہ مکمل ہے۔ لیکن مختصر فسانے کی یہ تعریف زیادہ عصری اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ کسی ایک واقعہ یا جذبے کی تاریخ بیان کردینا مختصر فسانہ ہے۔

الحاصل افسانے کی اس تعریف کے تحت، جہانتک پلاٹ کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مختصر فسانے میں "فطری پلاٹ" کا ہونا تو ناگزیر ہے۔ لیکن "فنی پلاٹ" مُستلزم نہ ہونا چاہیئے۔ "فطری پلاٹ" سے میرا مفہوم یہ ہے کہ آپ فسانے نام سے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو واقعہ بھی بیان کیا جائیگا اس کے اندر خواہی نخواہی ایک پلاٹ موجود ہوگا۔ اور "فنی پلاٹ" میں اُس کو کہتا ہوں جس کے لئے "قالینی بافندگی" ضروری بتائی جاتی ہے۔ پلاٹ کا مشجر کی طرح بافیدہ ہونا اس بات کو چاہتا ہے کہ اُس میں

افرادِ قصہ متعدد ہوں۔ لیکن مختصر افسانے میں افرادِ فسانہ کی تعداد ایک مناسب حد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی، ورنہ پلاٹ کا سُبک رہنا دُشوار ہو جائیگا، جو پلاٹ کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ اسکے ماسوا ایسا فسانہ مختصر فسانے کی تعریف سے بھی نکل جائیگا کیونکہ افرادِ قصہ کی کثرت زمان و مکان کی وحدت کے منافی ہے۔ اور جس پلاٹ میں سبک ہونے کے عوض بھدا پن آجاتا ہے اس میں آورد و تصنع کا عیب محسوس ہونے لگتا ہے۔

مختصر فسانے کے بنیادی عنصر پانچ ہیں۔ پہلی چیز تو فسانے کا مقصود ہے جسے بنیادی خیال بھی کہا جاسکتا ہے اسکو ہمیشہ مجرد ہونا چاہیئے۔ دوسرا نمبر مرکزی کردار فسانہ کا ہے، جس سے اُس مقصود کی تکمیل کرائی جائے گی۔ پھر ذرا سی تخیل کی ضرورت ہے جو رنگ آمیزی کریگی۔ اسکے بعد پلاٹ کا درجہ ہے کہ وہ تکمیل مقصود ہوگی کس طرح۔ اور آخر میں وحدتِ اثر کا نمبر ہے کہ پڑھنے والا ایک وقت میں اُسی ایک غرض سے متاثر ہو جو مصنف کا مقصد ہے۔ ان پانچ عناصر اولیہ کے بعد اختصارِ بیان، زمان و مکان، فضائے فسانہ، اور طرزِ بیان وغیرہ ہیں جنکو میں عناصر نہیں بلکہ اس کے ٹکنیک میں داخل سمجھتا ہوں۔

کسی ایک کردار کے بھی محض ذہنی تاثرات اور قلبی کیفیات کا بیان یعنی "یادِ ایام" یا "محویتِ خیال" وغیرہ بیان کرنا بھی مختصر فسانے کی تقسیم میں شامل ہے، اس لئے میرے خیال میں ایک فسانہ نگار کا طریق کار (method) یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فسانے کا مقصود جسے آپ غایت تصنیف بھی کہہ سکتے ہیں، قائم کر لینے کے بعد ایک مناسب اور خصوصی کردار وضع کر کے فسانہ سُنانا شروع کر دے، اور پلاٹ کا بروز (development) فطری طریق پر ہوتا رہے۔ یعنی جہاں ضرورت کا تقاضا ہو دوسرے ذیلی کردار اور نئی صورت واقعہ (situation) پیدا ہوتی رہے۔ جو پلاٹ اس طرح بنے گا، میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ قرین فطرت ہوگا۔ کیونکہ ایسا پلاٹ مصنف کے مشاہدے اور تخیل کا ماحصل ہوگا، اور واقعیت نگاری کی حدود کے اندر رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے بنیادی خیال قائم کیا جاتے اور اس کی مناسبت و ضرورت کے اعتبار سے جملہ کردار مقرر کر دئے جائیں، اور پھر دو چار ایسی صورت واقعہ ترتیب دے لی جائیں جو اصل مقصود کے ساتھ غیر متناسب بھی نہ ہوں اور کردار کے لئے غیر فطری بھی معلوم نہ ہوں۔ جب یہ خاکہ تیار ہو جائے تو فسانہ لکھنا شروع کیا اور اُس میں تخیل کی رنگ آمیزی کی جائے۔ لیکن اس طریق کار میں اکثر اوقات بناوٹ کا رنگ جھلک آتا ہے۔ کیونکہ مصنف کا خیال پابند ہو چکتا ہے اور اس کی تخیل کا فطری رُجحان اپنی گلکاریاں دکھا سکنے کے لئے آزاد نہیں رہتا۔

میں اس سے بے خبر نہیں کہ پلاٹ کا مکمل خاکہ پہلے سے طیار نہ کرنے بلکہ پلاٹ کو فسانے کے دوران بیان میں بروز دینے کو ترجیح دینے کو ناپسند کیا جائیگا اور ممکن ہے کہ کسی کی نظر میں مضحکہ خیز بھی ہو۔ لیکن میں معذور ہوں کیونکہ میں طبیعت و فطرت کا جلوہ زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنا چاہتا ہوں، اور تقلید و تصنع، مکر و ریا سے طبیعت کو بیزاری ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہی ہے کہ اگر پہلے سے کوئی خاکہ بنا لیا ہے تو دقت محسوس ہوئی اور گفتنی ناگفتہ رہ گئی ہے۔ آورد و تصنع بقول اناطول فرانس صداقت کے منافی ہے۔

وہی ڈرامائی اصول کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینے کی تقلیدی ذہنیت ہی جو مختصر فسانے میں بھی "پیچیدگی" پیدا

کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر فسانے میں زبردستی "پیچیدگی" پیدا کرنے سے مقصود فسانہ دھندلا پڑجاتا ہے لیکن اگر خود اُس واقعے کے اندر جو بیان کیا جارہا ہے، کوئی پیچیدگی موجود ہے تو وہ فسانہ یقیناً زیادہ دلچسپ ہوگا۔ یہ حال پیچیدگی پیدا اسی فسانے میں کی جاسکے گی جس میں کردار متعدد ہونگے۔ مگر پیچیدگی پیدا کرنے میں یہ فیصلہ کہ وہ کہاں فطری اور کہاں غیر فطری معلوم ہوگی، تمام تر مصنف کی سلامتی ذوق پر منحصر ہے۔ میں ذاتی طور پر پلاٹ کو پیچیدہ بنانے بغیر نتیجے کو توقف یا تعویق (suspense) میں ڈالدینے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس طرح پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رکھی جاسکتی ہے۔

پلاٹ اور عمل (action) دراصل ایک ہی چیز ہے۔ پلاٹ کا بہت بڑا انحصار اس فضا و ماحول پر ہے جس میں مُصنف اپنے کردار کو پیش کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ پلاٹ فضا، اور کردار، یہ تینوں ایک دوسرے پر حصر رکھتے ہیں۔ ان تینوں کے مابین اگر کسی وقت بھی خفیف سا عدم تناسب رُونما ہو جاتا ہے تو فسانے کی صناعت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

مختصر فسانے کے پلاٹ میں سب سے زیادہ مُشکل موقعہ جس میں فسانہ نگار کے ذوق و وجدان کا امتحان ہوتا ہے وہ نئی صورت واقعہ (situation) کا پیدا کرنا ہے۔ اس کی صورت اور صناعت ہمارے ادب میں قصیدے کی گریز سے بہت مماثل ہے۔ واقعات کے بیان میں جب بھی نئی صورت واقعہ پیش کی جائے تو پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ صورت حال، بیان ماقبل کا فطری نتیجہ ہے، اور اس صورت کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہ سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ پلاٹ جس چیز کا نام ہے وہ مختلف واقعات سے ترتیب پاتا ہے، اور یہ مختلف واقعات ایک بُنیادی واقعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ذیلی واقعات کو پیدا کرکے اُنہیں ایسے سلسلے میں لے آنا کہ وہ ایکدوسرے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوں، اسی کا نام پلاٹ کی سادگی اور یہی اس کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ ترتیب واقعات میں، میرے نزدیک، مصنف کی توجہ اسپر زیادہ صرف ہونا چاہیئے کہ ہر واقعہ اپنی جگہ اس طرح پیش آئے کہ باوجود متوقع ہونیکے پڑھنے والیکو مُنہمک رکھ سکے۔

ایک فسانہ نگار کو جو صورت اکثر پیش آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی واقعہ یا جذبے سے متاثر ہوکر اسکو ایک فسانے کی صورت دینے لگتا ہے تو اُس کا تحت الشعور یا حافظہ بعض ایسے واقعات پیش کردیتا ہے جو اُس کے مشاہدے میں پہلے آچکے اور اس واقعہ یا جذبے سے فطری لگاؤ یا مناسبت رکھتے ہیں۔ ان واقعات کو اس طرح مربوط کردینا کہ وہ آپس میں جان و جگر معلوم ہونے لگیں، بس یہی فسانہ نویسی کا فن ہے۔ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ مُصنف کے سامنے ایک کردار کی زندگی یا اس کی زندگی کے کسی خاص واقعے کا پورا علم ہوتا ہے اور وہ اسے بجنسہٖ یا معمولی اور خفیف تبدیلیوں کے ساتھ بیان کردیتا ہے۔ اس صورت میں فسانہ نگار کی تخلیقی قابلیت کو کم اور انتخابی صلاحیت کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اسکے برخلاف پہلی صورت میں مُصنف کو واقعات و تخیل کی مرصع سازی کرنا پڑتی ہے۔

افسانے کا اندازِ بیان بھی دو نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ مُصنف نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہو بس اُسی کو بیان کردے، یعنی خارجی طور پر جو زندگی جس طرح بسر کی جاتی ہے، وہ اُسے خارجی شکل ہی میں پیش کردے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ

جس زندگی کا بیان ہو اس میں مصنف یا تو اپنے تاثرات شامل کرتا جاتا ہے یا کردار فسانہ کے نفسیات کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔ اس عہد میں اسی نوع کی افسانہ نویسی زیادہ مقبول ہے۔

خارجی زندگی کو خارجی طریق ہی پر بیان کر دیتے ہیں بالعموم ابتدا ابتدا سے کی جاتی ہے جو ایک سپاٹ کہانی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسمیں ادیب کو دخل کم ہوتا یا ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن جس فسانے میں کردار کی داخلی زندگی بیان کی جاتی ہے وہ بالعموم پلاٹ کے کسی اہم نقطے سے شروع کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت افسانہ سمجھانے اور بیان کو واضح کرنے کیلئے اُس نقطے سے قبل کے بعض ضروری واقعات ضمناً بیان کر دئے جاتے ہیں۔ اس پیرایۂ بیان میں ادبی صناعت پیش کئے جانیکے لئے بہت گنجائش ہوتی ہے، اور اسی انداز کو قبولیت بھی حاصل ہے۔

ہمارے اہل قلم نے افسانے کو شعر کی طرح ایک الہامی چیز سمجھ لیا ہے، اور ایسے ہی دعووں کے ساتھ اپنی تصانیف کو پیش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ فسانے اور الہام کے درمیان دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ البتہ افسانے کی عبارت میں شعریت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایک مناسب حد تک۔ بہت زیادہ ادبیت پیدا کر دینے سے فسانے کا مقصود اور اُسکی وحدت اثر بالاستیعاب غارت ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فسانہ جب لکھا جا چکے اور اُس کی مرصع کاری جملہ پہلوؤں سے مکمل ہو تو شاید ہم اُسے بحیثیت مجموعی ایک شعر کہہ سکیں۔ لیکن وہ شعر بھی مشاہدہ و مکالمہ کے اظہار کی تکمیل کا شعر ہوگا، الہام نہ ہوگا۔

ابھی میں نے آپ سے کہا ہے کہ پلاٹ کا سُبک ہونا اُس کا سب سے بڑا حسن ہے جو افرادِ قصّہ کی کثرت سے باقی نہیں رہتا۔ لیکن افسانے کے پلاٹ کو سُبک رکھنے کیلئے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کردار میں تنوع اور تضاد پیدا کیا جائے۔ اور وہ تنوع آخر تک قائم رہ سکے۔

محض پلاٹ کی خاطر سے پلاٹ اختراع کرنا خام کاری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف پلاٹ سازی کی صناعت اس میں ہے کہ واقعہ متعلقہ ایک اوسط طبیعت کے انسان میں جو مختلف انداز مزاج پیدا کر سکتا ہے، پلاٹ کی بنا اُس انداز پر رکھنا چاہیئے۔ پلاٹ اگر اس طرح بنایا جائیگا تو اُس میں کردار کی دانمود کے ساتھ مرکزی و بنیادی خیال کی دانمود کو بھی پورا موقعہ ملے گا۔

افسانے کے کردار

میری آج کی گفتگو کا موضوع افسانے کے کردار ہے۔ پچھلی گفتگو میں میں نے عناصر فسانہ کی تعداد پانچ بتائی تھی جسمیں مقصود فسانہ کو پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ آج میں بتانا چاہتا ہوں کہ یورپ کے بعض ناقدوں کی رائے ہے کہ فسانے کے عناصر میں خود مصنّف بھی شامل ہے، کیونکہ اُن کی رائے میں مقصود فسانہ، مصنّف کی ذات سے الگ کوئی چیز نہیں یا یہ کہ مقصود اور مصنّف ہم معنی الفاظ ہیں چنانچہ اس لحاظ سے کہ مقصود، فسانے کا اصل اصول اور وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے بغیر نہ کوئی خط کھینچا جاسکتا ہے اور نہ کوئی دائرہ بنایا جاسکتا ہے، تو پھر فسانے میں اس کے کردار کو پہلی جگہ حاصل ہو جاتی اور کردار اہم ترین عنصر فسانہ بن جاتا ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ کردار کشی مصنّف کی کتنی گہری توجہ اور کسقدر غور و فکر کا مرکز ہونا چاہیئے۔

کردار فسانہ کے متعلق بڑی آسانی سے کہدیا جاتا ہے کہ ان کو جیتی جاگتی تصویریں ہونا چاہیئے لیکن یہ جیتی جاگتی تصویریں بنائی کیسے جاسکتی ہیں، اس کے قاعدے اور قانون کسی نے وضع نہیں کئے۔ تجویزیں جو پیش کی گئی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر محض اُنہیں پر عمل کیاجائے تو جیتی جاگتی تصویروں کی جگہ کٹھ پتلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ غالباً آپ اسکا سیدھا سادا جواب دینگے کہ مصنف اگر اپنے مشاہدے کے تاثرات پورے طور پر ادا کرسکے تو وہ جیتی جاگتی تصویریں بنا سکیگا۔ مگر میرا خیال ہے کہ صرف یہ مشورہ بھی جیتی جاگتی تصویریں بنانے کا اصول نہیں سکھاتا۔

کردار نگاری کے ذیل میں مجھے "تخلیق کردار" کی اصطلاح سے بھی اتفاق نہیں، کیونکہ یہ اصطلاح مجھے کچھ مبہم نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مصنف دراصل کردار تخلیق نہیں کرتا، وہ زندگی کی نقل اُتارتا ہے۔ انسانی کردار کی صحیح نقل ہی جیتی جاگتی تصویر ہوسکتی ہے۔ اگر ایک کردار، زندگی کی صحیح نقل نہیں بلکہ ایک "تخلیق" ہے تو میرے خیال میں وہ گوشت پوست کا انسان نظر آنے کے عوض ایک مطمح اور مثالی بن کر رہ جائیگا۔ "تخلیق" کی اصطلاح سے یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ وہ کردار ایک ایسا انسان ہے جیساکہ مصنف انسان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فسانے کا موضوع وہ انسان ہے جو اس دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ آپکو شاید میری اس رائے سے اختلاف نہ ہوگا کہ اگر زندگی کی نقل کا خیال نظر انداز ہوجائے تو مصنف کی ذہنی پیداوار عام انسانی مخلوق سے جُدا شئے ہوگی۔ اس میں خود مصنف کی نفسی کیفیات جلوہ فرما ہونگی۔ لیکن کردار نویسی میں اگر "زندگی" مصنف کے سامنے ہے تو وہ "تخلیق" نہیں بلکہ "نقل" ہوگی۔

کہا جاسکتا ہے کہ مصنف کا مشاہدہ اُسے ایک کردار کی تخلیق پر قادر کردیتا ہے۔ لیکن مصنف واقعی زندگی میں جس ایک انسان کو دیکھتا ہے اور اُسی کو بیان کردیتا ہے، یا پھر وہ مختلف واقعات زندگی کو جو اس کے دماغی خزانے میں محفوظ ہوتے ہیں، ترتیب اور ربط دیکر ایک انسانی کردار تیار کردیتا ہے۔ بہرصورت وہ انسانی زندگی کی نقل ہوتی ہے۔ صاحب کمال کردار نویس وہی مصنف سمجھا جاتا ہے جو نقل کو اصل کر دکھائے۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رہنا چاہیئے کہ واقعات کردار کو بناتے ہیں، یہ قانون فطرت ہے۔

رہگیا یہ سوال کہ نقلی کردار کو اصلی انسان کیونکر بنایا جاتا ہے، تو اسکے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ افسانہ نگاری کی دوسری تمام خصوصیات حاصل ہونیکے باوجود ایک مصنف اپنے کرداروں کو صرف اندازِ بیان کے کمال سے جیتی جاگتی تصویریں بنا سکتا ہے۔ اُس کا اندازِ بیان ہی وہ چیز ہے جس سے قلمی تصویریں بولنے لگتی ہیں۔ اندازِ بیان ایک ہی کردار کو کاٹھ کا پُتلا بھی بنا سکتا ہے اور اسے ایک زندہ انسان بھی دکھا سکتا ہے۔

ابھی تک ہمارے افسانوی ادب میں عبارت آرائی پر زور صرف کیا جاتا ہے، جسے میں لفاظی سے تعبیر کرتا ہوں، اور مشاہدے اور مطالعہ کی کردار نگاری عام نہیں ہوتی ہے۔ ایک دہقانی کا کردار پیش کرتے وقت عام طور پر ہم نے اسکو کافی سمجھ لیا ہے کہ اس کے مُنہ سے حضور کو ہجور اور وقت کو بکھت کہلوا دیا جائے۔ حالانکہ ایک دہقانی کے سوچنے کا طریقہ اور بیان کا انداز، ایک شہری سے جُدا ہوتا ہے۔ اور دہقانی ہی پر کیا منحصر ہے، سماج کے ہر طبقے اور فرقے کا پرواز فکر مختلف ہوتا ہے۔ خود دیہات میں زمیندار کی ذہنیت جُدا ہوتی ہے اور کاشتکار کی جُدا۔ کردار نگاری کا کمال چاہتا ہے کہ اگر کسی کسان

کا کریکٹر پیش کیا جا رہا ہے تو اس کی ایک ایک بات اور اس کے ہر ہر انداز سے غلتے او ر اراضی کی بو آتے۔

میں نے اپنی پہلی گفتگو میں بتایا ہے کہ یہ عہد واقعیت نگاری (realism) کا عہد ہے اور نظر آرہا ہے کہ مستقبل میں اسی رجحان کا غلبہ ہوگا۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں نے کسان اور مزدور کی زندگی کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ میں نہ تو واقعیت نگاری پر معترض اور کسان و مزدوروں کی زندگی کے موضوع ادب بننے کا مخالف۔ بلکہ مجھے واقعیت نگاری کی ادبی وقعت تسلیم ہے۔ اور سماج کے پست طبقوں کی زندگی کو موضوع قلم بنانے کو مفید و کارآمد سمجھتا ہوں۔ لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ واقعیت نگاری کے جوش میں نہ صرف رومانیت بلکہ صناعت ادب کی صداقت کو بے کار شے سمجھا جا رہا ہے۔ اس پر مجھے اعتراض ہی نہیں بلکہ اس سے مجھے تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اناطول فرانس کے خیال میں صداقت نام شعریت کا ہے؟ صناعت کا ہے! اور ایفریڈ نوئیس کی رائے ہے کہ انتہائی نقطے پر پہنچکر رومانیت، واقعیت، اور واقعیت، رومانیت بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا رجحان ادبی صداقت کو پس پشت ڈالتا نظر آرہا ہے۔ اور واقعیت یعنی اظہار صداقت کے نام سے صناعت ادب یعنی صداقت کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

میں اپنی زبان کے ادیبوں کی پُر زور تائید کرونگا کہ آپ سماج کے پست طبقوں کی زندگی کے مرقعے ضرور پیش کیجئے لیکن آپ سے یہ کس نے کہدیا ہے کہ ان طبقوں کی زندگی حُسن کی صداقت سے عاری ہے؟ کیا ایک دہقانی کی سوگوار سنجیدگی یا گمبھیرتا حسین نہیں؟ کیا اس کے بدن کی کرختگی میں جو مسلسل مشقت کا نتیجہ ہے ایک تقدس محسوس نہیں ہوتا؟ کیا ایک کسان اور اُس کی آراضی کے مابین ایک رشتہ، ایک ہم آہنگی نظر نہیں آتی؟ اس کے فاقوں میں عظمت نہیں؟ کیا اس کے افلاس اور صبر و شکر میں ایک جلال موجود نہیں؟ کیا ایک مزدور کی جانکاہیاں پریشان دکھائی نہیں دیتیں؟ پست طبقوں کی زندگی میں حُسن بھی ہے اور تقدس بھی، ہم آہنگی بھی ہے اور عظمت بھی، جلال بھی ہے اور شان بھی لیکن ہمارے ادیب جب ان کردار کو پیش کرتے ہیں تو ان کے اندر ان میں سے کوئی خوبی موجود نہیں ہوتی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارا عصری ادب صداقت یعنی صناعت سے معرا ہوتا جا رہا ہے۔

کردار نگاری میں وہ مصنف زیادہ کامیاب ہیں جو انفرادی انسان کی نہیں بلکہ انسان کی نفسیاتی قسموں (types) کی کردار کشی کرتے ہیں۔

ہر کردار کشی میں ایک انسان کی فطرت کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ یہ انکشاف دو طریق پر ہو سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ مصنف کی طرف سے کردار کی معرفی کیجائے، اور وہ اس کردار کی مزاجی خصوصیات خود بیان کردے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ کمزور کردار نگاری ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کردار کی فطرت، واقعات کے ذیل میں وانمود پائے۔ یہ طریقہ حسن صناعت کے اعتبار سے مکمل سمجھا جاتا ہے۔

کردار کا بروز، پلاٹ کے بروز، اور افسانے کی رفتار ترقی کے ساتھ ہو تو میرا خیال ہے کہ زیادہ قرین فطرت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں فسانہ نگار کو نہایت دقت نظر سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ آغاز فسانہ میں کردار کو جس طرح کی اٹھان دی گئی ہے اسکے خلاف باتیں بیان ہو جانا دشوار نہیں ہوتا اور تضاد و تخالف کو بڑی آسانی سے دخل مل جاتا ہے جو

بعض وقت نظر میں بھی نہیں آتا۔

ڈراما کی روایات کے تحت، پرانی ناول نویسی میں یہ بات بھی ضروری سمجھی گئی تھی کہ جو فرد فسانہ ایکبار داخل قصہ ہو گیا اسے خواہ مخواہ آخر تک نبھانا چاہیئے۔ لیکن مختصر افسانہ اسکو بھی روا نہیں رکھتا۔ ایک فسانے میں کسی فرد فسانہ کا جتنا کام اور جب تک ضرورت ہو، اسی حد تک اسے فسانے میں داخل رہنا چاہیئے۔ اور اس کے کردار کو بروز بھی اسی حد تک ملنا چاہیئے کہ وہ مرکزی کردار کو اُبھارتا ہو۔ اور جیسے ہی اسکا کام ختم ہوا اسے فسانے سے خارج ہوجانا چاہیئے۔ کیونکہ ہر کردار کو فسانے کے رنگ، فسانے کے عمل، اور فسانے کی زندگی کا حقیقی جزو بن جانا لازمی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیئے کہ جب تک ایک کردار داخل فسانہ ہے اسکے فعل و عمل کا حصہ، قصے کا ناقابلِ ترک جزو معلوم ہو، اور یہ نظر آئے کہ اس کی شرکت کے بغیر پلاٹ اور افسانہ ناقص ہوتا، اس کا داخل فسانہ ہونا کسی وقت بھی برائے بیت محسوس نہ ہوگا۔

ایک فسانہ نگار کیلئے، بالخصوص اس صورت میں کہ وہ نفسیاتی انداز کے فسانے لکھتا ہو، یعنی اپنے کردار کا ذہنی تجزیہ پیش کرے، میری رائے میں مناسب موقعے پر اس کی توراثی اور اسکے قیافے کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کردینا بہتر ہوتا ہے۔ اس سے اُس کردار میں ایک قسم کا تشخص آجاتا، اور پڑھنے والے کو اُس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور غالباً کردار کشی بھی مکمل ہوجاتی ہے۔

کردار کی صحیح نقاشی کے لئے فسانہ نگار کو یہ حقیقت ہر وقت سامنے رکھنا چاہیئے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں ہر لحظہ سے تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود تبدیل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک افسانہ نویس کے لئے اُس دُنیا کا جاننا ازبس ضروری ہے جس میں اسکے کردار پلتے بڑھتے ہیں۔ ایک کاشتکار کا کردار اُسی وقت کامل سمجھا جائیگا جب پڑھنے والیکو ناج کی بھَس اور گُڈ کی بھکراند آنے لگے۔ اس لئے کہ کردار نگاری معطل مادے کو ذی رُوح کردینے کا نام بلکہ اس کا کام ذی رُوح کو زندگی گزارتے دکھا دینا ہے۔

ایک خاص اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مختصر فسانے میں کسی کردار کی زندگی کے تمام پہلو پیش کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی ایسا کیا جائیگا، قاری کے ذہن میں اس کردار کی داخلی کیفیت کی تصویر کبھی قائم نہ ہوسکے گی۔ صاحب کمال فسانہ نگاروں کے یہاں ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک کردار کی زندگی کے بعض خاص اور وسیع المعنی پہلو منتخب کرلیتے ہیں، اور اُنہیں خصوصیات کو روشن کرتے ہیں جو روشن کئے جانیکے قابل ہوتی ہیں۔ اگر یہ مدعا حاصل ہوجاتا ہے تو اس کردار کی عمومی فطرت کا دھندلا سا خاکہ پڑھنے والے کی نظر خیال کے سامنے از خود قائم ہوجاتا ہے۔ کردار کی پوری زندگی کی تفصیل کرنے سے مقصودِ فسانہ چوک نہیں سکتا جو مختصر فسانہ کے عناصر خمسہ میں سے ہے۔ فوکس سے ایک ذرا باہر ہو کر تصویر زیادہ دلکش ہوجاتی ہے۔ اور خاکے کو ذرا سا دھندلا رکھنا بجائے خود ایک نزاکت فن، ایک صناعانہ فعل ہے میرے اندازے کے مطابق اس مقصد میں کامیاب ہوجانا فسانہ نگار کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

ایک کردار کش فسانہ نویس کو یہ بات کبھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ہم بالطبع شکل ہی کو دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ اس شکل کی تعمیر کن اجزاء سے ہوتی ہے ہمیں تو شکل کی بھی ایک ہی جھلک اس کا شدید ابنا دیتی ہے۔ اُس کا رازیہ ہے کہ

صناعت کو خوردبین سے واسطہ نہیں، چنانچہ کردار نویس کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ کردار کی صرف نمایاں اور جامع خصوصیات ہی پیش کرنے پر توجہ صرف کرے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ کردار کی دُنیا کا علم ہونا فسانہ نویس کے لئے لازمی چیز ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے، کہ اُس کے کردار اپنی سماج سے پوری مُناسبت اور اپنے ماحول سے کلّی مطابقت رکھتے ہوں۔

انسانی زندگی کے مطالعہ نے فلسفیوں سے کہلوا دیا کہ زندگی ایک معمّہ ہے۔ انسان زندگی جیتا ہے یا زندگی انسان کو جلاتی ہے، بہرحال یہ جینے کا فعل بجائے خود ایک مجبوری ہے، اور یہ مجبوری فی نفسہٖ زندگی کا استہزا ہے۔ چنانچہ ہمارے چاروں طرف زندگی مُنہ بناتی نظر آتی ہے۔ کردار نگار کی صناعت اِس میں ہے کہ وہ اپنے کردار کے اندر زندگی کے اِس مُنہ بنانے کی نقاشی کر سکے۔ فاقہ کش کسان، پھٹے حال مزدور، کھولو کا بیل کلرک، آبرو باختہ کسبی، خون آشام مہاجن، ظالم و بے رحم زمیندار، مُسرف و عیاش سرمایہ دار، غرض زندگی کے جُملہ مظاہر میں زندگی مُنہ بنا رہی ہے، اور وہ مظاہر فسانہ نویس کی زنبیل شعور و تحت الشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو زندگی بیان کی جائے گی وہ واقعیت نگاری ہوگی۔ واقعیت نگاری محض پست طبقوں کی زندگی کے بیان تک محدود نہیں۔ کردار نگاری کا فرض ہے کہ پست طبقوں کی زندگی کا حُسن و قبح بھی بیان کرے اور اعلیٰ طبقوں کی زندگی کی دلفریبی و کراہت بھی۔ ہبوطِ آدم نے اولادِ آدم کو جیسا کچھ بنایا یا بگاڑا ہے، اُس بننے یا بگڑنے کو جیتا، سانسیں لیتا ہوا دکھا دینا کمالِ فن ہے۔

ایک مُصنّف اگر حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ کرتا اور زندگی کے ابتدار و آفات اسے مُتاثر کرتے ہیں، تو یہ تو ناممکن ہے کہ اُس کا دل دُنیا کی بے رحمیوں پر دُکھ نہ جاتا ہو، اور بیچارہ و مجبور انسان کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کے بادل نہ اُمنڈتے ہوں۔ بلکہ حقیقت میں اس کے یہی محسوسات و جذبات اُسے زندگی کی نقاشی پر اُکساتے اور زندگی کے یہی پہلو اس کے فسانے کا مقصود قرار پاتے ہیں۔ لیکن کردار نویسی کی کامیاب صناعت کا راز یہ ہے کہ وہ متاثر ہونے کے باوجود اپنے کردار کے افعال و اعمال پر جج بن کر فیصلہ صادر نہ کرے، اور ایسا ہی بے تعلق رہے جیسے کہ فطرت انکو خلق کر کے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ یہ کسی وقت معلوم نہ ہونا چاہیئے کہ مُصنّف اپنے کردار سے نفرت کر رہا ہے یا محبّت، اُسے غصّہ ہے یا رحم۔ کیونکہ اس کا کام حقیقی زندگی کو روشنی میں لانا ہے، اسپر جرح و تعدیل کرنا نہیں۔ اس مدعا کو حاصل کرنیکے لئے مُصنّف کی طبیعت میں کسی قدر تفلسف کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ بات کہ دُنیا بہرحال رہنے کے قابل جگہ ہے، اس لئے کہ اس میں ناقص خلقت اور بدرد یہ انسانوں کی کمی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو افسانے کا مسالہ اور اُس کا عمدہ موضوع ہے۔ فسانہ نویس میں اگر یہ خوبی نہیں، تو آپ اکثر دیکھیں گے کہ فسانہ نگار صاحب ہیروئن کے ساتھ خود عشق فرماتے ہیں اور اپنے رقیب کو جی بھر کے گالیاں دے رہے ہیں۔

ایک فسانہ کے اندر جتنے کردار بھی ہوں، ان کا فرضِ منصبی یہ ہونا چاہیئے کہ فسانے کی فضا کو برقرار رکھیں اور وہ فی المعنی مرکزی کردار کو اُبھارتے ہوں۔ یعنی فسانے کے واقعات کی پیچیدگی کے اندر سے (بشرطیکہ اس پلاٹ میں کوئی پیچیدگی ہو بھی) فسانہ کے پلاٹ کا بروز ہو، اور مرکزی کردار کا بروز باقی کردار کے اختلافی یا تائیدی فعال سے ہوتا ہو۔

مُصنّف کے خیال میں اگر اُلجھن ہوگی تو نہ صرف اس کا بیان ژولیدہ ہوگا بلکہ کردارکشی بھی صاف وصریح نہ ہوسکے گی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کو اپنے مُشاہدے کی مدد سے کردار کا تصوّر نہایت قطعیت کے ساتھ قائم کرنا پڑتا ہے، اور اُسے پیش کرتے وقت اُس کی حِس تناسب اور قدرت تنظیم سے کام لیتا ہے۔ اعلیٰ کردارکشی کے لئے ایک مُصنّف کے ذہن و ذکاء کا صحیح و تندرست ہونا بھی اشد ضروری ہے یعنی اسکا محض تخیّلی یا نرا شاعر ہونا حقیقی کردارکشی کے منافی ہے۔

اس عہد کی کردارکشی کے لئے مُصنّف کا مابعدالطبیعاتی رُجحان بھی فن وصناعت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھے اُسی کو مانے، جسکو چھوئے اُسی کو تسلیم کرے۔

ایک فسانے میں جب متعدد کردار نقش کرنے ہوں تو یہ احتیاط بھی لازم ہے کہ اُن میں تنوّع اور تضاد ہو، کیونکہ تنوّع پلاٹ کو سُبک بنانے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ تنوع کے بغیر پلاٹ یقیناً بھدّا ہوجاتا ہے۔ لیکن متعدد کردار میں تنوّع پیدا اور قائم رکھنے کے لئے مُصنّف کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ عمیق ہونا لابدی ہے۔

کردارکشی کا یہ طریقہ زیادہ اثرآفریں سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اعمال بلاواسطہ صادر ہوں۔ جو مُصنّف اپنے کردار کو بالواسطہ عمل کا عادی بناتے ہیں ان کو حصولِ مقصد میں دقّت پیش آتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ ناکام رہتے ہیں یعنی کردار کے افعال بعیدالفہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

آخر میں، میں مکرّر کہونگا کہ کردارکشی منحصر ہے فسانہ نویس کے مُشاہدے کی گہرائی اور افعال انسانی کے نفسیاتی مطالعے کی عادت پر۔ اور چونکہ مشاہدہ و مطالعے کے مدارج ہیں اس لئے ایک فسانہ نویس کی کردارکشی اُسی مناسبت سے کامل یا ناقص ہوسکتی ہے۔ مُشاہدے اور مطالعے کے ساتھ طریق کار (method) اور طرزِ بیان وہ چیزیں ہیں جن سے کردار میں جان پڑتی ہے۔ کردار کو نمایاں کرنے یا اس کی فطرت کو واشگاف و نمود دینے کا احسن طریق بحث اور تقابل ہے، اور ناقص پیرایہ خود مُصنّف کا تعارف۔ کردارنگاری کے لئے کردار کا تقابل فطرت کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ دولت و افلاس، مادیت و روحانیت، محبّت و نفرت وغیرہ اور اس تقابل کے اندر تناسب و توازن پیدا کرنا وہ چیز ہے جو مُصنّف کے اندر عقیدۂ حُسن کی دلیل ہے۔ انسان ناقص ہونے پر عقیدہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ مُصنّف کو فطرت یعنی حُسنِ بسیط پر عقیدہ ہے!

فسانے کی فضا

فنِ فسانہ کے تحت، آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کی فضا ہے۔ مگر فضائے فسانہ کے متعلق یہ بتاسکنا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح وجود میں لائی جاسکتی ہے، نہایت دُشوار معلوم ہورہا ہے۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر انگریزی زبان میں بھی، جو ہماری علمی ترقیوں کا ذریعہ ہے، میری نظر سے کوئی ایسی جامع تحریر نہیں گزری جس میں کسی کامل فن نے فضا پیدا کرنے کے اصول بہ لحاظ فن بتاتے ہوں، بجز اس کے کہ مختلف ادبی تنقیدوں میں جستہ جستہ، فضائے فسانہ کی خوبی یا اس کے نقص کے متعلق ناقدوں کی قلم سے نکلے ہوئے چند فقرے

نظرسے گزرے ہوں۔ اِس لئے میں اپنے خیال کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کرونگا کہ فسانے کی فضا کا تعلق کن باتوں سے ہے۔ لیکن اس اصولی بات کو پہلے ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ فضا پیدا کرنا فی نفسہٖ یہ معنی رکھتا ہے کہ مُصنّف ایک نوع کی صناعانہ چالاکی سے کام لیتا ہے۔

بہرصورت، میرے خیال میں فضائے فسانہ کا تعلق کردارِ فسانہ کی داخلی کیفیات سے ہوتا ہے، اور یہ فضا حسبِ موقعہ وضرورت ایک منظر نقش کرکے بنائی جاتی ہے۔ یعنی جس موقعے کا بیان ہو، اور کردار کی جس ذہنی حالت اور دماغی کیفیت کو پیش کرنا مقصود ہو، اس کے مناسب حال گرد وپیش کی بعض ایسی چیزوں کی طرف چند ایسے اشارے کئے جائیں جس سے ایک ذی حیات اور اثر آفریں تصویر یا مرقعہ، پڑھنے والے کی نگاہِ خیال کے سامنے آجائے۔ اور یہ مُرقع اپنے اثر کے لحاظ سے اِس قسم کا ہونا چاہیئے کہ جو کردار متعلقہ کی داخلی حالت وکیفیت سے کلی طور پر ہم آہنگ وہمنوا ہو، اس کے افعال واعمال کا محرّک اور ممد ہو، اور اس کی رُوح یا نفس سے آمیز ہوتا ہو۔

جس قسم کی زندگی فسانے کا موضوع ہے اُس کے تفصیلی بیان (description) کے لئے اگر جزئیاتی اور طویل تصریح کی جائے گی تو فضا پیدا ہونے کے عوض غارت ہوجائے گی۔ کیونکہ مقصود تو کردار کی نفسیاتی حالت کو واضح کر دینا ہوتا ہے، اور تفصیلات کا طویل بیان ظاہر ہے کہ کردار کو قاری کی نگاہ خیال کے سامنے سے ہٹا دے گا۔ مختصر فسانے میں اختصارِ بیان بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ضرورت صرف اتنی ہوتی ہے کہ مختصر فقروں میں، پُرمعنی الفاظ کے استعمال سے اُسبک طریق پر آس پاس کے منظر کے چند ایسے مخصوص اور نمایاں خط وخال پیش کئے جائیں کہ پڑھنے والے کی توجہ کا مرکز خود وہ منظر نہ بن جائے، بلکہ اس منظر کا اثر اس کے ذہن میں قائم ہوجائے، اور وہ کردار کو اُس اثر ہی کی روشنی میں یا اس اثر کی عینک سے دیکھ سکے۔ اور چونکہ کردار کی حالت اُس منظر کے اثر سے مطابقت رکھتی ہے، کردارِ فسانہ اور فسانے کا پڑھنے والا ایک ہی اثر سے متاثر ہونگے۔ ان کے مابین اشتراکِ حال پیدا ہوجائیگا اور قاری کو کردار کے ساتھ ہمدردی ہوجائے گی۔ وہ اس کے جذبات اور حسیات کو کامل طور پر سمجھ سکے گا۔ مگر یہ بات اُسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ فسانہ نویس نے اِس منظر کے مخصوص خط وخال کو اس طرح چھوا ہو کہ پورا منظر نقش کئے بغیر اثر تو پورے منظر کا پیدا ہو مگر کردار اور قاری کے سامنے چند ہی چیزیں آئی ہیں۔

اس قسم کی منظر کشی ہر ایک کے لئے دُشوار رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا تمامتر مدار خود مُصنّف کے مزاج اور طبیعت پر ہوتا ہے کہ کسی قدرتی منظر کو دیکھ کر وہ خود کس طرح متاثر ہوتا ہے، اُسے کس شوق وانہماک کے ساتھ دیکھتا ہے، اور اُس سے کس حد تک لُطف اندوز یا منغض ہوتا ہے مظاہرِ فطرت کو وہ کس احساسِ انبساط یا کس احساسِ الم کے تحت سمجھتا ہے۔

ایک کامیاب فسانہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ اُسے مظاہرِ قدرت سے دلی لگاؤ ہو۔ وہ ہزار در ہزار وضع دار قطع کے برگستان و بوستان، مرغزار وگلزار کی رُوحوں سے آشنا ہو۔ گنگناتے ہوئے چشموں کے بول سمجھتا ہو، بادلوں کے نیرنگ کو دیکھ سکتا ہو۔ اُسے ان ہزار در ہزار شکلوں سے شناسائی ہونا چاہیئے جو کائنات میں چار ونطرف

بکھری ہوئی ہیں، اور اس کی تخیل و فکر اسے یہ سمجھنے کے قابل بنا دے کہ یہ بے شمار اور انگنت شکلیں اور جسم بالآخر دو ہی صورتوں میں ختم ہوتے ہیں — محبت اور موت کی صورتوں میں!

ایک افسانہ نگار جب فطرت اور اس کے مظاہر سے، اسکے تضاد اور ہم آہنگی سے، اور خود اس تضاد کی ہم آہنگی کے رازوں سے آشنا ہوگا تو بلا شبہ وہ اپنے مقصود کو صحیح طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

فسانے کی فضا پیدا کرنے میں سب سے بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ کردار اپنے آس پاس کی طرف سے بے خیال معلوم ہو اُس سے گہری دلچسپی لیتا محسوس نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کردار فسانہ اور منظر متعلقہ کو باہمدیگر، داخلی طور پر، ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور فسانہ نگار کی صناعت کا اہم راز اس بات میں ہے کہ وہ اس ہم آہنگی کے صحیح اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ اُس کے اندر اس امر کا صحیح اندازہ کر سکنے کی استعداد ہو کہ ماحول پیدا کرنے کے لئے صرف وہ باتیں انتخاب کرے اور اُسی حد تک بیان کرے جتنا کہ خود اس میں اور اس کے کردار فسانہ میں، نیز اسکے کردار میں اور منظر متعلقہ میں اشتراک ہو۔ اس کی مزید توضیح کے لئے یوں سمجھیئے کہ فضا کے اندر سے کردار، اور کردار کے اندر سے اُس کے افعال اس طرح صادر ہوں جیسے ایک متناسب الاعضار، ایک سڈول جسم کے جوان چہرے سے زندگی ہویدا ہوتی ہے — یعنی اس میں حُسنِ تناسب بدرجۂ اتم ہونا چاہیئے۔

غالباً میں یہ واضح کر سکا ہوں کہ فسانے کی فضا کے لئے خود مصنّف، منظر متعلقہ، کردار فسانہ، اور فسانہ پڑھنے والے کی داخلی کیفیات کا ایک ہونا فضائے فسانہ کی تکمیل ہے۔

حُسنِ تناسب کا کامل ہونا وہ اصول اور حقیقت ہے جو کردار فسانہ کے عنوان میں بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ فضائے فسانہ کے بیان میں۔ میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں کہا ہے کہ فسانہ اگر یہی زندگی کا مُرقعہ ہے تو اس کے بیان میں کردار کی اٹھان ایسی ہو کہ ہمیں اناج کی بھس اور کٹی کی بھکر اند آنے لگے۔ فضائے فسانہ کے ذیل میں بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنیکا صناعتی پہلو یہ ہے کہ بھس اور بھکراند تو محسوس ہو مگر اناج اور کٹی کا نام نہ لیا جائے۔ یعنی یہ اثر بالواسطہ پیدا کیا جائے۔

پلاٹ کے ضمن میں میں نے آپکو بتایا ہے کہ پلاٹ، کردار، اور ماحول فسانہ باہمدیگر حصر رکھتے ہیں۔ اس لئے آپنے محسوس بھی کیا ہوگا کہ مجھے بعض ان باتوں کی طرف مکرر اشارہ کرنا پڑا ہے جو میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ ناگزیر بھی تھا۔ بہر صورت ان تینوں عناصر فسانہ سے متعلق، فسانہ نگار کے لئے اُس کا طریق کار (method) ہی ایک وہ چیز ہے جسکی خوبی یا خرابی کے ساتھ فضائے فسانہ کی تخلیق وابستہ ہے۔ فسانہ نگار کے طریق کار کے متعلق میں اپنی آئندہ گفتگو میں مزید اظہار خیال کرونگا جو طرز بیان پر ہوگی۔

زندگی کے نیرنگ کا مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا مدار بھی مدارج پر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ موسیقی کا مدار اسکے زیر و بم پر ہے یا نقاشی کا مدار ہلکے اور گہرے رنگوں کے امتزاج پر۔

چنانچہ جب سازوں کے تار کامل طور پر مل جاتے ہیں تو ایک ایسی فضا وجود میں آجاتی ہے جس کے اثر سے سُننے

والا داخلی طور پر عالمِ کثیف سے باہر پہنچ جاتا ہے۔ اور ایک تصویر میں جب ہلکے اور گہرے رنگ صحیح طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو دیکھنے والا تصویر کی فضا کے اندر داخل ہو کر اپنے بطون سے ہمنوا ہو جاتا ہے۔ یہی حال شاعر اور ادیب کی صناعت کا ہے کہ جب وہ صحیح فضا پیدا کر لیگا، پڑھنے والا کردار فسانہ کے تاثر سے متاثر ہو جائیگا جو دراصل خود مصنف کا تاثر ہوگا۔ میرے نزدیک صاحبِ کمال فسانہ نویس کی کامیابی کا راز یہی ہے۔

اس لئے، فسانے کی فضا پیدا کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ مصنف جو کچھ دیکھتا ہے وہ قاری کو بھی دکھادے، جس طرح خود متاثر ہوتا ہے پڑھنے والے کو بھی محسوس کرادے۔ اور یہ کہ فسانہ نویس جس قماش کی بھی مخلوق وضع کرتا ہے، اُسے ایسے ماحول میں پیدا کرے جہاں اس کا خلق ہونا قرینِ فطرت ہو، اور جب وہ فسانہ پڑھا جائے تو پڑھنے والے کو بھی وہ سب کچھ نظر آنے لگے، وہ سب کچھ محسوس ہونے لگے۔

فسانے کی فضا، فسانے کے آغاز میں پیدا کر کے اسے آخر تک برقرار رکھنا اور نبھائے جانا مقصودِ فسانہ کو کبھی دُھندلا نہ ہونے دیگا، اور ہر نئی صورتِ واقعہ کے شمول سے گروا چمکتا جائیگا۔ لیکن اگر شروع ہی میں فضا تیار نہیں کی گئی ہے تو فسانے کا ناکام رہنا یقینی ہوتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ فضائے فسانہ کے باب میں میرا مافی الضمیر بخوبی واضح ہو جائے۔ اسلئے میں انگریزی کے ایک رومانی فسانے کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس اقتباس کو پڑھکر آپ میری گفتگو کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ سُنیئے:۔

"ایک دوشیزہ باغ کے وسط میں بیٹھی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں گہرے رنگ کے پھول ہیں، پُشت پر ایک پتلی ندی بل کھاتی ہوئی بہہ رہی ہے، کنارے پر کہیں کہیں بانسی کے جُھنڈ ہیں، اور ایک عجیب قسم کا پرند کھڑا ہے ...."

اِس مختصر تصویر میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی ہے، کچھ شوخ رنگ پھول ہیں، بل کھاتی ہوئی پتلی سی ندی ہے، بستان کے دو چار جُھنڈ ہیں، اور کنارے پر ایک تنہا پرند کھڑا ہے۔ مگر منظر کے ان چند خط و خال میں مجھے وہ سارا منظر اپنی تفصیلات کے ساتھ نظر آرہا ہے جو اس تصویر کے آس پاس ہو سکتا ہے۔ اور اس منظر کی ساری فضا جو اس نقاشی سے پیدا ہے میری روح میں پیوست ہوئی جارہی ہے۔ اسی اقتباس کا آگے کا ٹکڑا یہ ہے:۔

"لڑکی کے قریب ایک درخت ہے جس میں بڑے بڑے پھل لٹک رہے ہیں۔ یہ درخت طرفہ طریق پر عام درختوں کے خلاف متناسب ہے۔ لیکن عام درختوں کی طرح اس میں بھی وہ بے نام شے موجود ہے جو ہمیں محسوس کرادیتی ہے کہ درختوں میں جان ہے اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ وہ لڑکی ٹکٹکی باندھے ہم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مذور اور نیلگوں آنکھیں، اور وہ پھول بھی جو اس کے ہاتھ میں تھے، ہمیں گھورتے معلوم ہوتے تھے۔"

پہلے ٹکڑے میں تنہا پرند اور دوسرے میں تنہا درخت، اس لڑکی کی تنہائی کی طرف اشارہ ہے۔ یقیناً آپ محسوس

یہے ہونگے کہ اس مختصر بیان سے اُس لڑکی کی حیران نظری اور حیران خیالی، دونوں کا اظہار مقصود ہے۔ لڑکی کی گول موں اور اُن پھولوں کو بھی گھورتا ہوا دکھانا، لڑکی کے گھورنے کو صناعت ادب کے منتہائے کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اسکے ٹکی باندھکر دیکھنے سے اُس کی معصومیت اور الھڑپن کا علم ہوجاتا ہے۔ درخت کا غیر معمولی تناسب اور اُس میں رس پھلوں کا ذکر اُس دوشیزہ کی جوانی و جمال سے استعارہ ہے۔ درخت کی طرفگی و ندرت دوشیزہ کی نادر شخصیت ی رمز ہے۔ اور پھر درخت کے اندر اس شے خاص کی موجودگی کا اشارہ ہے جو تمام درختوں میں مشترک ہوتی ہے۔ لڑکی کے اندر اجتماعی زندگی کی آرزو پروری، شوق، اور روح کا نکتہ ہے۔

مختصر لفظوں کے اس جامع اقتباس سے شعریت و ادبیت اور اس کی صناعت کے ساتھ منظر کشی کا کمال، کردار کشی ی معراج، اور افسانہ نویسی کا معجزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ دوشیزہ کی جو تصویر اور اس کی فطرت اساس جوان مختصر جملوں میں دکھادی گئی ہے، اس میں اسقدر امکانات مخفی ہیں کہ اس کا کردار خود بخود بروز پاسکتا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی ہے معصوم ہے، لیکن محبت کی پزیرائی کے لئے طیار ہے۔ جس ماحول کے اندر یہ لڑکی پیش کی گئی ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی محبت پاکیزہ ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں روشن پھول ہیں، یعنی وہ اپنے گلہائے محبوبی کا تحفہ محبت کے شوالے پر چڑھانے کے لئے تیار ہے۔

ادب کے اس پُرصناعت نمونے میں آپنے دیکھا کہ مختلف قسم کی چیزیں بے ربط ہونے کے باوجود کتنی باربط ہیں؟ ایک کی حالت کا اثر دوسری کے ساتھ کس درجہ ہم آہنگ ہے، ہر شے منفرد ہے لیکن اثر آفرینی نے اُن کو پانی کی موجوں کا ایک سلسلہ بنادیا ہے۔ اس منظر نگاری کا مجموعی اثر فضا پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نقاشی میں اثر کی تکمیل و یکرنگی ہے اور موضوع کے مفہوم میں تسلسل اور اس کے ساتھ حسی و کیفیاتی سلسلہ و ربط بھی ہے۔

افسانے کا طرزِ بیان

افسانے کے پلاٹ، کردار، اور فضا، کے بعد میری آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کا طرزِ بیان ہے۔ ادبیات میں تخیل کو روح اور طرزِ بیان کو جسم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ادب کی تحسین اور ادیب کا کمال اس میں سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی ہر تحریر بالنظم ہو یا نثر، حشو و زوائد سے پاک ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی لفظ یا کوئی بات بھرتی کی نہ ہو۔ چونکہ مختصر فسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں قلیل وقفے کے اندر مختصر الفاظ میں ایک فسانہ کے مقصود کو مکمل طور پر پیش کرنا، اور وسیع مفہوم کو سمجھا دینا پڑتا ہے، اور چونکہ اس میں تمام تفصیلات بیان نہیں کی جاسکتیں اور مفہوم و مطلب کی طرف اشارہ سازی سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ دعوے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یعنی فسانہ پڑھنے والے کو اپنے مقصود کا یقین دلا سکتا ہے۔ مختصر فسانہ ایک قاری کو متحرک کر سکتا ہے، اس سے شورش کرا سکتا ہے، لیکن اس کے اندر اپنے مقصود کا یقین ۔ [illegible] نہیں ہوسکتا۔

الغرض کسی تحریر کو بھرتی سے پاک رکھنے کے لئے فسانے کے طرزِ بیان کا نادر ہونا ضروری ہے۔ طرزِ بیان کا حُسن اسی میں ہے کہ تحریر میں ایک لفظ، ایک فقرہ، یا ایک صورت واقعہ (Situation) ایسی نہ ہو جسکو اگر نکال دیا جائے تو عبارت بے ربط یا مطلب خبط ہو جائے۔

کم سے کم الفاظ کا استعمال فصاحت کا اصول ہے، بشرطیکہ مفہوم میں اُلجھاؤ پیدا نہ ہو لیکن مختصر فسانے میں فصاحت کے خیال سے قطع نظر، زیادہ سے زیادہ مفہوم بیان کرنے کے لئے محذوفات و مقدرات سے خاص طور پر کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایک پیرے اور صفحے کا کام لفظوں اور فقروں سے لیا جانا از بس لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے فسانہ نویس کو بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مقدرات و محذوفات سے عبارت ایسی مبہم نہ ہو جائے کہ مفہوم خبط اور بے ربط نظر آئیں۔

فسانے کا یہ طرزِ بیان، میرے خیال میں، زیادہ دلکش ہوتا ہے کہ کردار فسانہ کے جن حالات اور واقعات کا تعلق اصل قصہ اور مقصود فسانہ سے نہ ہو، لیکن قصے کو سمجھانے یا کردار کو اُبھارنے کے لئے اُن کا بیان ناگزیر ہو جائے تو اُن میں سے صرف وہ حصے ضمنی طور پر بیان کئے جائیں، اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ وہ اصل فسانے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہوں، پلاٹ کو واضح، اور کردار کو سریع الفہم بناتے ہوں۔

ہر عمدہ انشا کے لئے زورِ بیان لازمی چیز ہے۔ طرزِ بیان کمزور ہوگی تو فسانہ یقیناً غیر دلکش ہوگا اور غیر حقیقی نظر آئیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بیان کا پھیکا ہونا یا فسانے کا غیر حقیقی نظر آنا اسکا سب سے بڑا نقص ہے۔

زورِ بیان کے علاوہ طرزِ بیان میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی جس قدر زیادہ ہوگی، الفاظ کا انتخاب جتنا متناسب، اور فقروں کا دروبست جتنا چُست ہوگا، اس کا حُسن اسی قدر بڑھ جائیگا۔ حسین طرزِ بیان میں انداز کی قطعیت بھی اس کے لازمی اجزا میں سے ہے۔ لیکن طرزِ بیان میں زور اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ موقعہ کی مناسبت کے اعتبار سے اس میں جذبات کی کثرت و شدت ہو، اس میں گہرے اور نازک حسیات بیان کئے گئے ہوں اور جہاں تک ممکن ہو خیال وبیان، دونوں میں انتہا کی صفائی ہو۔

افسانے کے بروز میں اگر کسی وقت مقصود فسانہ مبہم ہوگا تو اُس کا سبب طرزِ بیان کا نقص یا اس کی کمزوری ہوگا۔ اس کے برعکس مقصود فسانہ کو، ہر تائیدی صورت واقعہ کے شمول اور ضروری تفصیلات کے اضافے سے صاف اور واضح تر ہوتے رہنا چاہیئے۔

مختصر فسانے کی غایت ایک مجرد اثر پیدا کرنا ہے، اور یہ اثر مترتب ہو سکتا ہے ضروری تفصیلات کے صناعانہ بیان اور تائیدی صورت واقعہ کے صحیح انتخاب سے۔ اسلئے تفصیلات وہ مخصوص و مختصر تفصیلات ہوں جو فسانے کی فضا بناتی ہوں، کردار کو بروز دیتی ہوں، اور اثر میں اضافہ کرتی ہوں، فضا کو غیر ہم آہنگ کرنے یا کردار کے بروز کو نہ روکیں، اور اثر کو زائل کرنے والی نہ ہوں۔ اور تائیدی صورت واقعہ وہی منتخب کی جائیں جو اصل اثر آفرینی میں ممد ثابت ہوں، اُس کو ابہام میں نہ ڈالیں۔

ہر مُصنّف کا طریق کار (method) جُدا ہوتا ہے کیونکہ یہ اس کی ذاتی اور خصوصی چیز ہے۔ افسانے میں مطلوبہ اثر ایک مُصنّف اپنے طریق کار سے پیدا کرتا ہے، اور اس اثر کے پیدا ہونے سے فضا بھی بنتی چلی جاتی ہے اور یہی وہ موقعہ بھی ہوتا ہے جب افسانہ نویس کو زمان و مکاں پر قدرت ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی فضا کی تکمیل یا اسکا ناقص ہونا مُصنّف کے طریق کار کی خوبی یا خرابی پر منحصر ہے۔ افسانہ نگار کا طریق کار جو اس کے طرزِ بیان کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے کردار کو بولتی چالتی تصویریں، گوشت و پوست کے انسان بنا دیتا ہے، اسکے پاس تنہا ذریعہ یہی ہے جس پر کہ زندگی کا سچا نقش کھینچنے کا مدار ہے۔

طرزِ بیان میں بالواسطہ اثر آفرینی زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ بے واسطہ اور براہِ راست اثر پیدا کرنے میں ایک افسانہ نگار کو حتیٰ الامکان تامل ہونا چاہیئے۔ اور جہاں تک طرزِ بیان کی تزئین اور آرائش کا تعلق ہے، اسے محض ہلکے لمس تک محدود رکھنا مناسب ہے۔ بالواسطہ اثر آفرینی اور اشاراتی آرائش کلام سے فسانہ پڑھنے والے کو فسانہ حقیقی معلوم ہونے لگے گا۔ اگر اثر آفرینی کا طریقہ بے واسطہ اور تزئین عبارت بھدی ہے تو فسانہ پہلی نظر میں غیر حقیقی معلوم ہوگا۔

ایک اور چیز جو طرزِ بیان کے لئے ضروری ہے وہ عبارت کی صوری و معنوی ہم آہنگی ہے یعنی الفاظ کا انتخاب اور ترتیب مفہوم کی نوعیت کے لحاظ سے ہوئی ہو۔ الفاظ کا باہمی ربط و توازن مفہوم کے مناسب حال ہو۔ فسانے کی خوبی یہ ہے کہ شروع کرنے کے بعد سے آخر تک قاری کی توجہ اس میں جذب رہے اور دلچسپی اگر بڑھتی نہ رہے تو قائم تو ضرور رکھی جاسکے۔

قاری کی توجہ اور دلچسپی قائم رکھنے کے لئے پہلے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ صورت واقعہ کا انتخاب نہایت صحیح ہو۔ پھر طرزِ بیان کی شگفتگی اور طریق کار کی ندرت کام دیتی ہے۔ فطری صورت واقعہ کا صحیح انتخاب اور طرزِ بیان و طریق کار کی شگفتگی و ندرت طویل ناول کے مقابلے میں مختصر فسانے میں بآسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ طویل ناول میں ان باتوں کو تا بہ آخر نبھا سکنا کامل فن ہی کا کام ہوتا ہے۔

میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں بتایا ہے کہ فسانے کے بروز میں ایک صورت واقعہ بیان کرنیکے بعد نئی صورت واقعہ کی طرف گریز قصیدے کی گریز سے مماثل ہے۔ یعنی جب نئی صورت واقعہ بیان ہونے لگے تو واقعات کا باہمی ربط ایسا ہو کہ پڑھنے والا اس گریز کو محسوس نہ کرسکے۔ طرزِ بیان جو اختیار کیا جاتے وہ موضوع فسانہ کے رُتبے کے موافق ہونا چاہیئے۔ اسکو انگریزی میں (scale of values) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

افسانے کی کامیابی صرف طرزِ بیان پر موقوف ہے۔ طرزِ بیان میں کسی موقعہ پر ابہام پیدا نہ ہو، اسے چشمے کے پانی کی طرح صاف و شفاف ہونا چاہیئے اور اس میں اُسی پانی کی سی روانی بھی ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک چشمے کی طرح جس کا پانی کہیں گہرا ہوتا ہے اور کہیں اُتھلا، لیکن اس کی روانی اور بہاؤ ہر جگہ حسین نظر آتا ہے، اسی طرح طرزِ بیان بھی گہرا اور اُتھلا ہوسکتا ہے، مگر اس کی روانی ہر جگہ حسین نظر آنا چاہیئے۔ آپ کے مُشاہدے میں آیا ہوگا کہ صاف و شفاف چشمے کی تہ میں بلور کے رنگین ٹکڑے اس پانی کو بھی رنگین دکھاتے ہیں، اور کسی چشمے میں تو کہیں واقعی سچے جواہر بھی چمکتے مل جاتے ہیں۔

ل یہی صورت طرزِ بیان کی ہے۔ اس کے مفہوم کہیں گہرے ہونگے کہیں سطحی، مگر جا بجا بلور پاروں کی سی رنگینی جھلکتی دکھائی
گی، اور کسی وقت جواہر ریزوں کی تاب و تابش بھی دکھائی دیجانے گی۔

زمان ومکان کی وحدت، اور اسکا ہم آہنگ ہونا، طرزِ بیان سے ، بیلئے قریبی تعلق رکھتا ہے کہ اگر ان دونوں میں
ی وقت تصادم رونما ہو جاتا ہے تو وہ ایک ادبی حادثے اور صدمے کا سبب بن جاتا ہے، جو فنِ فسانہ میں ناروا سمجھا
تا ہے۔

طرزِ بیان اگر شگفتہ ہے تو اس میں مصنف کا جمالیاتی ذوق بہ طرزِ احسن ہوئے کار آسکتا ہے۔ طرز اور عبارت اگر بیک
، تو مصنف کے لئے سہل ہوتا ہے کہ وہ دھنک کی نیرنگی، ریشم کی چمک، مخمل کی نرمی، اور پھولوں کی مہک اس طرح
بیں کر دے کہ خود اس کی طرزِ بیان زیادہ نازک و نظر فریب بن جائے۔ اس کے سے آسان ہو جاتا ہے کہ وہ جواہر کی رنگینی
ن کی جوت اور دمک کی مرصع کاری اس طرح کرسکے کہ طرز زیادہ لطیف ہونے کے ساتھ زیادہ قدر وقیمت کے قابل بھی
بجاتے۔ یہی اجزاء ہیں کہ جن کے صناعانہ استعمال سے فسانے میں پلاٹ کے تار و پود کے بغیر بھی، ایک خوش رنگ قالینی
ادٹ پیدا کی جاسکتی ہے۔

ایک افسانہ نگار کو کسی وقت بھی یہ نکتہ نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ کردار کی نقاشی اس کے ماحول کی مناسبت سے اگر
بیل یا شوخ ہو جائیگی تو باوجود زندگی کے مطابق ہونے کے بھی وہ زندہ نہ معلوم ہوگا۔ کیونکہ خود افسانے اور اسی کے
الہٰ تائید ی کردہ میں عدم تناسب کا نقص پیدا ہو جائیگا اور یہ تصنع اور آورد کی شکل ہے۔ اس لئے بہت احتیاط
زم ہوتی ہے کہ فسانہ نویس کردار کشی یا منظر نگاری میں اپنی حسِ تناسب کا صحیح استعمال کرے، تاکہ اس کے بناتے ہوئے
قعے موقعہ و محل کی مناسب حد سے گھٹ بڑھ نہ جائیں۔ لیکن یہ حسِ تناسب ایک فطری ودیعت ہے جسے تعلیم،
بیت اور ماحول سے مدد ملتی ہے۔

ایک دوسری احتیاط جو فسانہ نگار کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یک مانیت (Monotony) سے بچنا ہے۔
پہلے ایک مصنف کی فرہنگ الفاظ کا وسیع ہونا بہت ضروری چیز ہے۔ چنانچہ آپنے ادبی تنقیدوں میں پڑھا ہوگا۔ کہ
مصنفوں کے مستعملہ الفاظ کی تعداد بھی دیکھی اور شمار کی گئی ہے۔ فرہنگ کا وسیع ہونا بجائے خود ایک کمال ہے۔ لیکن
عموم ہوتا یہ ہو کہ جب ایک ادیب کی طرز قائم ہو جاتی ہے تو پھر اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا بھی تو وہ استعمال کم
وتا ہے۔ آپ جس مصنف کی جونسی کتاب بھی اٹھائیگا آپ اس کے خاص خاص الفاظ اور مخصوص اندازِ بیان و ادائے
یال کی تکرار پائیگا۔ کسی ادیب کی فرہنگ کا محدود ہونا ہر چند کہ خوبی نہیں بلکہ ایک نقص ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو
ں افسانہ نویس کو پلاٹ قائم کرکے کردار وضع کرنے میں وقت و زحمت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ دماغ میں خیال پیدا ہوتا
ہے اس کے ساتھ دماغ ہی الفاظ بھی پیش کر دیتا ہے۔ چنانچہ جتنی جس کی فرہنگ ہوگی اسی کے مطابق خیال بھی اس کے
ماغ میں پیدا ہوگا۔ یعنی اسے تلاش الفاظ نہ کرنا پڑیگی۔ لیکن اگر کسی کی فرہنگ وسیع ہے اور ایک ہی خیال کے لئے
ں کے حافظے میں متعدد الفاظ جمع ہیں تو یہ بات اس کے لئے گونہ دقت کا موجب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسکو صحیح اور مناسب ترین

لفظ اس خیال کو ادا کرنے کے لئے قائم کرنا پڑتا ہے۔ مگر جب اسے اپنی وسیع فرہنگ میں صحیح اور مناسب لفظ مل جاتا ہے تو اس کی ادبی پیداوار یقیناً اس محدود فرہنگ والے مُصنّف کی پیداوار سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ غرض کہ محدود ذخیرہ الفاظ والے افسانہ نویس کے لئے آسان ہوتا ہے کہ ایکبار موضوع و مقصود قائم کرکے، محدود طریق پر، افسانہ بیان کرنا شروع کردے۔ اُسے بہت سوچنا نہیں پڑتا۔ اس کا پلاٹ بن جانیکے بعد کردار بروز پاتے رہتے ہیں اسکے خیال والفاظ میں کشاکش نہیں ہوتی یا شاذ ہوتی مگر شدید نہیں ہوتی۔ اسے اِظہارِ خیال کے لئے مناسب ترین لفظ کے انتخاب پر غور نہیں کرنا پڑتا یا بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ سوچا لفظوں میں جاتا ہے اس لئے اس کا خیال انہیں الفاظ کی حدود کے اندر رہتا ہے جو اس کا حافظہ پیش کرسکتا ہے۔ یہ محدود اور وسیع فرہنگ کی بحث میرے لئے یوں ناگزیر تھی کہ مجھے آپ کے سامنے یہ نکتہ پیش کرنا ہے کہ محدود فرہنگ والا مُصنّف، کثیر الالفاظ مُصنّف کے مقابلے میں بے واسطہ اثرآفرینی سے تو قاصر رہتا ہے، لیکن وہ خیال آفرینی اور اشارہ سازی میں بسہولت کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور ہرچند اُسے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے، مگر یہ خطرہ بھی ہر وقت ہوتا ہے کہ جب اُس کا خیال اس کے الفاظ کی رسائی سے اونچا ہوجائیگا، اس کا اِظہارِ بیان ہمیشہ ناقص و نامکمل رہے گا۔ اور اظہارِ خیال کا ناقص ہونا، طرزِ بیان کو ناقص کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فسانے کے طرزِ بیان کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شروع میں لہجہ گو نہ شُست رکھا جائے اور پھر بتدریج زور پیدا ہوتا جائے۔ بعض نامور مُصنّفین کے اس انداز کی تعریف کی گئی ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں بہ صورت صناعت ادب کی کوئی اعلیٰ مظہر نہیں ہے۔ میں تو اس انداز کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں کہ فسانے کی اُٹھان کے ساتھ طرزِ بیان میں پوری قوت و توانائی کا اظہار ہو اور وہ آخر تک قائم رکھا جائے۔ طرزِ بیان کی ہمواری میری رائے میں ادبی حُسن ہے اور اس کی ناہمواری بہت بڑا نقص۔

طرزِ بیان کی دلکشی کے لئے اس میں اس طریقے کو مُرجح سمجھتا ہوں کہ کردار کے جذبات کبھی خود اس کے مُنہ سے براہِ راست بیان نہ کرائے جائیں، بلکہ بالواسطہ یعنی اس کے عمل (action) سے بیان ہوں یا تائیدی کردار فسانے کے ذریعہ سے بیان ہوں۔ آپکو خود بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ ایک شخص کی تکلیف یا خوشی کا بیان خود اُسکے مُنہ سے سُنکر آپ اتنے متاثر نہیں ہوئے ہیں جتنا کہ خود قیاس یا اندازہ کرنے سے۔ اور چونکہ افسانے کا مقصد پڑھنے والے کو کردار کے تاثر کی حد تک متاثر کرنا ہے، اِسلئے ہمیشہ بالواسطہ اثر پیدا کرنا زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے مگر بالواسطہ اثرآفرینی میں دستگاہ ہونے کو ایک مدّت درکار ہوتی ہے۔

آورد اور تصنع جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکام ثمر رہتی ہے، اُسی طرح افسانے کے طرزِ بیان میں اُس کا ناکام رہنا یقینی ہے۔ شاندار و خوشنما الفاظ اور سطحی مضامین حسین طرزِ بیان کو بھی بے جان بنا دیتے ہیں۔ ایک صاحبِ فن افسانہ نویس محض عبارت آرائی سے اتنا ہی پرہیز کرتا ہے جتنا کوئی کسی معدہ کو گندہ کرنے سے ایا کرسکتا ہے۔

روانی طرز بیان اور پلاٹ کی سادگی سے مصنف کو پورا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی صناعت ادب کو بروئے کار لاسکے۔ حسن بیان کا مقتضا یہ ہے کہ جذبات کو عریاں نہ کیا جائے۔ محبت کے بیان کو پاکیزہ رکھنا اور اس میں عمومیت یا آفاقیت پیدا ہونے دینا طرز بیان کے کمال کی دلیل ہے، ایک مصنف اگر اپنے فن میں کامل ہے تو وہ اکثر اوقات بیانات کے اظہار احساسات کے بیان، لفظی مرقعوں میں الفاظ کے متوازن استعمال سے صورت واقعہ پیدا کرسکتا ہے۔ اور اسکو طرز بیان کی معراج کہا جاسکتا ہے۔ طرز بیان ایک بے حقیقت بات یا واقعہ کو ایک اعلیٰ بات یا دلچسپ واقعہ بنا سکتی ہے، ارضی چیزیں سماوی بنجاسکتی ہیں اور کثیف لوری ہوسکتا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بتانے اور سکھانے سے آدمی بہت کچھ جان جاتا ہے، لیکن جو چیز کہ واقعی غیرفانی ادب پیدا کراتی ہے وہ یہ اسباق و بیانات نہیں، بلکہ صحیح ذوق اور صحیح حس تناسب ہے، اور ذوق کے بارے میں بیدل کا فیصلہ یہ ہے کہ ؎

طبع سالم فضل است ارث پدر نہ باشد!

ل۔ احمد

تجلیات

درد پاکر ہمہ تن دل نہیں ہونے پاتے
ہم ترے عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

اشک بنجاتے ہیں وہ خون جگر کے قطرے
قصۂ غم کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

ڈوب چکتے نہیں ہم بحر میں طوفانوں سے
یعنی آسودۂ ساحل نہیں ہونے پاتے

دیر و کعبہ ہیں بالفاظ دگر وہ سجدے
جو مرے عجز میں شامل نہیں ہونے پاتے

بے محابا نگۂ شوق تجھے دیکھتی ہے
اب حجابات بھی حائل نہیں ہونے پاتے

کردیا شوق طلب نے ہمیں گم کردۂ راہ
ہم سر جادۂ منزل نہیں ہونے پاتے

صورت شمع جلے بزم میں تیری برسوں
پھر بھی ہم رونق محفل نہیں ہونے پاتے

ہے کمی شوق شہادت میں دم قتل کہ ہم
قوت بازوئے قاتل نہیں ہونے پاتے

روز فردا بھی قیامت نہیں ہوتا تابش
اُن کے وعدے ہیں کہ باطل نہیں ہونے پاتے

تابش دہلوی

شاعرِ درماندہ

زندگی تیرے لئے بسترِ سنجاب و سمور،
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری،
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل۔

میں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش!
پارۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن!

تجھے اِک شاعرِ درماندہ کی اُمید نہ تھی
مجھ سے جس روز ستارہ ترا وابستہ ہوا
تو سمجھتی تھی کہ اِک روز مرا ذہنِ رسا
اور مرے علم و ہنر،
بحر و بر سے تری زینت کو گہر لائیں گے
میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب
کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں
اور راتوں کے سجود اور نیاز
(جسکا باعث مرا الحاد بھی ہے!)

اے مری شمعِ شبستانِ وفا۔
بھول جا میرے لئے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خُدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیاں میں ہے
تُو "مسرت" ہے مری تُو مری بیداری ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس نور کی ہے تجھکو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

ن۔م۔راشدؔ

نعرۂ انقلاب

از ——— قاضی نذرالاسلام
مترجمہ ——— اختر حسین رائے پوری

اشتراکی:- میں اس مساوات کے گیت گاتا ہوں جہاں پہونچکر سب اختلاف اور تفرقے مٹ جاتے ہیں۔
جس کے سایہ میں ہندو اور بودھ مسلمان اور عیسائی ہمدوش ہوجاتے ہیں۔
میں اُسی مساوات کا نغمہ سنج ہوں۔
تم کیا ہو؟— پارسی، جین یا یہودی۔ بولو تو ہی کیا ہو۔
تم جو بھی ہو۔ تمہاری مرضی ہے۔
پیٹھ پر خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لادے پھرو۔
قرآن۔ پران۔ انجیل۔ وید۔ تمہارا جی چاہے تو انہیں گھول کر پی جاؤ۔
لیکن یہ تو کہو اس دردِ سر سے مدعا کیا؟ ان کاغذی پھولوں پر جان کیوں دے دیتے ہو۔ وہ دیکھو باغ جہاں میں نئی چمن بندی ہو رہی ہے۔ سارے زمانہ کے علم کو کھنگالنے والو! ذرا کتابِ دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو۔
تمہیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگمگاتا ملے گا۔
اور تمہارا دل وہ کعبہ ہے جو بنی نوعِ انسان کا قبلہ نما ہے۔
تمہارا دل جو مشعلِ نور ہے تمہاری اس کور چشمی پر حقارت سے ہنستا ہے۔
بڑے بڑے تاجدار اسی دل کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔
وہی نیر تقدس ہے۔ وہی کعبہ ہے۔ وہی کاشی ہے۔ وہی جروشلم ہے۔
دیر و حرم۔ کعبہ و کلیسا۔ سب کچھ اسی دل میں ہے۔
عیسیٰ اور موسیٰ نے اسی خانۂ دل میں بیٹھ کر حق کی جھلک دیکھی تھی۔
یہی وہ میدانِ جنگ ہے جہاں کشن نے گیتا کا درد کیا۔
اور اسی کوہ میں بیٹھ کر نبیوں نے حقیقت کی تھاہ پائی۔
یہی وہ کوہِ ندا ہے جہاں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت کی پکار سُنی اور اس کی نجات کی خاطر راج پاٹ تج دیا۔
اسی دل کے مندر میں بیٹھ کر رسولِ عربی نے اپنا پیغام سُنایا۔
ہمدم تو کس فریب میں مبتلا ہے۔
سچ جان کہ اس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے۔

خدا:- تم آکاش پاتال اور دشت و جبل میں کس خدا کو ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔
مُردہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں ناحق مارے مارے پھرتے ہو۔

درویشو۔ صوفیو۔ تم نے بھی کمال کر دیا۔

دُنیا تمہارے مُنہ کو تک رہی ہے اور تم ہو کہ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو۔

خالق کی تلاش۔ یعنی تم آپ اپنی تلاش میں سرگرداں ہو۔

عقل کے اندھو۔ دل کی آنکھوں سے دیکھو تو آئینہ میں تمہیں اپنے چہرے کی ہر رگ پر اُسکی صورت نظر آئے گی۔

یہ سُنکر آگ بگولہ نہ ہو جاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ خدانخواستہ تم ہی اللہ میاں کے پرائیویٹ سکریٹری ہو!

ہر شے میں اس کا نُور ہے اور وہ ہر انسان سے شناسا ہے۔

سوداگر ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں لیکن اُنہیں سمندر کی تھاہ کیا معلوم۔ یہ موتی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن سمندر کی گہرائی کی خبر انہیں کیا۔

اس سمندر میں یہ گہرے کبھی نہیں گئے۔

ہمدم! تو ان کتابوں کو چھوڑ اور دریائے حقیقت کے اندر بیٹھ کر دیکھ کہ کیا تماشا نظر آتا ہے۔

انسان:-

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔

انسان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔

ہر زمانہ میں، ہر مُلک میں، ہر نسل میں، جتنے انسان ہوتے ہیں ــــ سب ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔ وہ سب انسانیت کے زمرہ میں شامل ہیں۔

پُجاری! دروازہ کھُول! بھوک کا دیوتا در پر کھڑا ہوا ہے۔ اُٹھ کہ پوجا کا وقت ہو گیا۔

خواب میں یہ ندا سُن کر پُجاری چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور عبادت گاہ کا دروازہ کھُول دیا۔ سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سب دلدّر دُور ہو جائیں۔

مسافر کے کپڑے تار تار تھے اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح لاغر تھا۔ بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "بابا۔ سات دن کا بھوکا ہوں"۔

مگر دروازہ بند ہو گیا اور ہراساں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے میں کانپتا ہوا وہیں گر پڑا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "دیوتا۔ یہ تیرا نہیں پُجاری کا مندر ہے"۔

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ، قورمہ کی رکابیوں کو مُلّا للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مسافر آیا جس کا جسم تکان سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ بولا "بابا! کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں"۔

مُلّا نے دیدے نکالکر کہا "مردود۔ یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے۔ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

بھکاری نے کہا "جی نہیں"۔ مُلّا نے چیخ کر کہا "ملعون نکل خدا کے گھر سے"۔ یہ کہہ کر مسجد میں اُس نے قفل جڑ دیا۔

فقیر نے آہ بھر کر کہا "یارب۔ اسّی سال کی مدّت میں میں نے تجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ تاہم میری روٹیوں پر تُو نے پابندی نہیں لگائی۔ تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے؟ پنڈتوں اور مُلّاؤں نے اُن پر کیوں قبضہ کر رکھا ہے"۔

ہلاکو۔ چنگیز۔ غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان مُقفّل عبادت گاہوں کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے۔

خدا کے گھر پر کون تالا جڑتا ہے۔ کون زنجیر لگاتا ہے۔

لاؤ ہتوڑی اور گدالا مسمار کر دو ان سیخانوں کو۔

اے عبادت خانو! تمہارے میناروں پر چڑھ کر منافقت نفس پرستی کا پرچم لہراتی ہے۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

قرآن۔ وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کمبخت مرے جاتے ہیں۔ یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انہیں بتلاتے کہ انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کرسکتیں۔ اور ان مُردہ کتابوں کے صدقے میں زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پی رہے ہیں۔

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانیوں کا خون بہہ رہا ہے۔ ہم انہیں کی اولاد ہیں۔ ہم بھی اُن جیسے انسان ہیں۔ معلوم نہیں۔ ہم میں سے کون اُن کے رتبہ کو حاصل کرے۔

ہمدم۔ میرا مذاق نہ اُڑا۔ "اُنا" کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی گلگی اوتار ہو۔ کوئی مہدی ہو۔ کوئی عیسیٰ ہو۔

پھر تُو کس سے نفرت کرتا ہے۔ کس پر وار کرنا چاہتا ہے؟

اے نادانو۔ اِس کا سینہ بھی بہت المعمور ہوسکتا ہے۔

اگر وہ بیمار اور نحیف ہے۔ اگر نادار اور مُفلس ہے تو کیا ہوا؟

دُنیا کے تمام عبادت خانے اس ایک پیکرِ خاکی سے زیادہ مقدس نہیں ہوسکتے۔

ممکن ہے کہ اسی دُکھیاری عورت کے بطن سے ایک ایسا انسان پیدا ہو جو تاریخ عالم میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔

جس بطلِ نور کو آج تک دُنیا نے نہیں دیکھا۔ جس ندا کو سُننے کے لئے زمانہ اب تک گوش برآواز ہے۔

ممکن ہو کہ وہ اسی کی جھونپڑی کو نوازے۔

انہیں گورکن کہہ کر حقارت سے نہ ٹھکراؤ۔ انکے اندر نہ جانے کتنے ہریشچندر چھپے ہوئے ہیں۔ کل انہیں میں سے کوئی سربلند ہوا تو تم اس کی آستان بوسی کو اپنی معراج سمجھو گے۔

گوالا کہہ کر اُسے کیوں نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں پھر کوئی 'کشن' پیدا ہو۔

کسان کے نام پر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو۔ سچ پوچھو تو وہی اس دُنیا کا سرتاج ہے۔

ان گڈریوں پر نہ ہنسو۔ انہیں میں ایک ایسا نبی پیدا ہوا جس کا پیام اب تک دُنیا کو منور کر رہا ہے۔

تمہارے دروازے پر کوئی فاقہ زدہ آیا تھا۔ اُسے تم نے دھکے دے کر بھگا دیا۔ تم کیا جانو کہ اس بھیس میں کون دیوتا تمہارا امتحان لے رہا تھا۔

ہمدم! تیرے سینہ میں حرص کی آگ سلگتی ہے، اور آنکھوں سے خود غرضی ٹپکتی ہے۔ ورنہ تُو دیکھتا کہ تُو فرشتوں سے قلی کا کام لے رہا ہے۔

دردِ دل ہی لذّتِ حیات ہے،

لیکن او دُنی فطرت، اسی جوہرِ انسانیت کو تُو اپنے نفس پر قربان کر رہا ہے۔

تجھے خبر نہیں کہ حرص و ہوا کا چنگل تجھے تیزی سے موت کے غار کی طرف دھکیل رہا ہے۔

گُناہ:۔ میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔
سب گنہگار میرے ہی بھائی بہنیں ہیں۔
اور میں؟ ——— میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے اترانے پاپیوں کا سردار ہوں۔

۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے بارِ گناہ سے جہنم دبا جا رہا ہے۔
لیکن انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر ملائک نے بہشت کی راہ پہچانی ہے۔

آدم سے لے کر نذر الاسلام تک ——— ہر فردِ بشر نے عذاب کی چھری سے ثواب کا گلا ریتا ہے۔

یہ تو پاپیوں کی بستی ہے۔
اس کے آدھے حصہ پر خدا کی حکمرانی ہے اور آدھے پر شیطان کی کارفرمائی۔

مذہبی دیوانو، سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو تو دیکھو۔

نیکی کے پودے پر صرف گناہ کے پھول کھلتے ہیں۔
اس جہانِ جمیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔

کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ نہ رکھ سکا۔

اُس نے اپنی روح اگر ثواب کے سپرد کی تو اپنا جسم گناہ کے حوالے کیا۔

ہمدم، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برہما، وشنو اور مہادیو جیسے جغادری ——— انسان کا ذکر ہی کیا ہے بڑے بڑے رشی منی ——— ان سب کی روح بے ریا ہو تو ہو، لیکن ان کے کالبد خاکی لہو و لعب کے پتلے تھے۔

یہ دُنیا سبہ خانہ ہے جہاں خرِ مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا خیالی پلان پڑا ہوا ہے۔

یہاں سب پرانے پاپی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے گناہ کے ترازو پر دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔

چوٹی اور ڈاڑھی کے پردے میں کیا تم اپنی ریاکاری کو چھپا سکتے ہو۔

پولیس کا وجود جس طرح چوروں کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے اسی طرح یہ پُر فریب وضع تمہاری سیہ کاریوں پر دلالت کرتی ہے۔

ایک روز فردوسِ بریں میں معصوم فرشتوں نے احتجاجی جلسہ کیا۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ اللہ میاں ہماری عبادت سے تو بے نیاز رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تمام رحمت اس خاکی عاصی ناری انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے۔

یہ شکوہ خالق کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ اس خاک کے پتلے نے کمال نازک دل پایا ہے، اسکی دُنیا میں ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے۔

ہر نین میں جادو ہے اور ہر لبِ لعلیں زہر ہلاہل میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہاں صندل بھی تپِ آرزو میں مبتلا ہے۔ اور چاند بھی بوسوں کی گرمی سے سیاہ پڑ رہا ہے۔

وہاں ہر حسین آنکھوں میں کاجل لگائے، گلے میں چندن ہار ڈالے، پیروں میں مہندی لگائے، ہونٹوں کو خونناب کئے ——— عالم کو تہہ و بالا کرنے کے درپے ہے۔

اِس دُنیا میں شیطان حُسن کی پوشش میں ملبوس ہے اور حُسن کی نگاہوں میں تیر ہے تو مُسکراہٹ میں انی ہے"۔

یہ سُنکر فرشتوں نے کہا کہ معبودا! ہمیں بھی ٹک اس جہان کی سیر کرا دے جہاں پھول اس لئے کھلتے ہیں کہ کملائیں، مُرجھائیں اور پھر پیوندِ خاک ہو جائیں۔

دربارِ باری سے ارشاد ہوا کہ تم میں سے دو جو سب سے افضل ہیں اس خاکدان کی طرف جائیں اور فریب ہستی کا تماشا دیکھیں۔

اجازت ملتے ہی "ہاروت" اور "ماروت" ٹوٹے ہوئے ستاروں کی طرح آسمان سے زمین پر اُترے۔

یہاں آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ذرّہ ذرّہ دامِ تزویر ہے۔ پتا پتا نقشِ فریب ہے۔ آسمان پر تو فقط ایک مہتاب جلوہ ساماں ہے لیکن آبِ دریا میں اس کی صدہا پرچھائیاں اُتر آئی ہیں۔

یہاں کی ہر ندا، ہر رنگ و بوحُسنِ خوں آشام کی تفسیر ہے۔

جس گھاٹ پر دیکھو روپ کی گگری کھل کھلا رہی ہے۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت بانسری کے سُروں میں فریاد بن گئی ہے۔

دو دن کے اندر ان آتشِ نفس فرشتوں کی رگ رگ میں مٹی کا رس سما گیا اور ان کے دل ایک جادو نظر کے گرفتار ہو گئے۔

جب زہرہ لہنگا پھڑپھڑا کر اور گگری چھلکا کر سامنے سے نکل گئی۔

تو ان خلد نشینوں کے پیروں میں عشق کی زنجیر پڑ گئی۔

آتشِ جہنم کا خوف لبِ شکریں کی شیرینی میں سرد ہو گیا۔

اور شرابِ کوثر کا لطف مٹی کے پیالوں کے آگے ہیچ ہو گیا۔

وہ ریاضت اور عبادت کہاں گئی؟ —— اب خدا کے ان مجلسیانِ خاص کو دیکھو کہ کس مزے سے ساغر سڈھا رہے ہیں۔

ادھر اللہ میاں نے فرشتوں پر طعن کس کر کہا۔ دیکھو زمین لیئم نے ہاروت و ماروت کا کیا حشر کیا؟

ہم نشین! یہاں ایک ایک جادو بھرے نین میں وہ قدرت ہے کہ اس کے ایک اشارہ کے سیل میں مدتوں کا زہد تنکے کی طرح بہہ جاتا ہے۔

مادرِ گیتی کا حُسن سدا بہار ہے۔

اور اس پر کسی جبار و قہار کا حکم نہیں چلتا۔ بلکہ اس پر محبّت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرماں روائی کرتا ہے۔

طوائف:- تجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟ ممکن ہے کہ تُو سیتا جیسی کسی ستی کی بیٹی ہو۔

تو جو بھی ہو، ہماری ماؤں بہنوں کی ہم جنس تو ہے۔

تیرے بچّے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں یا چچا اُن کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکسِ رخ نظر آ جائے۔ وہ بھی توقیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ پیدائش کے بعد انسان سے نفرت صریح کفر ہے۔

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟

اگر اہلیا[1] کو نجات حاصل ہو سکتی تھی اور میری[2] عصمت کی

---

[1] "اہلیا" گوتم رشی کی حسین و جمیل بیوی تھی، جس پر اندر دیوتا سو جان سے فریفتہ ہو گئے۔ ان دونوں کی خفیہ محبّت کا پتہ چلنے پر۔ رشی جی نے اہلیا کو بددعا دی۔ کہ پتھر کی مورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اس پر پڑے تو اس نے پھر انسانیت کا جامہ پہنا۔

[2] "میری" ایک فاحشہ عورت تھی جسے زنا کاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے تھے۔ جب اُنہوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انہوں نے جواب میں وہ معرکتہ الآرا جملہ کہا۔ "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو، وہ اس پر پتھر چلائے۔" بعد ازاں اس عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

دیوی بن سکتی تھی تو۔

تو بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابلِ عزت بن سکتی ہے۔

تیری اولاد کو جو لوگ نطفۂ ناتحقیق کہہ کر ٹھکراتے ہیں۔ اُن سے میں پوچھوں گا کہ اے نیکی کے فرشتو! دُنیا والوں میں سے کتنوں نے جذبۂ شہوت کو ٹھکرایا ہے؟ اُن میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟ ہم سب کو اسی شہوانی بھوک نے جنم دیا ہے۔ لیکن کوئی ہمارے غرور کو تو دیکھے۔

نطفۂ تحقیق ہو یا ناتحقیق ——— وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے۔

اگر عصمت فروش ماں کا بیٹا حرامی ٹھہرا تو شہوت پرست باپ کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا!

عورت:— میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں۔ دُنیا کے حشمت و جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا مرد کا۔

سوز و ساز، تپش و خلش، آگ اور آنسو ——— ان کی تخلیق میں مرد کا اتنا ہی حصّہ ہے جتنا عورت کا۔

دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے؟

کہدے کہ گناہ کا تخم بونے والا ابلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا۔ یا یوں کہو کہ وہ نہ مرد ہے نہ عورت بلکہ خواجہ سرا ہے! اور دونوں میں پل جل کر رہتا ہے۔

اِس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر اُبھرتے ہیں عورت ہی نے ان میں رنگ و بو، شیرینی و لطافت کی روح پھونکی۔

ہم نشین! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے؟

اندر ممتاز سوتی ہے۔ باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔

عورت دل ہے اور مرد جسم ہے۔

اگر مرد سُورج کی تپش اور بادِ سموم کا جھونکا ہے، تو عورت چاند کی کرن اور نسیمِ صبح گاہی ہے۔

اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جامِ کوثر ہے۔

مرد نے ہل چلایا۔ عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے سنجوگ سے کھیتی لہلہا اُٹھی۔

سونے اور چاندی کی زنجیریں عورت کے جسم سے چھُو کر حسین زیوروں میں مُبدّل ہو جاتی ہیں۔

عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی۔ اور مرد کے ہر لفظ کو موسیقی میں بدل دیا۔

عورت سلسبیل ہے، مرد مجسّم پیاس ہے۔

پانی اور پیاس ان دونوں کے میل سے ایک نیا آدم پروان چڑھتا ہے۔

مرد کی ہر فتح و نصرت عورت کی قربانی کی مِنت پذیر ہے۔

تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خُون بہایا۔

لیکن یہ کون بتلائیگا کہ اس کے لئے عورتوں نے کس طرح اپنا سُہاگ اجاڑ دیا ——؟

ماں نے جگر پاروں کو کیسے نکال پھینکا؟

شجاعت کی داستانوں میں یہ کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی نے برق دم بنا دیا تھا۔ راجہ پرجا پر حکومت کرتا ہے مگر راجہ پر رانی راج کرتی ہے۔ ملکہ کی محبّت، حاکم کی نخوت کو دھوتی ہے۔

اے بیدرد مردِ کُہن، کہ عورت نے اپنا خُون دے دے کر تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے، تاریخ جن لوگوں کے نام پر داری قربان ہوتی ہے، وہ سب خود فراموشی کے ایک لمحہ میں پیدا ہوئے تھے۔

عیاش باپوں کے ذہن میں ان کا تخیل بھی نہ تھا۔
ماں کی ممتا بچّے کو رحم و کرم، اُلفت و محبّت کا سبق
پڑھاتی ہے۔ مرد کی وفا نا آشنا آنکھوں میں عورت ہی
درد مندی کا کاجل لگاتی ہے۔
لیکن مرد کی احسان فراموشی تو دیکھو کہ وہ عورت
سے کس طرح پیش آتا ہے۔ جس نے اسے گود میں کھلایا
اسی کا گلا گھونٹتا ہے۔
جس شخص نے اپنے باپ کا حکم مان کر اپنی ماں کو
قتل کر دیا۔ اسے انسان، اوتار سمجھ کر پوجتا ہے پرش رام
جنھوں نے اپنے باپ کا حکم پا کر اپنی ماں کو قتل کیا تھا۔
لیکن سُن رکھو! اب وہ دن بیت گئے جب عورت
مرد کی پابند تھی۔
یہ مساوات، انسانیت اور اشتراکیت کا زمانہ ہے۔
بادِ صبا یہ پیغام لائی ہے کہ غلامی کے سب
بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔ اب نہ کوئی غلام ہے نہ کوئی غلام
فروش۔
اگر مرد عورتوں کو قید رکھنے کی کوشش کرے گا۔
تو وہ دن دور نہیں ہیں کہ یہ طوق خود اس کے گلے
کا پھندا بن جائے گا اور وہ آپ اپنے دام میں تڑپتا
ملے گا۔
دورِ حاضر للکار کر کہہ رہا ہے کہ جو دوسروں کے
لئے گڑھا کھودیں گے وہ خود اسی میں گر کر مٹ جائیں گے۔
او مٹی کے بلبلو! عورت پر جتنا تشدد روا رکھو گے
اسی قدر نامرد ہوتے جاؤ گے۔
عورت بتلا تو سہی، ان سنہری روپہلی بیڑیوں
میں تجھے کس نے جکڑ رکھا ہے؟
یہ کیوں ہے کہ اب تو اپنی جھجک سے آپ بگڑ گئی ہے۔

اور تیری آواز اس خیال سے کانپتی ہے کہ اسے کوئی
سُن نہ لے۔
آج تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔
تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، پاؤں میں بیڑی
اور چہرے پر گھونگھٹ۔
عورت، کب تک تو اس ظلم کو برداشت کرے گی۔
توڑ دے ان پابندیوں کو، نکل آ اس زنداں سے!
یہ زیور تیری غلامی کا تمغہ ہیں، انہیں مردوں کے منہ
پر پھینک دے۔
مادرِ گیتی کی لاڈلی بیٹی، پہاڑ اور جنگل کیوں اب
تیری آواز سے نہیں گونجتے؟
کیا یونانی سچ کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ ایک روز
تجھے اپنے اندھیرے تہ خانہ میں قید کر آیا تھا؟
ہاں ہاں، یہی ہوا تھا، تو روزِ ازل کی زندانی ہے۔
لیکن تو ڈرتی کیوں ہے، جب تو اپنے قید خانہ
کی دیواروں کو توڑ کر نکلے گی تو تیری چوڑیاں تاریک راستہ
کو اُجال دیں گی۔
مرد جو عزرائیل کا کُتا ہے، اپنے مالک کے ساتھ تیرے
قدموں پر لوٹتا نظر آئے گا۔
عورت! اپنے نازک ہاتھوں سے دُنیا کو آج تک
تو نے امرت کے پیالے پلائے تھے، للہ اب انہیں ہاتھوں
سے سم قاتل پلا دے! پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب آسمان
مرد کے ساتھ عورت کا بھی جیکارا منانے لگے گا۔

ڈاکو:- بھائی، تجھ پر جو چوری کا الزام لگاتا ہے اسے
یہ نہیں معلوم کہ آج یہی قانونِ کائنات ہے۔
حکومت منظّم ڈکیتی نہیں تو اور کیا ہے۔

کون ہے وہ خدائی فوجدار جو چوری کی بُرائیوں
پر وعظ کہہ رہا ہے ؟

اس سے کہو کہ دُنیا سے ایک بھی فرد بشر نکال کر
لادے جو ڈاکو نہیں ہے۔

منصف صاحب! ان قانون کے پوتھوں کو طاق
پر رکھئے۔

غریبوں کی جیب کاٹ کاٹ کر آج یہ سرمایہ دار جاہ مند
بنے پھرتے ہیں۔

جو شخص جتنا بڑا بے ایمان، فریبی اور جعلساز ہو۔
ہمارے سماج میں اتنا ہی معزز اور ہوشیار سمجھا
جاتا ہے۔

رعایا کی ہڈیوں سے راجہ کے محل کی اینٹیں اور
رعایا کے خون سے محل کا گارہ تیار ہوتا ہے۔

حریص سرمایہ داروں کے کارخانے غریبوں کی
محنت سے تیار ہوتے ہیں۔ ان کی مشینیں غریبوں کے
خون سے چلتی ہیں، مگر ان کے چلتوں انگنت انسان
بیکار ہو کر در در مارے مارے پھرتے ہیں۔

بیشمار انسانوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم
کر کے مل کا مالک شغل نا و نوش میں مست رہتا ہے اور
سونے کے تاروں سے مکڑی کا جالا بُنتا ہے

مہاجن کی توند اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب غریب
بھوکے رہیں، اور زمیندار اسی حالت میں آرام کر سکتا
ہے کہ غریب کی جھونپڑی کا دیا بجھ گیا ہو۔

دُنیا بیسوا ہے، گناہ رقص ہے،
دولت سرود ہے، سرمایہ دار تماشائی ہے
روٹی، صحت، امید اور زبان ــــــ
انسان ان سب نعمتوں سے محروم ہے اور تباہی کی
طرف بھاگا جا رہا ہے۔

اور کوئی رستہ نہیں ہے ــــــ کیونکہ سرمایہ داری
نے ہر ہر قدم پر گڑھے کھود رکھے ہیں۔

سارا جہان زنداں ہے اور ڈاکو اُس کے پہرے دار
ہیں۔

چوروں نے مالکوں کو قید کر رکھا ہے کہ کہیں وہ
باہر نکل کر اپنا مال چھین نہ لیں۔

ہمدم! کون کہتا ہے کہ تُو چور ہے، کون کہتا ہے
کہ تُو ڈاکو ہے۔

تُو نے ایک مُٹھی اناج کی چوری کی ہے۔ دلوں کا خون
نہیں کیا ہے۔

وہ بھی ہیں جو چوری نہیں کرتے تاہم انسان نہیں
ہیں۔

تُو نے چوری کی ہے، پھر بھی انسان ہے۔

حاکم اور محکوم

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔ جسے سُنکر، درد انسانی سب کو
ایک ہار میں گوندھ دیتا ہے۔

کتنی سیدھی سادی بات ہو کہ جب سب ایک ہی ماں
کی اولاد ہیں تو ان میں سے کوئی حاکم اور کوئی محکوم
کیوں ہو۔

لیکن لوگو۔ یہ تماشا دیکھو کہ کوئی اسی سیدھی سی
بات کو زور سے کہہ دے تو وہ بغاوت کا مُجرم ٹھہرتا ہے۔

رعایا تو حاکم کی باغی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر حاکم ظالم ہو تو رعایا کا باغی نہیں کہا جا سکتا۔

پرجا ہی راجہ کی خالق ہے۔ راجہ رعایا کو پیدا
نہیں کرتے۔

لیکن کتنی عجیب بات ہی کہ رعایا کی حالت غلاموں سے
بھی بدتر ہے۔
امن وامان کی قیمت ہم نے اپنی آزادی کی صورت
میں ادا کی ہے۔
کس سے فریاد کریں کہ ہم اپنے ہاتھوں محل بناتے
ہیں لیکن خود بے خانماں ہیں۔
جن کے لئے حکومت قائم ہوتی ہے، حکومت پر
اُن کا ہی کوئی زور نہیں چلتا۔
راجہ اور دیوتا ہمارے مُنہ کا نوالا کھا جاتے ہیں۔
اور ہم خود بھوکے مرتے ہیں۔
مگر یہ فریاد کس سے کیجئے۔ بھلا اسی میں ہے کہ ہم
"حکومت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے رہیں۔
عدالت رعایا کے گناہوں کی سزا کے لئے ہی، حاکم
تو انصاف سے بلند ہے۔
وہ دیکھو نقارۂ جنگ پر چوب پڑی!!
نونہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے
اور انہیں اپنے معصوم خُون کے چھینٹے دینے لگے۔
فتح کا ناقوس بجتا ہے اور اسکی صدائے بازگشت۔
بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی کراہ میں سُنائی دیتی ہی۔
لیکن شادمانی کا ڈھول پیٹے جاؤ کیونکہ فتح کی
دیوی کا رتھ گذرنے والا ہے۔
کیا کوئی بہن اپنے بھائی کے لئے ماتم کر رہی ہی؟
کیا کوئی ماں اپنے لختِ جگر کو رو رہی ہے؟
میدانِ جنگ سے اکلوتا بیٹا نہیں لوٹا؟
شوہر موت کا شکار ہو گیا؟ بھائی کی خبر نہیں ملی؟
تو کیا ہوا؟ یہ سب شہید ہو گئے!! ان سب نے
جامِ بقا پیا ہے!!

پریشان نہ ہو کیونکہ ہماری حکومت فتحیاب ہوئی ہی!
فغان وفریاد کا موقعہ ہی کیا ہے؟
فتح ونصرت کا پرچم بلند کرو! "بادشاہ زندہ باد" کا
نعرہ لگاؤ!۔
نقارہ پر ضرب لگاؤ!
دیکھو تو سہی کہ حضور پُر نور کتنے عرصہ کے بعد حرم سرا
سے باہر تشریف لاتے ہیں۔
ان زخمی سپاہیوں کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ کہ
ظل اللہ کی سواری کے آگے سے نہیں ہٹتے!!
یہ اندھے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ جاں بلب ہیں
تو کیا؟۔
حکومت کی فتح! بادشاہ کی کامرانی!
ہمدم، رعایا کا خون بہتا ہے۔ لیکن فتح حاکم کی ہوتی
ہے۔ اسی کا نام دُنیا ہے۔
سرکاری نوکروں کی تنخواہ رعایا کی جیب سے جاتی ہے۔
لیکن وہ حاکم کے نوکر ہیں، محکوم پر تشدد کرنے
کے لئے۔
رعایا کے نوکر رعایا پر ظلم کرنے کے لئے ——— کیا
بوالعجبی ہے!
لیکن آسمان کروٹ بدل رہا ہے۔
یہ اُمید اُمیدِ موہوم نہیں ہے کہ بہت جلد کائنات
کا ہر ذرّہ محکوموں کی فتح کے ترانے گائیگا۔

مزدور:- اُس روز ریل میں دیکھا کہ ایک قلی کو بابو صاحب نے
دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔
یہ دیکھ کر دل بھر آیا آنکھوں میں آنسو آگئے۔
کیا دُنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہینگے؟

جو مزدور اپنے گوشت و پوست کے ایندھن سے ریل
چلاتا ہے وہ خود تو پٹڑیوں پر پڑا ہوا ہے۔ ریل پر بڑے
لوگ بیٹھتے ہیں۔

کیا کہا "تنخواہ دیتے ہیں"! منافقو۔ کہتے شرم
نہیں آتی۔ مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے
انبار لگائے ہیں۔

سڑکوں پر موٹر، سمندر پر جہاز، فضا میں طیارے
اور شہروں میں مشینیں۔ یہ سب کن کے بنائے ہوئے
ہیں؟ اور کون انہیں چلاتا ہے؟

تمہارے قصر و ایوان کس کے خون سے رنگے ہوئے
ہیں۔ ان کی ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانۂ درد کندہ ہے؟
خاک کے ایک ایک ذرّہ کو اس جاہ و جلال کا اصل راز معلوم
ہے۔

لیکن وہ مبارک ساعت آ پہنچی۔
قرض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اسے فوراً
بے باق کرنا ہے۔

ہتھوڑی اور کدال سے جو آسمان بوس پہاڑوں کو
کاٹ کر رکھ دیتا ہے
راستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی
ہیں۔

تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ
اختیار کیا ہے۔
تمہاری بار برداری کیلئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے۔
وہی ــ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔
میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔

اس کا دکھا ہوا دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا۔
یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشین صرف اس وجہ سے
تمہاری توقیر کرینگے کہ تم بالا نشین ہو۔
جو لوگ فرطِ محبّت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا
بناتے ہیں، اب یہ زمین اپنے کو انہیں کے سپرد کرے گی۔
میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں، جن میں یہ
خاک پاک خود بخود لپٹ جاتی ہے۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون میں رنگ کر
بطنِ گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
اب تمام بندھنوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو۔
فلکِ کج رفتار کو چاہیئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے
آشیانے پر گر پڑے۔
ہمارے سر پہ چاند سورج اور ستارے پھول بنکر
برس پڑیں کہ ہم نے ایک جہانِ نَو کی داغ بیل ڈالی ہے۔
ساری دُنیا کے اِنسان سُن لیں۔ کہ ہم سب ایک
ہی کارواں کے مسافر ہیں۔
اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی
کھٹک محسوس کریں گے۔ ایک کی توہین بنی نوع انسان
کی توہین ہے۔
ایک نئی دُنیا نئے ارمانوں اور نئے مقصدوں
کے ساتھ راہِ حیات پر گامزن ہو رہی ہے جسے
دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے
لرزتا ہے۔

.. ..

حدیثِ میکدہ

نیرنگِ روزگار میں کیفِ دوام دیکھ
ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ

قدرت کی سیر کر۔ ترے ہوش و جنوں کی خیر
یہ گلستانِ صبح، یہ صحرائے شام دیکھ

کیا دیکھتا ہے غفلت و ہوش اس نگاہ کے
غافل حیاتِ غم کے فنا و دوام دیکھ

کل تک کھلا نہ تھا مرے دل کا معاملہ
آج اک جہانِ راز کو بے ننگ و نام دیکھ

بے جنبشِ نظر کے ہے یہ پرسشِ نہاں
یہ خاص ادائے لطف یہ اندازِ عام دیکھ

چشمِ سیاہ کار مٹاتی ہے۔ مٹ بھی جا
حشرِ حیات دیکھ، لبوں کا پیام دیکھ

بیکس نہیں ہے عشق بہت لے نگاہِ ناز
کیا تجھ کو میرے درد سے، تو اپنا کام دیکھ

ظلمت سرائے دہر میں کچھ روشنی سی ہو
اک رات کاروانِ عدم کا قیام دیکھ

یہ انقلاب ہے کہ یہ ہر جنبشِ نگاہ
ماضی و حال سب کے الٹتے نظام دیکھ

محرومیاں نہ دیکھ دلِ تشنہ کام کی
بزمِ نشاط، جلوۂ مے، چھلکے جام دیکھ

یونہی نہیں ہیں نرگسِ رعنا کی گردشیں
ہر دور، ہر سکونِ نظر، ہر مقام دیکھ

بس اک نگاہ حاصلِ بزمِ نشاط ہے
روئے نگار دیکھ، مے لالہ فام دیکھ

دنیا کو دیکھ لے کہ وہ دنیا نہیں رہی
برقِ نگاہ کا اثرِ ناتمام دیکھ

رعنائی خیال کو سمجھا جمالِ یار
یہ زعمِ عشق دیکھ، یہ سودائے خام دیکھ

اس زلفِ خم بہ خم میں ہو شامِ ابد کی سیر
صبحِ الست دیکھ، نظر کا پیام دیکھ

اٹھتی ہے چشمِ ساقیِ میخانہ بزم پر
یہ وقت وہ نہیں کہ حلال و حرام دیکھ

ہیں موجِ نور گنگ و جمن۔ جام ساقیا
یہ رات، یہ مقام، یہ ماہِ تمام دیکھ

خوابِ گرانِ رنج و غمِ روزگار سے
اٹھ اور جلوہ ہائے نشاطِ دوام دیکھ

ہر سانس موجِ بادۂ سرجوش ہو فراق
ہستی کو ماورائے فنا و دوام دیکھ

فراق گورکھپوری

ثمرِ گناہ

مجھے پہاڑ پر آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ یہاں نہ کوئی میرا ملنے جُلنے والا نہ میری کسی سے جان پہچان۔ اور اس پر طبیعت کچھ ایسی پائی ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں سے میل ملاپ پیدا کرنا مجھے پسند نہیں۔ تنہائی اور سکوت ہو تو اطمینان سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ سچ ہے۔ ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔ خیر! میں نے یہاں اپنے لئے ایک دستور العمل بنا رکھا تھا۔ صبح گھومنے چلا جاتا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر ذرا آرام کرتا۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر کوئی کتاب یا اخبار دیکھتا۔ اور پانچ بجے چائے پی کر پھر وہی گھوما گھامی۔

آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک آبشار تھا لیکن بارش شروع ہو جانے کے باعث میں یہ جگہ ابھی تک نہ دیکھ سکا تھا۔ "مانسون" کے ختم ہوتے ہی دن کو دھوپ خاصی نکلنے لگی۔ اور اکثر شگفتہ مقامات پر پک نِک پارٹیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ایک روز میں بھی یہ آبشار دیکھنے کے ارادے سے گھر سے چلا، سڑک بہت ناہموار تھی۔ دائیں جانب پہاڑ تھے اور بائیں طرف وادیاں۔ اور ان ہی وادیوں میں کہیں کہیں آبادیاں بھی تھیں۔ یہی پانچ پانچ دس دس گھر۔ آبادی کے قریب لبِ سڑک اکثر لڑکے اور لڑکیاں ہرے ہرے بھٹے بیچتے نظر آتے۔ پیسے میں ایک بھٹا ملتا۔ پہاڑ کی جانب چٹانوں پر سے جا بجا پانی ٹپکتا تھا۔ کہیں سڑک پر درخت اس قدر جھک آئے تھے کہ ایک محراب سی بن گئی تھی! بائیں جانب وادیوں کے دامن میں پانی کے دھارے سیماب کی طرح چمکتے نظر آتے۔

راستہ چونکہ اُترائی پر تھا اس لئے سفر جلد ختم ہو گیا۔ یوں تو دُور ہی سے آبشار کی شورشوں کی آواز کچھ ایسی معلوم ہوتی جیسے کہیں باجا سا بج رہا ہو۔ لیکن پاس پہنچکر جو منظر دیکھا وہ بھی کچھ کم دلکش نہ تھا پانی بلندی پر سے نیچے گر رہا تھا۔ اتنا صاف کہ بلور کی چادر کا دھوکا ہوتا۔ پاس ہی ایک دیو قامت پیڑ کے سایہ میں ایک سادھو پتّوں کی چھتری کے نیچے دُھونی رمائے بیٹھا تھا۔ سادھو کی برف کی طرح سپید سپید جٹیں تھیں! سُرخ سُرخ آنکھیں۔ ناخن کچھ بڑھے ہوئے۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ اور بدن پر بھبھوت رمائی تھی۔ پاس ہی کوئی تین ایک سال کی بچّی کھیل رہی تھی۔ معصومیت بھولے پن کی تصویر سمجھئے۔ ہلکے سُنہری گھنگھریالے بال تھے۔ کنول ایسی پیاری پیاری آنکھیں تھیں۔ گورے چِٹّے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ اور چاند ایسا خوبصورت چہرہ تھا۔ اِس ویرانے میں خاک کی اس تُپلی پر حورِ جنّت کا دھوکا ہوتا جیسے کردگارِ عالم نے اس گسائیں کے اطمینانِ خاطر کے لئے شاید عرش سے فرش پر بھیج دیا تھا۔

میں آبشار سے ذرا ہٹ کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ تھرموس میں چائے کچھ بسکٹ اور سینڈوچ جیب میں ساتھ لیتا آیا تھا۔ وہی نکال کر کھانے لگا۔ ننھی سی بچّی نے بھولے پن

سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بسکٹ اُس کی طرف بڑھا کر کہا۔ "لو بیٹا!"

بچّی نے دوسری طرف مُنہ موڑ لیا۔

"آؤ۔ لے لو!" میں نے پھر کہا۔

"لے لو اِندرا!" سادھو نے محبّت سے بچّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بچّی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں نے پاس جا کر دو چار بسکٹ اس کی گود میں ڈال دیئے۔

"یہ آپ کی بچّی ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"بھگوان کی دیا ہے!" سادھو نے جواب دیا اور مُسکرا مُسکرا کر بچّی کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کِس دیس سے آئے ہیں؟"

"لاہور سے!" میں نے جواب دیا۔

"بڑا نگر ہے!" سادھو بولا۔

"آپ نے دیکھا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں!" سادھو بولا۔ "میرا دیکھا ہے۔" پھر ہنسکر "یہاں تو آپ کا دل نہ لگتا ہوگا؟"

"کیوں؟" میں نے چائے کی پیالی مُنہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کِس چیز کی کمی ہے؟"

"شہر کی باتیں کہاں بابا!" سادھو نے مُسکرا کر کہا۔ "وہاں زندگی کی بہار یہاں اُداسی کا عالم!"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ آج کل جہنّم یہ جنّت۔ یہی شہر کی زندگی تو میں اس سُکوت پر ایسی ہزاروں زندگیاں قربان کر دوں۔"

یہ سُنکر سادھو کچھ مُسکرا کر بولا۔

"بھلا کہیئے تو سہی یہاں کی کونسی چیز آپ کے من کو بھائی؟"

"ایک ہو تو کہوں بھی۔" میں نے جواب دیا۔ "ذرا اس کُہساریؔ کو دیکھ لیجئے۔ کتنی شادابی اور زیبائش جلوہ نُما ہے۔ یہ آس پاس کے مناظر دیکھئے۔ کتنے پاکیزہ اور دلکش ہیں۔ پھر یہ آبشار کس قدر دل آویز ہے اور پھر یہ سبزہ گویا ایک جامِ زمردیں ہے۔ یہاں نہ فکر نہ آلامِ زندگی تمنّاؤں اور ارمانوں کے دکھ سے پاک۔ کھانے کو پھل پھلواری، پینے کو چشموں کا ٹھنڈا پانی اور دل بہلانے کو یہ مناظرِ قدرت اور سماعِ طیور!!"

سادھو نے ہنسکر سر جُھکا لیا۔

ایک زرد رنگ کی تیتری کہیں سے آگئی۔ اِندرا اُسے پکڑنے کے لئے پتھروں پر اِدھر اُدھر چھلانگنے لگی۔ اسی کشمکش میں غریب کا پاؤں پھسلا اور وہ مُنہ کے بل گری۔ سادھو نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ بچّی رونے لگی۔

"ماں ایسے ہی وقت یاد آتی ہے۔" بیساختہ میرے مُنہ سے نِکلا۔

"کیا یاد آتی ہے اِس ننّھی جان کو!" سادھو بچّی کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہوا غریب دُکھوں سے چُھوٹ گئی۔"

"کیا مر گئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مر گئی!" سادھو بولا۔ "بہُت دُکھ بھوگے غریب نے۔ افسوس! آپ کی سماج کے قوانین بہت ظالمانہ ہیں۔"

میں نے سادھو کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اِندرا ابھی بسُور رہی تھی اور وہ اسے بہلا رہا تھا لیکن کچھ اِس محبّت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا کہ اندرا کے چوٹ نہیں لگی بلکہ سادھو کے دل کا زخم دُکھ گیا ہے۔ وہ بچّی کو پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ بھی کہیں کا انصاف ہے کہ ظلم تو کرے مرد اور اُسکا

خمیازہ عورت غریب کو بھگتنا پڑے۔ وہ عورت جسے دیوتاؤں کی سینکڑوں برس کی التجاؤں کے بعد برہما جی نے رُوپ دے کر اس سنسار میں بھیجا۔ جو مرد کے نئے درد اور پریم لے کر آئی۔ جو مرد کے لئے محبّت کا تحفہ لائی۔ جس کی محبت میں مرد کے ہزار دُکھ کا درماں مستور ہے جو اس دھرتی پر مرد کے لئے بھگوان کی دیا کا رُوپ ہے۔"

پھر اندرا کو تھپک کر "میری اندرا کی ماں کا خُون آپ لوگوں کی گردن پر ہے۔ آپ تعلیم اور تہذیب کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ سماج کے لئے قوانین بناتے ہیں۔ قوموں کو رسم و رواج میں جکڑتے ہیں۔ یہ سب گندم نما جو فروشی ہے۔ آکاس کے منڈل پر آپ کے مظالم اس طرح چمک رہے ہیں۔ جیسے اندھیری راتوں میں تارے۔ لیکن دیکھتے وہی ہیں جنہیں بھگوان نے آنکھیں دی ہیں۔"

"سچ ہے!" میں نے کہا۔

"اگر سچ ہے!" سادھو بولا۔ "تو پھر آپ اس کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ بابا! جی تو آپ بھی رہے ہیں اور ہم بھی۔ لیکن حقیقت میں جینا اُسی کا ہے جو مُلک اور دھرم کی سیوا کرے۔"

میں چُپکا ہو رہا۔ بچّی سادھو کی گود میں سو گئی تھی۔ سادھو نے اُسے ایک کمبل پر لٹا دیا اور ایک کونہ اوپر ڈال دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"جانے! میں کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ بھول ہوئی معاف کر دیجئے!"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے!"

"سچ کہا ہے یا جھُوٹ!" سادھو کہنے لگا۔ "اُس کا علم تو بھگوان کو ہوگا۔ لیکن اس بچّی کے دُکھ کی ذمہ دار یہ آپ کی سماج ہے۔"

"یہ بچّی آپکی نہیں؟" میں نے پُوچھا۔

"میری ہی ہے!" اس نے بچّی کی طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال تو کیجئے! اس عمر میں ماں کی محبّت سے محروم ہو جانا کتنا دُکھ ہے۔ پاپ کی فضا میں پیدا ہونا کتنا ظلم ہے۔"

"پاپ کی فضا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"ارے بابا!" سادھو بولا۔ "تم یہ پاپ کی کہانی سُن کر کیا لو گے۔"

"کچھ ہرج ہے تو نہ کہئے!" میں نے کہا۔

"ہرج ورج کچھ بھی نہیں۔" سادھو نے جواب دیا۔ "ایک دُکھیا کی داستان ہے تم بھی سُن لو! بہت دن ہوئے شہر سے کوئی پونے میل پر جمنا جی کے کنارے ایک آم کے پیڑ کے نیچے میرا ڈیرا تھا۔ تم جانو! ہم سادھو لوگوں کو یہی بَن۔ پہاڑ اور دریا ایسی جگہیں پسند آتی ہیں۔ جہاں اُداسی ہو تنہائی ہو ہمارے من کا کنول کھلتا ہے۔ من کی جوت جگنے کا مزا ملتا ہے۔ تم شہر کے رہنے والے اس آکاس کے منڈل کے نیچے رہنے کا لُطف کیا جانو۔ جب شب کو تاروں کی سبھا سجتی ہے تو آنکھ پتنم سے لڑتی ہے اور وحدت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ جلوت میں خلوت کا مزا ملتا ہے۔ کوئی بستی پاس ہوئی تو بھوجن بھی بھگوان بھیج دیتے ہیں نہیں تو جنگل کی پھل پھلواری سے ہی پیٹ بھر لیا۔"

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"سُنتے ہو بابا! ساون رُت تھی اور کالی رات ہر طرف خاموشی اور سناٹا۔ جمنا جی کا پانی تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی

روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں اِسی طرح چھتری لگائے بیٹھا تھا کہ کہیں پاس سے ایک بچّے کے رونے کی آواز سُنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی

"اے بھگوان! اِس کلیجے کے ٹکڑے کو کس کے
سُپرد کروں۔ اسے پانی میں ڈالتے ہوئے بھی
میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ یہ پاپ کی گٹھری کہاں
لئے پھروں!"

یہ سُنکر میرے دل میں کچھ اضطراب سا پیدا ہوا۔ میں اُٹھ کر آواز کے رُخ پر ہو لیا۔ سرکنڈوں کے پاس ایک جوان عورت ایک بچّے کو جمنا جی کے کنارے گھاس پر لٹائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پھُوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آہٹ پاکر وہ کچھ خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بیٹی!" میں نے پاس جاکر پُوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیوں روتی ہو؟"

اُس نے روتے ہوئے میرے پاؤں پر سر رکھدیا۔

میں نے پھر پوچھا۔

"بیٹی! تم کون ہو۔ یہاں ایسے میں کیا کرتی ہو؟"

"مہاراج!" اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔ "میں ایک دُکھیا ہوں۔ دیا کیجئے مہاراج! اِس دھرتی میں میرے لئے سُکھ نہیں!"

یہ کہتے ہوئے اُس نے پھر میرے پاؤں پکڑ لئے۔

"چنتا نہ کرو بیٹی!" میں نے کہا۔ "بھگوان دیا کرینگے۔"

بچّہ بلک رہا تھا۔ میں نے اُسے گود میں لے لیا اور کہا "اِس غریب کو یہاں کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"مہاراج!" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اِس پاپ کی گٹھری کو کہاں لئے پھروں۔"

"پاپ کی گٹھری!" میں نے تعجب سے کہا۔ "تو یہ تمہارا بچّہ نہیں ہے؟"

"میری ہی بچّی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے پاپ کی گٹھری کیوں کہا؟" میں نے پوچھا۔

"مہاراج!" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میری آپ سے اتنی منتی ہے کہ آپ اس بچّی کو لے لیں۔"

"اِس کا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"باپ!" یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ پھر رونے لگی۔

"باپ!" میں نے ہولے سے کہا۔ "آخر تم ہو کون؟"

"آپ میری بپتا سُنیں گے مہاراج؟" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ہاں کیوں نہیں!" میں نے کہا۔ "سُنوں گا۔"

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی۔

"میری اِس بپتا کے ذمہ دار میرے ماتا پتا ہیں۔ میرے پتا گاؤں میں آٹے دال کی دُکان کرتے تھے اور دھن دولت کو دھرم سمجھتے تھے۔ وہ جب دُکان بڑھا کر گھر آتے تو مجھے گود میں لے کر کہا کرتے۔

"اِندرا! اِس جگ میں دھن ہی تو دھرم ہے۔ تُو سیانی ہو تو میں تیرا بیاہ کروں اور ہمیانیاں بھر بھر کر روپے لوں۔"

آخر میں جوان ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے پیغام آنے لگے لیکن میرا سنجوگ ایک پینسٹھ سال کے بُوڑھے کھوسٹ سے ہوا۔ یہ شخص پاس کے قصبے میں رہتا تھا۔ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ بے اولاد تھا اور اس کے یہاں دولت کا مینہ برستا تھا۔ میرے پتا بہت خوش تھے۔ اُنہیں مُنہ مانگی مراد ملی تھی۔ برات اِس دھوم دھام سے آئی کہ آس پاس کے گاؤں والے دیکھنے آئے۔ اتنے بھاری جوڑے اور سونے کا گہنا پاتا

میرے سے آیا کہ دیکھنے والیوں کو میری قسمت پر رشک ہونے لگا۔ دولھا پالکی میں سوار تھا۔ دو آدمیوں نے سہارا دیکر اُتارا۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔ ہاتھ پنجۂ مریم کی طرح سُوکھے ہوئے۔ بے نُور سی آنکھیں۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

سُسرال آئی تو ایک بُوڑھی بچی نے مجھے بہلیں سے اُتارا۔ اور ایک سیاہ فام سے جوان آدمی نے ماتا کہہ کر مجھے پرنام کیا۔ لیکن میرے پتی کا یہ حال تھا کہ کھاٹ پر پڑے کسی ہل جُتے بیل کی طرح ہانپ رہے تھے۔ سُسرال میں میرے لئے دھن دولت کی تو کمی نہ تھی لیکن زندگی موت سے بدتر تھی۔ خیال تو کیجئے! کہاں ایک سولہ سترہ برس کی کنیا کہاں ایک پینسٹھ سال کا بوڑھا۔ میرا بیاہ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے۔ میرے سوامی کو جب مجھ پر بہت پیار آتا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہتے "اندرا! بس ایک چاند سا بیٹا مجھے دیدے چاند سا!"

وہ سیاہ فام آدمی جس نے پہلے روز مجھے ماتا کہہ کر پرنام کیا تھا۔ گھر کا کام کاج سب اسی کے سُپرد تھا۔ اس کا نام جسونت تھا۔ چوڑا چکلا سینہ موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ پہلے تو اس کی وہی میلی کچیلی دھوتی اور گاڑھے کا کُرتا ہوتا۔ لیکن چند روز سے یہ اب بن سنور کر رہنے لگا تھا۔ کہتا تو مجھے ماتا ہی تھا لیکن اب کبھی مجھ سے بات کرتے کرتے ذرا مُسکرا بھی دیتا۔ ایک روز جو میں اسے کوئی برتن پکڑانے لگی تو اُس نے میری اُنگلیوں کو ذرا سا دبا دیا۔ جو مجھے بہت ناگوار گذرا۔ لیکن کہتی تو کس سے کہتی؟ بڑے لالہ جی صبح صبح دُکان پر چلے جاتے۔ اور چراغ

جلتی پڑے واپس آتے۔ اِدھر روٹی کھائی اُدھر کھاٹ پر لیٹ کر ہولناک ڈکاریں مارنے لگے۔ میں جو کبھی پاؤں دبانے لگتی تو مجھے آغوش میں لیکر اور میری ٹھوڑی ہلا ہلا کر کہتے۔ 'اندرا! اگر تو مجھے ایک چاند سا بیٹا دیدے تو بس چین ہی چین ہے!'

پھر خود ہی ہنسکر کہتے۔

"بھگوان دے ہی دینگے۔!"

مہاراج! ان کی یہ باتیں میرے سینے میں کانٹا رہو کر لگتیں۔ تو خیر! گھر میں ایک میں تھی، ایک وہ بوڑھی چچی۔ جسونت جو پہلے دن بھر میں دو ایک پھیرے کیا کرتا تھا اب کسی نہ کسی بہانے پانچ سات بار ضرور آتا۔ اور مجھے جن نظروں سے دیکھتا میں جان گئی تھی کہ اس کی نیت خراب ہے۔

ایک روز چچی کہیں برادری میں گئی تھی۔ جسونت چوکے کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "بھگوان کبھی ہمارے لالہ جی کی آس بھی پوری کر ہی دیں گے۔"

'کیا کوئی اور بیوپار کیا ہے؟' میں نے پوچھا۔

'بیوپار کیسا؟' جسونت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'انہیں تو اس دھن دولت کا وارث دیکھنے کی آس لگ رہی ہے۔'

پھر ہنسکر۔

'لالہ جی تو تم سے چاند سا بیٹا مانگتے ہیں۔'

'جسونت!' میں نے غصّہ سے کہا۔ 'خبردار جو پھر میرے سامنے ایسی بات کہی تو!'

'کوئی بُری بات کہی میں نے؟' اُس نے مُسکرا کر پوچھا۔

کم بخت مجھے ہمیشہ ماتا کہا کرتا تھا لیکن آج وہ بات نہ تھی۔ میں نے بگڑ کر کہا۔ "تمہیں اپنی ماں سے ایسی بات کہتے شرم تو نہیں آتی!"

"ماتا!" وہ ہنسکر بولا۔ "اٹھارہ برس کی اور بیٹا چوبیس سال کا! یہ بھی ایک ہی رہی۔"

"دُور ہو یہاں سے!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "ورنہ لالہ جی سے کہدونگی۔"

"تم اُن سے کیا کہو گی؟" اُس نے ہنسکر کہا۔ "وہ تو چاند ایسا بیٹا مانگتے ہیں۔ چاند ایسا!"

"دُور ہو مُوا کہیں کا!" میں نے دستِ پناہ اُٹھا کر کہا اور وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

اِس واقعہ کو بہت روز گذر چکے تھے۔ یہی ساون رُت تھی اور کالی رات۔ میں تیسری منزل پر کھاٹ ڈالے پڑی تھی۔ نیچے صحن میں لالہ جی اور جیجی سوتے تھے، ایک تو ان کے خراٹوں سے نیند حرام ہو رہی تھی دوسرے مچھر کاٹ کاٹ کر پریشان کر رہے تھے۔ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اچانک کسی نے پلنگ پر آکر مجھے دبوچ لیا۔ اور جلدی سے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھدیا۔ یہ وہی نمک حرام جسونت تھا۔ ایک ہاتھ سے تو اُس نے میرا مُنہ بند کر رکھا تھا دوسرے سے گھونسہ تان کر بولا:-

"خبردار! آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

میرا دم جو گھٹنے لگا تو اُس نے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ بھگوان کے لئے چھوڑ دو۔" میں نے منت سے کہا۔

"چُپ رہو!" اُس نے پھر گھونسہ تان کر کہا۔ "میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"تم میرا گہنا پاتا لے لو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے چھوڑ دو۔"

"مجھے گہنا پاتا نہیں چاہئے!"

"ظالم چھوڑ دے مجھے!" میں نے اب اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چُپکی پڑی رہو۔" اُس نے کہا۔ "ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔"

"پاپی!" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے ماتا کہتے ہو۔ اب اگر لالہ جی آجائیں تو؟"

"وہ کیوں آنے لگے!" اُس نے جواب دیا۔ "وہ تو چاند سا بیٹا مانگتے ہیں۔"

"ڈوب نہیں مرتے!" میں نے کہا۔ "بھگوان کا خوف کرو۔"

لیکن اُس وقت بھگوان کا خوف کون کرتا تھا۔ میں اس ظالم کے پنجہ میں تھی اور بے بس تھی۔

کچھ روز تو مجھے اس پاپی سے نفرت رہی لیکن آخر مانوس ہونا ہی پڑا۔ اور وہ مجھے سب کے سامنے اب بھی ماتا ہی کہتا۔ اسی طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ آخر پاپ اپنا رنگ لایا۔ میں اب ڈرنے لگی۔ جس طرح بن سکا یہ راز چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ سارا سارا دن کوٹھری میں پڑی رہتی۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتی کہ طبیعت اچھی نہیں۔ لیکن جیجی بھانپ گئی، وقت اِسی طرح گذرتا گیا اور یہاں ساتواں مہینہ لگ چکا تھا۔ پڑوس والیاں مجھے دیکھ دیکھ کر جب سرگوشیاں کرتیں تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جاتا۔ لیکن لالہ جی خوش نظر آتے کیونکہ انہیں تو اپنی تمنا پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔

ایک روز میں رو سیٹھی بیٹھی تھی کہ جسونت کہیں سے پٹا ہوا آیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اندرا!" وہ پاس بیٹھ کر کہنے لگا۔ "بہت ظلم ہوا!"

میں تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھانڈا پھوٹ گیا اندرا" وہ بولا۔ "لالہ جی کے کوئی بھانجے ہیں۔ وہ کسی دوسری جگہ کاروبار کرتے ہیں۔ مدت سے میل جول بند ہے۔ اس تمام جائداد کے وہی ایک وارث ہیں۔ کہیں ان کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ تمہارے بچہ ہونے والا ہے۔ آج وہ آئے ہیں۔ بہت دیر لالہ جی سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ آپس میں تو تو میں میں بھی ہوئی۔ میرے سامنے پڑتے ہی پہلے تو بے انتہا سنائیں پھر پیٹ ڈالا۔ کل لالہ جی کو ڈاکٹر دیکھنے آئے گا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلوالے آدمی بھی بھجوا دیا ہے۔"

"ڈاکٹر کیا دیکھے گا؟" میں نے پوچھا۔

جسونت بولا۔ "اندرا! تم انجان تو ہو نہیں۔ پینسٹھ سال کا بوڑھا بغیر سہارا دیئے نہ چلے نہ اٹھے۔ پھر تمہیں یہ پیٹ کیسے ہو گیا؟"

"اب کیا بنے گا؟" میں نے کہا۔ "یہ سب بپتا تمہارے کارن آئی۔ پاپی! تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

"میری سنو!" جسونت کہنے لگا۔ "اب اگر عزت کا پاس ہے تو بھاگو یہاں سے، نہیں تو یہ محلے والیاں ہی جینے نہ دینگی۔ ادھر میکے والوں کو کیا منہ دکھاؤ گی؟"

کچھ دیر اسی قسم کی بحث ہوتی رہی۔ آخر صلاح یہ ٹھیری کہ صبح ہونے سے پیشتر ہی کہیں نکل جائیں۔ میں نے اپنا زیور اور کچھ نقدی لی اور کوئی پہر رات گئے جب سب سنسار سوتا تھا ہم گاؤں سے نکل گئے۔ کوئی کوس دو کوس پر ریل کا اسٹیشن تھا۔ پو پھٹتے گاڑی آئی۔ جسونت نے کہیں کے دو ٹکٹ خرید لئے تھے سوار ہو گئے۔

کہاں کہاں رہے۔ کیسی کٹی! مہاتما جی یہ ایک طویل قصہ ہے۔ وقت پورا ہونے پر میرے ہاں یہ لڑکی ہوئی۔ اس وقت تک زیور بیچ بیچ کر گذران ہو رہی تھی۔ میں نے ہزار چاہا کہ جسونت کوئی کام کاج کرے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اب ہمیں اس دیس میں آئے دس پندرہ روز ہوئے ہیں، جو کچھ پاس تھا وہ اس نے شراب اور جوے کی نذر کر دیا ہے۔ اور اب مجھے رنڈی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مہاتما جی! میں مرتی مر جاؤں گی پر یہ ذلیل کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ غریب پھر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "تو پھر اب چاہتی کیا ہو؟ کہو تو میں تمہیں دیس پہنچا دوں؟"

"نہیں مہاراج!" وہ بولی۔ "میں اب دیس والوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"وہ پاپی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گھر ہے!" اندرا بولی۔ "آج سر شام ہی پی آیا تھا۔ آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔"

پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مہاراج! آپ بھگوان کے پیارے ہیں، ایک پاپن پر دیا کیجئے۔"

"بیٹی!" میں نے کہا۔ "تمہاری بپتا سنکر مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔"

"تو پھر میری اتنی بنتی ہے!" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بچی کو لے لیں۔"

"تم کہاں جاؤ گی!" میں نے پوچھا۔

"جہاں بھگوان لے جائیں" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی "تو کیا میں ایک دھرماتما کے دوار سے بھی مایوس ہی جاؤنگی"

پھر آسمان کی طرف دیکھ کر۔ بھگوان! میں اِس پاپ کی گٹھری کو کہاں اُٹھائے لئے پھروں!"

"بھگوان دیا کرینگے بیٹی!" میں نے کہا "لاؤ بچی مجھے دیدو"

میں نے بچی اُسکی گود سے لیلی۔ اِندرا سوتی ہوئی تھی!

"اِندرا!" میں نے تعجب سے کہا "اِندرا تو اسکی ماں کا نام تھا"

"ٹھیک ہے" سادھو بولا "یہ اِندرا کی اِندرا ہی بچی کا نام پوچھنا مجھے یاد نہ رہا۔ اس لئے میں اب اسے بھی اِندرا کہتا ہوں تو خیر! اِندرا کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مہاراج! بچی کسی اور کو مت دیجئے گا"

"بیٹی!" میں نے کہا "یہ تو بھگوان کی امانت ہے۔ میں کیوں کسی کو دینے لگا"

اُس نے بچی میری گود سے لی اور دیوانوں کی طرح چومنے لگی۔ تم جانو! ممتا کی لگن دیکھ کر میرا تو جی بھر آیا میں نے کہا۔

"بیٹی! انسان اگر اپنے پاپ پر نادم ہو تو بھگوان اُسے شکتی دیتے ہیں۔ اب تم نیک بنکر رہنے کی کوشش کرو۔ شاید بھگوان تمہیں کسی روز بیٹی سے پھر ملا دیں"

اُس نے روتے ہوتے اپنے کلیجہ کا ٹکڑا مجھے دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی :۔

"مہاتما جی! اس سنسار میں اِس معصوم کا اب آپ کے سوا اور کوئی نہیں"

"بھگوان جو ہیں" میں نے کہا "جسے کسی کا سہارا نہ ہو اُسے بھگوان کا آسرا ہوتا ہے"

اُس نے پھر ایک بار بچی کو پیار کیا اور مجھے پرنام کرکے شہر کی جانب چلی گئی۔

اِس رات بادل بہت گرجے بارش بھی ہوتی رہی لیکن میری ننھی سی اِندرا مزے سے چھتری کے نیچے سوتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو مندر کی جانب سے کچھ شور وغل کی آواز آنے لگی، کوئی بھگوان کا پیارا صبح صبح میرے لئے دودھ لایا کرتا تھا اُس کے آنے پر معلوم ہوا کہ مندر کے پاس کسی جوان عورت کی لاش جمنا جی میں تیر رہی تھی۔ کشتی والوں نے نکال کر کنارے پر رکھدی ہے۔ پھر بچی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟"

"بھگوان کی امانت ہے" میں نے کہا "ذرا خیال رکھیو میں بھی دیکھ آؤں" جب میں مندر کے پاس پہنچا تو یہاں لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ میں نے اُچک کر جو دیکھا تو سامنے اِندرا کی لاش پڑی تھی"

یہ المناک داستان سُنکر میرے دل کو بھی ٹھیس سی لگی۔ سادھو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور چھوٹی سی اِندرا مزے سے سو رہی تھی۔ کوہسار پر سکوت اور خاموشی مسلط ہو رہی تھی۔ وادیوں میں دہقانوں کے جھونپڑوں سے سپید سپید دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ اس سکوت اور خاموشی میں آبشار کی شورشیں، ایک بدنصیب عورت کی المناک موت کا نوحہ بنکر فضا کو اداس بنا رہی تھیں۔ آخر میں بھی واپس لوٹا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی مگر اُسوقت پہنچا جب فضا میں جگنو چمک رہے تھے چراغِ فطرت جلا رہی تھی!!

ایم۔ اسلم

جاسوس دوست

آ اِدھر آ دوست! آ تو مجھ سے چھُپ سکتا نہیں
سعیٔ "خود پوشی" ہی کیوں؟ جب میں تجھے تکتا نہیں

گرچہ پہلے "صوفیانہ سوانگ" نے دہوکا دیا
لیکن "ان آنکھوں کی چمک" نے تجھ کو پہچنوا دیا

تیری آنکھوں سے عیاں ابتک وہ "برقی لہر" ہی
قہر ہے تیری نگاہِ تیز ہاں، ہاں قہر ہے

الاماں یہ تیری "آشفتہ نگاہی" الاماں
عمرِ وعیّار کی بھی ہیچ ہیں چالاکیاں

کیوں میں حیراں ہوں جو ہر سُو آج تیری دہوم ہی
تیری فطرت ابتدا سے ہی مجھے معلوم ہی

تجھ سے مل کر آج مجھکو مدرسہ یاد آ گیا
پھر وہ طفلی کا مُرقع دل مرا تڑپا گیا

مُطمئن رہتی نہ تھی تیری "نگاہِ جستجو"
طور تیرے "عارفانہ" نرم تیری گفتگو

مدرسے میں اپنے ہمعمروں سے وہ سرگوشیاں
برمحل سرگوشیوں کے بعد وہ خاموشیاں

ہم جماعت دوست کہتے تھے تجھے اپنا عدو
تجھکو ان کے خانگی جھگڑوں کی بھی تھی جستجو

یاد ہی مجھ سے بھی کچھ پوچھا تھا اکدن ای شریر
اور ـــ پھر کہنے لگا تھا تو مجھے روشن ضمیر

ہر کِسی اُستاد کا تو مُنہ چڑھا شاگرد تھا
نام تیرا واقعی سب کی زباں کا ورد تھا

تیری "فطری قابلیت" تیرے کام آ ہی گئی
"غیر مُلکی حاکموں" تک تجھکو پہونچا ہی گئی

ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سی
شاید اب تو آرہا ہی خاص "مُلکِ شام" سے

کر رہا ہے سیرِ دُنیا بنکے اب جاسوس تو
آہ! ابنائے وطن سے خاک ہو مانوس تو

علی منظور حیدرآبادی

خوابِ گریزپا

افراد

سیلچن ——— ایک پہاڑی لڑکی؛
لیمنڈ ——— ایک پہاڑ پر چڑھنے والا؛
فلزمین ——— ایک رہنما،

افرادِ خواب

...ظیم
...بھر } (پہاڑوں کے نام)
...شراب

موگرا
گلاب
نیلوفر } (پھولوں کے نام)
گلِ اشرفی

خواب میں چند کردار

پروانے ——— پھول
جھلملیاں ——— بکرے
موت جو سونے میں آئے ——— نیند کی مختلف شکلیں
موت جو ڈوبنے سے آئے ——— گڈریا

پہلا منظر

...ست کی ایک شام کو غروبِ آفتاب کے بعد، ...منظر پہاڑ کی ایک جھونپڑی کے ایک کمرے پر ...مشتمل ہے جس میں صرف ایک دیوار گیری ہے اور دریچے ...سے بنی ہوئی ایک نیچی اور چوڑی بیٹھنے کی جگہ ہے۔

اس دریچے میں سے چاند کی روشنی میں جو غروبِ آفتاب کے رنگوں کو دھیمی کر رہی ہے، پہاڑوں کی تین چوٹیاں نظر آرہی ہیں۔ ایک چراغ جل رہا ہے۔ سیلچن ایک اٹھارہ سالہ پہاڑی لڑکی ایک دیہاتی گیت گنگنا رہی ہے اور تازہ دُھلے ہوئے شوربے کے پیالے اور گلاس الماری میں

رہتی ہے۔ وہ ایک خوشنما لباس زیبِ تن کئے ہوئے ہے اور اس کی دونوں گھنی چوٹیاں سر کے گرد لپٹی ہوئی ہیں۔ آخری برتن رکھتے وقت دستک کی آواز آتی ہے اور لیمنڈ بیرونی دروازہ کھولتا ہے۔ وہ نوجوان اور خوش شرو ہے اور پہاڑ پر چڑھنے والوں کے کپڑوں میں ملبوس ہے۔ اس کے ہاتھ میں برف توڑنے کی کلہاڑی اور ایک تھیلہ وغیرہ ہے۔

لیمنڈ۔ تسلیم۔

سیلچن۔ تسلیم، جناب عالی۔

لیمنڈ۔ میرا نام لیمنڈ ہے، شاید مجھے بہت دیر ہو گئی۔

سیلچن۔ کیا آپ یہاں سونا چاہتے ہیں؟

لیمنڈ۔ اگر آپ کرم فرمائیں

سیلچن۔ افسوس ہے ـــ تمام بستر رک چکے ہیں۔ خیر ذرا ٹھہریے۔

لیمنڈ۔ میں علی الصباح جبلِ عظیم پر چڑھنے کے ارادے سے آیا ہوں۔

سیلچن۔ (خوفزدہ ہو کر) جبلِ عظیم! مگر وہاں چڑھنا ناممکن ہے

لیمنڈ۔ (ہوا کرے) میں کوشش تو کرونگا۔

سیلچن۔ (مگر اس سے پہلے) جبلِ شراب اور جبلِ بقر بھی تو ہیں۔

لیمنڈ۔ ان پر میں چڑھ چکا ہوں۔

سیلچن۔ مگر جبلِ عظیم پر چڑھنا بے حد خطرناک ہے ـــ شاید ـــ موت کو دعوت دینا ہے۔

لیمنڈ۔ لاحول ولا! انسان کو کوشش تو کرنی چاہیئے۔

سیلچن۔ ابا کے پاؤں میں چوٹ لگی ہوئی ہے اور رہنما اس وقت صرف فیلز مین ہے۔

لیمنڈ۔ وہ مشہورِ عالم فیلز مین؟۔

سیلچن۔ (گردن سے اثبات کا اشارہ کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے تعریف کی جھلک ہے) کیا آپ وہی لیمنڈ صاحب ہیں جو اس سال ہمارے دوسرے چھوٹے پہاڑوں پر چڑھ چکے ہیں؟

لیمنڈ۔ ہاں، سوائے اس جبلِ عظیم کے۔

سیلچن۔ ہم نے آپ کا نام سنا ہے۔ کیا آپ ایک دن انتظار نہیں کر سکتے کہ ابا کا پاؤں اچھا ہو جائے۔

لیمنڈ۔ جی نہیں، مجھے کل تک گھر واپس پہونچ جانا چاہیئے۔

سیلچن۔ تو جنابِ عالی بڑی جلدی میں ہیں؟

لیمنڈ۔ (اسکو غور سے دیکھتے ہوئے) کیا کیا جائے!

سیلچن۔ کیا آپ کسی بڑے شہر کے باشندے ہیں؟ بہت ہی بڑے شہر کے؟

لیمنڈ۔ ہاں، وہاں چھ لاکھ کی آبادی ہے۔

سیلچن۔ اوہ! (کچھ دیر کے بعد) میں کورٹمبا دو دفعہ جا چکی ہوں۔

لیمنڈ۔ کیا تم تمام سال نہیں رہتی ہو؟

سیلچن۔ سردیوں میں وادی میں چلے جاتے ہیں۔

لیمنڈ۔ کیا تمہیں دنیا دیکھنے کی تمنا نہیں ہوتی؟۔

سیلچن۔ کبھی کبھی۔ (دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے پکارتی ہے۔) فلز مین! (پھر ایک دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے) وہاں سات جرمن حضرات سو رہے ہیں۔

لیمنڈ۔ او خدا!۔

سیلچن۔ ذرا ہولے! وہ یہاں طلوعِ آفتاب کی سیر کرنے آئے ہیں۔ (لیمنڈ کی جیب سے ایک کتاب گر پڑتی ہے، وہ اسے اٹھا لیتی ہے۔) میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں

لیمنڈ۔ یہ ایک بڑے شاعر کا دیوان ہے۔ کیا تم یہاں، ان پہاڑوں میں گھری ہوئی، کبھی شاعری نہیں کرتیں؟ اور کیا تمہیں

یہاں سُہانے خواب دکھائی نہیں دیتے؟۔

سیلچن:۔ (گردن سے نفی میں جواب دیتی ہوئی۔) دیکھو! آج چاند پورا ہے۔

(وہ دونوں دریچے کے پاس کھڑے ہوئے چاند دیکھ رہے ہیں ایک توانا، خاموش اور دُبلا پتلا شخص اندر داخل ہوتا ہے۔)

سیلچن:۔ فلزمین!

فلزمین:۔ کیا اِن صاحب کو میری ضرورت ہے؟

سیلچن:۔ (خوفزدہ سی) اِن کا کل صبح جبلِ عظیم کا ارادہ ہے۔

(اسکے کان میں) یہ دیہی مشہور شہری ہیں۔

فلزمین:۔ جبلِ عظیم پر چڑھنا ناممکن ہے۔

لیمنڈ:۔ یہ آپ کہہ رہے ہیں! اور آپ ہی وہ شہرہ آفاق فلزمین ہیں؟۔

فلزمین:۔ (تندی سے) ہم علی الصباح روانہ ہو جائیں گے۔

سیلچن:۔ یہ عرصۂ دراز کے بعد پہلا موقع ہے!

لیمنڈ:۔ (دریچے والی جگہ پر اپنا سامان رکھتے ہوئے) کیا یہاں میرے سونے کا انتظام ہو سکتا!۔

سیلچن:۔ میں ذرا دیکھ لوں۔

فلزمین:۔ (الماری میں سے کمبل نکال کر دریچے والی جگہ پر بچھا دیتا ہے۔) یہاں!۔

(اس کے باہر جاتے ہی سیلچن اندر آتی ہے)

سیلچن:۔ ایک بستر ابھی خالی ہے۔ یہ جگہ تو آپ کیلئے بہت سخت رہے گی۔

لیمنڈ:۔ شکریہ! نہیں، یہ ٹھیک ہے۔

سیلچن:۔ میری خاطر سہی!

لیمنڈ: تمہارا نام کیا ہے؟

سیلچن:۔ سیلچن۔

لیمنڈ:۔ ننھی روح، اس کا مطلب ہے ـــــ ہے نا! تمہیں خوش کرنے کے لئے میں اُن سات حضرات کے ساتھ سو جاؤنگا۔

(وہ جانے لگتا ہے)

سیلچن:۔ کیا یہ شہر (جو دنیا کہلاتے ہیں اور) جہاں سے تم آئے ہو بہت اچھے ہیں؟۔

لیمنڈ:۔ جب میں وہاں ہوں تو یہاں ہوتا ہوں اور جب یہاں ہوں تو وہاں ہوتا ہوں۔

سیلچن:۔ یہ تو میری طرح ہے ـــ لیکن میں ہمیشہ یہیں رہتی ہوں!۔

لیمنڈ:۔ ہوں! شہروں میں تم جیسا کوئی نہیں۔

سیلچن:۔ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔ (یکبارگی) شہروں میں تھیٹر ہوتے ہیں، حسین و جمیل صناعی کے نمونے ہوتے ہیں اور ـــــ رقص ـــ گرجا ـــ ۔ بلیں ـــــ اور وہ تمام چیزیں جن کا کتابوں میں تذکرہ ہوتا ہے۔ اور ـــ

لیمنڈ:۔ مصائب۔

سیلچن:۔ لیکن زندگی بھی تو وہیں ہے۔

لیمنڈ:۔ اور موت بھی تو

سیلچن:۔ کل، جب تم چڑھ چکے ہو گے ـــــ کیا واپس نہیں آؤ گے؟

لیمنڈ: نہیں۔

سیلچن:۔ تمہارے پاس تمام دُنیا ہے۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

لیمنڈ:۔ سوائے فلزمین اور پہاڑوں کے۔

سیلچن:۔ صرف روٹی ہی کھا لینا تو اچھا نہیں ہے۔

لیمنڈ:۔ (اُسکو تکتے ہوئے۔) میں تو تمہیں کھا لینا چاہتا ہوں۔

سیلچن:۔ مگر میں لذیذ نہیں ہوں۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔

لیمنڈ:- میں واپس آؤں گا۔
سیلچن:- پھر کوئی دُشوار گذار پہاڑ تو چڑھنے باقی نہیں رہینگے۔ اور اگر یہ سر درآ گئیں نہ ہو تو تم پروا بھی کب کرتے ہو۔
لیمنڈ:- کتنی سمجھدار ہو تم!
سیلچن:- نہیں، میں سمجھدار نہیں ہوں۔ یہاں ہر وقت کا رہنا دوبھر معلوم ہوتا ہے —— وہاں بڑی دُنیا میں کیا تم (مجھے) یاد رکھوگے؟۔
لیمنڈ:- (اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) اُس بڑی دُنیا میں کوئی شے اس جیسی حسین اور شیریں نہیں۔
سیلچن:- لیکن وہ بڑی دُنیا بذاتِ خود جو ہے۔
لیمنڈ:- کیا میں شب بخیر کہنے کیلئے تمہیں بوسہ دوں؟۔

(وہ اپنا چہرہ آگے کر دیتی ہے اور وہ اُس کے رُخسار پر پیار کرتا ہے۔ اور دفعتاً اُس کے لبوں پر بھی۔ اور جونہی وہ پیچھے ہٹتی ہے۔)

لیمنڈ:- مجھے افسوس ہے۔
سیلچن:- کوئی ہرج نہیں۔
لیمنڈ:- (شمع لیتے ہوئے) خواب شیریں! شب بخیر!۔
سیلچن:- (ہولے سے) شب بخیر
فلزمین:- (باہر سے آتے ہوئے اور اُنہیں دیکھکر) ٹھنڈ ہوگئی ہے —— بڑا لطف رہیگا۔

(لیمنڈ، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، چلا جاتا ہے۔ فلزمین اس کے جانے کا انتظار کرتا ہے۔)

سیلچن:- (دریچے کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) میں نے سوچا یہ جگہ اس کے لئے بہت سخت ہوگی۔

(وہ اُس کے پاس جاتا ہے اور ایک منٹ خاموش کھڑا رہتا ہے، پھر جھک کر اُسے اس طرح پیار کرتا ہے گویا بھوکا ہے۔)

سیلچن:- کیا تُو بھوکا ہے؟

(وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور چراغ بجھا کر ایک اندرونی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سیلچن دریچے میں سے، چاندنی میں نہائی ہوئی چوٹیوں کو بیٹھی دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کمبل اوڑھ کر وہیں دریچے والی جگہ پر بمشکل تمام لیٹ جاتی ہے۔)

سیلچن:- (سوئی ہوئی آواز میں) اُنہوں نے مجھے پیار کیا —— دونوں نے۔

(وہ سو جاتی ہے)
منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

دوسرا منظر

(منظر صبح کے تڑکے کی طرح دھیرے دھیرے روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن دریچے والی جگہ پر اب بھی لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا چہرہ اور ہاتھ کمبل میں سے نکال کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور گہری نیند کی بجائے رو دار خواب سے ملفوف کر لیتی ہے۔ جھونپڑی کی دیوار غائب ہو چکی ہے۔ سیلچن اور کہرے ڈھکے ہوئے سیاہ پہاڑوں کے درمیان سوائے تھوڑی سی تاریک فضا کے اور کچھ حائل نہیں ہے۔ سیلچن کے پاس ہی اِس اندھیرے کے سرے پر، جو اُسکو پہاڑوں سے جُدا کر رہا ہے، چار "پھول" موگرا، گلاب، نیلوفر اور گُلِ اشرفی اُسے تاریکی میں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر اپنے بے شمار پھولوں کے تاج

پہنے ہوئے ہیں جن پر شبنم کے قطرے جمے ہوئے
ہیں اور جو ننھی ننھی گھنٹیوں کی طرح بج رہے ہیں)

سیلیچن :- اسے! ان کے تو چہرے ہیں!

(چوٹیوں کے چاروں طرف صرف سیاہی مائل
نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ چوٹیاں چمک اٹھی ہیں)

موگرا :- (دھیمی آواز میں) کیا تم؟ کیا تم؟ کیا تم؟ آہ! آہ! گلاب،
نیلوفر، گلِ اشرفی (ان کی گھنٹیاں حسد سے بج رہی ہیں) او،
او۔ او۔

(دفعتاً جبلِ بقر کی چوٹی ایسی آواز میں بولنے لگتی
ہے جو غیر مانوس ہے۔)

جبلِ بقر :- میں پہاڑ ہوں اور اپنی گایوں اور بھیڑوں میں رہتا
ہوں۔ میں خاموش ہوں اور ایک ہی سی آواز ہوں، اور میں
ہی بلند پہاڑیاں ہوں۔ میں خوف اور کوہستانی ہوا ہوں، عمدہ
چراگاہ اور بے پناہ آرام میری آنکھوں میں دیکھو اور صرف مجھ
ہی سے محبت کرو۔

سیلیچن :- (حیرت زا) جبلِ بقر! وہ ترجمانی کر رہا ہے ـــ فلزمین
اور پہاڑوں کی۔ یہ میرا نصف قلب ہے۔

(پھول خوش خوش ہنسنے لگتے ہیں۔)

جبلِ بقر :- میں ابدی پہاڑیوں کو اگاتا ہوں ـــ میں کوہستانی
برف پیتا ہوں۔ میری آنکھوں کا رنگ دہکتی ہوئی شراب کا سا ہے۔
اور ان ہی میں اداسی بناہ گزیں ہوتی ہے۔ گایوں کی آوازیں،
ہوا کی سرسراہٹ، چٹانوں کے گرنے کا شور، سیلاب کا ترنم
ـــ (بس، ان کے علاوہ مجھے کوئی اور بات نہیں آتی ـــ
خیالات سادے، خون گرم، طاقت بے حد ـــ گردش
کا چھٹنا۔

سیلیچن :- ہاں، ہاں، مجھے اسکی ضرورت ہے۔ وہ بہت
طاقتور ہے!

جبلِ بقر :- ننھی روح! میرے پاس آ! مجھ سے محبت کر اور میرے
ساتھ تاروں کی چھاؤں میں رہ!

سیلیچن :- (دبی آواز میں) شاید ایسا نہ ہو سکے!

(بیچارگی جبلِ شراب کی چوٹی ایک نوجوان کی
سی آواز میں بولنے لگتی ہے۔)

جبلِ شراب :- میں وہ چھلاوہ ہوں ـــ جو بازاروں پر
ناچتا پھرتا ہے! میں قمری ہوں جو شاہ بلوط کے سائے تلے کوکتی
ہے۔ (دنیا میں) کسی شے کو قیام نہیں لیکن میں اپنے ہزاروں پوتاؤں
کو اپنی خوشبو پیش کئے جاتا ہوں۔ براق سے ایوان اور جذبات
کو برانگیختہ کرنے والے خیاباں میرے مسکن ہیں۔ سینکڑوں آدمیوں
کی زندگی میری ہے ـــ اور صبح کے تڑکے گلیوں کی روشنیاں
بھی۔ (رشان سے) میری الفتیں ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے
دائمی ایک بھی نہیں کیونکہ میں تمہارے ان بچھڑوں سے بھی زیادہ
شباب رو ہوں جو دھوپ میں کھیلتے ملتے ہوں۔

(پھول جن کی گھنٹیاں خوف میں بج رہی ہیں،
چیخنے لگتے ہیں "ہم انہیں خوب جانتے ہیں!")

جبلِ شراب :- میں مسرت کی تخلیق اور موت کی آوازیں سنتا ہوں
اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی میں لوگوں کی چیخ پکار سنتا ہوں
اور خاموش رات میں محبت سے لبریز بوسوں کی آوازیں بھی۔ میرے
بغیر اے ننھی روح! تم بھوکی رہو گی اور مر جاؤ گی۔

سیلیچن :- یہ ان صاحب (لیمنڈ) کی اور شہری دنیا کی ترجمانی کر
رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

جبلِ شراب :- میرے خیالات کا شمار تمہارے سبزہ زار میں لہلہانے
والے پھولوں سے کہیں زیادہ ہے اور ان کی پرواز ہوا میں اڑنے
والے عقابوں سے زیادہ تیز۔ میں بلند حوصلگی کی شراب اور حقیقت
کی دوا پیتا ہوں اور اس لئے میں کبھی کاہل نہیں ہوتا۔

سیلیچن :- مجھے شک ہے۔

جبلِ شراب۔ مجھ سے محبت کر لے ننھی رُوح! میں زندگی کو پچاسوں رنگوں سے مزین کرتا ہوں میں ہزاروں چیزیں بناتا ہوں! ـــــ میں تمہارے قلب کا طواف کرونگا۔

سیلیچن۔ وہ شہد کی طرح میٹھا ہے!

(پھول اپنی گھنٹیاں حسد سے بجانے لگتے ہیں اور چیختے ہیں تلخ بھی تو ہے! تلخ!!)

جبلِ بقر۔ میرے پاس رہو، سیلیچن! میں تمہیں شفاف ہوا سے بیدار کرتا ہوں۔

(پھول کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔)

جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلیچن! میرا رنگ برنگا پنکھا تمہیں بیدار کرے گا۔

(پھول ماتم کرتے ہیں۔)

سیلیچن۔ (رنج میں) میرا دل! آہ! یہ ٹوٹے جاتا ہے۔

جبلِ شراب۔ اے ننھی رُوح! میرے ساتھ رہکر تم بازاروں کی سیر کروگی اور بہت سے رازوں سے واقف ہو جاؤگی ہم دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پنکھڑیوں کی طرح اُڑتے پھرینگے۔

گلِ اشرفی۔ میری پنکھڑیاں زیادہ تیز اُڑتی ہیں!

جبلِ شراب۔ میں تمہیں سمندر کی سیر کراؤنگا۔

نیلوفر۔ میری نیلاہٹ زیادہ گہری ہے!

جبلِ شراب۔ میں تم پر ترنم و حجاب کی بارش کردونگا۔

گلاب۔ میرا حجاب زیادہ احمریں ہے۔

جبلِ شراب۔ ننھی رُوح، سنو! میرے جواہرات! ریشم! مخمل!

موگرا۔ میں مخمل سے زیادہ نرم و نازک ہوں!

جبلِ شراب۔ (فخریہ) پُراسرار لباس!

پھول (افسوس کرتے ہوئے)۔ ہاں یہ ہمارے پاس نہیں۔

سیلیچن۔ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

جبلِ بقر۔ یہ سبک بازو والے سحاب میرے ہیں اور یہ دھوپ میں تپنے والی چٹانیں بھی۔ میرے شبنم کے قطرے موتیوں سے زیادہ سرد ہیں میرے برفانی سانس اور لطیف گھاس سے دور رہکر، اے ننھی روح، تم پژمردہ ہو جاؤگی۔

جبلِ شراب۔ سیاہ لونگ میری خوشبو ہے!

سیلیچن۔ (گھبرا کر) آہ!

جبلِ بقر۔ میں تمہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرونگا۔

جبلِ شراب۔ میں تمہیں سینکڑوں مرتبہ چھوڑ دونگا اور سینکڑوں مرتبہ واپس آکر تمہیں پیار کرونگا

سیلیچن (سرگوشی میں)۔ میرے قلب کی تسکین!

جبلِ بقر۔ میرے ساتھ رہ کر تم کوہستانی نرم و گرم علف زار میں آرام کروگی۔

(پھول خوش خوش ہنستے ہیں)

جبلِ شراب۔ میرے ساتھ رہ کر تم قمری کے پروں کے ملائم بچھونے پر محوِ استراحت ہوگی۔

(پھول کراہتے ہیں۔)

جبلِ شراب۔ میں تمہیں پُرانی شراب دونگا۔

جبلِ بقر۔ میں تمہیں تازہ دودھ دونگا۔

جبلِ شراب۔ میرا گیت سُنو!

(دُور سے ستار کی سی آواز آتی ہے)

سیلیچن (اپنا دل پکڑ کر)۔ میرا دل ـــــــ آہ! مجھ سے جُدا ہو رہا ہے!

(بہت دُور سے کسی چرواہے کی بانسری کا نغمہ لہراتا ہوا آتا ہے۔)

سیلیچن (کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے)۔ بانسری کا نغمہ، آہ!

جبلِ بقر۔ میرے ہی ساتھ رہو سیلیچن!

جبلِ شراب۔ میرے پاس آؤ سیلیچن!

جبلِ بقر۔ میں تمہیں ایقان دیتا ہوں۔

جبلِ شراب۔ میں تجھے امرِ اتفاقی دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے سکون دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے تلوّن دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے خاموشی دیتا ہوں۔
جبلِ شراب۔ میں تجھے آوارہ دیتا ہوں۔
جبلِ بقر۔ میں تجھے واحد محبت دیتا ہوں
جبلِ شراب۔ میں تجھے کئی محبتیں دیتا ہوں
سیلیچن (گویا الفاظ اس کے قلب سے زبردستی چھینے گئے ہیں --)۔
دونوں، دونوں سے ــــــ میں محبت کروں گی۔

(یکبارگی جبلِ عظیم کی چوٹی مخاطب ہوتی ہے)

جبلِ عظیم۔ تو دونوں ہی سے محبت کرے گی اے ننھی روح! تو پہاڑیوں پر "خاموشی" کے ساتھ آرام کرے گی اور شہروں میں "علم" کے ساتھ محوِ رقص ہوگی۔ دونوں تجھ پر قابض رہیں گے! پہاڑوں پر چمکنے والے چاند اور سورج تجھے جلا دیں گے، اور اے ننھی پروانے! شہر کے چراغ تیرے پروں کو جھلس دیں گے۔ ان میں سے ہر ایک تجھ کو ایک دنیا معلوم ہوگا اور اپنی قبر بھی! تیرا دل اس پر کی مانند ہے جسے ایک منہ پھونک مار کر اڑا دے، اور پھر دوسرا۔ لیکن خائف نہ ہو! کیونکہ انسان کی زندگی باری باری بہت سی محبتوں کیلئے ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کی طرح ہے جو (ساحل پر) لنگر انداز ہوا اور پھر نیلے سمندر میں تیرنے لگے۔ یہ ایک نغمہ ہے جو سکوت میں الجھا ہوا ہو اور پھر سرگوشی کرنے لگے۔ یہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے، کچھ جری، کچھ غافل۔ اس میں منوّر موسیقی "ہے"۔ "تبدیلی" ہے۔ "سکوت" ہے۔ "اتفاق" ہے اور "یقین" ہے۔ "واحد" ہے اور "بیشمار" ہے۔ پھر کتارہ ــــــ اے حسین شعلے! اس کوشش میں کہ تو تمام دنیا کو نگل لے! پر آخر تو آئے گی میرے ہی پاس اے ننھی روح!۔

(مدہوش سی سیلیچن اس منظر اور آواز کو آغوش میں لے لینے کیلئے اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ مگر سب کچھ تاریک نیند میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(تاریک منظر رات کے آسمان تلے پھر چمک اٹھا ہے۔ سیلیچن کھڑی ہوتی ہے، اس کے ہاتھ ایک شہر کے دروازے کی طرف جس میں سے روشنی کی ایک نہر بہہ رہی ہے، پھیلے ہوتے ہیں۔ دروازے کی ایک جانب ایک نوجوان کی مورت کھڑی ہوتی ہے جس کے گرد روشنی کا ہالہ ہے۔ دوسری جانب سائے میں ملفوف ایک مجسمہ ہے۔ دروازے کے اوپر بیچ میں پتھر کا بنا ہوا ایک عجیب الخلقت جانور کا سر ہے جو دھندلا نظر آ رہا ہے۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے۔

"اے ننھی سی شہابی روح
جو کہر آلود اتحاد مات میں
یکہ و تنہا ماری ماری پھر رہی ہے، غیر مطمئن ــــــ
اس غضب کی سردی سے نکل آ،
میں تجھے آرام دہ اور گرم جگہ بلا رہا ہوں ــــــ
یہاں جہاں میں اپنا بربط بجاتا ہوں ــــــ
اس ماہتابِ زرنگار کے نیچے۔"

سیلیچن (سرگوشی میں) کیا یہ "شہر" ہے؟ ــــــ وہی وسیع دنیا۔

جبلِ شراب کا نوجوان گائے جاتا ہے۔

"جیسے سُندر ہرا پروانہ

تحیر خیز فروزاں شمعوں کے گرد،
جل جانا چاہتا ہے، اسی طرح مایوس و بےچین ــــ
آہ اے بے قرار قرمزی،
میں چاہتا ہوں کہ تجھ میں بھی ــــ
اب جبکہ میں بربط بجا رہا ہوں ــــ
عشق کا قرمزی شعلہ بھڑک اُٹھے ــــ

سیلچن:۔ (دروازے کی طرف مسرت سے دیکھتے ہوئے) وہاں گرمی اور روشنی ہے!

(جس وقت وہ بولتی ہے، دونوں جانب سے
پروانے آتے ہیں اور آپس میں مل جل کر ناچتے
ہوئے دروازے تک جاتے ہیں اور پھر اُچھلتے
کودتے سامنے آجاتے ہیں۔)

سیلچن (اپنے تیز ہاتھ پھیلاتے ہوئے) یہ تو سچ مچ کے ہیں ــــ
ان کے پروں سے ہوا نکلتی ہے۔

(پروانے اُسکے پاس سے گذر کر شہر میں غائب
ہو جاتے ہیں۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے:۔

اے میرے گیت کے ہونٹوں! تم
اس مرمریں دوشیزہ کے قلب کے پاس
جاؤ اور دل سوزی سے سرگوشی میں کہو
اِن الفاظِ پُر اثر کو
"اے سُننے والی!
تیرا محبت جب ایک دفعہ گذر جائے،
تو وہ دوبارہ واپس نہیں آتی!"

(سیلچن اسکی طرف دوڑتی ہے ــــ لیکن اُس
نوجوان کے گرد جو روشنی کا ہالہ ہے وہ مدھم
ہو جاتا ہے اور وہ ایک سایہ بنکر رہ جاتا ہے

دروازے میں سیاہ فرغل پہنے ہوئے لیمنڈ
کھڑا ہے۔)

سیلچن:۔ ارے تم ہو؟

لیمنڈ:۔ اپنی ننھی رُوح کے بغیر میں سرد اور بے جان ہوں۔
آؤ! ــــ

(اس کے لئے اپنی آغوش وا کر دیتا ہے)

سیلچن:۔ کیا میں محفوظ رہونگی؟

لیمنڈ:۔ حفاظت کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اپنے پہاڑوں میں
محفوظ ہو؟

سیلچن:۔ میں کہاں ہوں؟

لیمنڈ:۔ شہر میں۔

(مسکراتے ہوئے وہ دروازے کی طرف اشارہ
کرتا ہے۔ بازار کی جگنو جیسی روشنیاں رقص کرتی
نظر آتی ہیں۔)

سیلچن (سرگوشی میں) یہ کیا ہیں؟

لیمنڈ:۔ روشنیاں، پیاری ــــ بازار کی روشنیاں۔
چراغ ہیں ــــ زرِ حیات!

سیلچن:۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی چمکدار رہتی ہیں؟

(جبلِ شراب کے نوجوان کے گرد جو ہالہ ہے
وہ دوبارہ چمک اُٹھتا ہے اور وہ اپنا ساز
بلند آہنگی کے ساتھ چھیڑتا ہے اور جب سیلچن
اس آواز کی طرف مُڑتی ہے تو اُسکی رنگت دھیمی
پڑ جاتی ہے۔ وہ اب پھر وہی نیلا سا سایہ ہے
اور جگنوؤں کی روشنیاں دروازے میں سے
غائب ہو گئی ہیں۔)

سیلچن:۔ کیا وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے؟

لیمنڈ:۔ آؤ۔

سیلیچن ۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

لیمنڈ ۔ نئی باتوں سے؟ کیا تم صرف نصف ماہتاب ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو؟ آہ اے ننھی رُوح کیا تم صرف اپنی بکریوں ہی میں رہوگی ــــــ ایسی حالت میں جبکہ میں تم کو جو بے دکھا سکتا ہوں؟۔

سیلیچن ۔ کیا وہ اچھے ہیں؟

لیمنڈ ۔ وہ سب کچھ ہیں۔

سیلیچن ۔ (دروازے کی طرف قدمے سرکتے ہوئے) یہ شہر کس قدر عجیب و غریب اور روشن ہے! کیا وہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوتا ــــ ؟۔

لیمنڈ ۔ میں اپنی محبت سے اندھیرے کو تم سے دُور رکھونگا۔

سیلیچن ۔ اوہ! لیکن میں محبت نہیں کرتی۔

لیمنڈ ۔ اری معصوم، محبت کرنا ہی تو زندگی ہے ــــ بجو بے کی جستجو کرتے رہنا! جب کوئی پر اُڑتا ہے تو کیا وہ ہوا سے، جو ایک نامعلوم شے ہے، محبت نہیں کرتا ہوتا؟ اگر تاریکی اور روشنی بدلتی نہیں رہتیں تو کیا ہم سانس نہیں لے سکتے تھے؟ (اور جونہی وہ قریب آتی ہے) محبت کرنا گویا ایک درخت پر چڑھنا ہے اور پھر چھوٹے سے سبز پھول کو دیکھتے ہوئے اسے توڑنے کیلئے نیچے اُتر آنا! اس کے پر ہیں۔ یہ اڑ گیا ہے ــــــ تم کو پھر چڑھنا چاہیئے ــــ یہ کانپ رہا ہے، لیکن یہ صرف تمہارے ہاتھ کی ہوا ہے ــــــ تم کو گھٹنا چاہیئے، تم کو چھٹنا چاہیئے، تم کو کُودنا چاہیئے، پھر یہ کبھی وہاں ہے، یہاں نہیں ــــــ کیونکہ سبز پھول پروانے کی طرح اُڑتا ہے اور صرف اُس کے پروں کی ہوا ہی کو تم پکڑ سکوگی۔ مگر تمہاری آنکھیں چمک رہی ہوں گی، تمہارے رُخسار دَمک رہے ہوں گے۔ تمہارے سینے کا زیر و بم نمایاں ہو رہا ہوگا ــــ آہ! اے ننھے سے دل! (منظر تاریک ہو جاتا ہے۔) اور جب رات ہوگی ــــ یہ ساکت ہو جائیگا۔ گل مغیلاں کی طرح اندھیرے میں کہیں مُرجھایا ہوا، وہ تمہارا گورا ہاتھ اسکو تلاش کریگا لیکن تمہارا شیریں سانس اس کو کہیں دُور بہا دے گا اور تم ہرگز ہرگز اُسکو نہ پکڑ سکو گی ــــ ہاں، زندگی خوبصورت ہو جائے گی، (اسکی آواز بولتے ہوتے سرگوشی بن جاتی ہے۔ وہ اپنی آغوش وا کرتا ہے۔) میرے شہر میں آؤ ــــ آؤ۔

سیلیچن ۔ (لیمنڈ کے سینے پر ہاتھ رکھکر) میں آتی ہوں۔

لیمنڈ ۔ (اسکو دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے۔) مجھ سے محبت کرو۔

سیلیچن ۔ میں محبت کرتی ہوں۔

(بربط بجنے لگتا ہے۔ وہ شہر میں چلے جاتے ہیں۔ جبلِ شراب کا نوجوان اپنی قرمزی روشنی میں دوبارہ دکھائی دیتا ہے اور ساز کے ساتھ آہستہ آہستہ گانا شروع کرتا ہے:۔

"ہوائی گھڑیاں تاریکی میں گذری جا رہی ہیں ــــ
میری پیاری کیا تو انہیں نہیں سُن سکتی؟۔
نئی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور پُرانی محبتیں فنا ہو جاتی ہیں،
اور بوسے لیتے ہوئے لبوں کو جُدا ہونا پڑتا ہے۔
گذرے ہوئے سالوں کی خاکی مکھیاں ــــ
کیا تو انہیں نہیں دیکھ سکتی اے میری رُوح ــــ
کہ وہ کبھی اس پھول کے اور کبھی اُس پھول کے آنسو
چُوستی پھرتی ہیں۔
اور میٹھے شہد کی زرد شراب؟
(اُس کی آواز عجیب و غریب اور پُرجوش بن جاتی ہے۔)
اے وہ شُعلے جو وقت کی بادیہ پیمائی کرتا ہے
دم بہ دم نیچا ہونے والے!
جہاں کالی کالی محور دلدل میں سے نکل

ہم مایوس لوگ تیری رہنمائی میں پیچھے پیچھے جاتے ہیں —
اے آتشِ غیور وقت ہم التجا کرتے ہیں کہ تو ذرا ٹھیر!
ادھر اندھیری ہوائیں
تنہا خانہ بدوش مسافر کملا رہا ہے —
اور ایسا ہی محبت کے ساتھ ہوتا رہا ہے!"
(اسکے گانے کے دوران میں ہر چیز تاریک ہوجاتی ہے سوائے اُس روشنی کے ہالے کے جو اسکے گرد ہے۔ گیت ختم ہونے پر وہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ پو پھٹ رہی ہے۔ شہر کے تاریک دروازے میں سے سرد اور سبز روشنی میں سیلچن آتی ہے۔ وہ زرد ہے۔ گویا اُس کی زندگی گھٹ گئی ہے۔ اسکی پھٹی آنکھیں اور چہرے کی سفیدی سراسیمگی ظاہر کررہی ہیں۔)

سیلچن: میرا دل مرجھا گیا ہے۔

(جیسے ہی وہ بولتی ہے دُور سے گایوں کی گھنٹیاں بجنے کی مدھم آواز آتی ہے اور جب وہ کھڑی سنتی ہوتی ہے، شہر کے دروازے میں لیمنڈ نظر آتا ہے۔)

لیمنڈ: ننھی روح!

سیلچن: تم! ہر وقت تم!

لیمنڈ: میرے پاس نئے عجوبے ہیں (سیلچن سر کو جنبش دیتی ہے) بخدا تم مجھ سے اکتائی نہیں ہو کیونکہ میں کبھی ایک سا نہیں ہوں۔

سیلچن: سُنو!

(گایوں کی گھنٹیوں کی آواز پھر سُنائی دیتی ہے)

لیمنڈ: (حسد سے) کاہل نیند کی موسیقی! تو کیا زندگی میرے ساتھ غمگین رہی ہے؟

سیلچن: مجھے اس کا افسوس نہیں۔

لیمنڈ: آؤ۔

سیلچن: (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے) پرند اُڑتے اُڑتے تھک گیا ہے۔ (اپنے لبوں کو چھو کر) پھولوں میں شبنم نہیں رہی۔

لیمنڈ: کیا تم مجھے چھوڑ دو گی؟

سیلچن: دیکھو!

(صبح کے جھٹپٹے میں دروازے کے قریب لیکن شہر سے کہیں دُور اشارہ کرتا ہوا ادتم مجسمہ، جبل البقر کے چرواہے میں تبدیل ہوگیا ہے۔)

لیمنڈ: یہ کیا ہے؟

سیلچن: میرے پہاڑ!

لیمنڈ: وہاں کچھ نہیں دھرا۔ (اُسے مضبوطی سے گرفت میں لے لیتا ہے۔) مت جاؤ! مت جاؤ! میں نے تمہیں اپنے شہر کے عجوبے دیدئے ہیں۔ میں تمہیں اور عجوبے دونگا! (لیکن سیلچن اُس کی الگ ہٹ جاتی ہے) اگر اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا تو آؤ ہم دونوں ساتھ مرجائیں! دیکھو! وہ پیاری موتیں آرہی ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے واقع ہوتی ہیں۔

(شہر کے تاریک دروازے میں سے دُھندلی سی شکلیں نمودار ہورہی ہیں۔ یہ موتیں ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے آتی ہیں۔ وہ سیلچن کی طرف آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی آتی ہیں، اور کچھ دیر اسکو مسکرا کر دیکھتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔)

سیلچن: ہاں وہ اچھی اور نیک ہیں۔

(جب وہ شہر کی طرف دوبارہ حرکت کرتی ہے، لیمنڈ کا چہرہ مسرت سے چمک اُٹھتا ہے لیکن جونہی وہ دروازے کے پاس پہونچتی ہے دُور سے گایوں کی گھنٹیوں اور بانسریوں کے

بجنے کی آواز پھر سنائی دیتی ہے جبل شہاب کا
چرواہا گاتا ہے :-
آ! بیابان کی گھاس میں، اور
بہت دور، گھنٹے والی چٹانوں کی مترنم آواز دل میں
آ! پھولوں سے لدے ہوئے اپنے پہاڑی وطن کے چمن زار میں
جہاں عقاب پرواز کرتے ہیں
اور اون سے لدی ہوئی بھیڑیں دھوپ میں چرتی ہیں۔
آ! پہاڑ پر، جہاں میں چاند کی پتلی پتلی زرد
کرنوں کا تاج پہنے ہوئے
اپنے کاہستان میں گھومتا پھرتا ہوں۔
آ! پرسکون آسمان تلے۔ اور نکلہت ریز صبح کے
پُر آرزو نغموں میں ــــــ میری بیٹی!!
(وہ گا رہا ہے۔ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ سیلچن
لب کھولے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے علیحدہ
ہو چکی ہے اور موت کی شکلیں شہر میں واپس
جا کر غائب ہو گئی ہیں۔)

سیلچن:- میں آتی ہوں۔

لیمنڈ:- (اس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے) ننھی روح: تو کیا مجھے غروبِ آفتاب کے بعد مچھر کی طرح مر ہی جانا چاہیے؟ آہ! تمہارے بغیر میں زندہ نہ رہونگا۔

سیلچن (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے):- بے کس دل! میں جا رہی ہوں ــــ!

لیمنڈ:- تاریکی ہو گئی۔ (شہر کے دروازے میں وہ اپنے چہرے کو اپنے فرغل سے چھپا لیتا ہے۔)

(جب سیلچن، جبلِ بقر کے چرواہے کے پاس
پہونچتی ہے بانسری کا ایک طویل نغمہ گونجتا ہے،
منظر تاریک ہو جاتا ہے اور کہیں دور گایوں،
اور پھولوں کی گھنٹیوں، اور بانسریوں کی ملی جلی
مسلسل آوازیں بلند ہوتی ہیں۔)

چوتھا منظر

(منظر فجر کی کہر آلود سرخی سے آہستہ آہستہ روشن ہو رہا ہے۔ سیلچن ایک سبزہ زار پہاڑ پر کھڑی ہوئی ہے جس کے چاروں طرف سوائے نیلگوں آسمان کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسکی پشت پر ہلال چمک رہا ہے۔ ایک نیچی چٹان پر ایک گڈریا بیٹھا ہوا بانسری بجا رہا ہے اور "چار پھول" اپنے سبزی مائل سپید نیلے، قرمزی اور سنہری رنگوں کی تبدیلیوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے رنگ کے پھولوں سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تو اُن کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ انھیں سے ہر ایک اپنے رقص کی گردش پوری کرتے ہوئے باری باری سیلچن کی طرف پھول پھینکتا ہے جسے وہ اٹھا کر اپنے لبوں اور آنکھوں سے لگا لیتی ہے۔)

سیلچن:- شبنم (وہ چٹان کی طرف چلتی ہے) گڈریا!

(لیکن "پھول" سیلچن کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور جب وہ اُسکے گرد طواف کر کے چلے جاتے ہیں تو گڈریا بھی غائب ہو جاتا ہے۔ وہ "پھولوں" کی طرف متوجہ ہوتی ہے لیکن وہ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ دھندلکے کی نقاب اٹھ رہی ہے۔)

سیلچن:- چلا گیا! (وہ اپنی آنکھیں ملتی ہے۔ پھر چٹان کی طرف ایک بار اور مڑتی ہے۔ سامنے فلزمین اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے کھڑا ہے۔) تم ہو!

فلزمین:- تو تُو آ گئی ــــــ ایک زخم خوردہ بچھیا کی طرح

کر تکلیف سے نجات پائے؟ کیا شہر بہت ہی دلکش تھا جس نے تجھے اتنے عرصے تک وہیں جکڑے رکھا؟۔

سیلیچن:۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔

فلزمین:۔ پھر واپس کیوں آئی؟

سیلیچن:۔ میں اکتا گئی تھی۔

فلزمین:۔ اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔

سیلیچن:۔ (طعن سے) تو کس چیز سے مجھے اپنے پاس روکے گا؟

فلزمین:۔ (اپنی آغوش میں لیکر) اس طرح۔

سیلیچن:۔ میں تلوّن جان گئی ہوں ——— اور اب ڈرپوک دوشیزہ نہیں رہی۔

فلزمین:۔ (فکرمندی سے) ہاں، اب تو بدل گئی ہے۔ تیری آنکھیں خالی ہیں ——— تیرا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے۔

سیلیچن:۔ (طنزاً) لیکن تیرے پاس یہاں ہے ہی کیا جو تو مجھے روکے رہیگا؟۔

فلزمین:۔ سورج۔

سیلیچن:۔ مجھے جلانے کے لئے۔

فلزمین:۔ ہوا۔

(ہوا کی دھیمی دھیمی نالہ وزاری سنائی دیتی ہے۔)

سیلیچن:۔ مجھے جمانے کے لئے۔

فلزمین:۔ سکوت۔

(ہوا کا شور وغل ختم ہوجاتا ہے۔)

سیلیچن:۔ ہاں، اس میں تنہائی ہے۔

فلزمین:۔ پھول تیرے لئے رقص کرینگے۔

(پھول اپنی گھنٹیاں بجاتے ناچتے آتے ہیں اور پھر ایک ایک کرکے ناچنا بند کر دیتے ہیں۔ اُن پر غنودگی طاری ہوجاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں ———)

سیلیچن:۔ دیکھو! یہاں ان تک کو نیند اور سستی آجاتی ہے۔

فلزمین:۔ بکریاں انہیں جگا دیں گی۔

(گڈریا اپنی چٹان پر بیٹھا اور بانسری بجاتا ہوا پھر نظر آتا ہے۔ چار برہنہ، صحرائی آنکھوں والے، خوب رو، کمسن لڑکے، جن کے پاؤں بکروں کے سے ہیں، سوتے ہوئے پھولوں کے کبھی اندر اور کبھی باہر رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھول بیدار ہوجاتے ہیں، اچھلتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی یہ بکرے بھی اپنے اپنے پھولوں سے لپٹے ہوئے غائب ہوجاتے ہیں۔ گڈریئے نے بانسری بجانی بند کر دی ہے اور وہ اپنی چٹان پر بےحس و حرکت لیٹا ہوا ہے۔)

فلزمین:۔ مجھ سے محبّت کر!

سیلیچن: تو وحشی ہے!

فلزمین:۔ مجھ سے محبّت کر!

سیلیچن: تو اکھڑ ہے!

فلزمین:۔ ہاں میری زبان سیکھی نہیں۔ سُن! میری آواز یہ ہے! (خاموش پہاڑ پر ہاتھ پھیر کر) صبح کاذب سے لیکر ستارۂ آذیر کے جگمگانے تک مکمل خاموشی ہے (اپنے دل پر ہاتھ رکھکر) اور پرندے کے پر بھی ساکت ہوجائیں گے۔

سیلیچن (اس کی آنکھوں کو چھو کر) تیری آنکھیں مہیب ہیں۔ ان آنکھوں میں مجھے جنگلی درندے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی ہیبتناک رہتی ہیں!۔

فلزمین:۔ ہرگز نہیں ——— جب یہ تجھے دیکھیں اے میرے گُل رعنا۔

سیلیچن:۔ (اس کے ہاتھ چھو کر) تیرے ہاتھ گلچینی کیلئے بہت سخت

ہیں۔ (وہ اُس کے پاس سے ہٹ کر ـــــ اُس چٹان کی طرف جہاں
گڈریا بیٹھا ہوا ہے مُڑتی ہے) دیکھ! بالکل جُنبش نہیں! دن بھی تو
پُرسکوت ہے۔ لڑکے! (لیکن گڈریا نہ حرکت کرتا ہے اور نہ جواب
دیتا ہے) وہ آسمان کی نیلاہٹ میں کھویا ہوا ہے۔ (جوشیلی آواز
میں) لڑکے! آہ! میری آواز کا وہ جواب نہیں دیگا۔ یہاں میری
آواز کا جواب کوئی نہیں دیگا۔

فلزمین (پُرجوش تمنا کے ساتھ)۔ میں؟ کوئی نہیں ہوں؟

(شام کے دھندلکے میں منظر تاریک ہوجاتا ہے۔)

سیلیچن۔ دیکھ! نیند نے دن چُرالیا ہے! رات ہوچکی ہے۔

(نیند کی زنانی دھندلی شکلیں تارِ عنکبوت میں
ملبوس نمودار ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کو
ہولے ہولے حرکت دیتے ہوئے گویا وہ بھی
خوابناک ہیں وہ اس کے گرد اگرد چکر لگاتی
ہیں۔)

سیلیچن۔ کیا تم نیند ہو؟ میری محبّت نیند! میری محبوب
ـــــ آرام!

(مسکراتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ فلزمین کی طرف
پھیلادیتی ہے۔ وہ اس کے نیند میں جھومتے
ہوئے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ پھر
نیند کے دھندلکے میں دونوں غائب ہوجاتے
ہیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے، سوائے
چاند کی، جو یکایک چمک اُٹھا ہے، ہلکی سی روشنی
کے۔ گڈریا چٹان پر بانسری کے مدھم نغمہ کے
ساتھ ساتھ گاتا ہے :۔)

اے میری چھوٹی سی بکری! جس پر چتیاں پڑی ہوئی ہیں۔
جس کی آنکھیں زرد ہیں اور جس کی خوشبو دل پسند ہے۔
خدا کرے چاند، ہوا اور سنہری سورج،
اور بے شمار تارے،
ہر روز تیرے لئے چراگاہ میں عُمدہ گھاس پیدا کریں،
اور تیرا کُودنا پھاندنا زیادہ ہو!
اور خُدا کرے پہاڑی لومڑیاں تیرے پاس سے گذر جائیں،
اور تجھے سوتا ہوا کبھی نہ پاسکیں۔
ذرا میری بانسری کو صاف اور دُور تک گونجنے دے!
اور میں ذرا شیریں پانی تلاش کرلوں!
(خُدا کرے) کوئی باز یا کوئی اور شکاری جانور،
تیرے قریب تک نہ آئے، میری ننھی سی بیٹی!
کاش یہ آتشیں چٹانیں دوپہر کے وقت محفوظ رکھیں،
تیرے نازک پاؤں کو پھسلنے سے!
سُن میری اس التجا کو، چمکتے چاند کے نیچے ـــ
اے آقائے عظیم! ـــــ اُچھلنے والے خدائے بز!

(ایک طویل نالہ کے ساتھ گڈریا خاموش
ہوجاتا ہے۔ پھر چاند کے غائب ہوتے ہی اندھیرا
چھاجاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح کاذب کی دُھندلی
روشنی میں سیلیچن سوتے ہوئے فلزمین کے پہلو
سے بیدار ہوکر اُٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گڈریا
جاچکا ہے لیکن چٹان کے نزدیک جبلِ بقر کا چرواہا
اپنے فرغل میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔)

سیلیچن۔ سالہاسال تک میں سوتی رہی میری رُوح بھوکی ہے۔
(پھر جبلِ بقر کے چرواہے کو وہاں کھڑا ہوا دیکھکر)
میں اب تجھے جان گئی ہوں ـ ـــ اے حیاتِ ارض ـــ
ـــ تیری خوشبو کو، تیرے مناظر کو، تیری لذت کو، اور تیری
تمام موسیقی کو۔ میں تیرے پاس سے گُذر کر جاچکی ہوں۔
(وہ چلی جاتی ہے)

فلزمین۔ (جاگ کر) تو کہاں چلی؟

سیلچن:۔ دُنیا کے کنارے پر۔

فلزمین:۔ (ٹھکرا ور اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے)۔ تُو مجھے نہیں چھوڑ سکتی!

(وہ مُسکرا رہی ہے لیکن فلزمین اُس سے اِس طرح کشمکش کرتا ہے گویا کسی سخت منجمد شے سے اُلجھ رہا ہو۔)

سیلچن:۔ اے دوست! اب وقت آچکا ہے۔

فلزمین:۔ تو کیا میرے بوسے وحشی نہ تھے؟ کیا میں تیرے لئے بار تھا؟

سیلچن:۔ مجھے اسکا رنج نہیں ہے لیکن مجھے جانا ہی چاہیئے۔

(یکلخت جبلِ شراب کا نوجوان، جبلِ بقر کے بجیس و حرکت چرواہے کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور اسکا ساز بجنا شروع ہوتا ہے۔)

فلزمین:۔ شہر کی منحوس موسیقی! تو کیا تو اسی (جبلِ شراب کے نوجوان) کے پاس واپس چلی جائے گی؟۔

سیلچن:۔ خوف نہ کھا! میں آگے ہی بڑھتی رہونگی۔

فلزمین:۔ مجھے پہاڑوں کی ہوا پر نہ چھوڑ! تیرے بغیر محبت مُردہ ہے اور میں مرجاؤں گا۔

سیلچن:۔ اے شکستہ دل! میں تو چلی!

فلزمین:۔ (چٹان کا سہارا لیکر)۔ یہ سرد ہوچکی ہے۔

(چرواہے کی بانسری بجتے ہی جبلِ بقر اپنے ہاتھ سیلچن کی طرف بڑھاتا ہے۔ ساز بھی بجتا ہے اور جبلِ بقر بھی اپنی آغوش اُس کے لئے واکردیتا ہے۔ وہ ساکت کھڑی ہے۔)

سیلچن:۔ اے میرے رفیقو، مجھے چلا ہی جانا چاہیئے۔ کوئی دم میں پو پھٹ جائے گی۔

(جبلِ بقر اور جبلِ شراب خاموشی میں اپنے چہرے چھپا لیتے ہیں۔ صبح کاذب کا جنازہ نکلتا ہے۔ مکمل تاریکی پھیل جاتی ہے۔)

پانچواں منظر

(بہت دُور مدھم روشنی سے جبلِ عظیم کی برف آلود چوٹی چمک اُٹھتی ہے، اور پھر یہ روشنی تیز ہوکر سیلچن پر بھی پڑتی ہے۔ کوئی اور چوٹی نظر نہیں آتی، البتہ روشنی کے دونوں جانب جبلِ بقر اور جبلِ شراب اپنے سروں کو چھپائے سایوں کی مانند کھڑے ہوئے ہیں۔)

سیلچن:۔ جبلِ عظیم! میں آئی!

(جبلِ عظیم کی چوٹی ایک ایسی آواز میں جو دُور سے آرہی ہو مصروفِ تکلم ہوتی ہے۔ اس کی آواز روشنی کے ساتھ ساتھ صاف اور گرجدار ہوتی جاتی ہے۔)

اے شعلۂ آوارہ! اے بے چین تپش!
ہر شے کو خاکستر کرتی ہوئی، پر کسی بات پر متاسف نہ ہونے والی!۔
تقدیر کی ہوائیں ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی ہیں ـــــ
تیری پُرفیض زندگی کی کشتی کنارے آلگی،
اور تیری تمام پُرشوق جستجوئیں ختم ہوچکیں!
تو اب مسافر ہے ایسے سمندر کی جہاں مدّوجزر بھی نہیں ہوتا،
جہاں روشنی اور تاریکی، تلوّن اور سکون،
ایک ہیں ـــــ آ! اے ننھی روح، گہوارۂ راز میں!

(سیلچن گھٹنے ٹیک کر اپنا سر زمین پر جھکا دیتی ہے۔ روشنی دھیمی ہورہی ہے، یہاں تک کہ منظر بالکل تاریک ہوجاتا ہے۔)

بسلسلۂ ماسبق نومبر ۱۹۳۷ء

دَورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

جس طرح حضراتِ شعرا روایاتِ کہن کے دلدادہ ہوتے ہیں اُسی طرح اُن کا محبوب بھی ہر حال میں اپنی روایتی وضع کا پابند رہتا ہے۔ جیتے جی عاشق کو ستانا، جلانا، کڑھانا، حتیٰ کہ مار ڈالنا، اور کبھی نہ ملنا اُس کے آئینِ محبت کی اہم دفعات ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد عاشق کی قبر پر جانا لازمی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، محبت کی کشش اگر زندگی میں اپنا اثر نہ دکھائے تو کیا مرنے کے بعد بھی محرومِ تاثیر رہ جائے اس لئے کہ بقول شاعر ؎

جذبۂ عشق اگر سچ ہے تو انشاءاللہ ٭ کچے دھاگے میں چلے آئینگے سرکار بندھے

جذبۂ عشق کی تاثیر برحق۔ جیتے جی نہ سہی، بعد از مرگ ہی ایک بار "انہیں" آنا ضرور پڑے گا۔

کچھ ندامت کچھ حجاب، یکایک مزارِ عاشق پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی اس لئے وہ "شوخِ جفاجو" پہلے اپنے کوچہ کی صبا اور نسیم کو وہاں بھیجتا ہے کہ ذرا خبر تو لائے کہ قبر کے اندر عاشق صاحب کس حال میں ہیں۔ عاشق صاحب اپنے پُرانے تلخ تجربوں کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہوا ابھی میری خاکِ مزار کو برباد کرنے آئی ہے۔ چنانچہ کبھی اپنے دل سے اور کبھی خود ہوا سے پوچھتے ہیں کہ :- ؎ (فانی)

خیر ہے کیا چاہتی ہے اے نسیمِ کوئے یار ٭ اب تو ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

آتی ہے صبا سوئے لحد اُن کی گلی سے ٭ شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

آخر رفتہ رفتہ عاشق صاحب کی یہ بدگمانی دُور ہو جاتی ہے اور نسیم و صبا کو آمدِ محبوب کا پیش خیمہ تصور کر کے اُس کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اختلافِ طبائع ہر موقع پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہر شاعر کا محبوب ایک نئے انداز سے اپنے چاہنے والے کی قبر پر آتا ہے۔ حسرت صاحب کا محبوب اپنے گیسو آراستہ کر کے اُن کے مزار پر گیا تھا[1]۔ جگر صاحب کے معشوق نے اُن کی قبر پر روتے روتے اپنا بُرا حال کر لیا تھا[2]۔ فانی صاحب کے "خانہ بر انداز" نے اور بھی اپچ کی لی۔ وہ برافگندہ نقاب آتا ہے ؎

قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے ٭ آفتابِ صبحِ محشر ہمرکاب آنے کو ہے

خُدا جانے "اُس" کے آنے پر گورِ غریباں میں کیسا تہلکہ مچ گیا ہوگا۔ غالباً اسی لئے بعض مُلّا کہتے ہیں کہ "قبرستان میں عورتوں کا جانا منع ہے۔ بے ادبی ہوتی ہے۔" خیریت ہوئی کہ وقت سحر تھا اور ابھی تھوڑے ہی لوگ گھروں سے باہر آئے تھے۔

---

[1] فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ ٭ پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو۔

[2] برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے ٭ کیا اُٹھ کے کہدیا مری خاکِ مزار نے (جگر)

ورنہ اُسے "بے نقاب" دیکھکر مُردوں پر تو خیر جو گذرتی، گذرتی، زندوں کا خدا جانے کیا حشر ہوتا ؎

سحر ہوئی کہ وہ بادش بخیر آتا ہے ؂ چراغ ہیں مری تُربت کے جھلملائے ہوئے

قبرستان میں آنے کو تو وہ آیا مگر طبیعت میں جھجک باقی تھی اِس لئے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ فانی صاحب نے قبر کے اندر سے آواز دی ؎

چلے بھی آؤ یہ[1] ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ ؂ تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

پُرانا قبرستان تھا، قبریں شکست و ریخت کی حالت میں تھیں، پہچانی نہ جاتی تھیں۔ فانی صاحب کی قبر تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو چکی تھی۔ بی صاحبہ[2] گھونگٹ کے پٹ کھولے، سر جھکائے، فانی صاحب کی آواز کے سہارے آگے بڑھیں اور پھر ٹھٹک گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ فانی صاحب کی قبر کونسی ہے۔ خود فانی صاحب بھی صحیح نشان بتانے سے قاصر تھے۔ ناچار یہ صلاح دی کہ ؎

زمینِ گورِ غریباں پہ اِک جگہ نہ ٹھہر ؂ یہیں کہیں نگہِ شرمسار ہم بھی ہیں

چُنانچہ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر چل پھر کے اندازہ سے ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ دراصل یہی قبرِ فانی تھی۔ ہائے افسوس، جو آرزو زندگی میں پوری نہ ہوئی وہ مرنے کے بعد بر آئی۔ مگر زندوں کی مصلحتیں مُردوں کی مصلحتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ قبریں کچھ اس طرح جانچ تول کر تختے لگاتے ہیں اور پھر اس پر کچھ اس طرح مٹی لادتے ہیں کہ مُردہ لاکھ چاہے، قبر سے باہر نہ نکل سکے۔ حضرتِ فانی بہت تڑپے، بہت تلملائے، بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ تختے سرکا کر گھڑی بھر کے لئے باہر نکل آئیں مگر کمبخت قبر کچھ ایسی استوار بنی تھی کہ ذرہ برابر جُنبش نہ کی۔ ناچار نہایت دردناک آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ ؂ کوئی مزار میں کوئی سرِ مزار رہے

جب اور کچھ بس نہ چلا تو حضراتِ شعرا کے اصولِ مسلمہ کے مطابق آپکی خاکِ تربت دامنِ محبوب سے لپٹ گئی ؎

بخشا جو شرف اُنکے اُڑتے ہوئے دامن نے ؂ اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاکِ سرِ مدفن نے

محبوب نے جب دیکھا کہ یہ عجب دامنگیر مٹی ہے، چمٹی ہی جاتی ہے، تو اپنے دامن کو جھٹک کر صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جیسے ہی اس نیّت سے اپنے دامن پر نظر ڈالی، حضرتِ فانی کی خاک کا ذرّہ ذرّہ تھرّا اُٹھا کہ ہائے اب یہ سعادت بھی چھن

---

[1] مطبوعہ متن میں اس جگہ "وہ" ہے۔ میں نے "یہ" بنا دیا۔ اس جزوی تصرف کے لئے حضرتِ فانی سے معذرت خواہ ہوں۔ (شادانی)

[2] مضمون کے دورانِ تحریر میں میرے ایک دوست "حکیم صاحب" تشریف لاتے۔ اُنہوں نے لفظ "بی صاحبہ" پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپکو کیونکر معلوم ہوا کہ محبوبِ فانی ایک "بی صاحبہ" ہیں۔ ممکن ہو کوئی "اَمرد" ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں ممکن تو ضرور ہو مگر اس مصرع میں (قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہیں) لفظ "نقاب" سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ غالباً "بی صاحبہ" ہونگی۔ بہت ممکن ہو کہ پروفیسر فراق بھی یہی اعتراض کریں۔ تو جواباً گذارش ہو کہ مضمون لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا اسلئے کہ ؏ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ بہرحال اگر فراق صاحب اپنے ذاتی علم کی بنا پر میرے اس قیاس کو غلط سمجھتے ہیں تو میں بخوشی اسکے لئے تیار ہوں کہ وہ لفظ "بی صاحبہ" کاٹکر "صاحبزادہ صاحب" بنا دیں۔ (شادانی)

جانے گی ؎

کس نظر سے اُس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف ؛ کانپ اُٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامنگیر کا

جس وقت بی صاحبہ گورستان سے پلٹنے لگیں تو حضرتِ فانی نے یہ آخری وصیت کی کہ "حضور! آخر ایک مرنے والے کا ماتم کب تک۔ بہت سوگ ہو چکا۔ اب اس خاکسار کو بھول جایئے اور دوسروں پر مشق تغافل فرمایئے۔ اس لئے کہ حضور کا اس طرح سوگوار رہنا تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ؎

وہ مشق خوئے تغافل پھر ایک بار رہے ؛ بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

حضرتِ فانی نے گورستان کی یہ داستان بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ ہم نے بخوفِ طوالت یہاں اس کا خلاصہ درج کر دیا ہے جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو اور جزئیاتِ امور سے آگاہی حاصل کرنا چاہیں وہ حضرتِ فانی کا دیوان ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ نزع و مرگ کی آخری کڑی روزِ جزا، حشر، محشر، اور قیامت ہے۔ معاد کا عقیدہ تو اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے لیکن قیامت کب آئے گی اس کی تعیین کسی نے نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ قربِ قیامت کے کچھ آثار بتا دئے گئے ہیں مگر وہ ایسی مبہم باتیں ہیں کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے شعرا، خصوصاً چوٹی کے غزلگو جس درجہ حساس واقع ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے بھلا اُن سے اس غیر معین حالت کی برداشت کہاں ممکن تھی اور وہ کب تک انتظار کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ایک خیالی دُنیا بنائی اور اُس دُنیا میں پہونچنے کے لئے فرضی طور پر یا تو جلاد محبوب کی چھُری سے ہلاک ہوئے یا پھر اُس کے جور و ستم کے باعث ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دی۔ پھر قیامت قائم کی۔ حشر و نشر کے سامان ہوئے۔ خُدائی دربار سجایا اور داورِ محشر کے سامنے فریاد لے کر پہونچے۔ چونکہ یہ حضرات شاعر ہونے کی حیثیت سے گویا ایک ہی "اُمت" کے افراد ہیں۔ اسلئے حشر میں سبکو تقریباً ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، چونکہ اس سلسلہ میں حسرت و جگر وغیرہ کے جو اشعار ہم پیش کر چکے ہیں وہ اثباتِ دعویٰ کے لئے بالکل کافی ہیں۔ لیکن اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو حضرتِ فانی آنجہانی کے اشعار سے مل جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بات نہایت دلچسپ اور قابل غور ہے وہ یہ غالباً ان بزرگوں نے کسی ایسی وجہ سے جو خود انکے سوا کسی دوسرے کو معلوم نہیں، یہ عہد کیا ہے کہ جو کچھ بیان کریں اس میں تناقض و تضاد ضرور ہو۔ چنانچہ حضرتِ فانی حشر میں پہونچکر کبھی تو برسلائے محبت، گلۂ جور و جفا کے بجائے سراپا شکر و امتنان بن جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

روزِ جزا گلہ تو کیا، شکرِ ستم ہی بن پڑا ؛ ہائے کہ دل کے درد نے، درد کو دل بنا دیا

اور کبھی شکووں کے دفتر کھولدیتے ہیں اور ایسی دُھواں دھار تقریر فرماتے ہیں کہ بیچارہ محبوب بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور خاموشی کے سوا اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا ؎

وہ مری شکایت پر چُپ کھڑے ہیں محشر میں ؛ بُت اُنہیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے

اس شعر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ معنوی اعتبار سے دیکھئے تو سبحان اللہ، اور لفظوں پر غور کیجئے تو ماشا اللہ۔ بُت اُنہیں بنا پایا اب خدا خدا کرے۔ واہ کیا بات کہی ہے۔ رعایت لفظی کیا کہنا۔ میاں امانت زندہ ہوتے اس شعر کو سُنکر اپنی ساری "ضلع جگت" بھول جاتے۔

دوسرے شعرا کی طرح حضرت فانی بھی جب اپنے محبوب سے ملاقات یا "اُس بات" کے طالب ہوتے ہیں تو وہ عیارِ دفع الوقتی کے لئے اُن سے روزِ حشر کا وعدہ کر بیٹھتا ہے۔ ان کی سادہ دلی دیکھو کہ اس عہد کو سچا جان کر، اس کے ایفا کی اُمید میں خوشی خوشی جان دے کر حشر میں جا پہونچتے ہیں۔ وہ ہزار جھوٹوں کا جھوٹا جب دیکھتا ہے کہ یہ نامراد تو پیچھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا اور حشر میں بھی آ پہونچا تو صاف مُکر جاتا ہے کہ میں نے تم سے کسدن وفا کا وعدہ کیا تھا ؎

محشر میں بھی وہ عہد وفا سے مُکر گئے ؎ جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

یہ جواب سُنکر حضرت فانی کو جیسی کچھ مایوسی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ اس دردناک سانحہ میں ہماری دلی ہمدردیاں اُنکے ساتھ ہیں۔ ہمارا بس ہوتا تو اس دغاباز کو اس عہد شکنی کی پاداش میں غلام بنا کر حضرت فانی کو بخشدیتے۔

حشر کے دن پیش آنے والے گوناگوں واقعات کے بیان میں ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرا نے خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔ فانی صاحب کے یہ دو شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں ؎

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چُپ کی داد ؎ یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبانِ داغ

محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خونبہا بھی ہے ؎ وہ اِک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

بخوفِ طوالت ہم اس موضوع پر رسمی شاعری کے ان ہی چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں اور جنابِ فراق سے نہایت مودبانہ گذارش ہے کہ اس قسم کے لایعنی کلام کی حمایت کر کے اپنے ذوق کو رسوا اور نوخیز شعرا کو گمراہ نہ کریں۔

"زاہد، واعظ، مُحتسب، ناصح"

رسم و تقلید کی بنا پر جس طرح ہمارے شعرا اپنے آپ کو رندِ سیہ مست، مریدِ پیرِ مغاں، پرستارِ ساقی اور بے نیاز طاعت و زہد بنا کر پیش کرتے ہیں اُسی طرح اُن کے آئین شاعری میں یہ بھی فرض ہے کہ زاہد، واعظ، اور شیخ کی ہجو کریں، اُن پر پھبتیاں کسیں، اُن کی پگڑیاں اُچھالیں[1]۔ اُنہیں میخواری کی دعوت اور ترغیب دیں بلکہ موقع ملے تو پچھاڑ کر پلا دیں۔ اُنہیں محفلِ ساقی اور بزمِ حسن میں بلائیں اور شراب و حسن کی بے پناہ قوتوں سے مغلوب نہ ہونے کا چیلنج دیں۔ جن اشعار میں اس قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں اُن کے مطالعہ کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضراتِ شعرا کو زاہد و واعظ وغیرہ سے اسقدر کد کیوں ہے اور اُن کے درمیان وجہِ مخالفت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ

---

[1] لے گیا ہے کوئی پگڑی جو اُڑا کر حسرت ؎ مجھ گنہگار پہ ہے شب سے گمانِ واعظ۔

ہمارے شعراء نے بربنائے تقلید چونکہ رندانِ سیہ مست کا سوانگ بھرا ہے اس لئے ہر ایسے گروہ کی مخالفت اُن پر واجب ہے جو مذہب و دینداری سے کوئی علاقہ رکھتا ہو۔ رندی کا فرض جبھی ادا ہوگا جب مستوری کی دھجیاں اُڑائی جائیں

زاہد و واعظ کے گناہوں کی ایک طویل فہرست ہر رسم پرست غزلگو کے دیوان میں آپکو مل جائیگی۔ ہم یہاں صرف اُن چند "کبائر" کا ذکر کرینگے جو حضراتِ شعراء کے بیان کے مطابق زاہد و واعظ کے لئے لازم و ملزوم قرار دیئے گئے ہیں۔

زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گنواتا ہے۔ منہیاتِ شرعیہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ جنّت کا طالب ہے۔ کوثر و تسنیم کے آبِ گوارا سے اپنی تشنگی بجھانے کا آرزومند ہے۔ حورانِ بہشتی سے اپنے چشم و لب و آغوش کے لئے سرمایۂ کیف و سکون حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے مقابلے میں شاعر صاحب ایک رندِ دُرد آشام اور دین و مذہب کی تمام قیود سے آزاد ہوتے ہوئے بھی خاصانِ خُدا میں سے ہیں۔ اِن کا سینہ اسرارِ معرفت کا گنجینہ اور اُن کا دل انوارِ حقیقت سے رشکِ طورِ سینا ہے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت اور زاہد و واعظ پر شدّت سے نکتہ چینی کرنے کے لئے گویا من اللہ مامور ہیں۔ تعصب کے پردے اگر آنکھوں پر پڑے ہوئے نہ ہوں تو ہر شخص کو صاف نظر آجائے کہ ان خود ساختہ ریفارمروں یعنی ہمارے شاعروں نے جن میں اکثر ہماری آپکی طرح اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں، رندی کا سوانگ بھر کر اپنے اشعار میں زاہد و واعظ اور شیخ و مُحتسب پر جو لے دے کی ہے وہ محض نقالی اور رسم پرستی ہے۔

جب کبھی اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم تھی مُحتسب بھی تھے، مگر آج اُن کا وجود کہاں۔ چند تعلیم یافتہ حضرات کے سوا عام طور پر تو لوگ "مُحتسب" کے معنی سے بھی ناآشنا ہیں، لیکن فراق صاحب کے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرت موہانی آج بھی "مُحتسب" سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ شراب کی حلّت و حرمت کے بارے میں اس سے مباحثے کرتے ہیں اور آخر اُسے لاجواب کرکے چھوڑتے ہیں۔ نہ صرف اسقدر۔ بلکہ دلیلِ قطعی کے طور پر ایک ایسا الزامی جواب دیتے ہیں کہ "مُحتسب" کے پاس دم بخود رہجانے کے سوا چارہ نہیں ؎

ترکِ مے کے معاملے میں فضول ٭ مُحتسب ہم سے گفتگو نہ کرے

میکشوں سے نہ مُحتسب کی چلی ٭ آخرکار لاجواب اُٹھا

اسقدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے ٭ مُحتسب خود بھی تو فکرِ جنّت و کوثر میں ہے

اپنی خیالی دُنیا میں جگر صاحب کو بھی ایک مرتبہ مُحتسب سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ اُنھوں نے ہزار منّت کی مگر اس کمبخت نے شراب پھینک ہی دی ؎

اے مُحتسب نہ پھینک، مرے مُحتسب نہ پھینک ٭ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

ہاں تو جیسا ہم ابھی بیان کر چکے ہیں زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ جنّت اور اس کے لوازم کی آرزو ہے۔ اور یہ ایک ایسا جُرم ہے جو کسی طرح معاف نہیں ہوسکتا چُنانچہ حسرت صاحب بہانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ؎

حشر میں بھی نہ ہوگا اے واعظ ٭ گنہِ آرزوئے حور معاف

اور یہ خواہشِ جنّت وہ بُری بلا ہے کہ اس کی بنا پر زاہد نورِ معرفت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر کسی کو نورِ معرفت کی

تلاش ہو تو وہ شاعر صاحب کے قلب سیاہ میں ڈھونڈھے اسلئے کہ نورِ معرفت رندوں ہی کے حصّے میں آیا ہے اور اسی لئے وہ مخلوق کے ارشاد و ہدایت کے اہم منصب پر مامور کئے گئے ہیں ؎

نورِ عرفاں کی عبث ہو دلِ زاہد میں تلاش ✤ اور یاں خاک نہیں خواہشِ جنّت کے سوا
جلوۂ حق سے بیخبر زاہد ✤ محوِ تسنیم و سلسبیل ہیں سب
واعظو! مُرشدِ کامل کی تمہیں ہو جو تلاش ✤ بزمِ رنداں میں کبھی اِک روز ذرا جا دیکھو

"بادشاہِ متغزلین" نے جنابِ شیخ کو ہجو شراب سے باز رکھنے کیلئے ایک نہایت "معقول" بات کہی ہے ؎

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرتِ شیخ ✤ خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں

ہمارے "مشایخ" یعنی شعرائے رندی کا جامہ پہن کر زاہد، واعظ، اور شیخ پر ہزار گونہ برتری حاصل کرلی ہے اور بات بات پر ان بیچاروں کو ناڑتے اور شرمندہ کرتے ہیں۔ جگر صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر ہے زاہد کو حور و کوثر و تسنیم کی ✤ اور ہم جنّت سمجھتے ہیں ترے دیدار کو

ظاہر ہے کہ "طالب مولیٰ" کے مقابلہ میں طالب جنّت کا مرتبہ بہت پست ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا سچ مچ آپ "عشقِ حقیقی" کے چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ دعویٰ اگر حقیقت پر مبنی ہے تو اس کا پیش کرنا انتہائے کم ظرفی ہے بلکہ کھلی ہوئی دلیل ہے اس امر کی کہ یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اصلیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور اگر آپ کا مقصود "محبوبِ مجازی" ہے جس کے دیدار کو آپ جنّت سمجھتے ہیں تو پھر اس میں زاہد بیچارے پر طعن و تعریض کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا اپنا مذاق اور اپنی اپنی پسند ہے۔

حضرتِ فانی نے چونکہ رندی و ہوسناکی اور بادہ و ساغر سے چنداں سروکار نہیں رکھا اسی لئے زاہد و واعظ اور شیخ و محتسب سے بھی زیادہ نہیں اُلجھے۔ تاہم کہیں کہیں اپنی ظاہری "معصیت" ۔ جسے وہ اپنے زعم میں معنوی عصمت سے کم نہیں سمجھتے — کا ذکر بڑی شان سے کرتے ہیں ؎

ذکرِ خورشیدِ قیامت مُن کے واعظ کیا کہوں ✤ خیر اس تر دامنی کو روزِ محشر دیکھنا

حضرتِ اصغر ارشاد فرماتے ہیں ؎

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے ✤ سو راہِ طریقت کھُلی[1] اِک لغزشِ پا سے

رندانِ سیہ مست کی لغزش پا سے "طریقت" کی سو راہیں کیا ہزار راہیں کھُل سکتی ہیں مگر "طریقت" کے مسلّم معنی میں کچھ تغیّر کرنا پڑے گا۔ زاہد بیچارہ کیا جانے کہ رندی و کرامت لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اسرار و رموز تو ہمارے شعرائے

---

[1] سو راہ طریقت کھلی "صد راہِ طریقت کشود" کا لفظی ترجمہ ہے مگر اُردو زبان کے قاعدہ کے مطابق فاعل اگر بصیغۂ جمع ہو تو فعل بھی اسکی مطابقت میں بصورتِ جمع ہی آنا چاہیے۔ اس لئے "کھلی" جو صیغۂ واحد ہے اس محل پر قطعاً غلط ہے۔ فارسی میں اگر فاعل، اسمِ بے جان ہو تو جمع ہونیکے باوجود بھی اس کا فعل صیغۂ واحد ہی میں ہوگا۔ لیکن اُردو میں ایسا نہیں۔ (شادانی)

نوش ہی کو معلوم ہیں۔

حسرت ؎ جم چکا ہم پہ حال وقال کا رنگ ÷ شیخ بیکار ہائے و ہو نہ کرے

ظاہر ہے کہ جو شخص حال وقال کے تمام مدارج طے کرکے عرفانِ رندانہ کی انتہائی منزلوں تک پہونچ گیا ہو اُس پر شیخ بیچارے کی ہائے وہو کا کیا رنگ جم سکتا ہے۔

اصغر ؎ ابھی اک موج مے اٹھی تھی میخانہ میں اے واعظ ÷ ابھی اِک برق چمکی تھی مری وادیٔ ایمن میں

واعظ بیچارہ تو صرف حضرتِ موسیٰ والی وادیٔ ایمن کو جانتا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ میخانہ بھی وادیٔ ایمن اور موجِ شراب برقِ تجلی ہوسکتی ہے۔

جگر ؎ کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ ÷ میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

واعظ کی کتاب کیا ہوگی؟ قرآن مجید یا کوئی دوسرا صحیفۂ مذہبی۔ ظاہر ہے کہ جگر صاحب کے جامِ شراب میں جو تجلیاں رندانہ ہوتی نظر آئیں گی وہ اِن "پرانی" کتابوں میں کہاں۔ بیچارہ واعظ کس برتے پر اپنی "کتاب" کا جامِ شراب سے مقابلہ کرسکتا ہے۔ اور اگر کریگا تو مُنہ کی کھائیگا۔

جگر ؎ نہ پوچھی بات بھی اس شوخ کی کافرنگاہوں نے ÷ لئے بیٹھا رہا زاہد متاعِ دین وایماں کو

یہ زاہد کی انتہائی حماقت تھی جو متاعِ دین وایمان کو اس اُمید پر لئے بیٹھا رہا کہ "اُس شوخ کی کافرنگاہیں" ملتفت ہونگی اسلیئے کہ متاعِ دین وایمان سے ہی کیا بلا جو کوئی اس کی طرف اعتنا کرے۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ شوخ کافرنگاہ تھا کون؟ شاید خُدا؟ مگر نہیں۔ اسلیئے کہ خدا کے نزدیک اگر دین وایمان ایسی ہی بیقدر چیز ہوتے تو اتنے پیغمبر بھیجکر اتنے مذاہب کی تبلیغ کاہے کو کراتا۔ کیوں نہ اُسی شے کو لوگوں میں رواج دیتا جو اُس "کافرنگاہوں" کو محبوب ہوتی۔

اصغر ؎ زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا ÷ رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

حضرتِ اصغر کا موضوعِ سخن چونکہ "حقیقت" ہے اسلیئے اُن کے اشعار کو "مجازی" معنی پہنانا ان کے ساتھ حد درجہ بے انصافی کرنا ہے۔ رہ گئے "حقیقی" معنی تو اس کا سمجھنا زاہد کے بس کی بات نہیں۔ اسلیئے کہ استعارات کا حجاب اُٹھا لینے کے بعد بھی معنی پر تاریکی کے پردے پڑے ہی رہتے ہیں۔ "اصطلاحاتِ صوفیہ" میں "رخ" کے معنی "تجلیات" اور "زلف" کے معنی "موجودات" "وتعینات" کے لکھے ہیں۔ زلف کا رُخ پر بکھرنا گویا ذاتِ احدیت پر تعینات کے حجابوں کا حائل ہوجانا ہے اور یہی اصغر صاحب کا "حاصلِ ایمان" ہے۔ اس چیستان کا سمجھنا زاہد تو کیا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

ان بزرگوں کا ایک دلچسپ مفروضہ یہ بھی ہے کہ واعظین جو لوگوں کو ارتکابِ مناہی سے روکتے اور پاداشِ گناہ سے ڈراتے ہیں تو گویا وہ رحمتِ ایزدی کے منکر ہیں اسلیئے کہ رحمت تو بہرحال گنہگار ہی پر نازل ہوگی۔ انسان اگر مرتکبِ عصیان نہ ہو تو خُدا کو اپنی رحمت کے صرف کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ اس طرح ارتکابِ معصیت گویا خدا پر ایک طرح کا احسان ہے۔ حقیقتاً یہ ایک زبردست مغالطہ ہے اور انتہائے تنگ نظری کی دلیل ہے۔ دراصل ہمارے شعرا کا منشا کسی حقیقت کا بے نقاب کرنا یا کسی واقعۂ نفس الامری کو پیش کرنا ہرگز نہیں ہوتا۔ نہ وہ کبھی ایسی گہری باتوں پر غور وفکر

کرنے میں اپنا وقتِ عزیز "ضائع" کرتے ہیں۔ وہ تو صرف وہی کہتے ہیں جو اُن کے پیشرو کہہ گئے ہیں۔ اس سے انہیں بحث نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ کوئی دانش و حکمت کی بات ہے یا محض لایعنی خرافات۔ وہ اس مسئلہ میں "نقل را چہ عقل" کے اصول پر کاربند ہیں اور بس۔ کاش وہ اتنا سوچتے کہ واعظ جو کام کر رہا ہے وہ خود اُس کی ایجاد نہیں۔ یہی کام تمام ادیان و مذاہب کے بانیوں نے بھی کیا ہے اور واعظوں سے ہزار درجہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ کیا ہے۔ تو کیا وہ سب کے سب رحمتِ ایزدی کے منکر تھے؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ انسان کو اگر معصیت سے روکا جائیگا تو رحمتِ خداوندی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان کو ارتکابِ گناہ پر ٹوکا جائے تو وہ گناہ نہ کرے گا۔ انسان بہرحال انسان ہے فرشتہ نہیں۔ از روئے خلقت معصوم نہیں۔ خطا اس کی فطرت ہے۔ اُسے عذاب سے ڈراؤ یا بہشت کا لالچ دو، معصیت سے باز رکھنے کی جو تدبیر بھی ممکن ہو عمل میں لاؤ مگر وہ گناہ کریگا اور ضرور کریگا۔ پھر رحمتِ الٰہی کے معطل ہو جانے کا اندیشہ کیسا۔ بات صرف اتنی ہے کہ "رندوں" کو اپنی سیاہ کاریوں پر ملامتِ خلق سے بچنے کے لئے کسی پناہ کی ضرورت تھی اسلئے جوازِ معصیت کی یہ "معقول" دلیل پیدا کی گئی۔ مگر اس کے موجد ہمارے شعرا نہیں۔ یہ تو بہت پُرانی بات ہے۔ ہمارے شعرا نے تو اپنے شاعرانہ اصول کے مطابق محض تقلید بلکہ نقالی پر اکتفا کی ہے۔ دیکھئے حضرتِ اصغر اس میدان میں کس شان سے وارد ہوئے ہیں ؎

کیا کرے زاہد بیچارہ اُسے کیا معلوم ٭ رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوئی

حضرتِ اصغر کے مُریدِ خاص جنابِ جگر بھی اپنے مرشد کے قدم بقدم چلے ہیں ؎

مجھکو مرے عصیاں سے کیا خاک ڈرائے گا ٭ زاہد وہی زاہد جو رحمت سے گریزاں ہے

زاہد کیلئے "خشک" ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ عشق کی رنگینیوں سے محروم ہے اسلئے وہ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

حسرت ؎ پیرو عشق رہنما نہ ہوا ٭ زاہدِ خشک با خدا نہ ہوا

جگر ؎ کعبۂ دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں ٭ باندھکر شیخ کہاں جامۂ احرام چلے

اصغر ؎ نہ ہوگا ہستیِ بے مدعا کا رازداں برسوں ٭ وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

"ہستیِ بے مدعا" ماشاءاللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ حکمت و فلسفہ سب اسکے آگے چیں بول جائے۔ دانایانِ روزگار جنہیں حضرتِ اصغر کے کلام کی روشنی میں عقل و دانش سے یکسر بے بہرہ سمجھنا چاہیئے۔ آج تک اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی ہستی کا ایک مقصد و منشا ہے اور وہ مقصد و منشا بہت عالی ہے۔ "بے مدعا" صرف وہ ہستی ہو سکتی ہے جس کا وجود محض بیکار ہو۔ سو ایسی ہستی ایک انسان کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر حضرتِ اصغر چونکہ سطحِ انسانی سے الگ ہو کر شعر کہتے ہیں اس لئے اُن کے بیان کئے ہوئے "نکات" کا سمجھنا ایک انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور زاہد بیچارہ بھی چونکہ آدمی ہی ہے اسلئے حضرتِ اصغر نے واقعی بجا فرمایا کہ وہ ہستیِ بے مدعا کا رازداں نہیں ہو سکتا مگر مصرعِ اولیٰ میں ردیف (برسوں) سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ شاید دس پانچ برس حضرتِ اصغر سے درسِ معرفت لینے کے بعد اس سمجھ میں نہ آنے والے معمہ کو سمجھ جائیگا۔

حضراتِ شعرا اپنی عالی ظرفی کی بنا پر بیچارے زاہد و واعظ پر ترس کھا کر اُسے بھی میخواری کی دعوت دیتے ہیں۔ زاہد بیچارہ محفلِ رنداں میں آتا ہے اور "سفینۂ مینا" میں "برقِ سینا" کو تڑپتے دیکھ کر اُس کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ وہ ہچکچاتا ہے۔ رندانِ مے آشام طرح طرح سے اس کی ہمت بندھاتے ہیں مگر وہ کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ حیلے حوالے کرتا ہے۔ مگر کون سنتا ہے۔ آخر زبردستی اُسے پلائی جاتی ہے اور جب اُس کے مُنہ کو مزہ لگ جاتا ہے تو ہزار جان سے اس انگوری بیٹی پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی "ظاہری مصلحت" کی بنا پر اس کی ہجو کرتا ہے۔ مگر پیتا ہے اور دھوم سے پیتا ہے یہاں تک کہ میخانے کی کنجی ہر وقت اپنی دستار میں لٹکائے پھرتا ہے کہ جب جی چاہے میخانہ کا تالا کھولے اور دو چار جام چڑھائے۔ یہ داستان رنگین ہمارے شعرائے رسم پرست نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی۔ یہاں اُس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

دعوت و ترغیب۔ ؎

حسرت ؎ واعظو منہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی ؛ مے رنگیں کا جو ساغر سے چھلکنا دیکھو
جگر ؎ بزمِ ساقی میں ذرا دیکھ تو چل کر زاہد ؛ کیا بہاریں ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
حسرت ؎ بزمِ ساقی میں چلیں بھی تو کہیں حضرتِ شیخ ؛ شرط ہم کرتے ہیں رہ جائے جو ایمان کا ہوش

حضرتِ زاہد کے میخانہ میں پہونچنے کے بعد ؎

جگر ؎ دم بخود ہیں حضرتِ زاہد یہیں تک دیکھ کر ؛ ہوش اُڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے
اصغر ؎ میخانے کی یہ صحبت اے شیخ غنیمت ہے ؛ لے کچھ لبِ ساغر سے، کچھ سینۂ مینا سے
جگر ؎ پی بھی جا زاہد خُدا کا نام لے کر پی بھی جا ؛ بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے
حسرت ؎ نہ کر بزمِ ساقی میں انکار واعظ ؛ بگڑ جائینگے رندِ میخوار واعظ
جگر ؎ یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد ؛ یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

میخانے کا آخری سین۔

حسرت ؎ رندوں نے پچھاڑ کر پلادی ؛ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

دوسرا دور۔

حسرت ؎ شوق ہی دل میں لب پہ ہجوِ شراب ؛ ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ
جگر ؎ کھل گیا آج تجھے دیکھ کے بیخودِ دمِ کیف ؛ زاہدِ خشک کو سمجھا تھا میں نا محرمِ کیف
حسرت ؎ ہے کلیدِ درِ میخانہ مقرر اے شیخ ؛ وہ جو پنہاں ہے ترے گوشۂ دستار کے پاس
جگر ؎ ہو گیا کیا مریدِ مے زاہد ؛ اب تو چہرہ پہ نور رہتا ہے

غرض جس طرح کبوتر اور بلّی میں قدرتی دشمنی ہے[1] اسی طرح ہمارے شاعر اور زاہد میں بیر ہے۔ اور لطف یہ کہ نہ وہ

[1] سخت حیرت ہو کہ بنگال میں، کم سے کم ڈھاکہ میں، بلّیاں خانگی پرندوں مثلاً کبوتر، مُرغی، مینا وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کرتیں (شادانی)

خود رند ہے نہ اُسے محتسب اور زاہد و واعظ سے کوئی سروکار مگر رسمی شاعری کے طفیل اُسے یہ سوانگ بھرنا پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرائے چند شعر اور سُن لیجئے اور ان کی "صنّاعانہ" نقالی کی داد دے لیجئے۔

جگر ؎ عزت کرے تجھکو زاہد، تیری دُنیا کو خراب ✽ کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

اصغر ؎ زاہد سادہ لوح کو وہم تھا اشتباہ کا ✽ مصحفِ رُخ سے حل ہوا مسئلہ جوازِ عشق

حسرت ؎ لیگیا ہے کوئی پگڑی جو اُڑا کر حسرت ✽ مجھ گنہگار پہ ہے شُبہ گمانِ واعظ

جگر ؎ اِک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں ✽ مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں

اصغر ؎ نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں ✽ ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

افسوس ہے کہ حضرت اصغر کی زندگی میں کسی نے اس شعر کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ ہندوستان کے حاجیوں کو بڑی سہولت رہتی۔ حضرتِ اصغر کے بنائے ہوئے کعبوں ہی سے کام چل جایا کرتا۔ مکہ معظمہ جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ نہ کچھ خرچ ہوتا نہ صعوباتِ سفر سے دوچار ہونا پڑتا۔ مگر اب کون بتائے کہ حضرتِ اصغر کے وہ خانہ ساز کعبے کہاں کہاں واقع ہیں۔ شاید فراق صاحب رہنمائی کر سکیں۔

حسرت ؎ فصلِ گل میں پڑیں تو خوب کھلیں ✽ خرقۂ زہد پر شراب کے رنگ

جگر ؎ زاہد مسجد نشیں ہیں اور اک ٹوٹا سا ظرف ✽ میکدہ میں اہتمامِ جام و ساغر دیکھتے

ہمارے شعرا نے زاہد، واعظ، محتسب اور شیخ کی جو دُرگت بنائی ہے وہ تو آپ نے دیکھ لی۔ اب حضرتِ ناصح باقی ہیں۔ بر بنائے رسمِ زمانہ شاعر صاحب چونکہ عاشق بھی ضرور ہوتے ہیں اس لئے ان کو سمجھانے، بہلانے اور مشورہ دینے کے لئے ایک ناصح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا جس طرح روشنی میں ہر مادّی جسم کا سایہ لازمی ہے اسی طرح عالمِ عاشقی میں شاعر صاحب کے لئے ناصح کا وجود ناگزیر ہے۔ ناصح جہاں ہمدرد اور دلسوز ہوتا ہے وہاں اس کا نادان ہونا بھی ضروری ہے اور ناصح کے اِن صفات کے متعلق تمام شعرائے مجتہدین و مقلدین متفق الرائے ہیں مگر ہمارا موضوعِ بحث چونکہ شعرائے مقلدین ہیں لہذا ہم صرف اُنہیں کے کلام سے چند مثالیں اپنے بیان کی تائید میں پیش کریں گے۔

فانی ؎ چارہ گر، ناصحِ مشفق، دلِ بیصبر و قرار ✽ جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

جگر ؎ ہر قدم پر ناصحِ مشفق کی دلسوزی نہ پوچھ ✽ آدمی اچھا ہے لیکن اِک ذرا دیوانہ ہے

اصغر ؎ ناصحِ مشفق مگر یونہی تڑپنے دے مجھے ✽ مجھکو بھی معلوم ہے سود و زیانِ اضطراب

جگر ؎ جا بھی اے ناصح کہاں کا سود اور کیسا زیاں ✽ عشق نے سمجھا دیا ہے عشق کا حاصل مجھے

اصغر ؎ مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح ✽ بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

یہ ہیں ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کی جدّت طرازیاں۔ یہ ہے اُن کا انفرادی رنگ۔ اسی کی بنا پر فراق صاحب کا دعویٰ ہے

کہ اُردو غزل گوئی لکھنؤ اور دلّی کی تاریک گلیوں سے نکل کر ..... نئی آواز سے نغمہ سرا ہوتی ہے" ہمیں یقین ہے کہ اگر جناب فراق غزل گوئی کی حمایت میں اپنا مقالہ سپردِ قلم کرنے سے پیشتر اصغر، جگر، فانی اور حسرت کے دیوانوں کا مطالعہ کر لیتے تو انہیں اپنی اکثر رایوں کی غلطی اور اپنے بیشتر دعووں کی بے اساسی کا علم ہوجاتا اور جو نو واقف لوگ اُن کا مقالہ پڑھکر غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہیں اُن کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری بھی موصوف پر عاید نہ ہوتی۔

جفائے محبوب

مضامین مسودہ کی پانچویں سُرخی "جفائے محبوب" ہے "پیکان وتیر، خنجر وشمشیر اور قتل وخون" کے سلسلہ میں اس موضوع پر کافی بحث ہوچکی ہے لیکن یہ عنوان خصوصیت کے ساتھ اس لئے علیحدہ قائم کیا گیا ہے کہ "بادشاہِ متغزلین" نے اس موضوع پر بہت کچھ زورِ طبع صرف کیا ہے اور دل کھول کر نقالی اور رسم پرستی کی داد دی ہے۔ اُن کے دوسرے معاصرین یعنی اصغر، جگر اور فانی اس میدان میں اُن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے ساقی میں میں نے اپنے مضمون "ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر" میں ایرانی شاعر کے معشوق کی بیوفائی اور ستمرانی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس محل پر اُن کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہمارے شعرا کی "نقالی" پر کافی روشنی پڑتی ہے:۔

"ہر ایرانی شاعر کے محبوب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بے انتہا ظالم اور بے وفا ہے۔ اس کی تمام عنایتیں رقیبوں کے لئے وقف ہیں۔ عاشق اُس کے لُطف وکرم سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ اسکے اخلاق حد درجہ پست اور اطوار بالکل غیر شریفانہ ہیں۔ میں مدّتوں حیران رہا کہ یہ صفاتِ رذیلہ ایران کے حسینوں کے لئے کیوں مخصوص ہیں۔ میں نے بارہا اسپر غور کیا کہ ایران کے ہزاروں شاعروں میں سے جن کا کلام ہم تک پہونچا ہے کیا کوئی ایک بھی ایسا خوش قسمت نہ تھا کہ اُسے باوفا محبوب ملتا۔ آخر محبّت تو دونوں ہی جانب سے ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اصطلاحاً مرد کو عاشق اور عورت کو محبوب (معشوق) قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ ایران میں کبھی کسی محبوب کو اپنے چاہنے والے سے محبّت نہیں ہوئی۔ آخر بہت غور وفکر کے بعد یہ نکتہ سمجھ میں آگیا کہ ایرانی شاعر کے معشوق کی "بیوفائی" اور "ستمرانی" بالکل فطری ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک امرد کا حُسن شاعر کی فریفتگی کا باعث تو ہوسکتا ہو لیکن خود شاعر میں وہ صفاتِ سادہ روئی کہاں کہ اس کے محبوب کے جذباتِ محبّت کو برانگیختہ کرسکیں۔ اس لئے چاہت یکطرفہ رہتی ہے اور محبّت کا جواب محبت سے نہیں ملتا بلکہ نہیں مل سکتا۔ اسی کا نام شاعروں نے محبوب کی بیوفائی اور ایذا رسانی رکھا ہے۔"

اس بیان سے ایرانی شاعر کے محبوب کی جفاشعاری کا سبب تو واضح ہوگیا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُردو شاعری میں جفائے محبوب کے اسباب وہی ہیں جو ایرانی شاعری کے سلسلہ میں ابھی مذکور ہوئے۔ اسلئے کہ شعرائے اُردو میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جنہیں امرد پرستی سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ پھر بھی جفائے محبوب کا رونا سبھی

نے رویا ہے، درحقیقت اُن چند افراد کو چھوڑ کر جنہوں نے آپ بیتی بیان کی ہے باقی سب نے محض رسم و تقلید کی بنا پر اِن مضامین کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُردو کا ہر شاعر بلا استثنا محبوب کی بے وفائی اور جفاشعاری کا قائل ہے۔ نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو تقلید کی شاہِ عام کو چھوڑ کر بیانِ واقع کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں چنانچہ کوئی دلسوختہ حرماں نصیب کہتا ہے ؎

رات اِک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے ٭ دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

کسی اور مجبورِ اُلفت کا ایک شعر ہے ؎

حُسن سے سب کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں ٭ یاں یہ رونا ہے کہ مجبور ہے مختار نہیں

مگر اس قسم کے کہنے والے "الشاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔ شاعرانہ رسم پرستی کے جتنے نمونے اب تک ہم نے پیش کئے یوں تو وہ سبھی "دفترِ بے معنی" کہلانے اور "غرقِ مے ناب" بلکہ نذرِ آتش کئے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن جفائے محبوب کے سلسلہ میں ہمارے چوٹی کے غزل گو شعرا نے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اب ہم "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں اُن مخصوص صفات کا ذکر کیا گیا ہے جو شاعر کے محبوب کے لئے لازمی ہیں مثلاً وہ بانیِ جور و جفا ہے۔ بدخو اور ستمگر ہے۔ وفادشمن اور عیار ہے۔ جفاکار اور خودبیں ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا کچھ نہیں ہے ؎

کیا کیا تو نے یہ حسرت کہ دل اپنا چھوڑا ٭ ایسے عیار، ستمگار، جفاکار کے پاس
یہ بھی کیا انصاف ہے اے دشمنِ اہلِ وفا ٭ ہم رہیں ناکام یوں اور کام ہو حُسّاد کا
آرزو لازم ہے وجہِ آرزو ہو یا نہ ہو ٭ التفات اس کا فرِ خودبیں کی خو ہو یا نہ ہو

نہ سمجھا بانیِ جور و جفا اس شوخ کو کوئی ٭ کہ ہم نے جس کو پایا شکوہ سنجِ آسماں پایا
وصل اُس بُتِ بدخو کا میسر نہیں ہوتا ٭ وابستۂ تقدیر ہے تدبیر ابھی تک

مشقِ جفا کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے ایک نہایت دلچسپ صورت یہ بھی ہے کہ عاشق صاحب کے زخموں پر نمک پاشی کی جائے عشقِ کامل کا کرشمہ یہاں نظر آتا ہے کہ یہ نمک پاشی باعثِ آزار ہونے کے بجائے عاشق صاحب کے لئے موجبِ تسکین و لذت ہوتی ہے۔ حسرت ؎

قیامت کا تعلق ہے قیامت کی محبت ہے ٭ مرے زخموں کی گویا جان ہے اُسکے نمکداں میں

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آزار سے لذت گیری محض ایک عارضی کیفیت تھی اور جلد ہی آزار درحقیقت آزار ثابت ہوا چنانچہ اُس کی برداشت نہ لاکر حضرت مولانا صاحب نے دبی زبان سے شکایت شروع کردی ؎

ہم بندگانِ درد پہ عشقِ جفا ہے کیا ٭ دلجوئی وفا کا یہی مقتضا ہے کیا

اور جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو ایک نہایت لطیف پیرائے میں اُسے جتا دیا کہ اگر تم جفا سے باز نہ آؤ گے تو پھر

ہم بھی عاشقی سے استعفا دیدینگے۔ اور اس کے ذمہ دار خود تم ہوگے ؎

اے ستمگر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں ٭ میں کروں لیکن کبھی ایسا تو کیا بیجا کروں

غرض شکوہ و شکایت کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس "دشمنِ وفا" کو یہ بات ناگوار گذرنے لگی اور اُس نے تنگ آکر مولنٰنا صاحب سے کہدیا کہ مولانا آپ کی روز روز کی گلہ سنجیوں سے دل پک گیا۔ خدا کے لئے اب بس کیجئے۔ یہ سُنکر مولانا نے فوراً یہ عادلانہ تجویز پیش کردی ؎

ستم تم چھوڑدو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری ٭ کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری

مگر بھلا وہ کب کسی کی سُنتا ہے۔ ادھر مولانا کی قوتِ برداشت بھی قریب قریب سلب ہوچکی تھی اسلئے جی کڑا کرکے کنایتاً ترکِ محبت کی دھمکی دیدی کہ ؎

نہ کر اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دُنیا سے ٭ مبادا یکقلم اُٹھ جائے تہذیبِ وفاداری

مگر جب دیکھا کہ وہ "بانیٔ جور و جفا" محض کودن ہے اور لطیف کنایوں کو نہیں سمجھتا تو ناچار صاف صاف کہنا پڑا کہ ؎

وفا سے دشمنی رکھکر مرے دل کی خریداری ٭ بہت مشکل ہے اس جنسِ گرامی کی خریداری

جی ہاں، یہ عاشق کا دل ہے محض پارۂ گوشت نہیں۔ آپ حسین ہیں تو ہوا کریں مگر مہر و وفا قیمت میں دئے بغیر اس جنسِ گرانبہا کی خریداری ناممکن ہے۔ مگر وہ "عیار" مولانا کی اِن گیدڑ بھبکیوں میں کب آتا ہے۔ نہ جانے اِن جیسے کتنوں کو تگنی کا ناچ نچا چکا ہے کچھ ایسے تیور بدلے اور اس انداز سے مولانا کو ڈانٹا کہ بیچارے سہم کر رہ گئے اور چُپکے چُپکے خُدا سے دُعا کرنے لگے کہ پروردگارا! یا تو اس کے دل میں رحم ڈالدے یا پھر میرے دل سے اس کی محبت نکال دے ؎

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب ٭ نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کردے

مولنٰنا کی یہ بیکسانہ حالت دیکھکر اس کا تاؤ ذرا ٹھنڈا پڑا۔ پھر بھی یہ حکم دے دیا کہ خبردار، خبردار، آج سے ہمیں ستمکار نہ کہنا۔ نہ ہمارے جور و جفا کا شکوہ زبان پر لانا۔ یہ مانا کہ ہم ایسے ہی ہیں مگر تمہیں حق نہیں کہ ہمیں ایسا کہو ؎

خود ہے اقرار اُنہیں اپنی ستمگاری کا ٭ پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

ایسی صورت میں صبر کے سوا مولنٰنا کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ وہی مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اُس سے تو خدا ہی باخبر تھا مگر بربنائے مصلحت اس جفا کار کو خوش کرنے کے لئے نہایت نیازمندانہ انداز سے یہ عرض کیا کہ ؎

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی ٭ مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

مثل مشہور ہے کہ ؎ جو خوشامد کرے خلق اُس سے خُدا راضی ہے ٭ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خُدا راضی ہے۔ اُسپر بھی مولنٰنا کی اس "نیازمندی" کا بہت اثر ہوا اور غصہ مہربانی سے بدل گیا۔ مولانا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فی الفور کہا ؎

کچھ غیر نہیں ہم کہ بگڑ جائیں وفا سے ٭ اظہارِ مراعات کی حاجت نہیں ہم کو

جور و ستم کی یہ بے پایاں داستان کہاں تک بیان کی جائے۔ اب ہم محبوبِ حسرت کی ایک مخصوص عادت بیان کرکے دوسری

"اساتذہ" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اشعار بالا سے یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کافر بدخو جور و ستم کا بادشاہ ہے مگر یہ جان کر آپکو بے انتہا افسوس ہوگا کہ وہ بدخو ہونے کے ساتھ ساتھ بدلگام اور بدزبان بھی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا بھولا بھالا اور سیدھا سادہ ہے مگر جب تنہائی میں ملاقات ہوتی ہے تو مولانا کو ایسی فحش گالیاں سناتا ہے کہ خدا کی پناہ ؎

مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجئے گالیاں ؛ اور بزمِ غیر میں جانِ حیا بن جائیے

یوں تو ہر شاعر کا محبوب جفا کار ہوتا ہے لیکن حضرتِ فانیؔ کے معشوق نے انتہا کر دی۔ کمبخت نے مَنّت کے طوق پہنے تھے تاکہ فانیؔ صاحب سچ مچ آنجہانی ہو جائیں۔ مَنّت آخر پوری ہو کر رہی اور حضرتِ فانیؔ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ محبت اسے کہتے ہیں، اور وفاداری اس کا نام ہے کہ مرنے کے بعد بھی محبوب کے آرام و راحت کا خیال ہے چنانچہ فانیؔ صاحب نے مرنے کے بعد بزورِ کرامت شاعرانہ جب یہ دیکھا کہ اُس ظالم نے اب تک مَنّت کے طوق نہیں اُتارے اور اُن کے بوجھ سے گردن دبی جاتی ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے تو قبرستان کے مجاور کی معرفت کہلا بھیجا کہ ؎

طوقِ مَنّت کے بڑھا، ہوگئی مَنّت پوری ؛ بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

فانیؔ صاحب رعایتِ لفظی کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہاں بھی ماشاءاللہ طوق کے ساتھ بیڑیاں موجود ہیں۔ رقیب نوازی ہر شاعر کے محبوب کی ایک ممتاز صفت ہے اسلیئے اگر فانیؔ صاحب کا معشوق بھی اس سے متصف ہے تو کچھ جائے شکایت نہیں ؎

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز ؛ دل ستم دوست، وہ رقیب نواز

ہاں شاعر کی یہ صفت البتہ قابلِ داد ہے کہ مرتے مرجاتا ہے مگر دامنِ وفا کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ فانیؔ ؎

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر ؛ تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فنا ہوجا

حسبِ دستور جگر صاحب کو بھی ایک "جور و جفا کے مالک" سے سابقہ پڑا ہے۔ چند کلمے اُن کی داستانِ درد کے بھی سُن لیجئے ؎

میں خوگرِ ستم ہوں، پروردۂ الم ہوں ؛ جور و جفا کے مالک مہر و وفا نہ کرنا

نگاہِ قہر پر بھی جان و دل سب کھوئے بیٹھا ہے ؛ نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہوتی تو کیا ہوتا[1]

شوخِ گستاخ کا چہرہ پہ اثر دیکھ نہ لے ؛ ڈر رہا ہوں کہ وہ سفاک دہر دیکھ نہ لے

ایسے "سفاک" سے ڈرنا ہی چاہیئے۔ ذرا میں چھری بھونک دے تو کوئی اسکا کیا کرلے۔ ؎

شیشۂ دل وہ ہستیٔ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا ؛ اسپہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہیئے

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم ؛ پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

---

[1] جب اتنی بیوفائی پر دل اُسکو پیار کرتا ہے ؛ الہی وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا۔ آغا حشر کاشمیری مرحوم۔

خُدا ایسے بیدرد سے دوست دشمن سب کو بچائے۔ ایک بیچارہ ہو کہ بلک بلک کر رو رہا ہے اور اس سنگدل کے بھاویں ہی نہیں۔

مضامین فرسودہ کی فہرست میں چھٹا نمبر "تصوف و فلسفہ" کا ہو اور ترتیب کے لحاظ سے پہلے اسی موضوع پر بحث ہونی چاہیئے مگر ہم نے بعض مصالح کی بنا پر اس موضوع کو چوتھی قسط کے لئے اُٹھا رکھا ہو۔

اشکِ خونیں

رسم پرستی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ انسان لمحہ بھر کیلئے اسپر غور نہیں کرتا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا کہہ رہا ہوں آخر اس کا مطلب و منشا کیا ہے۔ اصل و حقیقت کیا ہو۔ حاصل و نتیجہ کیا ہے۔ اس قسم کی بے معنی نقالی کا بہترین نمونہ ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کے وہ اشعار ہیں۔ جنمیں اشکہائے خونیں کا ذکر ہے۔ چہرۂ محبوب کیلئے غازہ کا استعمال اسی حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے کہ حُسن کو نکھار کر چمکا دے۔ نہ اتنا کہ اصلی رنگ کو دبا دے۔ اگر اعتدال کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ آرائش رغبت کے بجائے کراہت بلکہ بعض اوقات نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال تشبیہ و استعارہ اور مبالغہ کا ہے لعبتانِ خیال کو زیادہ جاذبِ توجہ اور دلربا بنانے کے لئے ان زیوروں سے آراستہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس کی ایک انتہا ہونی چاہیئے۔ اشعار میں جذبات انگیز مضمون کیلئے ضروری ہو کہ اس کی بنیاد کسی نہ کسی حد تک اصلیت پر قائم ہو ورنہ سُننے والے پر اُس سے کسی قسم کا اثر مترتب ہونا غیر ممکن ہو مگر ہمارے شعرا جو اپنے پیشروؤں کی کورانہ تقلید کے شیدائی اور سنتِ جاریہ کے شدّت سے پابند ہیں کبھی اس حقیقت کی طرف اعتنا نہیں کرتے۔

انسان جب کسی روحانی یا جسمانی رنج و تکلیف کی برداشت نہیں لا سکتا تو بے اختیار اُس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ رونے سے اضطرابِ قلب کو نہ تسکین پاتا ہے اور غم کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس سے شاعروں نے یہ مضمون پیدا کیا۔ یعنی کہ دل کا خون ہو جاتا ہے تب آنسو نکلتا ہو۔ دل کے خون ہو جانے سے دل کا حد درجہ تکلیف پانا مراد ہے۔ یہ نہیں کہ دل فی الواقع خون کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت و رعایت سے، جب شدّتِ غم کا اظہار مقصود ہوا تو آنسوؤں کو اشکِ خونیں اور گریۂ خونیں سے تعبیر کرنے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آنسوؤں میں سچ مچ خون کی سُرخی موجود ہوتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ لے یہاں تک بڑھی کہ آنسوؤں کی سُرخی ایک مسلمہ حقیقت ہو گئی۔ نہ صرف اسقدر بلکہ آنسوؤں کو عینِ خون تسلیم کر لیا گیا۔ لہذا خون کی جو ایک مخصوص صفت ہو یعنی سُرخی و رنگینی وہ آنسوؤں کیلئے بھی ثابت ہو گئی۔ اور جس طرح خون کے چھینٹوں یا قطروں سے کپڑے یا دوسری چیزوں پر سُرخ دھبے پڑ جاتے ہیں اُسی طرح آنسوؤں سے بھی چہرہ، رومال، آستین اور دامن رنگین ہونے لگے۔ قطراتِ سرشک کہیں لالہ و گل کو شرماتے ہیں۔ کہیں دامنِ کہسار میں آگ لگاتے ہیں۔ کہیں شفق اور بہار کی رنگینیاں دکھاتے ہیں۔ وہی قطراتِ سرشک جن کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر صاف ہوں تو کپڑے پر گر کر خشک ہو جاتے ہیں اور کوئی نشان باقی نہیں رہتا اور اگر

آنکھوں کا کیچل بھی اُن میں شامل ہو تو صاف کپڑے پر میلے میلے دھبے ڈال دیتے ہیں۔ خدارا انصاف! اِن مَیل کے دھبوں کو لالہ و گل سے تشبیہہ دینا کہاں کی خوش مذاقی ہے۔ کب تک یہ کورانہ تقلید کا جُوا اُردو غزل کے کاندھے پر سوار رہے گا۔

جناب اصغرؔ کا ایک شعر ہے ؎

روانی رنگ لائی دیدۂ خونابہ افشاں کی ✣ اُتر آئی ہے اِک تصویر دامن پر گلستاں کی

"نشاطِ روح" کے مقدمہ میں مرزا احسان احمد صاحب اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "غور کرو کس قدر رنگین پیرایۂ بیان ہے"۔ مرزا صاحب کے یہ الفاظ پڑھکر بیساختہ ایک حکایت یاد آگئی ؎

"ایک نواب صاحب نے مرتے وقت اپنے فرزند ارجمند کو وصیت کی کہ بیٹا ہماری وفات کے بعد اگر ہمارے احباب میں سے کوئی تم سے ملنے کیلئے آئے تو اُسکے ساتھ بہت عزّت و احترام سے پیش آنا۔ اونچی جگہ پر بٹھانا اور نہایت نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ میں باندھی اور مرحوم کی رحلت کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ جلد سے جلد ایک بلند مینار تیار کرایا۔ حُسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق، مینار کی تعمیر کے چندہی روز بعد نواب صاحب مرحوم کے ایک بُوڑھے دوست صاحبزادے صاحب سے ملنے آئے۔ صاحبزادے صاحب کی ہدایت کے بموجب نوکروں نے بڑے میاں کو مینار کی آخری منزل پر پہونچادیا۔ کمزور، سن رسیدہ آدمی چڑھتے چڑھتے بیچارے کا دم پھُول گیا۔ آخری سیڑھی پر پہونچکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں صاحبزادے صاحب بھی تشریف لے آئے اور دُور سے دیکھکر تعظیم بجالائے۔ بڑے میاں نے کہا "کہو بیٹا، اچھے تو ہو" صاحبزادے نے جواب میں فرمایا "رُوئی" بڑے میاں نے متعجب ہوکر پھر خیریت دریافت کی۔ صاحبزادے صاحب نے کہا "ریشم۔ موم۔ پروں کا تکیہ"۔ بڑے میاں سخت حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ آخر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ میں رُوئی، ریشم، پروں کے تکیہ کا حال نہیں پوچھتا میں تم لوگوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ صاحبزادے صاحب نہایت مودبانہ انداز میں بولے "گڑ، شکر، قند، مصری"۔ یہ الفاظ سُنکر بڑے میاں کو ضبط کی تاب نہ رہی۔ جھلّا کر مینار سے نیچے اُتر آئے اور نہایت درشت لہجہ میں صاحبزادہ صاحب سے مخاطب ہوکر بولے کہ "ابے احمق! کچھ دیوانہ ہوگیا ہے۔ پہلے تو مجھ بُڑھے کو چار منزل اوپر چڑھادیا۔ اور حال پوچھتا ہوں تو رُوئی، ریشم اور گُڑ شکر خدا جانے کیا کیا خرافات بکتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے انتہائے عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ چچاجان گستاخی معاف، میں نہ احمق ہوں نہ دیوانہ۔ میں نے جو کچھ کیا وہ ابّاجان مرحوم کے ارشاد کی تعمیل تھی اور بس۔ مرحوم نے مرتے وقت فرمایا تھا کہ ہمارے دوستوں کو اونچی جگہ پر بٹھانا اور نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ اسی لئے میں نے یہ مینار بنوایا ہے کہ اس سے اونچی جگہ یہاں اور کوئی نہیں ہے اور میرا خیال تھا کہ دُنیا میں سب سے زیادہ نرم چیزیں رُوئی، ریشم اور موم ہیں اور اسی طرح سب سے زیادہ میٹھی چیزیں شکر، قند، اور مصری ہیں، اس سے زیادہ نرم اور میٹھی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ خفا ہوگئے۔ بڑے میاں یہ جواب سُنکر بھونچکا رہ گئے"۔

اگر رُوئی ریشم اور قند و شکر کے معنی نرم و شیریں گفتار کے ہوسکتے ہیں تو یقیناً اصغرؔ کا شعر بھی رنگینیوں سے معمور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ اشک بیچارے میں پہلے رنگ تو ثابت کر لیجئے اسکے بعد دامن پر گلستاں کی تصویر اُتار دیجئے گا۔ رنگین اشعار کا یہ مطلب ہے کہ انہیں پڑھکر یا سُنکر بہار کی رنگینیاں آنکھوں میں چھا جائیں۔ رنگین صحبتیں یاد آجائیں۔

رنگین نغمے کانوں میں گونجنے لگیں۔ تصوّر میں رنگینیوں کی ایک دُنیا آباد ہو جائے۔ حُسن کی بجلیاں چمکیں، بادۂ گلرنگ کے ساغر چھلکیں۔ فضا رنگ و بو سے یکسر معمور ہو جائے اور ناظرِ خیال اُسی میں کھو جائے۔ یہ نہیں کہ شعر میں رنگ کا لفظ آگیا اور شعر رنگین ہو گیا۔ اگر اسی کا نام رنگینی ہے تو بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہو کہ "خالق باری" کا یہ شعر ؎

نیلا، پیلا، زرد، کبود ٭ تانا، بانا، تنست و پود

دُنیا کے ہر شعر سے زیادہ رنگین ہے۔ "اشک خونین" کے متعلق اب اپنے چوٹی کے غزلگویوں کے چند شعر سن لیجئے ؎

فانیؔ ؎ بدلا ہوا ہو آج مرے آنسوؤں کا رنگ ٭ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

ماشا اللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ دل کا زخم اور پھر اس کا رفو۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے طبّی دُنیا ابد تک ہمارے شعرا کی ممنون رہے گی۔ کس قدر غلط خیال ہے کہ جملہ تحقیقاتِ علمیہ کے لئے ہمیں دورِ جدید اور یورپ و امریکہ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کوئی بتائے کہ بیسویں صدی میں دل کے زخم میں ٹانکے لگانا یورپ یا امریکہ کے کس ڈاکٹر کو نصیب ہوا۔ مگر شعرا کے یہاں یہ ایک پُرانی چیز ہے۔ ہاں تو فانیؔ صاحب کے دل کے زخم کا ایک ٹانکا ٹوٹ گیا۔ اس سے خون بہ نکلا۔ آنسوؤں کا منبع چونکہ دل ہے اسلئے اشکوں میں اس خون کی آمیزش ہو گئی اور آنسوؤں کا رنگ عُنابی ہو گیا۔ اِسے کہتے ہیں پروازِ تخیل یا بالفاظِ دیگر دُور کی کوڑی لانا۔ اشکوں کی مفروضہ سُرخی کا ماشا اللہ کہاں سے تار نکالا ہے ؎

فانیؔ ؎ فرقت میں تارِ اشک ہی ہر تارِ آستیں ٭ ہر داغِ خون ہے دیدۂ خونبارِ آستین

اصغرؔ ؎ اشکِ خونین ہے کہیں نالۂ رنگین ہے کہیں ٭ ہر قفس میں اُتر آتا ہے گلستاں کوئی

نالۂ رنگین سے تو خیر کیا مگر اشک خونین سے ضرور قفس میں گلستاں اُتر آتا ہوگا۔ اشکِ خونین کے فرضی رنگ سے گلستاں کی تصویریں بنانے کا اصغرؔ صاحب کو بہت شوق ہے۔ مگر اِن تصویروں کی حقیقت اُس "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ بعض عیاروں نے کسی زمانہ میں ایک سادہ دل بادشاہ کو پہنایا تھا۔ اور جس کی یہ صفت بیان کی گئی تھی کہ صرف "ایماندار" لوگوں کو نظر آسکتا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر جب بادشاہ اُس "نوری جامہ" کو پہنکر جلوس کے ساتھ شہر میں گشت کیلئے نکلا تو اُسے دیکھکر لوگ ہکّا بکّا رہ گئے۔ وہ مادر زاد ننگا تھا مگر لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ ہمارے ایمان کا قصور ہے جو "نوری جامہ" نظر نہیں آتا اور بادشاہ برہنہ دکھائی دیتا ہے۔ سب دم بخود تھے اور جو کچھ دیکھ رہے تھے اسکا اظہار و اعتراف دوسروں سے اسلئے نہیں کرتے تھے کہ "بے ایمان" سمجھے جائینگے۔ آخر ایک معصوم بچّہ نے چلّا کر کہا۔ "ارے یہ کیا، بادشاہ ننگا جا رہا ہے"! ایک دفعہ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ اس سرے سے اُس سرے تک ایک ہلچل مچ گئی۔ اب ہزاروں زبانوں پر یہی الفاظ تھے کہ "بادشاہ ننگا جا رہا ہے"! اب لوگوں کو یقین آگیا کہ اُن آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھی۔ اُن کے ایمان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ "نوری جامہ" کوئی خارجی یا مادی وجود نہیں رکھتا تھا۔ عیاروں نے بادشاہ اور رعایا سب کو فریب دینے اور احمق بنانے کی کوشش کی تھی۔ آخر فریب کا پردہ چاک اور حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہو گیا۔

یہی حال اصغرؔ صاحب کی اُن تصویروں کا ہے جو مقدمہ نگاروں کو بغایت "رنگین" نظر آتی ہیں حالانکہ وہ نقوشِ سادہ کی

حیثیت بھی نہیں، رکھتیں بلکہ سرے سے اُن کا وجود ہی نہیں۔ مقدمہ نگاروں کی لفظی جادوگری نے لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو کچھ اس طرح مسحور کر دیا ہے کہ اب وہ اُنہیں کی آنکھوں سے دیکھتے، اُنہیں کے دماغ سے سوچتے اور اُنہیں کے دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی رائے پر مطلق اعتماد نہیں رہا۔ مقدمہ نگار نے اگر کسی شعر کو حد درجہ حسین و رنگین بتایا ہے مگر پڑھنے والے کو اس میں کوئی حُسن و رنگینی دکھائی نہیں دیتی تو وہ اِسے اپنے فہم کا قصور اور استعداد کا نقص سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت وہی ہے جو اُسے نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رسمی، تقلیدی اور بے بنیاد شاعری کے خلاف میں نے جو آواز بلند کی ہے وہ بہتوں کی آنکھیں کھول دے گی اور انہیں نظر آنے لگے گا کہ ہمارے شعرائے رسم پرست کے اشعار کی رنگینی و رعنائی اور "معنویت" کی حقیقت "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں۔ اور مقدمہ نگار حضرات اُن صنعت گروں کے ہم فن اور ہم رتبہ ہیں جنہوں نے "نوری جامہ" تیار کیا تھا۔

ہاں تو اصغرؔ صاحب نے اپنے چیپڑ — جنکو بمنزلہ رنگ سمجھنا چاہیئے — آنسوؤں کے پانی میں حل کر کے مژگان کے مُوقلم سے دامنِ قبا کے کینوس پر جو تصویریں کھینچی ہیں ان میں سے بعض آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش کی جاتی ہیں ؎

وہ نغمۂ رنگیں میں سب بھول گیا اصغرؔ ❊ اب گریۂ خونیں میں روداد گلستاں ہے

دل میں اک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا ❊ اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

تھا لطفِ جنوں دیدۂ خوننابہ فشاں سے ❊ پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

حضرت اصغرؔ کے دیدۂ خوننابہ فشاں نے دامنِ صحرا کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ جناب جگرؔ کے دیدۂ خونبار نے دامنِ کہسار کو گلستاں بنا دیا۔

جگرؔ ؎ جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو ❊ بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامنِ کہسار کو

مُرشد و مُرید کے ان شعروں میں کس بلا کی صوری و معنوی مشابہت ہے۔ "من تو شدم تو من شدی" کی منزل اب دُور نہیں

جگرؔ ؎ پوچھ مت مجھ سے مرے زخمِ جگر کی حالت ❊ میرے دامن میں ہر آنسو گُلِ تر ہے کہ نہیں

حضرت فانیؔ نے زخمِ دل کے لہو سے آنسوؤں کو رنگین کیا تھا[1]۔ جناب جگرؔ کے اشک، زخمِ جگر کے خون سے گُلرنگ ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جگر کا خون زیادہ شوخ رنگ ہوتا ہے یا دل کا تو اسی کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا سہل ہوگا کہ جگرؔ کا شعر زیادہ رنگین ہے یا فانیؔ کا۔

جگرؔ ؎ رنگین ہیں فضائیں جاری ہیں اشکِ خونیں ❊ افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشکِ خونیں ہی سے فضائیں رنگین ہو گئی ہونگی۔ لیکن یہ نکتہ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر صاحب جہاں بیٹھے اشکِ خونیں بہا رہے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں جو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

---

[1] بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ ❊ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا۔ — فانیؔ

طوالت کا خوف اپنی جگہ پر درست۔ مگر نامنصفی ہوگی اگر "بادشاہِ متغزلین" کے چند اشعار اس موضوع پر یہاں نقل نہ کئے جائیں۔

نمونہ۔ حسرت ؎ جوشِ گل کی ہیں یہی کیفیتیں تو کیا عجب ✤ اشکِ بُلبُل سے قفس ہو لالہ زار اب کی برس

"اشکِ بُلبُل" کی جدت قابلِ داد ہے اور اُن اشکہائے خونیں سے قفس کا لالہ زار بنجانا دادے مستغنی۔

حسرت ؎ مری گریۂ خون کی سب لالہ کاری ✤ نمودار ہے دامن و آستین پر

وہ دن اب یاد آتے ہیں بہارِ خونفشانی کے ✤ وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا

چشمِ رنگینِ یار کو ہے پسند ✤ سُرخیِ اشکِ عاشقان کی بہار

ظاہر ہے کہ بربنائے مُشابہت چشمِ رنگین یار کو سُرخیِ اشکِ عاشقاں کی بہار پسند ہوگی۔ مثل مشہور ہے کہ ؎

کُند ہمجنس با ہمجنس پرواز ✤ لال کے ساتھ لال اور باز کے ساتھ باز

"جنون"

دُنیا میں ایسا کون ہو جس نے زندگی کے کسی نہ کسی دور میں محبت کی گرمی اپنے قلب میں محسوس نہ کی ہو۔ خصوصاً ایک غزلگو شاعر کیلئے تو عاشق ہونا ناگزیر ہے مگر ہمارا شاعر ہم آپ جیسا یعنی معمولی درجہ کا عاشق بننا پسند نہیں کرتا بلکہ لغوی، اصطلاحی تاریخی ہر اعتبار سے ایشیا کے آئیڈیل عاشق میاں مجنوں کا سچّا جانشین بننا چاہتا ہے۔ میاں مجنوں کا اصلی نام قیس تھا مگر جب فرطِ عشق نے جنون کی صورت اختیار کی تو مجنوں مشہور ہو گئے۔ حُسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے یہ واقعہ ہمارے شاعر صاحب کو بھی معلوم ہے اور اس سے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کمالِ عشق کے لئے جنون لازمی ہے لہذا دیوانے بن گئے۔ مگر دیوانے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دور کے بعض مفکرین کی طرح "عدمِ تشدّد" کے قائل ہوتے ہیں اور اپنا جنون اپنی ہی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جنون کے جوش میں طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ جو چیز سامنے آئی اُٹھا کر پھینکدی، توڑ دی، برباد کردی۔ جو ملا اُس سے بھڑ گئے۔ لڑ پڑے۔ پتھر مارنے لگے۔ اِس قسم کے دیوانوں کو حفظِ امنِ عامّہ کی خاطر آزاد نہیں پھرنے دیا جاتا۔ یا اُن کے اعزّہ اُن کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر گھر ہی میں اُنہیں بند رکھتے ہیں یا پھر سرکاری پاگل خانوں میں اُنہیں قید رکھا جاتا ہے۔ اس طرح پہلی قسم کے دیوانے آزاد پھرتے ہیں اور دوسری قسم کے پابزنجیر رکھے جاتے ہیں۔ شاعر صاحب نے کہیں یہ بھی سُن لیا ہے کہ "کمالِ فن" اس کا نام ہے کہ انسان جامع حیثیات ہو لہذا دونوں قسم کے دیوانوں کی تمام خصوصیات و صفات اپنی ذات میں ثابت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دیوانے کا سوانگ بھرنے کیلئے ایسا کرنا ضروری ہو۔ فرضی دیوانگی کے جوش میں ہمارا شاعر کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔ پہلے گریباں چاک کرتا ہے۔ اس کے بعد دامن کی دھجیاں اُڑاتا ہو۔ پھر سر بصحرا نکل جاتا ہو۔ جب تک شہر کی حدود سے خارج نہیں ہو جاتا لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے ہوتا ہو جو تالیاں بجاتا، شور مچاتا اور اُسپر کنکریاں برساتا ہو۔ میاں مجنوں کے لئے تو نجد کا صحرا قریب ہی موجود تھا اسلئے صحرا نوردی سہل تھی مگر ہمارے شاعر کے لئے کسی صحرا تک پہونچنا بھی آسان نہیں اسلئے اور بھی مصیبت کا سامنا ہوتا ہو۔ جنون کے جوش میں اتنا ہوش کہاں کہ جوتا پہنکر صحرا کو جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ ان میں کانٹے چُبھتے ہیں۔ پھر آبلے پھوٹتے ہیں اور زخم بنجاتے ہیں۔

یہ دیوانگی کا ایک رُخ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب اسیرِ دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے تو اُسے زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ قید خانے میں پہونچکر وہ کچھ اس درد اور جوش سے آہیں کرتا ہے کہ زنداں کی دیواریں ہلجاتی ہیں۔ محافظوں کے کلیجے اُلٹنے لگتے ہیں۔ پھر جب فصلِ بہار آتی ہے تو اس کا جنون اور بھی تیز ہوجاتا ہے۔ پہلے وہ گریباں چاک کرتا ہے پھر سارے کپڑے بدن پر سے نوچ کر پھینکدیتا ہے اور مادر زاد ننگا ہوجاتا ہے۔ کبھی جوشِ دیوانگی میں اپنا سر پیٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ لہولہان ہوجاتا ہے کبھی زنجیر کو پارہ پارہ کرکے اور کبھی زنجیر سمیت زنداں سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ ہے مختصر رُوداد دیوانگی کی جو ادنیٰ تغیر ہر شاعر نے تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ رسم پرستی اور نقالی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی کہ ایک صحیح المزاج انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو دیوانہ کہے۔ جھوٹ موٹ اپنا گریبان چاک کرے۔ فرضی محبس میں قید رہے اور محض خیالی صحراؤں میں تنکے چُنتا پھرے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرت موہانی اس میدان میں اپنے حریفوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ دیوانے تو بنے مگر گھٹیا قسم کے۔ یعنی اُن کا جنون چاک داماں اور صحرانوردی سے آگے نہیں بڑھا۔ نہ اُنھوں نے زنجیر پہنی۔ نہ اپنا سر پھوڑا۔ نہ قید خانے میں لاسے۔ نہ اپنی آہوں سے زنداں کی دیواریں ہلائیں۔ یہ سعادت اصغرؔ، جگرؔ، اور فانیؔ کا حصہ تھی۔ اُنہیں کو ملی اور حسرتؔ صاحب باوجود سعی اس سے محروم رہ گئے۔ سچ ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ❊ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آیئے اب اپنے شعرائے فرزانہ کی فرضی دیوانگی کا تھوڑا سا تماشا دیکھ لیجئے، پہلے دامن و گریباں کی دھجیاں اُڑتی ہیں ؎

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرتؔ ❊ اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

مولانا کو سکون و خاموشی کے مقابلہ میں چونکہ شور و ہنگامہ زیادہ پسند ہے اسلئے صحرا میں جی نہیں لگتا اور ناچار شہر میں تشریف لے آتے ہیں تاکہ لڑکوں کا غول تالیاں بجاتا، شور مچاتا، پتھر برساتا آپ کے پیچھے پیچھے ہو اور آپ اس برات کے دولھا بنے آگے آگے کوچہ و بازار میں چکر لگاتے پھریں ؎

شورِ طفلاں چاہیئے اے عشق سودائی مجھے ❊ کیوں پسند آنے لگی صحرا کی تنہائی مجھے

بحیثیت ایک مردِ سیاسی کے مولانا حسرتؔ کی ہمت و جرأت کا ہندوستان بھر میں شہرہ ہے۔ آپ نے سچ مچ سے جیل خانوں میں رہکر قید بامشقت کی اذیتیں برداشت کی ہیں، چکیاں پیسی ہیں اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں مگر یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جب آپ ایک مجنوں عاشق کا سوانگ بھرتے اور خیالی صحرا گردی کرتے ہیں تو آبلوں میں کانٹے چُبھنے کی بھی تاب نہیں لاسکتے اور تکلیف کے تصور ہی سے بلک بلک کے رونے لگتے ہیں ؎

جانِ افگار پہ طاری ہوئی رقت کیا کیا ❊ آبلوں سے جو سُنی خارِ مغیلاں کی صلاح

موضوعِ زیرِ بحث پر مولانا صاحب کا صرف ایک شعر اور سُن لیجئے ؎

زیبائشِ فرقِ عاشقی ہے ❊ دستارِ جنوں میں غم کا پیوند

ظاہری مطلب تو اس شعر کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ عشق کے سر پر جنون کی پگڑی لپٹی ہوئی ہے۔ اِس میں غم کا پیوند

لگا ہواہے اور یہ بیوند لگی ہوئی پگڑی آنجناب کے سرمبارک پر بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت اگر صرف اتنا ہی مطلب ہے تو یہ تو کچھ بات ہی نہ ہوئی۔ اسلئے ضرور اس میں کوئی "باطنی" مطلب بھی ہوگا جس پر اہل ظاہر کی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ اُنہیں اس شعر میں ضلع جگت اور لفظوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

"بادشاہ متغزلین" کی جنون سامانیوں کا مظاہرہ بہت پھیکا اور پھسپھسا رہا۔ آیئے اب حضرت جگر کے جوش دیوانگی کی ہنگامہ آرائیاں دیکھیں جنہوں نے اتنے گریباں پھاڑے ہیں کہ اب مرادآباد میں ایک ثابت پیرہن بھی مشکل ہی سے ملیگا۔ موصوف کا جنون نہایت تدریجی رفتار سے بڑھا ہے۔ آغازِ جنون میں اتنا ہوش تھا کہ گریباں چاک نہ ہو ورنہ رازِ محبت افشا ہوجائے گا ؎

عشق کا راز جنونِ عشق کی حد ہی میں ہے ٭ دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے

بلکہ سچ پوچھیے تو رازِ عشق چھپانے ہی کیلئے جنون کا یہ روپ بھرا تھا ؎

پیراہنِ جنون سے تنِ عشق ڈھک لیا ٭ یہ اِک طریق خاص ہی اخفائے راز کا

مگر یہ موصوف کی ناتجربہ کاری تھی جو یہ سمجھ لیا کہ جنون، عشق کی پردہ پوشی کرے گا ابتدا میں غالباً جھوٹ موٹ آپنے اپنے اوپر جنون طاری کرلیا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی جنون، حقیقی دیوانگی بنگیا اور اس کا جوش اتنا بڑھا کہ رازِ محبت چھپانے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اسلئے کہ گریبان سو سو جگہ سے چاک ہوگیا ؎

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی ٭ سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

جگر صاحب کو خود حیرت ہے کہ گریبان چاک ہوا تو کیونکر اسلئے کہ عالمِ دیوانگی میں آپکا ضعف اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہاتھ کا اُٹھنا بھی محال تھا۔ پھر اُس نے گریبان کس طرح پھاڑ ڈالا اور اگر اُس نے نہیں پھاڑا تو پھر کیونکر پھٹا ؎

دستِ جنوں کا ضعف سے اُٹھنا محال تھا ٭ کیا جانے کس طرح سے گریباں نکل گیا

بہرحال گریبان چاک ہوا۔ اور جب ایکمرتبہ یہ سلسلہ جاری ہوگیا تو پھر جاری ہی رہا ؎

حالِ وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا ٭ جیب چھوٹی تو گریباں لئے بیٹھے ہیں

جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے ٭ خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا

اس عشق میں پورا کبھی ساماں نہیں دیکھا ٭ دامن پہ نظر کی تو گریباں نہیں دیکھا

یہ سب ابتدائی دور کا حال ہے۔ اس کے بعد تو آپ نے اس بُری طرح گریبان و دامن کی دھجیاں اُڑائیں کہ الٰہی توبہ ؎

خاص یہ شان ہے اِک آپکے دیوانوں کی ٭ دھجیاں خود بخود اُڑتی ہیں گریبانوں کی

ہم نے دیکھی تھی اداکل ترے دیوانوں کی ٭ دھجیاں کچھ لئے بیٹھے تھے گریبانوں کی

رحم کر اے جنوں جان پہ دیوانوں کی ٭ دھجیاں پاؤں پہ آپہونچیں گریبانوں کی

یا تو جناب جگر جنون سے اس امر کے ملتجی تھے کہ "گریبان نہ جانے پائے" یا بالآخر گریبان و دامن پھاڑنے ہی کو رازِ عشق کا عرفان سمجھنے لگے ؎

عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا ؛ جس نے دامن کبھی جانا نہ گریباں سمجھا

اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہو گیا کہ جہاں کسی کو چاک گریباں دیکھا ان پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ مثل مشہور ہے کہ "دیوانہ را ہوے بس است" مگر یہاں "ہو" کی بھی ضرورت نہیں۔ پھٹا ہوا گریبان دیکھا اور دیوانگی نے طوفان برپا کر دیا ؎

اللہ اللہ مرے جوش جنوں کی لہریں ؛ نظر آجاتا ہو جب چاک گریباں کوئی

گریباں پھاڑتے پھاڑتے آخر ہاتھ شل ہو گیا ؎

اب اُسی دست جنوں پر آستیں ہو خندہ زن ؛ دھجیوں کو بارہا جس نے گریباں کر دیا

مرزا غالب نے بطریق طنز کہا تھا کہ ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ؛ صحرا مگر بتنگیٔ چشم حسود تھا

جگر سے اپنے عہد میں اس طعنہ کی برداشت نہ ہو سکی اور جنون کا وہ نام اُچھالا وہ صحرا گردیاں کیں کہ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ آخر دُنیا کو ماننا پڑا کہ میاں مجنوں کے سچے جانشین اس "قحط الرجال" کے دور میں جناب جگر ہی ہیں اُنہیں خود بھی اپنی اس بزرگی کا احساس ہے چنانچہ بڑے فخر کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں ؛ میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا

سچ یہ ہے کہ جگر صاحب کو یہ دعویٰ ہر طرح زیبا ہے اسلئے کہ گریبان تو سبھی دیوانوں نے پھاڑے ہیں مگر نہ اسطرح کہ ؎

دامان وجیب ہوگئے نذر جنوں تمام ؛ باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں

ہائے بیچارے جس طرح برہنہ دُنیا میں آئے تھے اُسی طرح برہنہ دُنیا سے جائینگے بشرطیکہ میونسپلٹی نے ننگا دفن کرنے کی اجازت دیدی۔

اس میں شک نہیں کہ جناب جگر کا جنون مولنا حسرت کے جنون سے کہیں زیادہ تیز ہے پھر بھی آپنے کچھ ایسی زیادہ صحرا نوردیاں نہیں کیں اور پاگل خانے میں بھی غالبًا آپ کو زندگی کے آخری چند روز ہی گذارنے کا اتفاق ہوا ایک شعر سے معلوم ہوتا ہو کہ ایک مرتبہ آپ مع زنجیر صحرا میں جا پہونچے تھے ؎

حاصل دشت نوردی ہیں یہ اے دشت جنوں ؛ آبلے ٹوٹ نہ جائیں کہیں زنجیر کے ساتھ

مگر اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ گھر سے فرار ہوئے تھے یا پاگل خانے سے۔ یقینی طور پر تو صرف اتنا معلوم ہے کہ جب آپ گرفتار کر کے زنداں لے جائے گئے تو وہاں آپ کی بہت حفاظت کی جاتی تھی کہ کہیں نکل نہ بھاگیں۔ اس واقعہ کا آپنے بڑی حسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے ؎

ان جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی اُمید ؛ حسرتیں بھی دفن زیر خاک زنداں ہوگئیں

یہ امر بھی متحقق ہو چکا ہو کہ عالم جنون ہی میں آپ کا وصال ہوا ؎

سخت دشوار حفاظت تھی گریبانوں کی ؛ آبرو موت نے رکھلی ترے دیوانوں کی

حضرت اصغر نے بھی گریبان دری میں کچھ کمی نہیں کی پھر بھی آپ جناب جگر کو نہیں پہونچتے۔ صحرا نوردی میں البتہ

آپ جگر کے ہم رتبہ قرار دئے جا سکتے ہیں مگر قید خانے کی سختیاں جھیلنے میں یقیناً اُن سے افضل ہیں۔ آپکی روداد کا خلاصہ یہ ہے ؎

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم　٭　کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

اس کے بعد آپ حسبِ دستور صحرا نوردی کے لئے تشریف لے گئے ؎

خوب صحرا ہی بر لائے جوشِ جنوں　٭　پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں
تکلف ہر طرح کا ہے دشتِ جنوں میں لیکن　٭　پھاڑنے کو نہیں ملتا ہو گریباں کوئی

صحرا میں آپکی دلبستگی کے تمام سامان موجود تھے، کمی اگر تھی تو صرف اتنی کہ ہر روز نیا گریبان پھاڑنے کو نہیں ملتا تھا کیونکہ آدھی درجن قمیص اور اتنے ہی کرتے جو آپ اپنے ہمراہ صحرا کو لے گئے تھے وہ چند روز میں پھٹ پھٹا کے برابر ہو گئے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ دیوانہ بن کر گریبان و دامن پھاڑ ڈالنے کے بعد آپ کو یہ پتہ چلا کہ آپ کا محبوب دل اور کلیجی کے کباب بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ لہٰذا اُسے آپ کے قلب و جگر کے ٹکڑوں کی ضرورت ہے ؎

اس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے　٭　جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

پاگل خانہ جانے سے پیشتر جس زمانہ میں آپکا قیام صحرا میں تھا آپ آستانِ یار سے جُدا ہو جانیکے غم میں بہت رویا کرتے تھے ؎

جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار　٭　روتے ہیں مُنہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے

مگر روتے وقت آپ صحرا کا دامن کس طرح اپنے مُنہ پر ڈھانک لیا کرتے تھے اس کا سمجھنا اور سمجھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شاید فراق صاحب یا سہیل صاحب یا مرزا احسان احمد صاحب کچھ ان اسرار و رموز کا انکشاف کریں تو پتہ چلے جس زمانہ میں آپ پاگل خانے میں تشریف رکھتے تھے آپ کا جنون بہت جوش پر تھا۔ زنجیروں کو اُٹھا کر جھنجوڑتے اور زمین پر دے دے مارتے تھے جس سے ایک نہایت وحشت انگیز شور پیدا ہوتا تھا ؎

اور آجائے نہ زندانی وحشت کوئی　٭　ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا

جس وقت آپ دیوانگی کے جوش میں چیختے تھے تو پاگل خانے کی دیواریں اور محافظوں کے دل ہل جاتے تھے ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی　٭　نگہباں چیخ اُٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی

پاگل خانے میں قریب قریب یہی حالت حضرت فانی کی بھی ہو گئی تھی ؎

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا　٭　چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

"حلقۂ زنجیر کا گھبرا کے چونک اُٹھنا" کچھ ایسی بات ہے کہ جو سمجھے اسکو بھی مزہ آئے اور جو نہ سمجھے وہ بھی لُطف اُٹھائے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یوں تو جگر، اصغر اور فانی تینوں حضرات نے صحرا نوردی بھی کی اور زنداں کی ہوا بھی کھائی مگر فانی صاحب اپنے دونوں رفیقوں سے اس باب میں ممتاز ہیں کہ اُن کی زندگی کا زیادہ حصّہ پاگل خانے ہی میں گذرا اور ظنِ غالب یہ ہے کہ پاگل خانے ہی میں وفات بھی پائی۔ زنداں سے وہ کچھ اسدرجہ مانوس ہو گئے تھے یا یوں کہئے کہ پاس وضع کا انہیں کچھ ایسا خیال تھا کہ قید خانہ چھوڑ کر صحرا جانے کو کبھی تیار نہ ہوتے تھے ؎

بے مروت بن کے کیوں اب سوئے صحرا جایئے　٭　لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

دوسرے ارباب جنوں کی طرح پاگل خانے میں بھی آپ کا شغل گریباں دری جاری تھا ؎

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو ÷ گریباں نے گلے لپٹا لیا ہو بڑھ کے داماں کو

فصلِ بہار میں چونکہ جنون کا جوش زیادہ ہوتا ہے اسلئے ایکدن فانی صاحب نے پاگل خانے کی دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیا اور خون جو بہا تو اس میں انگلیاں بھگو کر زمین پر گل بوٹے بنانے شروع کر دئے۔ خالی بیٹھے بیٹھے بھی انسان اکتا جاتا ہے آخر کچھ تو شغل چاہیئے ؎

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھول نکے خاک ہی سہی ÷ موسمِ گل آگیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حضرات شعراء دیوانے ہونے کے بعد پہلے پاگل خانے تشریف لیجاتے ہیں اور اسکے بعد صحرا نوردی کیلئے نکلتے ہیں اور کبھی پہلے صحرا گردی فرماتے ہیں اور اسکے بعد پاگل خانے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ اور کبھی مکرر بھی قیدخانے کو نوازتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی صاحب ایک مرتبہ سے زیادہ محبوس رہے تھے ؎

پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں ÷ صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

خاتمہ پر حضرتِ فانی کی صحرا نوردی کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے ؎

مرے تلووں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہونگی ÷ مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

یہ صحبتیں بھی دیکھئے لاتی ہیں رنگ کیا ÷ مہمانِ خار پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسرت کی طرح فانی صاحب صحرا جاتے وقت جوتا ساتھ لیجانا بھول گئے تھے اور ناچار ننگے پاؤں گھومنا پڑا۔ آبلے پڑے تھے تو پڑے تھے، اُن میں کانٹے بھی چُبھ کر رہ گئے۔ مضمون کا یہ حصہ ختم کرنیسے پہلے فانی صاحب کے تین شعر اور سن لیجئے۔ شعر لئے جنون زدہ کی یاد کچھ دنوں تو آپ کے دل میں تازہ رہے ؎

رکھ پنجۂ جنوں سے سرو کارِ آستیں ÷ کبتک رہینگے ہاتھ گرانبارِ آستیں

ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں ÷ سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق ÷ پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

فانی صاحب کی فرزانگی سے ہمیں توقع ہے کہ اُنہوں نے باہمہ جوشِ جنوں حضرتِ عشق سے یہ خلعتِ عریانی قیامِ صحرا کے زمانہ ہی میں مانگا ہوگا کیونکہ شہروں میں تو ننگا پھرنا نہ صرف اخلاقاً معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ قانوناً بھی ممنوع ہے۔ جسطرح جناب جگر نے عالمِ دیوانگی میں رحلت فرمائی تھی اسی طرح حضرت فانی بھی جنون کی حالت میں رہگرائے عالم باقی ہوئے جسکی تفصیل ہم "جنازہ" کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس شعر کا دُہرا دینا کافی ہے ؎ فانی ؎

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں ÷ لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

عندلیب شادانی

جولیٹ

[ملک اطالیہ میں ورونا ایک خوشنما شہر ہے۔ وہاں کبھی ؟ بڑے
ے تھے۔ ایک کپولٹ، دوسرا مانٹگو ان میں ایک زمانے سے دشمنی
۔ یہ دشمنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ گھر والے ایک طرف نوکر چاکر تک آپس
دشمن ہوگئے تھے۔ سودا سلف کو نکلے ہیں ایک نے دوسرے کو دیکھا
میں ہونے لگی۔ کبھی لکڑی چلی۔ کبھی تلوار چلی۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا۔ کسی کا سر
کی جان سے گیا۔ ان باتوں سے شہر کا سکھ چین اٹھ گیا تھا۔ ہر وقت
نی چھائی رہتی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کپولٹ گھرانے کے امیر کبیر نے اپنے والوں
کی ابھی مہمان نہیں آئے۔ ایک جگہ گھر والی بیگم بیٹھی اپنی بیٹی کی ددا
بکر رہی ہیں]

جی کہاں ہے؟ میرے پاس بلانا۔

جی بلاتی ہوں

(آواز دیتے ہوئے جاتی ہے)

اجی، ہرنی! اجی، قمری!.... اللہ کی امان!.... جانے یہ
ی کہاں ہیں؟.... اجی، جولیٹ!!۔

[جولیٹ اس وقت خانہ باغ میں بیٹھی ہے۔ پاس ایک ہرنی کھڑی ہے
ہاتھوں کچھ کھلا رہی ہے۔ گو اس لڑکی کی عمر نے ابھی چودہ بہاریں ہی
مگر جس سرزمین میں پلی بڑھی۔ پروان چڑھی۔ وہاں کی آب و ہوا سے
شاداب معلوم ہوتی ہے۔ بھولی بھولی۔ سُندر۔ جیلی من کی رانی۔
یا! جونہی ددا کی آواز سنی رنگین تیتری کی طرح تڑپ کے اٹھی اور
آئی۔]

ا۔ کیا ہے ددا؟ کون بلاتا ہے؟۔

تمہاری امی۔

(جولیٹ اور ددا ساتھ ساتھ آتے ہیں)

ا۔ (ماں کے پاس آکے) جی، امی، کہیے؟۔

[بیگم پہلے تو ددا کو جانے کے لئے کہتی ہیں۔ مگر پھر کچھ سوچکر روک
اور ان دونوں میں یہ باتیں ہونے لگتی ہیں کہ نام خدا بچی سیانی ہوئی۔
باتیں باتیں ہوتی ہیں]

جولیٹ! میاں پیرس سے تمہاری بات آئی ہے۔

ددا:۔ لے ہے بیگم، پیرس میاں تو آنے کی آپا ہیں!۔

بیگم:۔ کیا کہا؟!..... ورونا کی بہار میں ایسا پھول نہیں!!

ددا:۔ بس حضور، وہ پھول ہی ہیں!

بیگم:۔ (جولیٹ سے) تو بیٹی! آج رات لڑکا ہمارے ہاں دعوت میں آئے گا۔
نیک ہے شور رہا ہے۔ تم دیکھنا، حسن کی زبان میں اُس کے ماتھے شادمانی
لکھی ہے۔

جولیٹ:۔ جی۔

[دعوت میں کپولٹ گھرانے کے بیسیوں مہمان آئے۔ ان میں خواتین کی
سج دھج دیکھنے کی ہے۔ جسے دیکھو رنگینیوں کا گلدستہ بنی ہوئی ہے۔ رات بھر
محفل رقص بھی۔ سب نقابیں پہن کر ناچ میں مصروف ہوئے۔ جان منچے
کی موج بن گئی۔ اس بزم میں قضارا مانٹگو گھرانے کا ایک خوبصورت نوجوان
——— رومیو بھی بھیس بدل کے آیا۔ ہاتھ پیر کا سیدھا، باذوق۔ جی دار
جس کی زندگی کا ابھی کوئی مقصد نہ ہو۔ جس کی روح میں ایک انہونی پیاس
سی رہتی ہو۔ یہاں آکے کیا دیکھتا ہے کہ فطرت کی لاڈلی ——— جولیٹ پر
چودھویں کے چاند کا سا نکھار ہے۔]

رومیو:۔ (جولیٹ کی طرف اشارہ کرکے ایک نوکر سے) یہ کون ہیں؟؟

نوکر:۔ جی معلوم نہیں۔

رومیو:۔ (جولیٹ کو دیکھتے ہوئے) اللہ رے حُسن! کہ نورِ شمع دوبالا ہو
جاتے!..... معلوم ہوتا ہے کہ لیلائے شب ہیرے جگمگاتا آویزہ
پہنے ہے۔..... حسن جو دنیا میں انمول ہو۔ اور جسے چھوا کہ مُرا!!

[رومیو انجانی میں ایک طرف کھڑا یہ کہہ رہا تھا کہ جولیٹ کے ممیرے
بھائی ——— ٹائی بالٹ نے اس کی آواز پہچان لی۔ سوچا یہ مانٹگو ضرور
ہماری بھد اڑانے یہاں آیا ہے۔ اور تلوار سونت کر اُس سے لڑنے چلا۔ مگر جولیٹ
کے والد کو اس کی خبر ہوگئی۔ تو انہوں نے ٹائی بالٹ کو روک لیا۔ اور کہا،
اس وقت لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی رومیو اچھا لڑکا ہے۔ وہ کسی
کے بُرے میں نہیں۔ آگیا ہے، تو آجانے دو۔ یہ شرافت سے دور ہے کہ کوئی
تو محبت سے اپنے ہاں آئے۔ اور ہم اُس کے ساتھ بُرا سلوک کریں۔ ماموں کے
کہنے سُننے سے ٹائی بالٹ خون کا سا گھونٹ پی کر چپکا تو ہو رہا۔ مگر مارے
غصے کے وہاں نہ ٹھیرا۔ چلا گیا۔ سوچا کہ خیر آج نہیں تو کل رومیو سے سمجھ لونگا۔

اسے یہاں آنے کا مزہ چکھا دوں گا۔]

رومیو۔ (نزدیک آکر، جولیٹ سے) حُسن کے اس پاک مندر کو میرے نجس ہاتھ چھو لیں؟!۔

(یہاں ذرا کی ذرا رومیو مُنہ سے نقاب ہٹا لیتا ہے۔)

جولیٹ۔ (رومیو کو دیکھتے ہوئے لجا کر) اچھے جاتری!! .....

رومیو۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) مندر میں دیوی کے لب بھی ہوتے ہیں۔ جاتریوں کے بھی ہوتے ہیں؟!

جولیٹ۔ ہوتے ہیں جاتری! مگر اُن سے سُمرن جپنی چاہیئے!!

رومیو۔ بس تو اے دیوی! یہ ہاتھ اور لب تیرے حضور دُعا بنکے گئے ہیں۔ انہیں قبول فرما۔ نہ ہو کہ میری آس یاس بنجائے!!

(یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دَدا آجاتی ہے)

ددا۔ (جولیٹ سے) بی بی! تمہیں امّی بُلا رہی ہیں۔

(جولیٹ چلی جاتی ہے)

رومیو۔ (ددا سے) ان کی امّی کون ہیں؟۔

ددا۔ کون ہیں کی بھی ایک رہی۔ اِسے گھر کی بیگم۔ نیک بخت۔ پاکدامن۔ میں ان کی بچی کی ددا ہوں جس سے تم باتیں کر رہے تھے۔ میاں! اس بچی سے جو بیاہ کریگا، نہال ہو جائیگا۔

رومیو۔ (اپنے میں آپ) کپولٹ کی بیٹی!!! ..... اپنی زندگی میں نے دُشمنوں کو سونپ دی!!۔

[ناچ ختم ہوتا ہے۔ سب مہمان جانے لگتے ہیں تو ایک طرف جولیٹ بھی آکھڑی ہوتی ہے۔]

جولیٹ۔ ددا! ذرا یاں آنا۔ دیکھنا' وہ صاحب کون ہیں؟۔

ددا۔ بیٹی! ٹائیبرو کے صاحبزادے ہیں۔

جولیٹ۔ اور وہ جو دروازے میں سے جا رہے ہیں؟

ددا۔ میاں پیٹرد شو ہیں۔

جولیٹ۔ اچھا وہ جو پیچھے آرہے ہیں۔ ناچے بھی نہیں؟

ددا۔ معلوم نہیں۔

جولیٹ۔ اچھی ددا جاؤ۔ ان کا نام پوچھ لو۔

(ددا جاکر نام پوچھ آتی ہے۔)

ددا۔ وہ تو مانٹگو گھرانے کا لڑکا ہے! ... رومیو!! ... تمہارے خاندانی دُشمن کا اکلوتا بیٹا!!!

جولیٹ۔ (گھبرا کر اپنے آپ) ہائے چاہت بھی ہوئی تو اس ظالم سے جس کے گھرانے سے نفرت ہے ...... (رنجیدہ) جولیٹ! تو نے زہر کیوں دیکھا۔ پہلے کیوں نہ معلوم کر لیا کہ کون ہیں۔ آہ! اب وقت نکل گیا... نصیب ایک بیری سے پیار کراتا ہے!!

ددا۔ ہائیں بیٹی!! کیا کہہ رہی ہو؟

جولیٹ۔ کچھ نہیں ددا، ناچ میں گیت سُنا تھا۔ یاد آگیا۔

(کوئی اندر سے آواز دیتا ہے، جولیٹ!)

ددا۔ جی آئے .....

(جولیٹ سے) چلو بیٹی! دیکھتی نہیں، سب مہمان چلے گئے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

[جولیٹ کی محلسرا۔ خانہ باغ۔ آدھی رات گذر گئی۔ کچھ کچھ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ رومیو چھپ کر باغ میں آتا ہے۔ جہاں تھوڑی دیر میں پہلے تو جھروکے میں روشنی نظر آتی ہے، پھر جولیٹ آتی ہے۔ گویا اُفقِ مشرق سے سُورج نکلا جس نے چاند کو شرما دیا۔ اس لڑکی کی آنکھیں دو دہکتے تارے ہیں۔ عارض ایسے ہیں جیسے ایک ہی وقت میں چاندنی بھی کھلی ہو، شفق بھی پھُولی ہو۔ اپنے ہاتھ پر رُخسار کو سہارا دیتی ہے۔ اور سوچ میں پڑجاتی ہے۔ پھر ایک آہِ سرد بھر کر اپنے آپ باتیں کرنے لگتی ہے۔]

جولیٹ۔ ہائے اللہ، میں کیا کروں!)

رومیو۔ (جولیٹ کو دیکھ کر دبی زبان میں کہ جولیٹ نہ سُنے۔ بول، آسمان کی حور! بول!!

جولیٹ (اپنے میں آپ)۔ رومیو! رومیو! تم رومیو کیوں ہو؟!۔ .. کہدو، رومیو نہیں ہوں۔ مانٹگو نہیں ہوں! ..... اچھا! تم یہ کہنا نہیں چاہتے تو مجھے نباہ کا قول دو۔ میں کپولٹ نہیں رہوں گی!۔ .... بس یہ تمہارا نام بُرا ہے۔ نہیں، میں چُوکی۔ تم مانٹگو کب ہو؟ تم تو تم ہو!! ...... ویسے بھی تو یہ مانٹگو بھلا کیا شے ہے؟ نہ ہاتھ۔ نہ پیر۔ نہ آنکھ۔ نہ ناک ــــــ کوئی حصۂ جسم نہیں! اسے بدل ڈالو۔ نام میں دھرا ہی کیا ہے؟ گلاب کو گلاب نہ کہا۔ کچھ اور کہا۔ تب بھی وہ اپنی خوشبو دیگا پر دیگا۔ اسی طرح رومیو کو بھی رومیو نہ پکارا تو تم اتنے ہی پیارے رہوگے۔ جتنے اب ہو۔ بس تو رومیو! اپنا نام بدلدو اس کے بدلے مجھے لے لو!! .....

رومیو۔ (بے اختیار بول اٹھتا ہے) نہیں نہیں میں رومیو نہیں رہا۔ مجھے اب اپنا پریمی پکارو!۔

جولیٹ۔ (چونک سی پڑتی ہے) آپ کون ہیں؟؟!!!

رومیو۔ کیونکر بتاؤں، کون ہوں؟ نام لے نہیں سکتا۔ کیونکہ خ۔ اپنے نام سے اب مجھے نفرت ہو گئی کہ تمہارا بیری ہے۔ کاش یہ لکھا ہوتا

لفظ ہوتا تو میں اس کے پُرزے پُرزے کرڈالتا۔

جولیٹ:۔ (دل ہی دل میں) یہ آواز تو میں نے زیادہ نہیں سُنی۔ پر جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے (رومیو سے) آپ رومیو ہیں؟ ... مانٹگو؟؟ ....

رومیو:۔ یہ نام تمہیں پسند نہیں ہیں۔ میں ان میں سے ایک بھی نہیں!

جولیٹ:۔ (گھبرا کر) آپ یہاں کیسے آگئے ؟ کہیئے تو کیونکر آگئے؟! باغ کی دیواریں اونچی اونچی ہیں ان پر چڑھنا آسان نہیں۔ جگہ بھی خطرے کی ہے میرے لوگوں نے آپ کو دیکھ پایا تو مرتے جوکھم کی بات ہے۔

رومیو:۔ محبت کو سنگین دیواریں نہیں روک سکتیں۔ یہ جو چاہتی ہے کرتی ہے۔ اسی کے سبک پر مجھے ان دیوار ودل پر سے اُڑا لائے۔

جولیٹ:۔ مگر وہ لوگ آپ کو یہاں دیکھ لیں گے تو خون کے پیاسے ہوجائیں گے۔

رومیو:۔ رہنے بھی دیجئے۔ پہلے اپنی آنکھوں کی تو خبر لیجئے۔ جان لیوا یہ ہیں۔ بلا بلا ان میں ہے۔

جولیٹ:۔ نہیں نہیں۔ آپ چلے جائیے۔ وہ آپ کو دیکھ لیں گے۔

رومیو:۔ گھبراؤ نہیں۔ نقابِ شب مجھے چھپائے رہے گی!

جولیٹ:۔ آخر آپ کو یہ جگہ کس نے بتادی؟

رومیو:۔ محبت نے!

[جولیٹ جو مارے لحاظ کے عرق عرق ہوجاتی ہے۔ دل ہی دل میں کہتی ہے کہ اچھا ہوا کہ رات ہے۔ جس نے میری شرم و لحاظ کی لاج رکھ لی۔ ورنہ بڑی مشکل آبنتی۔]

جولیٹ:۔ (لجاتے ہوئے) اچھا، میں اگر یہ پوچھوں۔ آپ مجھے چاہتے ہیں؟ تو آپ شاید "ہاں" کہیں گے؟! ... خیر آمنّا! مگر آپ مرد ہیں! مردوں کا پیمانِ وفا کچا دھاگہ ہوتا ہے! سُنتی ہوں اس پر عشق کا دیوتا بھی ہنستا ہے!!! ابھی دُنیا دکھاوے کی تو کہئے گا نہیں مجھے سچ سچ بتادیجئے! ..... مگر ہاں، شاید میری ان باتوں سے آپ خیال کریں، میں کیسی خراب لڑکی ہوں، جو ایک دن کی ملاقات میں اتنی بے لحاظ ہوگئی۔ تو یہ میں مانے لیتی ہوں۔ مگر اللہ جانتا ہے مجبور دل نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اب آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔ میں سیدھی سادی لڑکی ہوں۔ مجھے اینچ پینچ نہیں آتا ..... دل میں چور تھا، یوں زبان پر آگیا۔ اور انجانی میں نہ جانے کیا کہا۔ جسے آپ نے بھی سُن لیا۔ وہ تو خیر گذری کہ آپ بول اُٹھے۔ ورنہ خدا معلوم اور کیا کیا کہہ جاتی ......

آپ مجھے معاف کردیں . .

رومیو:۔ میرے من کی ملکہ! اس چاند کی قسم جس کی روپہلی کرنیں ان پھل پھول والے درختوں کی چوٹیوں کو چھو رہی ہیں .....

جولیٹ:۔ اے ہے! چاند کی قسم تو نہ کھائیے۔ کہ وہ بھولا مسافر آج ہے کل نہیں۔ سارے مہینے میں، دو ڈھلتا بڑھتا رہتا ہے۔ نہ ہو کہ آپ کی چاہت بھی ایسی ہوجائے۔

رومیو:۔ پھر کس کی قسم کھاؤں؟

جولیٹ:۔ قسم کی کیا ضرورت! ..... اور کھانی ہے تو اپنی قسم کھائیے کہ آپ میرے دیوتا ہیں مجھے یقین آجائیگا۔

رومیو:۔ اگر میری . . . .

جولیٹ:۔ (قطع کلام کرکے) نہیں نہیں، کوئی قسم نہ کھائیے۔ رات کی بات کا کیا بھروسہ! ..... ویسے بھی یہ باتیں کچھ ایسی اچانک ہوتیں، جیسے بجلی کی چمک۔ چمکی نہ چمکی کہ آنکھوں سے اوجھل بھی ہوگئی ... مگر اب آپ جائیے۔ خدا حافظ! جب ہم پھر ملیں تو خدا کرے پیار کی یہ کلی کھلکر پھول بن جائے! ..... اچھا، خدا حافظ! ..... مولا میرے! مجھ سا سُہانا چین ان کے بے قرار دل کو بھی دیدے!!

(جانے لگتی ہے۔)

رومیو:۔ جولیٹ! مجھے کانٹوں ہی پر تڑپتا چھوڑ چلیں؟

جولیٹ:۔ کیوں؟

رومیو:۔ تم بھی تو وفا کا عہد کردو!!

جولیٹ:۔ واہ! میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی قول دے چکی! ..... اچھے رومیو! یہ دل سمندر ہے۔ اس سے جتنی الفت لوگے۔ اتنی ہی بڑھیگی۔

(دَدا اندر سے آواز دیتی ہے، جولیٹ!)

جولیٹ:۔ مجھے اندر بلا رہی ہیں۔ جاؤ۔ اللہ نگہبان ..... دَدا ماں! ابھی آئی . . . رومیو! بھولنا نہیں! (جاتے جاتے لوٹ کر) اچھا ذرا ٹھیرو میں پھر آتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے۔)

رومیو:۔ اے مبارک رات! یہ ساری باتیں کہیں سُہانا خواب تو نہیں!!

(اتنے میں جولیٹ پھر آتی ہے۔)

جولیٹ:۔ اچھے مانٹگو! ایک بات اور کہنی ہے۔ شادی کی تاریخ .....

دَدا:۔ (اندر سے) بی بی!

جولیٹ:۔ آئی دَدا! ابھی آئی۔ (رومیو سے جلدی جلدی) آپ نہیں چاہتے تو میری التجا ہے .....

ددا:۔ (اندر سے) بی بی۔

جولٹ:۔ آتو رہی ہوں، ددا! (رومیو سے) آپ مجھے بھول جائیں۔ مجھ پر جیسی بنے گی سہہ لوں گی۔ . . . . بس تو کل آدمی بھیجوں گی جو منشا ہو کہلا بھیجنا۔

رومیو:۔ کاش کہ تم میری ہو جاؤ۔ اور میری آتما پھولے نہ سمائے!

جولٹ:۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ! ہزار ہزار بار خدا حافظ!!

[جولٹ جھروکے میں سے اندر چلی جاتی ہے۔ رومیو بھی بادلِ نخواستہ جانے لگتا ہے۔ بلکہ خاصی دُور آجاتا ہے کہ جولٹ پھر جھروکے میں آتی ہے۔]

جولٹ:۔ (دبی آواز میں) سُنتے نہیں، رومیو! سُنو تو!!

رومیو:۔ (اُچٹتی ہوئی آواز سُنکر) میری رُوح میرا نام لیکر پکارتی ہے!! . . . . نقرئی گھنٹیوں کی آواز! رسیا کانوں کے لئے کومل سُروں کی چھیڑ!!

(رومیو واپس آتا ہے)

جولٹ:۔ رومیو!

رومیو:۔ دیبی!

جولٹ:۔ تو کل کب آدمی بھیجوں؟

رومیو:۔ نو بجے۔

جولٹ:۔ اچھا! . . . . مگر، لیجئے! میں بھول ہی گئی۔ جانے آپ کو کیوں پھر بلایا تھا۔

رومیو:۔ (مسکراتے ہوئے) میں ٹھیرا رہتا ہوں۔ یاد کرلو۔

جولٹ:۔ (نیچی نظروں) واہ! آپ کے ہوتے میں سب کچھ بھول جاتی ہوں! . . . . ادہو! پَو پھوٹنے لگی۔ صبح ہو رہی ہے۔ بس اب جائیے۔ خُدا حافظ! اللہ نگہبان۔ ورنہ غمِ فرقت میں تو وہ چاشنی ہے کہ میں صبح ہونے تک یونہی رُخصت ہوتی رہوں گی!۔

[جولٹ چلی جاتی ہے۔ رومیو بھی خانہ باغ سے نکلا۔ تو خیال ہوا۔ روحانی پیشوا کے پاس چلنا چاہیئے۔ اس آڑے وقت میں وہی کوئی نیک صلاح دیں گے۔ پیشوا کا نام لارنس ہے۔ جو ایک گوشہ نشیں بزرگ ہیں۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہیں۔ ہاتھ میں ایک چنگیر لئے ہیں۔]

لارنس:۔ صبح، بھوری بھوری آنکھوں والی دیبی رات پر مسکرانے لگی۔ مشرق کی سمت بادل نور کی کرنوں سے گنگا جمنی بن رہے ہیں۔ اندھیرا ایک خراباتی کی طرح بدحواس بھاگتا ہے۔ دن کا رستہ صاف ہو رہا ہے کہ سُورج کی سواری آتی ہے۔ دن نکلے گا۔ دلوں کی کلی کھلے گی۔ رات کی اُداسی دُور ہو گی۔ لاؤ میں بھی چنگیر پھولوں سے بھر لوں۔ جس میں کوئی تریاق ہوگا۔ کوئی سم ہوگا۔ زمین فطرت کے ان دُلاروں کی ماں ہے۔ اس کے گودوں بھانت بھانت کے لاڈلے پھولتے پھلتے ہیں۔ مرجھا بھی جاتے ہیں۔ اس جڑی بوٹی میں بڑے بڑے خواص ہیں مگر دُنیا کی کوئی شے بُری نہیں۔ اس میں ایک نہ ایک بھلائی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان بُری بنالے۔ موقع سے بُرائی بھلائی ہے۔ بے موقع بھلائی بھی بُرائی بن جاتی ہے۔ اس ننھے مُنّے پھول کے معصوم خول میں زہر بھی ہے امرت بھی ہے۔ سونگھو تو جان تازہ ہو جائے۔ کھاؤ تو مر جاتے پھل پھول ہو یا انسان ہو ان میں بھلائی بُرائی کے دو کارفرما ہوتے ہیں۔ لیکن جب بُرائی چھاؤنی چھالے تو سمجھو موت کا گھن لگ گیا۔

[اتنے میں رومیو بھی آگیا۔ لارنس نے دُعائیں دیں۔ باتوں باتوں میں رومیو نے اپنا ماجرا لارنس کو سُنا کر کہا "بابا! میرے دُکھ کا مداوا تمہارے ہاتھ ہے۔ جان جس ظالم کو سونپ رہا ہوں۔ وہ کپولٹ کی بیٹی ہے۔ جولٹ نام ہے۔ گو ہمارے خاندان آپس میں جانی دُشمن ہیں۔ مگر ہم دونوں بیاہ پر راضی ہیں۔ اب آپ کے دو بول شاملِ حال ہو جائیں۔ تو ہم ایک ہو جائیں"۔ لارنس سوچتا ہے، شاید خدا کو یہی منظور ہو کہ ان دونوں کے سنجوگ سے ان کے خاندان بھی ایک ہو جائیں۔ اس لئے مخفی طور پر انکے عقد پر راضی ہو جاتا ہے۔ رومیو کو بڑی جلدی ہے۔ چاہتا ہے کل کا ہوتا کاج آج ہو جائے اور جولٹ کو بیاہ لائے۔ مگر لارنس سمجھاتا ہے، "رومیو! جلدی کا کام اچھا نہیں! بیٹا، دُنیا میں دوڑ چلو، نہ پیر پھسلے!!۔" یہ باتیں کرکے رومیو گھر آیا۔ تو دیکھا۔ محلہ میں دوست احباب کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور ٹائی بالٹ نے رومیو کے بھیس بدل کے دعوت میں آنے پر جو خط رومیو کے والد کو لکھا ہے اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ وہیں رومیو بھی آجاتا ہے۔ سب ہنسنے بولنے لگتے ہیں۔ قریب نو بجے جولٹ کی ددا آتی ہے۔ رومیو کے ساتھی اس کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ ددا رومیو کو دریافت کرتی ہے۔ رومیو آپ اپنا تعارف کرتا ہے۔ دونوں الگ جا کر کچھ باتیں کرتے ہیں۔ ددا چلی جاتی ہے۔]

جولٹ:۔ (اپنے خانہ باغ میں) نو بجے سے پہلے ددا گئی تھیں۔ کہتی تھیں، آدھ گھنٹے میں آجاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ملے . . . . مگر یہ بات نہیں۔ ددا بوڑھی بھی تو ہیں . . . . محبت کا پیامی خیال ہوتا ہے۔ جو سُورج کی کرنوں سے بھی دس گُنا تیز خرام ہے! . . . . ادہو! سُورج سب سے اونچی پہاڑی پر آگیا۔ نو سے بارہ تک تین پہاڑ سے گھنٹے گزر گئے، مگر ددا کا پتہ نہیں۔ کاش اُن کے لہو میں جوانی کی گرمائی

ہوتی۔ اُنہیں اُلفت کا مزہ یاد ہوتا۔ تو طرارے بھرتی آئیں! ......

میرے اُن کے پیام سلام میں دَدا خُوب ہچکولے کھا رہی ہیں۔ بڑھیا ہی تو ہیں۔ بچاری نیم جان۔ آہا ہا! (اتنے میں دَدا کو آتا دیکھکر) اللہ تیرا شکر ہے آگئیں!!

(دَدا آتی ہے۔)

جولیٹ۔ پیاری دَدا کیا خبر لائیں! وہ ملے؟؟ ..... بولو چپ چپ کیوں ہو؟! اچھی بُری جو کچھ ہو، ہنستی پیشانی سُنا دو۔ خوش خبری ہے تو تمہارے اس اُداس چہرے پر بھی پھب جائیگی

ددا۔ مارے میں تھک کر چکنا چُور ہو گئی۔ مجھے تھوڑی دیر یونہی رہنے دو...... ارے رے رے! درد کے مارے میری ہڈیاں ٹکڑے جارہی ہیں!! تھوڑا پھرنا پڑا ہے!

جولیٹ۔ کاش تم نہیں، اور میں تم ہوتی! اور اُن کا سندیسہ لاتی!!

(جولیٹ دَدا کو ایک طرف لیکر بیٹھ جاتی ہے۔)

لو آؤ، اب کہو۔ اچھی ددا! بولو؟

ددا۔ اے میرے اللہ، اتنی کیا جلدی ہے۔ تھوڑی دیر کا بھی صبر نہیں۔ دیکھتی نہیں ہو۔ میرا سانس تو سماتا نہیں کیا خاک بولوں!

جولیٹ۔ (اداسی سے) سانس پھولے پر بھی تو آخر باتیں کر ہی رہی ہو؟ ...... اچھی زبردستی ہے..... کہہ چکو اچھی بُری جو بھی سُنا دو۔ میں قسمت پر شاکر رہوں گی۔

ددا۔ (سنجیدگی سے) ہاں! تو سُنو، لڑکا اچھا ہے۔ آنکھ ناک خاصی ہے ہاتھ پیر بھی چوکھے ہیں خلق و محبت کا گلدستہ نہ سہی۔ بھلا مانس ضرور ہے! بس جاؤ اب مزے کرو!.... جولیٹ! تم نے کھانا کھا لیا؟!!

جولیٹ۔ (اضطرابی سے) نہیں نہیں یہ ساری باتیں ہیں پہلے سے جانتی ہوں یہ بتاؤ بیاہ کے بارے میں انہوں نے کیا کہا؟

ددا۔ ہائے میرا درد سر! کیسا درد ہی ہو رہا ہے! اتڑخنے جاتا ہے، جیسے ٹکڑے ہو جائے گا..... اُف! میری کمر!! (درد کا بہانہ کرتی ہے۔) اللہ میری کمر! میری کمر! .....

(جولیٹ جلدی جلدی ددا کی کمر دبانے لگتی ہے۔)

ددا۔ (سنجیدگی سے) دیکھو جی! اب اپنے پیام سلام چھپر پر رکھو۔ مارے مارے پھرنے سے میری جان نکل جاتی ہے!۔

جولیٹ۔ ددا! یقین مانو مجھے بڑا دُکھ ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی۔ تم نڈھال ہو گئیں ...... (خوشامدانہ) مگر پیاری پیاری ددا بولو۔ انہوں نے کیا کہا؟

ددا۔ وہ کہتے ہیں..... جیسے ایک بھلا مانس کہتا ہے..... ہاں ہاں بھلا مانس!!..... تمہاری امی کہاں ہیں؟!!...

جولیٹ۔ (حیرانی سے) امی کہاں ہیں؟؟!!.. اندر ہیں۔ اور کہاں ہیں!!... کہاں جائینگی؟؟!!... (خفا سی ہوکر) واہ، ددا تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟... کیا خوب!!... کہتی ہو: وہ کہتے ہیں۔ بھلے مانس کی طرح،.... تمہاری امی کہاں ہیں؟!!

(جولیٹ روٹھکر ایک طرف بیٹھ جاتی ہے)

ددا۔ (کن انکھیوں سے جولیٹ کو دیکھکر بے تحاشہ ہنس دیتی ہے۔) ہیں!!! اب اشتیاق بڑھا؟؟!!..... (جولیٹ کو مناتے ہوئے۔) اچھا لو آؤ! سنو۔

(جولیٹ ہنستی ہوئی اُٹھکر ددا کو لپٹ جاتی ہے۔)

ددا۔ کیوں جی! میرے پیر توڑنے کا یہ بدلہ ہے کہ مجھ سے روٹھ رہی ہو؟ اچھا تو جاؤ۔ اب سے خود ہی پیام سلام کر لینا۔

جولیٹ۔ (خوشامد سے) نہیں ددا، مجھے کیا معلوم؟ تم چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔..... (بے تابی سے) لو اب سُنا دو۔

ددا۔ تم نے آج گرجا جانے کی پروانگی لے لی؟

جولیٹ۔ ہاں، لے لی۔

ددا۔ تو جاؤ۔ لارنس بابا کے پاس جلدی چلی جاؤ۔ وہیں میری مہربانی آج بنی بنے گی۔ .. (جولیٹ کو شرماتا دیکھکر) لے لو، اب شرم آگئی۔ گورے گورے گالوں پر لہو کی سُرخی دوڑ گئی!..... (جولیٹ کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے) جی! اُٹھو جلدی گرجا جاؤ ...

جولیٹ۔ میری دَدا!!

(ددا کو لپٹ کر چلی جاتی ہے۔)

[اس وقت تک رومیو بھی لارنس بابا کے پاس پہونچ گیا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔]

لارنس۔ خداوندا! تیرے آسمان اس پاک سنجوگ پر کچھ ایسے متبسم ہوں کہ زمانہ پھر ہمیں غم کی صورت نہ دکھائے!

رومیو۔ آمین، آمین!... لیکن غم بھی آسکتا ہے تو آئے یہ اس شادمانی کو ماند نہیں کر سکتا جو جولیٹ کے ہوتے مجھے نصیب ہوتی ہے۔ بابا! آپ دو ایک بولوں سے ہمارا پلہ باندھ دیجیے۔ پھر پریم کی بیرن، موت بھی آجائے تو ہرج نہیں۔ یہی کیا کافی ہے کہ اس نیک بخت کو میں اپنا کہہ لوں!۔

لارنس۔ نا بیٹا! ایسا نہیں کہتے..... طوفانی خوشیوں کا انجام

بھی طوفانی ہوتا ہے۔ انہیں آگ اور بارود سمجھ کہ اِدھر ملیں اُدھر بھک سے ہو گئیں۔ یاد رکھو! شہد جتنا میٹھا ہوگا اتنی ہی تھی سے ہوگا۔ اور بھوک مار دے گا۔ اسی لئے طوفانی محبت بھی بُری۔ یہ تو دل کی دھیمی آنچ پر اکسیر بنتی ہے۔ دیکھو، بیٹا! میں پہلے ہی کہہ چکا۔ دوڑو چلو۔ نہ پیر پھسلے۔

[اتنے میں جولٹ بھی آ گئی جس سے رومیو ہنسی خوشی باتیں کرنے لگا لیکن لارنس نے یہ کہہ کر روک دیا "آؤ! آؤ! تم دونوں میرے پاس آؤ۔ اب دیر نہ ہونی چاہیئے۔ جوان بیٹے بیٹیوں کی خلا ملا اس وقت تک ٹھیک نہیں، جب تک وہ اللہ رسول کے حکم سے ایک نہ ہو جائیں.... خیر تو اِدھر لارنس نے اِن دونوں کا عقد کیا اُدھر محلہ میں رومیو کے دوست بن وولیو اور مرکوشیو سے جولٹ کا ممیرا بھائی ـــ ٹائی بالٹ آ کر ملا۔ یہ اصل میں رومیو سے بن بلائے دعوت میں آنے کا بدلہ لینے آیا ہے۔ ٹائی بالٹ، رومیو کو دریافت کرتا ہے۔ مرکوشیو اُلٹے سیدھے جواب دیتا ہے۔ دلوں میں خاندانی بیر ہے۔ اس لئے تیز م تازی ہونے لگتی ہے۔ اس اثنا میں رومیو آ جاتا ہے۔ اب ٹائی بالٹ بجائے مرکوشیو کے رومیو سے اُلجھتا اور اُسے پاجی تک کہہ دیتا ہے۔ لیکن رومیو خیال کرتا ہے کہ جولٹ سے رشتہ ہو گیا۔ اب ٹائی بالٹ سے کیا لڑوں۔ اس لئے اُس کی باتیں سہہ لیتا ہے۔ مگر مرکوشیو کے آگ لگ جاتی ہے۔ ٹائی بالٹ اور اس کے ساتھی بہت خوش ہیں کہ رومیو ڈر گیا۔ اور جانے لگتے ہیں۔ مگر مرکوشیو بگڑ کر ٹائی بالٹ کو آواز دیتا ہے۔ تلواریں بے نیام ہوتی ہیں۔ اور لڑائی ہونے لگتی ہے۔ رومیو بہتیرا رد کتا ہے۔ مگر مرکوشیو نہیں مانتا۔ بپھرا شیر بنا ہوا ہے۔ تا آنکہ رومیو آگے بڑھ کے بیچ بچاؤ کرتا ہے "اور مرکوشیو کو ہاتھ سے ہٹانا چاہتا ہے کہ ٹائی بالٹ موقع پا کر مرکوشیو پر کاری وار کر دیتا ہے، جو تھوڑی دیر میں مر جاتا ہے۔ اس حادثہ سے رومیو بے آپے ہو جاتا ہے۔ غم و غصہ سے تلوار لیکر بھاگتا ہوا ٹائی بالٹ کے پاس جاتا اور کڑک کر کہتا ہے "ٹائی بالٹ! آ، اب اس کا فیصلہ کر لیں کہ پاجی کون ہے؟ تو یا میں؟ مرکوشیو کی رُوح ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اور میری یا تیری یا دونوں کی منتظر ہے۔ اس لئے دُنیا کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ یہ سُنکر ٹائی بالٹ بھی تیز ہوتا ہے۔ اور دونوں میں تلوار چلتی ہے۔ مگر لڑائی میں ٹائی بالٹ مارا جاتا ہے۔ رومیو کا جگری دوست بن وولیو جو رومیو کو بھاگتا ہوا دیکھ کر ساتھ آ گیا تھا۔ یہ ماجرا دیکھتا اور رومیو کو ترکیب سے فرار کر دیتا ہے۔ اور خود وہیں رک جاتا ہے۔ اس لڑائی اور قتل کی خبر آناً فاناً میں چوطرف پھیل جاتی ہے۔ رستہ پر شہریوں کا ہجوم ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر میں بادشاہ سلامت بھی آتے ہیں۔ دریافت حال پر بن وولیو سارا قصہ سچ سچ بتا دیتا ہے۔ بادشاہ سوچتا ہے کہ ٹائی بالٹ نے مرکوشیو کو جان سے مارا تھا۔ جو شاہی خانوادے کا رکن تھا۔ اس سے اسے موت کی ہی سزا دی جاتی مگر چونکہ رومیو نے اُسے مار ڈالا۔ جو بجائے خود اک جرم ہے۔ اس لئے رومیو کو جلاوطن کر دیا۔ اور دوسرے فسادیوں پر سخت جرمانے کئے۔ اِدھر یہ حادثے ہو رہے ہیں اُدھر جولٹ ان باتوں سے بے خبر خانہ باغ میں اپنے آپ باتیں کرتی مگن بیٹھی ہے۔]

جولٹ:- سُورج دیوتا! سدھارو! جلدی اپنی سواری بڑھاؤ۔ آج تمہارے قدم کیوں جم گئے۔ ایک گھٹا ٹوپ رات کی اندھیری ڈالدو کہ پیت کی ریت ہو جائے۔ اور وہ آئیں تو کوئی انہیں دیکھ نہ پائے۔ اے سیاہ ابروؤں والی پیاری رات! جلدی آجا! اور اپنے ساتھ خیر سے انہیں بھی لا جو میرے مَن کا اُجالا ہیں! ..... اور ہاں دیکھ، دُنیا آنی جانی ہے۔ فانی ہے۔ اے رات! وہ جب بھی اللہ کو پیارے ہوں، تو اُن کے ذرات کو جگمگاتے تارے بنا دینا کہ آکاش مگھ ہو جائے! اور ساری دُنیا تجھے ہی عزیز رکھے۔ دہکتے سورج کو کوئی نہ پوچھے...... ہائے! میں نے بک کر تو پریم محل خریدا۔ مگر میرے قبضے میں نہیں مجھے اس سے آرام نہیں.......... دن کیسا اجیرن ہو گیا! ..... مجھے رات کا ایسا انتظار ہے۔ جیسے تہوار کے پہلے رات میں ایک بے تاب بچہ نئے نئے کپڑے دیکھ کر باغ ہوتا ہے۔ مگر انہیں پہن نہیں سکتا!..... اے لو، دَدا آ رہی ہیں ضرور، کوئی خوشخبری لائی ہیں۔ ایک دوا کیا جو بھی میرے ساجن کا نام لیتا ہے۔ سمجھو منہ سے بہشتی پھول برساتا ہے!!

(ددا آتی ہے۔ سراسیمہ۔ کفِ افسوس ملتی ہوئی۔)

جولٹ:- کیوں ددا، خیر تو ہے؟ یوں ہاتھ کیوں مل رہی ہو؟

ددا:- ارے غضب ہو گیا۔ وہ مر گیا۔ فنا ہو گیا! ہم کہیں کے نہ رہے۔ برباد ہو گئے!

جولٹ:- ہائیں!! کیا فلک نے کوئی نیا گل کھلا دیا؟!

ددا:- فلک نے نہیں تمہارے دولہا نے! ..... ارے رومیو! رومیو! کسی کو اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ رومیو!! .....

جولٹ:- ددا! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟؟ کیوں تم مجھے کانٹوں پر کھینچ رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا ہوا؟ تم نہیں جانتیں یہ دُکھ مجھے دوزخ کے برابر ہے!

ددا:- میں نے زخم دیکھا۔ خدایا تیری پناہ! اپنی آنکھوں میں نے اُس کے

چھاتی پر زخم دیکھا ہے۔ لاش خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ چہرہ سفید گویا دھویا ہوا کپڑا ــــ یہ دیکھ کر میرے تو اوسان جاتے رہے مجھے غش آ گیا۔

جولیٹ:۔ شق ہو جا۔ اے دل! مفلس، دوالیہ۔ شق ہو جا۔ آنکھوں بے نور ہو جاؤ کہ پھر کبھی سُکھ چین کا منہ نہ دیکھو جسم! تو بھی مٹی کے حوالہ ہو کہ اب آرزو، ارمان ملیامیٹ ہو گئے!!

دوا:۔ ہائے! ٹائی بالٹ! ٹائی بالٹ!! محبت دار۔ ملنسار۔ بھلے مانس! کیا میں تیری موت ہی کے لئے ابتک زندہ رہی تھی۔

جولیٹ:۔ الہی! یہ کیسی چربائی ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ کسی نے انہیں قتل کر ڈالا؟ یا ٹائی بالٹ بھیا مر گئے؟ آخر ہوا کیا؟؟ اگر وہ دونوں نہ رہے، تو پھر دُنیا میں رہا کون؟ صور کیوں نہیں پھنک جاتا!!

دوا:۔ تمہارے دولھا نے تمہارے بھائی کو مار ڈالا۔ اور خود جلا وطن ہو گئے۔

جولیٹ:۔ غضب خدا! ٹائی بالٹ بھائی کا خون اُن کے ہاتھوں ہوا ـــ!

دوا:۔ ہاں، یہی تو ہوا۔ اُس گھڑی جھلسا لگ جائے۔ ایسا ہی ہوا!!

جولیٹ:۔ (ایک دم بپھر کر) روّمیو! او پھولوں کے ڈھیر! تجھ میں ناگ چُھپا تھا!!! ایسے سُندر ڈھیر میں بھی سانپ ہوتے ہیں؟! ــــ خوبصورت ظالم! فرشتہ رُو قاتل!! قمری کی صورت شکرے!!! بھیڑ کی صورت بھیڑیئے!!!!..... (اور زیادہ بگڑ کر) ایزدی سروپ کے بھونڈے نمونے! جو تم دکھائی دیتے ہو، وہ نہیں! نہ جانے قدرت اُس وقت کون سے جہنمی کام کی دیکھ بھال میں تھی جو ایسی دلفریب گوشت پوست والی فانی بہشت میں تم بس گئے!! روّمیو ایک دلفریب لفافہ ہے۔ جس میں بدی کا نقش بند ہو!..... اُف! ایسے سجیلے ایوانِ عناصر میں یہ دغا، یہ فریب رہے!!

دوا:۔ اس دُنیا میں بھلا کس پر بھروسہ کیا جائے۔ جسے دیکھو جھوٹا۔ مکار!..... ارے کوئی ہے!..... (نوکر سے) لا میرے پینے کا امرت جل تو لے آ! یہ دُکھ۔ یہ غم۔ مجھے مروڑے ڈالتے ہیں.... خدا روّمیو کو شرمائے!.....

جولیٹ:۔ (چونک سی پڑتی ہے۔) دوا! تمہاری زبان کٹے! انہیں ایسا کیوں کہتی ہو؟ تم کیا جانو! شرمندہ ہونے کو وہ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ شرمساری تو اُن کے ابرو پر آتے شرماتی ہے۔ وہ تنہا سریرِ ناموس ہیں۔ میں بھی عجیب ہوں کہ حق ناحق کو میں نے انہیں بُرا بھلا کہدیا!

دوا:۔ بیٹی! اُنہوں نے تو تمہارے میرے بھائی کو مار ڈالا۔ اب بھی تم اُنہیں کی گائے جاتی ہو؟

جولیٹ:۔ کیوں نہ گاؤں۔ کیا اپنے سرتاج کو بُرا کہوں؟ بیاہ کو تین گھنٹے ہوتے کہ میں نے انہیں اتنا بُرا بھلا کہدیا۔ خدا مجھے معاف کرے! ... لیکن سچ پوچھو تو اُنہوں نے بُرا کیا کہ میرے بھائی کو مار ڈالا ..... مگر ہاں یہ بات بھی تو تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ خود مارے جاتے۔ بس تو نادان آنسوؤں اپنے اصل چشمے لوٹ جاؤ۔ تم دُکھ کی نشانی ہو۔ خوشی میں تمہارا کیا کام۔ یہ کیا کم ہے کہ وہ جیتے ہیں! ایسی خوشی کی بات پر میں کیوں روؤں! .. مگر اس قتل سے بھی زیادہ ایک اور بات ہے جو مارے ڈالتی ہے۔ اور بھلائے نہیں بھولتی۔ جیسے گنہگار کو اپنے ناپاک گناہوں کا خیال! یعنی ٹائی بالٹ بھیا مر کے چھوٹے۔ وہ جیتے جی چھوٹ رہے ہیں۔ جلا وطن ہو رہے ہیں.... "جلا وطنی!" اُف! کہنے کو یہ دو لفظ ہیں۔ مگر انہوں نے ٹائی بالٹ جیسے میرے ہزاروں عزیزوں کو مار ڈالا...... بھائی مر گئے تھے۔ کافی دُکھ دے گئے تھے۔ یا اگر مصیبت تنہا نہیں آتی تو دوا نے پھر یہ خبر کیوں سُنائی کہ میرے ماں باپ بھی مر گئے۔ میں یتیم یسیر ہو گئی! یا جائیکہ بھائی کی موت کے ساتھ کانوں نے دل کی موت کی خبر سُنی کہ وہ جلا وطن ہو گئے۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں، باپ بھائی بہن، میں، وہ، سب مر گئے۔ برباد ہو گئے!..... "روّمیو جلا وطن ہو گئے!!" اس جملے کے دُکھ کا حد و حساب نہیں! دُنیا کے کوئی لفظ مجھ پر ایسا ستم نہیں ڈھا سکتے!!...... (ہراساں ہو کر) دوا! میرے ابا جان کہاں ہیں؟ میری امی کہاں ہیں؟۔

دوا:۔ تمہارے ماموں کے ہاں ہیں۔ مرنے والے کی جواں مرگی کو روتے ہیں۔ چلتی ہو۔ تمہیں بھی لے چلوں؟

جولیٹ:۔ نہیں۔ انہیں اپنے آنسوؤں سے مرنے والے کے زخم دھو لینے دو۔ میرے آنسو جب بہیں گے کہ ان کے خشک ہو جائیں!...... ہائے! اب جولیٹ سہاگن بیوہ مرے گی!!

دوا:۔ جاؤ بیٹی! اب آرام کرو۔ میں لارنس بابا کے پاس جاتی ہوں۔ تمہارے دولھا وہیں ہوں گے۔ ان سے کہوں گی۔ جانے سے پہلے رات کو چھپ چھپا کے وہ تم سے رخصت ہو جائیں۔

جولیٹ:۔ ہاں دوا، ضرور جاؤ۔ تو یہ میری انگوٹھی بھی انہیں نشانی دیدینا۔ اور کہنا، ضرور ضرور آ کر مجھ سے وداع ہو جائیں!

(دوا چلی جاتی ہے)

[رومیو ٹائی بالٹ کو مار کے لارنس بابا کے ہاں آگیا ہے۔ لارنس باہر گیا ہوا ہے کہ رومیو کے بارے میں شاہی حکم سزا سن کر آتے۔ تھوڑی دیر میں آتا ہے۔ اور رومیو کو جلا وطن ہونے کی خبر سُنا کر کہتا ہے کہ خُدا نے بڑا رحم کیا کہ تمہاری جان بچ گئی۔ مگر رومیو کی نظر میں دُنیا اندھیر ہو جاتی ہے-]

لارنس:- رومیو! گھبرانے کی بات نہیں۔ ورونا سے جلا وطن ہو گئے تو کیا ہوا۔ دُنیا پڑی ہے۔ بیٹا! پائے گدا — ملک خُدا

رومیو:- بابا! ورونا کی چار دیواری سے باہر دُنیا نہیں، دُکھ ہی دُکھ ہے۔ دوزخ ہے۔ یہاں سے جو جلا وطن ہوا۔ سمجھو، دُنیا سے جلا وطن ہوا۔ جس کا دوسرا نام موت ہے! ..... آپ جلاوطنی کو کچھ نہیں سمجھ سکے۔ اُسے ظلم نہیں رحم کہتے ہیں! گویا سونے کی چھری سے مجھے ذبح ہوتے دیکھ کر مطمئن ہیں!! ..... بہشت تو یہاں ہے۔ جہاں جولٹ رہتی ہے ..... بابا! خدارا کہیے، یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ ہر کس و ناکس تو اس جنت میں رہے۔ جولٹ کو دیکھے۔ مگر رومیو اُس کے دیدار کو ترسے جو میرے لئے جیتے جی کی موت ہے ..... (مضطرب ہو کر) آپ میرے محسن ہیں۔ بزرگ ہیں۔ صاحب دل ہیں! لِلّٰہ دیکھئے کہ جلا وطن ہو کر میری رُوح کس طرح پاش پاش ہوئی جاتی ہے!

لارنس:- دیوانے! میں تجھے اس کی بھی روک بتائے دیتا ہوں۔ سُن بیٹا! دھیان گیان فلاکت کا کھاجا ہوتا ہے۔ اس سے تیرے دل کو بھی قرار آجائے گا!

رومیو:- تبہ! دھیان گیان کو آنچ لگائیے! بھلا یہ کیا میری مدد کریگا ان سے نہ حکم شاہی رد ہوگا۔ نہ جولٹ ہی ملیگی!

لارنس:- تو معلوم ہوا دیوانوں کے کان بھی نہیں ہوتے!

رومیو:- کیسے ہو سکتے ہیں، بابا! جب سیانوں کے آنکھیں نہیں ہوتیں!

لارنس:- کیا؟؟

رومیو:- بابا! بُرا نہ مانیے، آپ اُس بپتا کی نسبت کیا کہہ سکتے ہیں۔ جو آپ پر نہیں پڑی۔ ہاں میری طرح آپ بھی نوخیز ارمان لئے ہوتے۔ آپ کے سر میں بھی سودا ہوتا۔ کسی جولٹ کی چاہت ہوتی۔ اس سے بیاہ کو کچھ ہی دیر گزرتی کہ کوئی ٹائی بالٹ آپ کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اور آپ جلا وطن ہو جاتے تو پھر ایسی باتیں نہ کرتے۔ بلکہ سر پھرا نکل جاتے!

[اس موقعے پر جولٹ کی دایہ آجاتی ہے — دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ لارنس دروازہ کھول کر اُسے اندر بلاتا ہے۔ رومیو، دایہ کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ پوچھتا ہے: جولٹ کیسی ہے؟ کہاں ہے؟!

کیا کرتی ہے؟ میرے متعلق کیا کہتی ہے؟ مجھے تو قاتل سمجھتی ہوگی؟ ہائے! میں نے معصوم خوشی کے دامن کو کیوں خونیں کر دیا! اس خیال سے بے آپے ہو کر کہتا ہے، بتاؤ، ارے مجھے کوئی بتاؤ کہ اس تن خاکی میں رومیو کہاں ہے کہ میں اُسے مٹا دوں! جھٹ خنجر نکال کر چاہتا ہے کہ اپنا کام تمام کرے۔ مگر لارنس بابا آڑے آجاتے ہیں-]

لارنس:- (رومیو کا ہاتھ پکڑ کر) کیا کرتے ہو! کوئی آدمی ہو؟ ..... صورت شکل سے انسان ہو۔ انسان ہی بنو۔ عورتوں کی طرح بتھر مارنے سے کیا ہوگا ..... بھئی واہ! ظاہر میں مرد، باطن میں عورت! یا ان دونوں کے برن میں کوئی اور!! ..... حیرت کی بات ہے کہ تم بھی اس پر اتر آئے۔ میں تمہیں طبیعت کا اتنا ہیٹا نہیں سمجھتا تھا ..... ٹائی بالٹ کو تو مار ڈالا۔ خود کو بھی مارے ڈالتے ہو۔ لیکن یہ بھی سوچا کہ جولٹ کی جان بھی تمہارے ہی قالب میں ہے اس ناشدنی بات سے اُسے بھی جیتے جی مار ڈالو گے ..... یہ بھی اچھی رہی کہ اپنا آپا بُرا، زمین بُری، آسمان بُرے! میاں! یہ سب تمہارے ہی ہونے سے تو ہیں۔ بلکہ خود تم میں ہیں۔ تم نہ ہوگے تو یہ بھی نہ رہینگے۔ خود کو گنوا کے انہیں رائیگاں کرتے ہو!! ... توبہ! توبہ!! ایسی باتوں کو تو تمہاری زندہ دلی، چاہت، وجاہت سب کو شرم آتی ہوگی جو تم میں مہاجن کے سُود کی طرح بے حساب ہیں۔ یقین مانو تم ان میں سے ایک سے بھی کام نہیں لے رہے۔ ورنہ تم میں چار چاند لگ جائیں ..... واہ وا واہ! تم تو موم کی مریم ہی نکلے۔ کیوں جی! وہ وفا و محبت کے عہد و پیمان ہوا ہو گئے؟؟!! صاحبزادے! اپنی زندہ دلی کا تو پاس کرو۔ وہ تمہاری چاہت، وجاہت کی آرسی ہے۔ آج اُسے ایسی بارود نہ بناؤ جو ایک اُجڈ سپاہی کے پاس ہو۔ اور جس میں نادانی سے وہ آگ لگا لے! نہ ہو کہ پھر پچھتا کر یہ کہنا پڑے کہ گھر کو گھر کے چراغ ہی سے آگ لگ گئی!! ..... (رومیو کو اٹھاتے ہوئے) چلو اُٹھو۔ مردِ خدا! ..... سُنو۔ تمہاری جولٹ زندہ ہے۔ اس کی خاطر تم مر گئے ہوتے۔ ٹائی بالٹ تمہیں مار ڈالتا۔ مگر تم نے اُسے مار ڈالا۔ قانون بھی بجائے دشمن کے تمہارا دوست ہے کہ پھانسی کی جگہ تمہیں جلا وطنی کا حکم ہوا ہے۔ جو کچھ کم خوشی کی بات نہیں۔ بیٹا! دیکھو تو فضل خدا تمہارے شامل حال ہے خوشی خرمی نے چھاؤنی چھائی ہے۔ مگر تم ہو کہ ایک بدنہاد لونڈی کی طرح تقدیر پر بڑبڑا رہے ہو! ..... سمجھ سے کام لو۔ ورنہ یاد رکھو، ایسے بن آئی مرا کرتے ہیں!! جاؤ، اپنی دُلہن کے پاس جاؤ۔ اس سے مل آؤ۔ مگر زیادہ نہ ٹھہرنا۔ مُنہ اندھیرے ہی تمہیں شہر سے چلا جانا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد ہم موقع سے تمہاری شادی کا

ذکر کردیں گے۔ بادشاہ سلامت سے بھی معافی چاہ لیں گے۔ اور تمہیں واپس بلالیں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آج اداس جاتے ہو، اللہ چاہے کل خوش خوش آؤ گے۔ ددا، جاؤ۔ بٹیا سے کہدو کہ یہ آرہے ہیں!

[ددا، رومیو کو جولیٹ کی دی ہوئی انگوٹھی دیدیتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ اس انگوٹھی کو دیکھکر رومیو باغ باغ ہے۔ پھر آکر ددا دیکھتی ہے۔ اس کے سرکار، بیگم اور پیرس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں جولیٹ کی شادی کی ہیں۔ جن میں آخر یہ قرار پاتا ہے کہ دو تین دن میں پیرس سے جولیٹ کی شادی ہو جائے گی۔ ددا دبے پاؤں نکل کر جولیٹ کے پاس جاتی ہے اور رومیو کے آنے کی خبر کرتی ہے۔ خیر! تھوڑی دیر میں چوطرف سناٹا ہو جاتا ہے۔ جولیٹ جھروکے میں آکر رومیو کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد رومیو بھی آجاتا ہے۔ اور یہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت ایکا ایکی رومیو کو لوے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ صبح ہو رہی ہے۔ رومیو کو لارنس کا کہا یاد آتا ہے کہ اُسے منہ اندھیرے شہر سے چلا جانا ہے۔ اس لئے جانے کا ارادہ کرتا ہے۔]

جولیٹ۔ ابھی صبح تو نہیں ہو رہی! آپ جا رہے ہیں!! (پرندکی آواز بغور سُنکر) یہ لوے کی آواز تھوڑی ہے۔ بلبل کی ہے۔ جو روز رات کو اِدھر انار کے درخت پر بولا کرتا ہے! (رومیو کو متامل دیکھکر) سچی! وہ بلبل ہے!!

رومیو۔ اچھا؟!! مجھے تو لوے کی آواز معلوم دی۔ جو صبح کا پیامی ہے.... مگر جولیٹ! دیکھنا، مشرقی بادلوں میں وہ نور کی دھاریاں کیسی ہیں؟..... کافوری شمعیں بھی پوری پوری جل چکیں..... ہنس مکھ دن پہاڑ کی چوٹیوں پر آتا دکھائی دے رہا ہے...... (اپنے میں آپ) اب جاؤں اور زندہ رہوں۔ یا ٹھیروں اور مرجاؤں'

جولیٹ۔ وہ روشنی؟ نہیں، دن کی روشنی نہیں! میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ تو کوئی شہاب ہے۔ جسے سورج نے اُگل دیا ہے کہ آج رات سفر میں آپ کو مشعل کا کام دے!..... بس تو ٹھہرئیے! ابھی مت جائیے!!

رومیو۔ تم کہتی ہو تو میں نہیں جاتا۔ کچھ پروا نہیں کہ لوگ مجھے پکڑ لیں یا مار ڈالیں۔ ٹھیک ہے۔ وہ بھُورا بھُورا دھندلکہ دیدۂ صبح نہیں۔ وہ تو حُسن کی دیبی کا ہلالِ ابرو ہے! نہ یہ لوا بول رہا ہے جسکے چہکنے سے گنبدِ فلک گونج اُٹھتا ہے!... بلکہ اب تو جانے سے زیادہ

مجھے ٹھہرنا مزہ دے رہا ہے۔ آ، موت! خوش آمدید! جولیٹ کی یہی مرضی ہے!!!.... تو لو آؤ، اب جی کھولکر باتیں کریں..... ہائیں!! چپ ہوگئیں؟؟!!

جولیٹ۔ (روشنی کو دیکھتے ہوئے) جی نہیں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دن نکل رہا ہے۔ جائیے۔ جلدی جائیے۔ یہ لوا ہی بول رہا ہے جسکے چہچہے کانوں کے پار ہوتے جاتے ہیں..... جائیے۔ اب جائیے۔ روشنی بڑھنے لگی۔

رومیو۔ آہ! روشنی کیا بڑھ رہی ہے۔ سیاہ بختی بڑھ رہی ہے!

(ددا آتی ہے)

ددا۔ بی بی؟

جولیٹ۔ ددا؟؟

ددا۔ تمہاری امّی بیگم آرہی ہیں۔ دن نکل آیا۔ کچھ خبر بھی ہے؟!

جولیٹ۔ (کھڑکی کے پٹ کھولتے ہوئے) بس تو اے کھڑکی! روشنی کو آنے دے۔ جان کو نکل جانے دے۔

رومیو۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ! اللہ نگہبان!!

جولیٹ۔ میرے سرور! سرتاج! پریمی! پیتم! آپ مجھے چھوڑے جا رہے ہیں!..... دیکھئے! ہر روز اپنی خیریت بھیجتے رہیئے گا۔ کیونکہ آپ کے نہ ہوتے ایک ایک پل میرے لئے کئی کئی دن کے برابر ہوگا!!

رومیو۔ ہاں ہاں، ضرور۔

جولیٹ۔ ہم پھر کبھی ملیں گے، پیتم؟!

رومیو۔ پیاری! دل تو کہتا ہے!!.....

(رومیو چلا جاتا ہے)

جولیٹ۔ اے نصیب! اے مقسوم!! لوگ تجھے متلون کہتے ہیں۔ تو اپنے تلوّن کا ہی کرشمہ دکھا دے کہ وہ مجھ سے جلدی آن ملیں!!

بیگم کپولٹ۔ (اندر سے آواز دیتی ہوئی آرہی ہیں۔) کیوں بیٹی! اُٹھ گئیں؟

جولیٹ۔ (اپنے میں آپ) کون؟ امّی!..... رات کو دیر سے سو کر بھی اتنے سویرے بیدار ہوگئیں؟!..... یا اللہ خیر!..... کس لئے یہاں آرہی ہیں؟؟

(بیگم، جولیٹ کے پاس آتی ہیں)

بیگم۔ کیوں، کیسی ہو؟ جولیٹ!

جولیٹ :- امّی، جی اچھا نہیں ہے۔

بیگم :- بھائی کے مرنے پر آخر کب تک روگی؟ ان آنسوؤں کے طوفان میں تو قبر سے مُردہ بھی بہہ جائے!..... بیٹی! اب جتنا چاہے رولو۔ وہ تو جینے سے رہا! میری دانست میں تو تھوڑا غم محبت کی نشانی ہے۔ زیادہ غم نادانی!!

جولیٹ :- امّی! ایک بیش بہا شے کے چھن جانے پر کیسے نہ روؤں؟

بیگم :- ہاں ہاں، مگر.....

جولیٹ :- اپنوں ہی کیلئے رویا جاتا ہے۔

بیگم :- بھائی کی موت سے زیادہ تو اس موذی کے جان جانے کو رو، جس نے تمہارے بھائی کو جان سے گزرا!

جولیٹ :- وہ کون موذی ہے، امّی؟

بیگم :- وہی موذی — رومیو۔

جولیٹ :- ہائے غضب! کیسا موذی ہاتھ سے نکل گیا۔ اس خیال سے مجھے دلی دُکھ ہوتا ہے۔

بیگم :- تھوڑے دُکھ کی بات ہے کہ وہ عیار جیتا جاگتا بچ گیا!!۔

جولیٹ :- امّی، کاش میرے ہاتھ اس کے گلے تک پہونچ سکتے!... میری طرح تائی بالٹ بھیّا کا کوئی بھی بدلہ نہ لے سکتا۔

بیگم :- گھبراؤ نہیں۔ ہم اُس سے بدلہ لیکر چھوڑیں گے.... بس اب رونا دھوتا چھوڑ دو۔ وہ مربیا نتو میں نظر بند ہے۔ وہاں ایک آدمی کے ہاتھ زہر بھیجیں گے کہ وہ جانہار بھی تائی بالٹ کے پاس پہونچ جائے۔ اسے تم کو بھی قرار آجائے گا۔

جولیٹ :- مجھے تو اُس وقت تک قرار نہ آئے گا کہ رومیو کو دیکھ لوں —— مُردہ، میرا دل نہیں مانتا!...... امّی! اُسے "ہلاہل" میں بھیجوں گی اور خوب تیز بنا کے بھیجوں گی!!..... کیا بتاؤں، اس کے نام اور "ہلاہل" کے خیال سے میرے دل کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ مگر افسوس! اُس تک نہیں پہونچ سکتی؛ ورنہ بتاتی کہ مجھے تائی بالٹ سے کتنا لگاؤ تھا!!!

بیگم :- اچھا تو تم زہر فراہم کرو۔ مَیں آدمی فراہم کرتی ہوں.... مگر ماں جولیٹ! یہ خوشخبری تو سنو؟

جولیٹ :- سنائیے امّی! کیا ہے؟ ایسے وقتوں خوشی کی بات بڑی سُہانی ہے!

بیگم :- ہاں، سُنو بیٹی! تمہارے ابا بڑے سمجھ کے آدمی ہیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ تم رنجیدہ ہو تو جھٹ تمہاری خاطر ایک "روزِ خوشی" قرار دیدیا بھئی، جو دید ہے۔ نہ شنید ہے!

جولیٹ :- اچھا!..... وہ کیا روز ہے!

بیگم :- جمعرات!..... آئندہ جمعرات کی صبح کو نوجوان، شوریدہ اور بھلے مانس پیرس سے ہنسی خوشی تمہارا بیاہ ہو جائیگا!!

جولیٹ :- (حیران ہو کر)..... ہیں، یہ تو بڑی جلدی ہے۔ امّی ابا جان سے کہئیے۔ اتنی جلدی نہ کریں۔ ورنہ اس وقت تو یہ کام ایسا ہی بے موقع ہوگا۔ جیسے پیرس کے بجائے رومیو سے میرا بیاہ ہو گیا!!۔

بیگم :- لے لو تمہارے ابا بھی اِدھر آرہے ہیں۔ اب تم خود ہی اُن سے کہہ لو۔ دیکھو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

(کپولٹ اور دودا آتے ہیں)

کپولٹ :- سُورج غروب ہوتا ہے تو فلک اُس کے آنسو ٹپکاتا ہے مگر میرے بھانجے کے غروب پر بارش ہو رہی ہے۔ (جولیٹ سے)۔ ہائیں، لڑکی! تمہارے آنسوؤں کی لڑیاں ابھی جا رہی ہیں ہیں؟ آنکھیں ہیں یا سر جیون چشمے! مَیں دیکھ رہا ہوں، ایک ہی وقت میں تم کشتی بھی ہو۔ سمندر بھی ہو۔ بادِ مخالف بھی ہو۔ یعنی تمہاری آنکھیں سمندر ہیں جن میں اشکوں کا مدوجزر ہوتا ہے۔ تن کشتی کہ اس کھاری سمند میں تیر رہی ہے۔ اور آہیں بادِ مخالف ہیں۔ نہ ہو کہ ان کا طوفان تمہا جیون نیّا ڈبو دے!..... کیوں جی، بیگم! تم نے جولیٹ کو میرا فیصلہ سُنا دیا؟

بیگم :- ہاں کہدیا۔ مگر یہ بات صاحبزادی کے بھاتی ہی نہیں۔

کپولٹ :- کیا بات!....... ہم تو اس کے لئے اتنا کریں مگر اس کے بھاتی ہی نہیں۔ نالائق یہ تو سمجھے کہ ایک لائق سے اس کا پلّہ بندھ رہا ہے۔

جولیٹ :- آپ مجھ پر بے حد شفقت فرماتے ہیں۔ اس کی ممنون ہوں، مگر.......

کپولٹ :- مگر کیا؟!..... بس لگی منطق بگھارنے!.... یہ مَیں کچھ نہیں۔ صاف سُن لو، پیرس سے تمہارا بیاہ ہوگا۔ ورنہ نہ ہوگا۔

جولیٹ :- ابّا جان! خُدارا میری تو سُن لیجئے!

کپولٹ :- چپ۔ نالائق، مُردار! میں تیرا ایک لفظ نہیں سُنو!..... بیگم! اس ناشدنی کو ہم ایسا نہیں سمجھتے تھے..... واہ رے

قسمت! لڑکی بھی ہے تو عذاب جان!

ددا:۔ سرکار! اتنا غصہ نہ کیجئے۔ بچی کو یوں بُرا بھلا نہ کہیئے۔ خدا اُسے اپنی امان میں رکھے!

کپولٹ:۔ تم چُپ رہو جی۔ بڑی عقل کی دیبی بن کے آئی ہیں۔

ددا:۔ سرکار، میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔

کپولٹ:۔ پھر وہی!۔

ددا:۔ (دبی زبان سے) ونّی، بات کرنی مشکل ہوگئی۔

کپولٹ:۔ جاؤ۔ جاؤ۔ دفعان ہو۔ اپنے برابر والوں کو عقل سکھاؤ۔ یہاں ضرورت نہیں۔

بیگم:۔ لے ہے، اتنا غصہ نہ کیجئے

کپولٹ:۔ اس نامنجو رنجی کی باتیں مجھے پاگل بنائے دیتی ہیں۔ دن، رات، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے مجھے اسی کا خیال ہے کہ یہ اپنے گھر کی ہوجائے۔ کسی شریف سے اس کا پلہ بندھے۔ . . . . پیرس کو دیکھو بھلا مانس۔ خوبصورت۔ ذات جماعت کا اچھا۔ سوچی تھا ان لاڈو کو اس کے سر چیپ دوں گا۔ مگر یہ اپنی عقل کے آگے کسی کی چلنے نہیں دیتی۔ . . . . . . (جولیٹ سے) خوب کان کھول کے سُن لے: اس دیوانگی کا میرے ہاں گزارا نہیں۔ جمعرات نزدیک ہے۔ دل پر ہاتھ رکھ۔ اس سے صلاح لے۔ پھر تو تو میری بیٹی، میں تیرا باپ۔ ورنہ دربدر بھیک مانگے گی۔ فاقوں بھی مرجائے گی تو الٹ کر نہیں دیکھونگا۔ یاد رکھ، پھر تجھے مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔

(یہ کہکر کپولٹ چلا جاتا ہے)

جولیٹ:۔ اے اللہ! تیرے آسمانوں میں کیا رحم نہیں رہا کہ میرے دُکھ درد کی گہرائیاں دیکھے؟! . . . . پیاری امّی! مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکئے۔ اس بیاہ کو ہفتے عشرے کے واسطے روک دیجئے۔ یا نہیں تو پھر میری سہاگ سیج بھی مقبرے میں سج دیجئے۔ جہاں ٹائی بالٹ بھیا موت کی نیند سوتے ہیں۔

بیگم:۔ بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ اب جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بیٹی ہم تو تم سے دہلیا!

(بیگم بھی چلی جاتی ہیں)

جولیٹ:۔ خدایا!! . . . . . ددا!!! . . . . . . یہ بیاہ کیسے رُکے گا وہ زمین پر زندہ سلامت ہیں . . . . . . اب میں کیا اُن کا بُرا چیتوں کہ وہ دُنیا کو خیرباد کہیں۔ جنت سدھاریں . . . . . ددا! مجھے تسلی دو۔ کوئی صلاح دو . . . . . . ہائے اللہ! مجھ ناتواں بندی کا بے سبب آسمان دشمن ہوگیا . . . . . پیاری ددا! تم چُپ ہو! کچھ نہیں کہتیں؟ کیا میرے لئے آج تمہارے پاس ایک حرف تسلی بھی نہیں؟؟

ددا:۔ بیٹی! . . . . . . رومیو جلاوطن ہوگئے۔ اب دُنیا اُن کو تمہارے پاس نہیں لاسکتی۔ آئے بھی تو چوری چھپے آئیں گے۔ جو ٹھیک نہیں۔ یہ سب دیکھتے بہتر ہے کہ پیرس میاں ہی سے تمہارا بیاہ ہوجائے۔ بڑے خوبصورت آدمی ہیں۔ میاں رومیو تو اُن کے آگے پانی بھرتے ہیں! دیکھنا، آنکھیں تو ایسی پائی ہیں کہ نگوڑی ہرن کی بھی کیا ہونگی:: . . . . . میں سمجھتی ہوں اس دوسرے سنجوگ سے تمہیں بڑی خوشی ہوگی۔ یہ پہلے سے کہیں بہتر ہے بہتر نہ بھی ہوا تو پہلے سے کم بھی نہیں۔ اور میاں رومیو کا تو اب تمہارے لئے ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

جولیٹ:۔ ددا! یہ باتیں تم اپنے دل کی زبانی کہہ رہی ہو؟

ددا:۔ دل وجان کی زبانی، ورنہ دونوں ناپید ہوجائیں!!

جولیٹ:۔ آمین!!

ددا:۔ کیا؟۔

جولیٹ:۔ نہیں، میں یہ کہہ رہی ہوں۔ تمہاری نیک صلاح سے میرے دل کو قرار آگیا . . . . . جاؤ، امی سے کہدو۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اور اب آپ جو فرمائیں میں حاضر ہوں۔

ددا:۔ اللہ اللہ! کیسی سمجھ کی بچی ہے!!

(ددا چلی جاتی ہے)

جولیٹ:۔ (ددا کا دھیان کرکے) مکار بڑھیا۔ بدذات چڑیل، اس زبان سے تو ہزاروں بار اُن کی بھلائیاں گناتی تھی۔ آج انکو برا کہکر اُسی پر فالج گراتی ہے؟ . . . . . جا، جہنم واصل ہوا . . . . میں لارنس بابا سے اس دردِ دل کا مداوا پوچھوں گی۔ اُنہوں نے کچھ نہ بتایا تو خود میں مٹ جانے کا یارا رکھتی ہوں۔

[جولیٹ، لارنس بابا کے ہاں جاتی ہے۔ وہاں پیرس بھی پہلے سے آیا ہوا ہے۔ اور لارنس سے کہہ رہا ہے کہ آئندہ جمعرات کو جولیٹ سے اُس کا بیاہ ہوجائے گا لارنس، سنجان بنکر کہتا ہے کہ بھئی! عجیب بات ہے۔ تم خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ لڑکی تم سے بیاہ پہ خوش نہیں۔ مگر تم ہو کہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہوگئے۔ پیرس نے کہا بابا! بات دراصل یہ ہے کہ جولیٹ کو اپنے ممیرے بھائی ٹائی بالٹ کے مرنے کا بڑا قلق ہے۔ اس لئے وہ چُپ چُپ ہے آپ جانتے ہی ہیں محبت کی دیوی اشک۔ محل میں نہیں مسکرایا کرتی۔ اتنے میں جولیٹ بھی آجاتی ہے۔ اُسے دیکھ کر پیرس پھولے نہیں سماتا۔ اور مارے خوشی

کے جو جی میں آتا ہے، کہنے لگتا ہے۔ جولیٹ، لارنس سے کہتی ہے: مجھے آپ سے علیحدگی میں کچھ کہنا ہے۔ جس پر لارنس، پیرس کو چلتا کر دیتا ہے]

جولیٹ:- (پیرس کے جانے کے بعد) بابا! جائیے، دروازہ بند کر دیجئے پھر میرے ساتھ آپ بھی میری قسمت کو روئیے کہ اب میرا کوئی دستگیر نہیں رہا۔ میری آس یاس بن گئی۔ میرا دکھ لا دوا ہو گیا!

لارنس:- آہ! جولیٹ، مجھے پہلے ہی تمہارا دکھ درد معلوم ہو گیا۔ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کروں . . . . (متامل ہو کر) جمعرات کو پیرس سے تمہارا عقد ہو گا۔

جولیٹ:- بابا! صرف یہی نہ کہئے کہ آپ نے میری بپتا سن لی۔ کوئی سبیل بھی نکالئے کہ میں بچ جاؤں . . . . . آپ کوئی ایسی تدبیر نہیں بتا سکتے تو اس خنجر سے میں اپنی جان گنوا دوں گی۔ کیونکہ جب آپ نے ہمارا سنجوگ کر دیا، تو خدا رسول سے ہم ایک ہو چکے۔ اب کسی اور سے پلہ نہیں بندھ سکتا! . . . . بیوفائی بھی کبھی سرسبز ہوئی ہے! . . . . آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ آپ ہی مجھے کوئی نیک صلاح دیجئے ورنہ میں کہہ چکی! پھر یہ خنجر میرے دکھ کی دوا کریگا۔

لارنس:- ٹھیرو بیٹی! امید کی ایک جھلک مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ دیکھو: جب تم میں اتنا یارا ہے کہ جانِ عزیز سے بھی گنوا سکتی ہو تو میں تمہیں اس عذاب سے نجات کا علاج بتاتا ہوں۔

جولیٹ:- بتائیے، بابا! جلدی بتائیے۔ پیرس سے بیاہ نہ ہونے کے لئے اگر آپ کہیں کہ مینارے پر چڑھ کر کود پڑ۔ تو میں کود پڑوں گی، سانپ کے بل میں گھس جاؤں گی۔ بھوکے بھیڑیوں کے ساتھ رہ جاؤں گی۔ ایک مقبرے میں بند ہو سکتی ہوں، جو مُردوں کی ہڈیوں سے پٹا پڑا ہو۔ جہاں چوطرف ڈراؤنے ڈھیر ہوں۔ زرد زرد کھوپڑیوں کے خول نظر آئیں۔ یہی نہیں۔ میں کسی تازی قبر میں بھی مُردے کے ساتھ روپوش ہونے کو تیار ہوں۔ گو لوگوں کی کہی سُنی باتیں مجھے یاد آئیں گی۔ مجھے ڈر لگے گا۔ مگر اس خیال سے بلا خوف و خطر چھپی رہونگی کہ باوفا مروں گی!

لارنس:- اچھا تو یہ لو میں تمہیں ایک عرق دیتا ہوں۔ جسے میں نے جڑی بوٹیوں سے تیار کیا ہے۔ یہ لیکر گھر جاؤ۔ اور ماں باپ پر یہ ظاہر کرو جیسے اس بیاہ سے تم خوش ہو۔ کل بدھ ہے۔ کل ہی رات میں تم اپنے کمرے میں اکیلی سونا۔ دوا بھی پاس نہ رہے۔ جب سونے لگو تو یہ عرق پی لینا۔ عرق کے پیتے ہی تمہارے خون میں گرمی دوڑ جائے گی۔ اور تم پر غشی چھا جائیگی۔ نبضیں ساقط ہوں گی۔ سانس رک جائے گا۔ گرمائی جاتی رہے گی! اور یہ تمہارے لب و عارض جو گلاب بنے ہوئے ہیں، زرد پڑ جائیں گے آنکھوں کے سُندر دریچے بھی بند ہو جائیں گے۔ جیسے موت کے ہاتھوں جان کی روشنی آنی بند ہو گئی ہو! تمہارا ہر عضو اکڑ جائیگا۔ خنک ہو جائیگا۔ مُردہ نظر آئے گا۔ یہ مصنوعی موت تم پر (دوا پر) چالیس گھنٹے طاری رہے گی۔ پھر اس طرح بیدار ہو جاؤ گی جیسے کوئی میٹھی نیند سے جاگے! صبح میں جب پیرس نوشاہ بن کے آئے گا تو تم مُردہ بنی ہوئی ہو گی۔ اور جیسا ہمارے ملک کا دستور ہے۔ سب تمہیں پہنا اڑھا کر کھلے ڈولے میں مقبرے لا دینگے جہاں تمہارے خاندانی لوگ بلا دفنائے رکھے گئے ہیں۔ اس عرصے میں میں رومیو کو بھی اطلاع دے دونگا۔ وہ بھی آجائے گا۔ میں اور وہ تمہاری دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ جب تم اس نیند سے جاگ جاؤگی، تو اپنے دولہا کے ساتھ مانتو چلی جانا۔ بس یہی ایک تدبیر ہے جو تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم نسوانی ڈر دل سے نکال دو۔ اور ہمت سے کام لو۔

جولیٹ:- لائیے، بابا! وہ امرت مجھے دیدیجئے۔ اور ڈر اور خوف یاد نہ دلائیے۔

لارنس:- یہ لو۔ (عرق سے بھری ہوئی ایک شیشی دیتا ہے) جاؤ . . . . دیکھو استقامت ہاتھ سے نہ جائے۔ (زیادہ پیتا نہ ہو۔ میں بھی خط دیکر ایک آدمی کو مانتو بھیج دیتا ہوں۔

جولیٹ:- خدا حافظ، اچھے محسن! . . . . محبت مجھے ہمت دلائے گی ہمت میری اعانت کریگی۔

[وہاں سے آکر جولیٹ دیکھتی ہے کہ اس کے ماں باپ مہمانوں کی فہرستیں تیار کر رہے ہیں۔ پکوان کی فردیں لکھی جا رہی ہیں کل بدھ ہی بیاہ قرار پا گیا ہے۔ چوطرف ایک دھوم مچی ہوئی ہے۔]

بیگم کیپولٹ:- (رخاوند سے) آپنے بھی کمال کیا۔ کل ہی کر . . . ایک رات میں کیا کیا ہو گا؟!

کیپولٹ:- کیا کروں۔ لڑکی کا تو یہ حال ہے کہ گھڑی میں . . . میں ماشہ . . . . . تم گھبراؤ نہیں چپکی بیٹھی دیکھتی رہو۔ میں سب انتظام کر لونگا۔

[رات کا وقت۔ محلسرا روشنی سے دلہن بنی ہوئی ہے۔ جولیٹ . . . کے ساتھ اپنی خوابگاہ میں بیٹھی ہوئی ہے۔ دوا کپڑے نکال رہی ہے . . . پر عجب کیفیت طاری ہے۔ بالکل خاموش ہے۔]

جولیٹ:- (ایکا ایکی بھرائی آواز میں) بس یہ جوڑا ٹھیک ہے

دوا! آج رات تم میرے پاس نہ سونا۔ میں اکیلی اپنے اللہ سے دعائیں مانگوں گی کہ مجھ دکھیاری پر آسمان مسکرائیں۔ غضب نازل نہ کریں۔ تم جانتی ہو ایسا کاج گناہ ہے۔

(بیگم کپولٹ آتی ہیں)

بیگم، کیوں بیٹی، جولیٹ! کیا ہو رہا ہے؟

جولیٹ ۔ جی امی کپڑے نکلوا رہی ہوں . . . . امی بیگم! آج آپ کو تو بہت کام ہوگا۔ آپ جائیے دوا! تم بھی جاؤ۔ کچھ ہاتھ بٹاؤ میرے پاس کا تو کام ختم ہو گیا!

بیگم ۔ (مسکرا کر) ہاں بہت کام ہے، بیٹی!

(بیٹی کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے)

اچھا، خدا حافظ! اللہ نگہبان!! تم بھی آرام کرو۔ جی تھک گیا ہوگا۔ صدقے، میرے لال نے کل سے تو ناحق کو بڑا بجھا! سنانا۔

(بیگم کپولٹ اور دوا چلی جاتی ہیں)

جولیٹ ۔ خدا حافظ! اللہ ہی بہت جانتا ہے کہ ہم اب پھر کب ملیں گے ۔!!

(جولیٹ کا دل بھر آتا ہے۔ اور اپنے آپ ایک خوف طاری ہو جاتا ہے۔)

جولیٹ ۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) ایک موہوم خوف سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ روح سینے میں گھٹ رہی ہے۔ کیا ان لوگوں کو بلا لوں؟ . . . . . . (وہی آواز میں) دوا! . . . . (پھر متامل ہو کر) مگر وہ کیا کریں گے۔ آج رات تو مجھے اپنا دکھیارا پارٹ خود کرنا ہے، آ، اے شیشی!! (لارنس کی دی ہوئی شیشی دیکھتے ہوئے) مگر اس عرق سے بھی کچھ نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ صبح کو پیرس سے میرا بیاہ ہو جائیگا . . . نہیں، یہ عرق مجھے اس عذاب سے بچا لے گا . . . . . . مگر، کہیں یہ عرق زہر تو نہیں! جسے بابا نے اس لئے دیدیا کہ میں مر جاؤں۔ مخفی طور پر انہوں نے پہلے ہی میرا عقد کر دیا۔ سوچا ہوگا، آئندہ یہ بات پھوٹی تو ہمارے ساتھ ان کی بھی بے حرمتی ہوگی . . . . . . ایک دل یہ کہتا ہے لیکن ایک دل یہ بھی کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے بابا بڑے پاک خیال بزرگ ہیں . . . . ہائے!! یہ کیسے خوف کی بات ہے کہ مُردوں کی طرح تو میں مقبرے میں رکھی جاؤں، اور ان کے آنے سے پہلے ہی جاگ جاؤں! . . . . . . مقبرے میں تازی ہوا آ نہیں سکتی؟ ان کے آتے آتے تک دم گھٹ جائے گا۔ بس تڑپ، تڑپ کر مر جاؤں گی! . . . . . اجی زندہ بھی رہی تو رات اور موت کی ہولناکی مجھے زندہ درگور کر دے گی۔ کیونکہ تن تنہا میں ہوں گی۔ مقبرہ ہوگا۔ سالہا سال سے میرے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں بھری پڑی ہیں۔ جہاں خونیں ٹائی بالٹ کا تازہ لاشہ تابوت میں گل سڑ رہا ہے . . . تو میں ایسی جگہ رکھی جاؤں گی۔ جہاں کہتے ہیں کہ رات میں روحیں آیا کرتی ہیں ہائے اللہ! ایسا تو نہ ہوگا کہ وہاں میں جلدی بیدار ہو جاؤں۔ بدبو سے میرے اوسان جاتے رہیں اور روحوں کی چیخ پکار مجھے سچ مچ مار ڈالے؟؟ . . . . بیدار ہو کر میں کہیں دیوانی تو نہیں ہو جاؤں گی؟؟ کیونکہ اس وقت مجھے خوف سا خوف گھیرے ہوگا۔ نہ ہو کہ اس نیند سے اٹھوں، تو دیوانی اٹھوں۔ اور اپنے بڑے بوڑھوں کی ہڈیاں چھینے لگوں۔ ٹائی بالٹ کو تابوت سے باہر کھینچ لاؤں۔ اور اس دیوانگی میں کسی ہڈی سے اپنا سر پاش پاش کر لوں!! (خیال میں ڈوبے ہوئے) ہائیں!! یہ کون؟؟؟ میرے میرے بھائی ٹائی بالٹ کی روح!!! جو شاید "اُن" کی تلاش میں بھٹکتی رہی ہے؟!! جنہوں نے اس کے کالبد خاکی کو تلوار میں اس طرح پرو دیا تھا جس طرح سیخ کباب کو پرو دیتی ہے!! . . . . . ٹھہرو، ٹائی بالٹ بھائی، ٹھہرو! . . . . . . رومیو!! میں آئی!!! . . . . تمہارے خاطر یہ بھی سہی!!!

(عرق پیتی ہے اور بیہوش ہو کر بستر پر گر جاتی ہے)

[گھر کے صحن میں پکوان ہو رہا ہے۔ جہاں گھر والے بڑے میاں کپولٹ بھی ہیں۔ بیگم بھی ہیں۔ دوا بھی ہیں۔ نوکر چاکر گڑبڑ کرتے پھرتے ہیں۔ بڑی گھما گھمی ہے۔ بہار آ رہی ہے۔]

بیگم ۔ (نیند میں) دوا! لو یہ کنجیاں لو۔ ذرا گرم مصالحہ تو نکال لاؤ۔ باورچی مانگ رہا ہے!

دوا ۔ دی بیگم! گرم مصالحہ کا اس وقت کیا ہوگا؟ وہ تو میٹھے کیلئے بہی کا مربہ اور چھوارے مانگ رہا تھا!

کپولٹ ۔ (اٹھ کر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے) چلو چلو۔ چٹ پٹ کام ختم کرو۔ . . . . . . مرغ بانگ دینے لگے تین بج گئے۔ استاد! لو اب بریانی دم دینی شروع کر دو!!

[وقت کے پر ہوتے ہیں۔ دم بھر میں یہ جا، وہ جا۔ ابھی تین بجے تھے۔ بات کی بات میں آسمان پر نور کے دریا بہنے لگے۔ اس وقت کپولٹ کی گھبراہٹ دیکھنے کی تھی۔ بڑے میاں آپے میں نہ تھے۔ اتنے میں برات کے باجے کی بھی آواز آنے لگتی ہے۔

بس اب کیا تھا۔ اُن کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے]

کپولٹ :۔ ارے، دولھا آرہا ہے! باجے کی آواز آنے لگی! . . .
. . . . . بیگم! . . . . . دَدا!! . . . . ہیں؟؟ . . . . سب چلے گئے؟
. . . . . ارے میرے کپڑے کہاں ہیں؟؟؟ . . . . . لاحول ولا!! .
. . . میں کہہ رہا تھا . . . . . .

(اتنے میں دَدا آتی ہے)

کپولٹ :۔ دَدا!! ابھی تم نے جولٹ کو بیدار کیا؟ . . . . . ابھی اُسے دُلہن نہیں بنایا!! . . . شاباش ہے!!! جاؤ، جلدی جاؤ، یہاں کیا کر رہی ہو؟۔

ددا :۔ ابھی جاتی ہوں، سرکار!

(دَدا جاتی ہے اور جولٹ کی خوابگاہ میں قدم رکھنے سے پہلے ہی خوشی خوشی آوازیں دینے لگتی ہے)

ددا :۔ بیوی! سنو!! . . . . جولٹ جانی!!! . . . . . اوہو کیسی میٹھی نیند ہے! . . . . ابی ہرنی، ابی قمری!! سستن کہیں کی!!! . . . سجنی!
. . . . دُلہن!! . . . . . اللہ اللہ نیند سی نیند ہے!!۔

(مسہری کے پاس جاکر بہ آواز جولٹ کو اُٹھانا چاہتی ہے)

بی بی! بیگم!! . . . .

(پھر مسہری کا پردہ ہٹاتی ہے)

لو اور سُنو، ریت کا جوڑا پہن، اور سو گئیں!

(جولٹ کو ہاتھ سے ہلا کر جگاتے ہوئے)

میری موہنی! میری بیگم!!

(جونہی جولٹ کے سرد ہاتھ پر دَدا کا ہاتھ لگتا ہے تو اس پر بجلی سی گر جاتی ہے۔)

ارے غضب ہوگیا! لوگو دوڑو۔ دیکھو میری بچی کو کیا ہوگیا؟؟ . . . . . سرکار! . . . بیگم صاحب!! . . . . .

(بیگم کپولٹ آتی ہیں)

بیگم :۔ دَدا! کیا ہوا؟!!

ددا :۔ بیگم صاحب! غضب ہوگیا!!

بیگم :۔ (پریشانی سے) بولو تو سہی، آخر کیا ہوا؟؟

ددا :۔ (روتے ہوئے۔) دیکھئے۔ دیکھئے۔ (جولٹ کی طرف اشارہ کر دیتی ہے۔)

بیگم :۔ (جولٹ کو ہاتھ لگا کر پہلے سکتے کے عالم میں ہو جاتی ہے۔ پھر جولٹ کو پٹ کر،) ہائے! میں لُٹ گئی!! برباد ہوگئی!!! . . . . .
میری بچی! میری اکلوتی بچی!!! (جولٹ کو پیار کرتے ہوئے) جولٹ، بیٹی! اُٹھو!! بولو!!! . . . . بولتی کیوں نہیں؟ تم پہ ماں قربان!!!

(کپولٹ بھی آتا ہے)

کپولٹ :۔ (بگڑتے ہوئے) بڑے شرم کی بات ہے، اب تک دُلہن کو نہیں لائے؟ دولھا کبھی کا آچکا!

ددا :۔ سرکار میری دُلہن تو اللہ کو پیاری ہوگئی۔

بیگم :۔ (خاوند سے) جولٹ روٹھ گئی! ارے کوئی اُسے منا دو!!

(رونے لگتی ہے)

کپولٹ :۔ یہ کیا ہوگیا!!!

(جولٹ کو ہاتھ لگا کر، رنجیدہ)

دوڑتا خون رُک گیا۔ ہاتھ پیروں میں سختی آگئی۔ گلابی لبوں سے بہارِ زندگی کبھی کی سدھار چکی . . . . . جولٹ کو موت نے توڑ لیا۔ میرے چمن کے پھول کو بے وقت پالا مار گیا!!

[یہ کہتا ہوا کپولٹ مغموم نیچے جاتا ہے۔ وہاں لارنس، پیرس اور بہت سے مہمان ہیں]

لارنس :۔ (کپولٹ سے) کہیئے صاحب! دُلہن گرجا چلنے کے لئے تیار ہے؟!۔

کپولٹ :۔ گرجا جانے کے لئے تو تیار ہے۔ مگر وہاں سے پھر کبھی نہیں لوٹے گی! . . . . . (پیرس سے) بیٹا! تمہاری ہونے والی دُلہن کو رات فلک نے ہم سے چھین لیا۔ اس کھلتے پھول کو اجل نے مسل ڈالا . . . . . اب ملک الموت ہی میرا داماد ہے۔ میرا وارث ہے۔ اسی کے ہاتھ میں نے جولٹ کا ہاتھ دیدیا ہے!

پیرس :۔ ہائیں!! . . . . . اتنے آرزو ارمان کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا!!!

کپولٹ :۔ ہائے کیسے کہوں! میری بچی کے ساتھ میری ساری خوشیاں مر گئیں!!

لارنس :۔ (کپولٹ سے) صبر کیجئے! . . . . پریشانی کا علاج پریشانی سے نہیں ہوتا . . . . . جولٹ میں ایک جولٹ آپ کی لاڈلی تھی۔ ایک جولٹ قدرت کی دُلاری تھی۔ آپ اپنی جولٹ کو اجل سے نہ بچا سکے قدرت نے اپنی جولٹ کا بھلا چاہا۔ تو اُسے آسمان پر اُٹھا لیا اور باغِ جناں کا پھول بنا دیا! . . . . برادر! یہ بشریت ہے کہ انسان عزیزوں کی موت پر آنسو بہائے۔ مگر سوجھ کی روشنی میں دیکھو تو یہ آنسو سانچے نہیں، مومی موتی ہیں!

[آہ یہ ہے کہ دُنیا اسی کا نام ہے۔ یہاں شادی اور غم ساتھ ساتھ ہیں۔ اللہ اللہ جو گھر ابھی ابھی شادی کا گھر تھا۔ دیکھتے دیکھتے ماتم کدہ بن گیا۔ چو طرف وحشت برسنے لگی۔ عبرت طاری ہو گئی۔ ماؤں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دلوں کے بند ٹوٹ گئے۔ غموں کے ناسور بہہ نکلے۔ یہاں یہ ہوا۔ وہاں مانتو میں رومیو نیند سے بیدار ہو کر ٹہل رہا ہے۔]

رومیو۔ (اپنے میں آپ) خواب کی باتوں کو سچ جان لوں۔ تو خوشی کے دن قریب ہیں . . . . عشق کا دیوتا من کے مندر میں براجمان ہے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میری رُوح کے جلو میں بہت سے سُہانے خیالات ہیں، جو مجھے اُڑائے لئے جا رہے ہیں ! . . . . . . (سوچ میں) مَیں نے خواب دیکھا کہ جولیٹ آئی ہے۔ مگر مَیں مر گیا ہوں ! . . . . . عجب خواب ہے اِس سے تو ایک مُردہ بھی سوچ میں پڑ جاتے ! . . . . . . ہاں تو جولیٹ آئی۔ اُس کا سانس سنجیون تھا۔ جس سے مَیں جی اُٹھا! اور دل کا بادشاہ بن گیا! . . . . ہائے! محبت کی پرچھائیاں جب اتنی دلربا ہیں تو خود محبت کتنی موہنی ہو گی !!

[ایک شخص ــــ بلتاسر نام گھوڑے پر سوار آتا ہے۔]

رومیو۔ (خوشی سے) کہو، بلتاسر! ورونا سے کیا خبر لائے؟ لارنس بابا نے خط دیا؟ میرے والدین اچھے ہیں؟ جولیٹ خیریت سے ہے؟ وہ خیریت سے ہے تو پھر سب خیریت ہی خیریت ہے!

[بلتاسر کو رومیو نے لارنس کے پاس بھیجا تھا۔ جو خفیہ طور پر ورونا گیا تھا۔ مگر یہ شخص ورونا اُس وقت پہونچا کہ جولیٹ کی میت جا رہی تھی۔ ملک کے دستور کے موافق جولیٹ عروسی پوشاک میں ڈولے میں تھی۔ ساتھ بہت سی راہبات تھیں جو سر سے پیر تک سفید لباس پہنے تھیں۔ دوسری طرف پادری لوگ تھے۔ جن کے کالے پیرہن تھے، یہ سب کے سب دھیمے سُروں میں خُدا کی حمد گا رہے تھے۔ جب ڈولہ قریب آیا تو بلتاسر نے ایک درخت کی آڑ سے دیکھا کہ جولیٹ پر ایک پُر سکون حُسن کی لہر آئی ہوئی ہے۔ جولیٹ کو حباب کی سی مہین ریشمی چادر اُڑھا دی گئی ہے۔ جس میں سے اُس کا حسین چہرہ اس طرح جھلک رہا ہے جیسے صافی سے گلاب! یہ حادثہ دیکھکر بلتاسر اُلٹے پاؤں رومیو کے پاس آیا۔ رومیو نے جولیٹ کے مرنے کی خبر سُنی تو جیتے جی مر گیا۔ بلتاسر کو اپنے لئے گھوڑا لانے کو بھیجا اور خود سوچ میں پڑ گیا]

رومیو۔ (اپنے میں آپ) جولیٹ!! تمہیں تو وفا کا بڑا دعویٰ تھا۔ . . . . . پھر یہ کیسی بے وفائی؟؟ . . . . . اچھا گھبراؤ نہیں۔ اب تمہارا یہ باوفا بھی تمہارے پاس آتا ہے! . . . . . . مگر رومیو! اس کی تدبیر؟ . . . . آہ، اے شرارتِ نفس اب تیرا کام ہے۔ جان ہاروں کی تو ہی مونس ہوتی ہے! . . . . . ہاں، خوب یاد آیا! یہاں قریب ہی میں ایک دواساز رہتا ہے۔ بُرے حالوں، مفلوک۔ میں نے پہلے پہل اُسے دیکھا تو خیال ہوا تھا کہ یہ شخص موت بیچتا ہو گا! اسکے پاس چلوں، اُس کے ہاں ضرور کوئی تُند زہر مل جائیگا۔

(دواساز کے پاس آتا ہے اور آواز دیتا ہے)

دواساز۔ (اندر سے) کون ہے؟

رومیو۔ ذرا اِدھر آؤ۔

(دواساز آتا ہے)

رومیو۔ تم غریب آدمی ہو۔ یہ اشرفیاں لو، اور مجھے کوئی ایسا زہر دو کہ کھاتے ہی رُوح اس طرح پرواز ہو جائے، جیسے توپ سے گولہ چھوٹ جاتا ہے۔

دواساز۔ ایسے زہر تو میرے پاس کئی ہیں۔ مگر یہ بات میں مُنہ سے نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو قانوناً موت کی سزا دی جاتی ہے۔

رومیو۔ کیا تم اتنے عیش میں ہو کہ مرنے سے ڈرتے ہو؟ . . . . . فاقے تمہارے چہرے پر بسورر ہے ہیں۔ احتیاج تمہاری آنکھوں سے جھانک رہی ہے . . . . . بھیک تمہاری گردن پر سوار ہے۔ نہ دُنیا تمہاری ساتھی، نہ قانون تمہارا ساجھی کہ تمہیں مالدار بنا سکے۔ پھر افلاس کی کڑیاں جھیلنے سے حاصل؟ . . . . . . لو اشرفیاں لو۔ اور فلاکت پر خاک ڈالو۔ . . . . . .

دواساز۔ میری طینت تو اسے قبول نہیں کرتی۔ ہاں میری غریبی قبول کرلے تو کر لے۔

رومیو۔ مجھے تمہاری غربت سے کام ہے۔

دواساز۔ (اندر جاتا اور زہر کی شیشی لاکر دیتا ہے) انسان میں بیس آدمیوں کی بھی قوت ہو تو اس کے پینے سے پلک جھپکاتے ختم ہو جائے گا!

رومیو۔ (زہر کی شیشی لیکر) لو یہ اشرفیاں . . . . . . مگر یاد رکھو، رُوحِ انسانی کے لئے سونا زہر سے بھی کہیں زیادہ خطرے کی چیز ہے! اس گھناؤنی دُنیا میں اس نے اتنوں کو برباد کیا ہے کہ تمہارے سارے زہر ہیچ ہیں!! . . . زہر تو میں نے تمہارے ہاتھ بیچا ہے۔ تم نے مجھے زہر مول نہیں دیا! . . . . . . اچھا، خُدا حافظ! . . . . . . جاؤ اب تم بھی اس سے کچھ آذوقہ خرید لو۔ اور گھر کے کیڑوں کیلئے اپنا تن تازہ

کرو!! (شیشی کو دیکھتے ہوئے) آ! اَمرت، تُو زہر نہیں!! چل میرا ساتھ دے۔ جولٹ کے پاس تجھے نوش جان کرنا ہے!!!

[لارنس اپنے گوشۂ تنہائی میں پریشان بیٹھا ہے۔ اُس نے بھی ایک شخص کو خط دے کر مانتو بھجوایا تھا۔ جو رستہ میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ طاعون کے شبہ میں روک لیا گیا۔ لارنس کو اس کی کوئی خبر نہ ہو سکی۔ اور نہ رومیو ہی کو اطلاع ملی۔ جب وقت بہت زیرہ ہو گیا۔ اور لارنس کو رومیو کے آنے کی توقع نہ رہی تو وہ خود مقبرے روانہ ہو گیا تاکہ جب جولٹ بیدار ہو تو وہ وہاں رہے۔ ورنہ مقبرے میں دَم گھُٹ کر مر جائے گی۔ ابھی یہ مقبرے نہیں پہونچا تھا کہ وہاں پہلے سے پیرس آموجود ہوا۔ جس نے ساتھ کے آدمی کو تو یہ کہکر ایک درخت تلے چھوڑ دیا کہ تم یہاں رہو۔ اور جب کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہو تو سیٹی بجا دینا۔ اور خود پھُولوں کی چادر چڑھا مقبرے میں اندر چلا گیا۔]

پیرس:- (اپنے میں آپ) جولٹ! پیارے پھُول!! مَیں تیری اَبدی سیج کو اِن پھولوں سجنے آیا ہوں .... میری محبّت کی نذر و نیاز یہی ہے کہ میں تیرے مزار پر پھُول چڑھاؤں۔ اور تیری یاد میں آنسو بہاؤں!۔

[پیرس ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ اُس کے نوکر نے سیٹی بجائی۔ سمجھا کوئی آ رہا ہے۔ اس لئے مقبرے کے دروازے میں ایک طرف چھُپ گیا۔ مگر کیا دیکھتا ہے کہ رومیو آیا ہے اور مقبرے میں اندر جا رہا ہے۔ پیرس آڑے آکر اُسے اندر جانے سے روکتا ہے۔ دونوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ جس میں پیرس مارا جاتا ہے۔ رومیو، جُولٹ کے پاس جاتا ہے۔]

رومیو:- (اپنے میں آپ) مرنے سے کچھ دیر پہلے انسان کتنا بشاش ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے سنبھالا لینا کہتے ہیں۔ ہائے میں اسے کیوں کر سنبھالا لینا کہوں؟ ..... پیاری، جُولٹ! دُلہن! گو موت نے تیرے سانس کا شہد چھین لیا۔ مگر تیری زیبائی کو تاراج نہ کر سکی! تجھے کسی نے نہ جیتا!! حُسن کا قرمزی پرچم تیرے لب و عارض پر جھُوم رہا ہے۔ موت کا زرد رنگ پھریرا ابھی تک نہیں لہرایا .. ٹائی بالٹ! تم بھی یہاں سو رہے ہو؟ ..... بتاؤ اِن ہاتھوں تمہاری اور کیا خدمت کروں۔ جن سے میں نے تمہیں موت کے گھاٹ اُتارا ہے! ..... بھیّا! مجھے معاف کر دو! ..... جولٹ! تم اب تک کیوں اتنی دلربا ہو؟ ..... کہیں اَن دیکھ موت بھی تو تمہاری گھائل نہیں ہو گئی۔ جو تمہارا رکھ رکھاؤ ہے۔ مجھے اس بات کا خوف ہے۔ مَیں یہاں ٹھیر دُنگا۔ اس اندھیرے محل سے ہرگز نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے یہیں اَبدی چین ملے گا۔ اور زندگی کے مجھ تھکے ماندے کو قسمت پھر جہاں تہاں کی ٹھوکریں نہ کھلوائے گی! ..... آنکھوں! اپنی نور کی پتلی کو آخری مرتبہ دیکھ لو۔ باہنوں! آخری مرتبہ اس پیکر محبت کو کلیجے سے لگا لو۔ لبوں! اے سانس کے دروازوں!! جولٹ سے آخری پیام سلام کر لو!! ..... بس اب آ، اے تلخ رہنما!! بد مزہ ناخدا!!! اور میری ڈُوبتی جیون نیا کو موت کی چٹان سے ٹکرا دے!! (شیشی کو دیکھکر) یہ جولٹ کا جامِ محبّت ہے!!! ..... (زہر پی لیتا ہے) .. .. اے سچے دواساز! واقعی تیری دوا زود اثر ہے!!

[رومیو وہیں گر کے مر جاتا ہے۔ اتنے میں دوسرے دروازے سے لارنس روشنی لئے ہوئے دبے پاؤں آتا ہے۔ مگر یہاں منظر ہی اور دیکھتا ہے۔ اُدھر پیرس کا نوکر سارے مقبرے کے دربانوں کو اُٹھا دیتا ہے۔ اور اپنے آقا، رومیو اور لارنس کے مقبرے میں جانے کی خبر کر دیتا ہے۔ چوطرف جاگ ہو جاتی ہے۔ دربان مقبرے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ لارنس، جولٹ کے پاس آتا ہے اور وہ بیدار ہوتی ہے۔]

جولٹ:- (لارنس سے) اے تسکین دینے والے بزرگ!! فرمائیے؟ وہ کہاں ہیں؟! ..... مَیں سمجھتی تھی کہ بیدار ہوں گی تو کہاں رہوں گی۔ شکر ہے وہیں ہوں .... بولئے نا؟ وہ کہاں رہ گئے؟! ...

(مقبرے میں لوگوں کے آنے کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں)

لارنس:- (سراسیمہ) جولٹ، اُٹھو، دیکھو۔ کوئی اندر آ رہا ہے ..... موت کے اس نشیمن سے نکل بھاگو۔ بیٹی! ایک بالاتر قوت نے ہمارے ارادوں کو زیر کر دیا! چلو، چلو، رومیو یہ مرا پڑا ہے۔ پیرس بھی جان سے گزر گیا۔ آؤ اب تم بھی اللہ کی یاد میں زندگی گزار دو۔ زیادہ کہنے سُننے کا وقت نہیں۔ دربان جاگ گئے۔ دیکھو، خاصے قریب آ گئے ہیں۔ یہاں ٹھہرنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔

جولٹ:- (بگڑ کر) جائیے، آپ یہاں سے چلے جائیے۔ میں نہیں جاؤں گی۔

(لارنس چلا جاتا ہے۔)

جُولٹ:- (رومیو کو دیکھکر) یہ کیا ہے؟ شیشی؟! ...... زہر کے ہاتھوں آغوشِ الٰہی میں سو گئے! ...... کیا خُوب! سب کا سب



حکیم عبدالحی صاحب انصاری
خلف اکبر لقمان الملک حکیم
عبدالوہاب صاحب انصاری

“ماہی” دہلی



مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں صاحب
خلف مسیح الملک محمد اجمل خاں صاحب مرحوم -
سکریٹری - طبیہ کالج دہلی و ناظم ہندوستانی دواخانہ دہلی-

Calcutta Art Press Delhi

آبِ حیات پی لیا؟ ..... میرے لئے بُوند بھی نہ چھوڑی کہ مجھے مدد ملتی؟ ...... شاید اِن ہونٹوں پر کچھ لگا رہ گیا ہو۔ جو میرا کام بنا دے گا۔ ..... اُف! ہونٹوں میں اب تک جان کی گرمائی ہے!!

(لوگوں کے آنے کی آوازیں اور قریب آنے لگی ہیں۔)

جولٹ:- (اپنے میں آپ) لوگ بہت قریب آ گئے! جولٹ!! بس اب قصہ تمام کرو!!!۔

(یہ کہکر رومیو کے پہلو سے خنجر نکالتی ہے۔)

جُولٹ:- (خنجر کو دیکھتے ہوتے) یہ سینہ تیری نیام ہے! (سینہ میں خنجر بھونکتے ہوتے) یہاں بسرام کر!!۔

(رومیو کے جسم پر گر کے مرجاتی ہے۔)

[لوگ آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ بوڑھا لارنس ساری بپتا سُناتا ہے۔ جسے سُنکر سب سینہ کوٹ لیتے ہیں۔ اور اُس دن سے ایسے شیر و شکر ہوتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں لڑتے جھگڑتے۔ مُبارک ہیں دیس کے بیٹا بیٹی جن کی جاں نثاری سے روٹھے من جائیں! بچھڑے مل جائیں!!]

سید وزیر حسن

ارمغانِ عید

(بحضورِ دوست)

موسمِ گُل سے کیا غرض برگِ خزاں رسیدہ کو
دیدِ خوشی سے کام کیا، دیدۂ خوں چکیدہ کو

فصلِ بہار آگئی عیش مناؤ خوش رہو!
کافی ہے سوز و سازِ دردِ چاکِ جگر بُریدہ کو

یوں ہے دلِ تباہ کی، حالتِ زار ہمنفس
کوئی مسل کے پھینکدے غنچۂ نارسیدہ کو

قابلِ داد ہے مگر، تیرا یہ ظُلم بھی خزاں!!
چلتی بنی اُجاڑ کر، سبزۂ نودمیدہ کو

داغِ جگر دکھاؤں گی، قصۂ غم سناؤں گی!
خواب ہی میں کبھی نواز اپنی الم رسیدہ کو

لذّتِ انتظارِ مرگ، پوچھ نہ مجھ سے ہمنشیں
آتا ہے کچھ قرار سا، اس میں دلِ طپیدہ کو

اے دلِ درد آشنا! شکوۂ بخت تا کجا؟!
جامِ طرب ہی زہر ہے، لذّتِ غم چشیدہ کو

اب ہے غمِ فراق ہی، رُوحِ روانِ زندگی!
سوزشِ مُستقل سے ہے تاب و توانِ زندگی!

"دلفگار"

ساقیِ گلفام

گھنگھور گھٹا جھوم کے اٹھی ہے سرِ شام گل گشت کو نکلے ہیں حسیں، شوخ، گل اندام
تھمتی نظر آتی نہیں شیشے میں دلآرام لا دور میں مے خانۂ تنشیط کے اجرام

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

رنگین فضائیں ہیں دہک جائے گلابی سرمست نوائیں ہیں چہک جائے گلابی
سرشار ہوائیں ہیں لہک جائے گلابی بارش کی سرائیں ہیں بہک جائے گلابی

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ہر چہرۂ گل رنگ پہ آتے ہیں پسینے بجلی کی چمک سے دمک اٹھے ہیں نگینے
کوئل کی صدائیں ہیں لگاوٹ کے قرینے بے تاب ہیں لٹنے کو نوا سنج دفینے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

عریاں ہیں مرے سامنے فطرت کے نظارے مہ پاروں کا دربار ہے ساگر کے کنارے
تقوی شکن آنکھوں میں جوانی کے شرارے ہر سانس میں لہراتے ہوئے شوق کے دھارے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

کھائی ہے نہ پینے کی، پلانے کی قسم، خوب! اس میکدہ بردوش زمانے کی قسم، خوب!
متوالے، حیا بیز ترانے کی قسم، خوب! ہنس ہنس کے مجھے اپنا بتانے کی قسم، خوب!

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ساون کے ہیں لمحات جنوں خیز گہربار آغوشِ سماعت میں لئے نغمۂ سرشار

انگڑائیاں لیتی ہے تجلیِٔ طرب زار　　سوتوں کو جگا دیتی ہے پیمانوں کی جھنکار
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

اس فصل میں لازم ہے پئیں اور پلائیں　　حوروں کو نئے نغمۂ تخریب جگائیں
پُرکیف رہیں، کیف میں عالم کو بسائیں　　ہر ذرۂ ناچیز کو فردوس بنائیں
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

دُم دَو بگڑا ہے مینہ کا اِک ہوگیا جل تھل　　آئی ہے ندی بازوؤں میں پاربتی کا جل
ہر فرشِ زمیں ہوگیا گُل بوٹوں سے مخمل　　اس رُت میں نہ یوں بیٹھ لنڈھا جام میں بوتل
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

بُوندوں کی ٹپا ٹپ ہے نکھر آئے ہیں گلشن　　ضو ریز ہیں الماس، قیامت کا ہے جوبن
ہر گوشۂ ویرانہ ہے اک وادیِ ایمن　　رنگ رلیاں ہیں، جھُولے ہیں فسونکار فسوں فن
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

آ، ساغرِ بلّور میں کونین سما دے!　　آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہی آج پلا دے
اربابِ شریعت کو نگاہوں میں جھکا دے　　اک دھوم مچا دے، ارے اِک دھوم مچا دے
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

صدقے ترے انداز کے اے ساقیِ گلپوش　　ہر ایک ادا ہے تری شوخیِ غزل کوش
اس بادلے موسم میں عطا کر مئے سرجوش　　کاوشؔ کو نہ احساسِ تکلم کا ہے ہوش
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

کاوش حیدرآبادی

بہوجائی

(ایک خط بخدمت محترمہ چودھرانی حیا رحمٰن صاحبہ)

جناب بھاوج صاحبہ. سلام و دُعا۔ آپ کا خط ملا۔ جی ہاں آپ بھابی جان قطعی نہیں ہیں۔ بلکہ بھاوج ہیں۔ اُردو کی اصطلاح والی بھابی جان تو کلکتہ والی مسز سراج الدین ہیں۔ ور بہوجائی ایک دوسری ہیں۔ آج آپ کو اُن کا تھوڑا سا حال سُناتا ہوں اور اسی کو جی چاہے آپ رسالہ میں چھاپ دیجئے۔ ورنہ اب اس بُڑھاپے میں افسانے کہاں سے آئے۔

جس روز میرا اسکول کی دوسری جماعت میں داخلہ ہوا تو ہم تین لڑکے مُرغا بنائے گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ تیسرے گھنٹہ میں ماسٹر صاحب کے آنے میں دیر ہوئی اور لڑکوں نے مجھے نیا سمجھکر آڑے ہاتھوں لیا۔ نوبت چپقلش پر پہونچی۔ نتیجہ یہ کہ ماسٹر صاحب آن پہونچے اور ہم تین لڑکوں کو دو دو چانٹے مار کر مُرغا بنا دیا۔

مُرغا بنے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے پڑوسی مُرغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کان ہاتھ میں، بند مٹھی مگر چھنگلی کے پاس ایک اور صیحو سالم چھنگلی مٹر کی پھلی کی طرح لٹک رہی ہے میں نے بہ سلسلہ تحقیقات آہستہ سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں سے نکال کر اُس انگلی کا بچہ پکڑ کر جو معائنہ کیا ہے تو یہ مُرغ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں سے جا کر بدستور اپنا کان پکڑ لیا۔ لیکن ماسٹر صاحب نے دیکھ لیا۔ حالانکہ میں نے اُنگلی آہستہ سے صرف چھو کر دیکھی تھی۔ لیکن چھنگا کی اُنگلی کھینچنے کے الزام میں خوب پٹا۔ چھنگا بھائی سے یہ میری پہلی مُلاقات تھی۔ اُن کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک فاضل اُنگلی اس طرح لٹک رہی تھی اور یہ اس کام آتی تھی کہ لڑائی ہو تو پکڑ لی جائے۔

بھائی چھنگا کا نام رام لال تھا اور یہ ذات کے بنئے تھے۔ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ صرف ایک بہن مُنی تھی جو تفریح میں اُنکے لئے ایک گلاس دودھ بھر کر لاتی تھی جو اکثر یار لوگ پی جاتے تھے۔ بھائی چھنگا کے باپ کی مصالحوں اور کرانے وغیرہ کی دوکان تھی۔ بہت جلد میری اور اُن کی ایسی دوستی ہو گئی کہ ہم دونوں بچے تو تھے ہی لیکن بھائی چارہ ہو گیا۔ ایسی یاری اور بے تکلفی ہو گئی کہ عرض نہیں کر سکتا۔ میرا انکا چار برس ساتھ رہا۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کو وہ شہر چھوڑنا پڑا ذرا غور کیجئے کہ کبھی عمر بھر چھنگا بھائی سے خط و کتابت نہ ہوئی۔ زمانہ گذر گیا۔ ایک دوسرے کو بھول بھال گئے۔ میرے بتنے کی خیر خبر نہ رہی کہ ابھی حال میں اُن سے مع بہوجی کے مُلاقات ہو گئی اس مُلاقات کا مختصر حال سناتا ہوں۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کام سے رتلام جانا پڑا۔ رتلام جاورہ سے ریلوے سے دو اسٹیشن اور بذریعہ موٹر چوبیس میل پختہ سڑک ہے۔ میں ایک دوست کی آمد کے سلسلہ میں موٹر سے گیا۔ یہ بدتمیز دوست نہ آئے۔ مایوس چلا آرہا تھا کہ سر اُٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کھدر پوش بزرگ مجسّم کانگریس بنے گاندھی ٹوپی لگائے، ڈیڑھ بالشت کی ڈاڑھی اور مونچھوں میں کل کا کل مُنہ پوشیدہ، پیشانی پر لال پیلا قشقہ اس زور کا لگائے کہ برہمن شرمائے۔ گود میں دو سال کا بچہ۔ پیچھے ایک سفید چادر اوڑھے کوئی ڈھائی ڈھائی سیر کی پازیب پہنے خوش جمال اور نوعمر عورت۔ میں بھلا ان سُورماؤں کو کاہیکو پہچانتا۔ مگر گود والے ہاتھ کو دیکھا تو چھنگلی لٹک رہی تھی۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ لاکھ ضبط کرتا ہوں پر جی نہیں مانتا۔ قدم بڑھا کر آگے راستہ کاٹا۔ میں نے کہا "کیوں جی۔ یہ تم کس کی عورت بھگا لائے؟" میں نے نوعمر بہوجی کی طرف اُنگلی اُٹھا کر پوچھا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کافی طور پر برہم ہو سکیں یا آنکھیں نکال سکیں میں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ارے صاحب میں اس خوفناک ڈاڑھی والے کانگریسی کو پیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ڈاڑھی دار گال پر بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ خواہ میری عینک ڈاڑھی میں اُلجھ کر رہ جائے۔ مگر وہ شہر کی بہو کی طرح لڑے پڑتے ہیں۔ مگر تو بہ کیجئے۔ لونڈا الگ حمزہ بن کر گود سے سرک پڑا پر میں نے نہ چھوڑا۔ نہ یہ سوچا کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہیگا۔

ہم دونوں دوست ایک دوسرے کو پہچان کر محبت سے مل رہے تھے اور اُن کی بیوی اس عجیب و غریب سین کو دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے ہی سے پتہ چلتا تھا کہ پہلی بیوی کا بھوجن کر چکے اور یہ دوسری بیوی ہیں۔ اب انہوں نے مجھ سے پردہ کیلئے گھونگھٹ فرما لیا تھا۔ میں نے

ازراہِ قدردانی پھر پوچھا "بھئی یہ کہاں سے پکالائے؟ - وہ پہلی والی کیا ہوئی؟ اور وہ جولاہی کو کب چھوڑا! ... بھئی ہم بھی تو دیکھیں ...." اور یہ کہکر جو بڑھا میں بھوجی کی طرف تو چھنگا نے خفا ہوکر مجھے مارنے کو کہا۔ لڑنے لگے کہ کیسی جولاہن۔ مجھے بیہودہ بدتمیز سب کچھ کہا۔

آپ جانتے ہیں مسافر کے یوں ہی حواس گم ہوتے ہیں۔ وہ اجمیر ہوتے ہوئے کوئی تیرتھ والی مزید حماقت کرکے گھر جاتے تھے تو بھی چھوٹنے کے بے حد قائل۔ ادھر میں نے کہا کہ بھئی جاورہ راستے میں پڑتا ہے ایک دو روز ٹھہرو۔ کیا عرض کروں اس موذی لالہ سے کیسا کیسا کہا پر نہ مانا۔ میں نے بھتیجے کو گود میں لے لیا تھا پھل والے۔ یہ ہو گیا کہ وہ نہ مانیں گے۔ ان کی گاڑی میں بٹھلانے گیا۔ اور اب خداحافظ کرکے اور بھوجائی جی سے بھی رخصت ہوا۔ میں نے کہا "بھوجی جی یہ بھتیجے ہمیں دیدو اور دراصل تم ان کی ڈاڑھی پر نہ جاؤ ہم اس کے بدلے دو کا انتظام کر دیں گے" حضرت چھنگا نے اس پر خندہ فرمایا اور کہنے لگے "بڑے بیہودہ ہو۔ طے ہو گیا بھتیجے ہم لیں گے۔ بھوجائی جی نے کہدیا کہ لیلو۔ میں ان کو رخصت ہوکر بھتیجے کو گود میں باہر اپنی موٹر پر آیا اور چھنگا مجھے رخصت کرنے آئے۔ میں نے بچے کو پیار کیا اور چھنگا سے کہا "یار یہ لونڈا مجھے دیدو" وہ ہنسکر بولے "لیلو" میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی میں نے بچہ دینے کا شکریہ ادا کیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ وہ مذاق ہی سمجھے اور میں بھتیجے لیکر یہ جا وہ جا۔ سیدھا جاورہ آکر دم لیا۔ مجھے نہیں معلوم وہاں میاں بیوی پر کیسی گذری۔ مگر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گھر پہ پہونچا تو گھر والی نے پوچھا۔ اُسکو سارا حال بتایا۔ بچہ مزے میں کھیل رہا تھا۔ اور اسے مٹھائی کھلونوں پر دھر لیا۔

زیادہ دیر گھر پہونچے نہ ہوئی تھی کہ ریل کی آواز آئی اور کوئی پندرہ منٹ میں ایک تانگہ آکر رکا۔ بھائی چھنگا اور بھوجائی جی موجود۔

"خیر تو ہے" میں نے کہا "کیسے آئے؟" ادھر نہ پوچھئے بھائی چھنگا کا حال۔ جز بز ہو رہے تھے۔ زیادہ جو اکڑے تو میں نے کہا "اپے ہوش میں بھی ہے۔ غصہ دکھانا گورنمنٹ افسروں کو۔ یہ آپے سے باہر کیوں ہوا جاتا ہے"

مجھے مطلع کیا گیا کہ حضرت مذاق قطعی ناپسند فرماتے ہیں۔ اب تقاضہ یہ کہ لڑکا لاؤ تو جاکر دھرم شالہ میں ٹھہریں۔ میں نے اوپر سے نیچے تک دیکھکر کہا کہ "بچا یاد رکھو عقل ٹھکانے کر دوں گا۔ سیدھے سیدھے اتر آؤ"

نوکروں نے جلدی جلدی اسباب لیا۔ غرض دوست کو گھر میں اُتارا۔ ذرا دیر میں محبت کی باتیں کرنے لگے۔ بچوں کو پیار کرنے لگے۔ آدمی ہو گئے۔ قصہ مختصر آرام سے ٹھہرائے گئے۔ پانی وغیرہ کا انتظام کرایا۔ کھانے کیلئے میں نے گھر والی کو آواز دی کہ بھئی کباب پراٹھے پکاؤ۔ اس پر بیحد خفا ہوئے۔ کہنے لگے "یہ کیا بیہودہ مذاق ہے" اور میں نے بھوجائی کے سامنے کہا "یار کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ بکرے کے بکرے ہضم کر گیا" اور بھوجی سے میں نے پوچھا "کہ تم کیا کھاؤ گی۔ انڈا مرغی کھاؤ گی"

بھوجائی جی نے "ہے رام" کی صدا کھینچی اور میں نے اُن سے معافی مانگی یہ سوچکر کہ بھئی میں نے سمجھا کہ میرے دوست کھاتے پیتے ہیں تو تم بھی کھاتی ہوگی۔ اس بات پر چھنگا بہت خفا ہوئے۔ بہت بُرا مانے۔ اور ٹیڑھے ہو بیٹھے۔ ایسے کہ میری بیوی نے کہا کہ بُرا مان گئے اور ایسا نہ چاہئے تھا۔ میں نے بیوی سے بھی کہا کہ "تم کیا جانو اسے یہ بڑا ہتھیارا آدمی ہے۔ چھنگا ہاتھ مُنہ دھونے گئے اور میں نے گھر والی سے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا کہ چھُپا کے کبابوں کا انتظام کر دینا ورنہ بہت ہی بُرا مانیگا یہ میں نے اس طرح کہا کہ بھوجائی یہ سمجھیں کہ میں اُن سے چُھپا کر چپکے سے کہہ رہا ہوں۔ مگر اس انتظام سے کہا کہ وہ اچھی طرح سُن لیں۔ اور یہ بھی تاکید کر دی کہ بھوجائی کو پتہ نہ چلے۔

اور گھر والی سے یہ کہکر میں نے بھوجائی جی سے کہا "میں تو اپنے دوست سے مذاق کرتا ہوں۔ یہ گوشت کبھی نہیں کھاتے ہیں میں نے جھوٹ کہا تھا۔ توبہ توبہ کہیں یقین بھی نہ کر لینا"

اور میں نے بھوجائی جی کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ انہیں کب ایسے معاملات سے سابقہ پڑا ہوگا۔ اور ادھر میری بیوی اس دھوکے میں کہ واقعی چھنگا دوست چھپ کر کباب کھائیں گے۔ چنانچہ اُس نے پوشیدہ انتظام کرنا شروع کیا۔ اب درمیان میں جو میں نے چُھپ چُھپ کر دو چار ہدایتیں گھر والی کو دیں تو بھوجائی جی کے بیچ بیچ کان کھڑے ہوئے اس لئے کہ واقعی آدمی کو جلد سے جلد کبابوں کے انتظام کیلئے دوڑایا جاچکا تھا۔

دوسرا آدمی ایک برہمن کے یہاں پوری کچوری اور مٹھائی کے انتظام کے لئے گیا تھا۔ اور بار بار میں بھوجائی جی کو سُنا رہا تھا کہ بڑی اونچی ذات کے برہمن کے یہاں بھوجن تیار ہو رہا ہے۔ ادھر چھنگا بھائی ہاتھ مُنہ دھوکر اپنی بیوی کے پاس گئے اور ادھر میں قینچی چھانٹنے لگا کہ کس قینچی سے ان کی ڈاڑھی پکی جاوے۔

اب ادھر کا حال سُنیئے میاں بیوی میں کچھ باتیں ہوئیں۔ بیوی نے

میاں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا کیا معلوم کیا باتیں ہوئیں کہ میں نے پکار کر یہ تجویز کی کہ ہم تم ساتھ کھائیں گے، اور عورتیں علیحدہ۔ وہ بولے "ٹھیک ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چھنگا میرے پاس آئے۔ بے حد سنجیدہ۔ ملول اور کبیدہ خاطر۔ آپ یقین مانئے کہ ان کی بیوی کا عقیدہ متزلزل ہو گیا۔ چھنگا نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایسی باتیں نہ کرنا چاہیئے ورنہ ہمارے یہاں کو چلے جائیں گے۔

لیکن باوجود برہمن کا کھانا کھانے کے چھنگا کی آفت آگئی۔ میں نے گھر والی سے پھر اس طرح چپکے سے کہا کہ بھوجائی جی سن لیں۔ میں نے کہا کہ "ابھی یہاں تو موقع نہیں ملا۔ چھنگا بھائی کہتے ہیں کہ بھوجائی جی شکی ہو گئی ہیں۔ لہٰذا سیر کرنے چلیں گے وہاں کھائیں گے۔ لہٰذا موٹر میں تم چھپا کر رکھوا دینا۔ کہیں بھول نہ جانا اس لئے کہ انہوں نے کھانا قصداً نہیں کھایا ہے اور بھوکے رہ گئے ہیں۔"

اب تقدیر کی خوبی کہئے کہ چھنگا بھائی نے واقعی کھانا بہت ہی کم کھایا تھا۔ لہٰذا بھوجائی جی کا ماتھا اور بھی ٹھنکا۔ یہی کیا کم تھا کہ بعد کا ڈرامہ۔ موٹر میں ایک لپٹے ہوئے رومال میں کٹوردان جو رکھنے لگے تو چھنگا بولے "یہ کیا ہے" تو میں نے کہا "وہی ہے"! وہ مسکرا کر بیٹھ گئے اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔

شام کے وقت میں نے چھنگا کو موٹر ہی پر مٹھائی اور کچالو اور الا بلا کھلائی اور خود بھی کھائی۔ چھنگا دہی بڑے بہت کھا گئے کہنے لگے کہ "یار اب کھانا نہیں کھایا جا سکے گا۔" میں نے دل میں کہا کہ۔ "جا وہ تیری گت بنوائی ہو جو یاد کرے۔"

ہم دونوں واپس آئے۔ رات کے کھانے کے لئے جو پوچھا گیا تو بولے کہ نہ کھائیں گے۔ اور بھوجائی جی نے جو مشکوک ہو کر پوچھا "کیوں؟" تو بولے "ہم کھا آئے ہیں؟" اور قبل اس کے کہ بھوجائی جی کچھ بول سکیں۔ میں نے کہا "بھوجائی جی قسم لے لو جو سوائے دہی بڑے اور مٹھائی کے کچھ بھی کھایا ہو۔ بازار سے منگائے تھے۔۔۔"

اب لاکھ بھوجائی جی سے کہا جاتا ہے کہ کھانا کھا لو مگر انہوں نے نہ کھایا۔ میں نے چھنگا سے کہا کہ "یار جورو سے وجہ تو پوچھ۔"

اب جناب یقین کریں کہ وجہ جو پوچھنے علیحدہ گئے تو جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ بھوجائی جی نے خوب رونا شروع کیا۔ اب لاکھ میں سمجھاتا ہوں کہ خدا کی بندی یہ تیرا شوہر سوائے دال ساگ کے کبھی کچھ نہیں کھاتا۔ خود چھنگا خفا ہوتے ہیں، مگر توبہ کیجئے! کہیں بگڑ گیا۔

چھنگا سے مجھ سے خوب لڑائی ہوئی۔ ایسی کہ پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ بہت برا مانے اور بات بے حد طول کھینچا۔ رات گئے جا کر ان کو منایا سمجھایا۔ مگر بھوجائی جی بگڑی پھولی پڑی رہیں۔

رات کو سونے کا وقت آیا تو میں نے کہا تم ادھر سو رہو میں اندر سوؤں گا بار بار وجہ پوچھنے لگے مگر میں نے نہ بتائی۔ آرام سے لیٹ گئے میں نے بھی کہا کہ رات گئے تک بیٹھا رہونگا لہٰذا ساتھ سونا نہ سونا برابر ہوا۔ چھنگا تو مزے سے باہر لیٹے۔ میں اندر جو آیا تو بیوی نے وجہ پوچھی۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جانتی ہو تیندوا رات کو آتا ہے۔" بیوی ہنسنے لگی مگر بھوجائی نے سن لیا۔ اب میری طرف غور سے دیکھتی ہیں میں نے کہا "دیکھتی کیا ہو، بڑے آرام سے سو رہیں گے۔"

میں نہیں عرض کر سکتا کہ وہ کس طرح بے کل ہو گئیں۔ کسمساتی رہیں۔ میں نے قصداً موقع دیا اور وہ سٹک کر گئیں اور چھنگا سے کہا چھنگا مارے ہیبت کے پھاند پڑے۔ گھبرا کر چلائے۔ میں پہونچا تو اکیلے کھڑے تھے۔ میں نے کہا "خیر تو ہے؟" کہنے لگے "تم گرمی میں کیوں اندر سو گئے؟" میں نے کہا "یونہی!" کہنے لگے "یہاں تیندوا آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ، ہونا آخر کو جنگل۔ ہاں اب تھوڑی آتا ہے پہلے آتا تھا!" یہ سنکر گویا پھاند پڑے۔ "ارے! وحشت کہیں کا!" تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ اب لاکھ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ برادر اب نہیں آتا پہلے آتا تھا مگر نہیں مانتے۔ گھر سر پر اٹھا لیا۔ اندر آئے۔ غل مچایا کہ مجھے کھا جاتا تو کیا ہوتا۔ بھوجائی کی جان ضیق میں آگئی تھی۔ وہ بھی بڑبڑائیں۔ قصہ مختصر نہ مانے۔ اندر سونے پر راضی ہوئے۔ میں نے کہا کہ "یار ادھر چور آتا ہے۔" ہنسنے لگے کہ "رہنے دو۔"

اس کے بعد بڑے محبت اور پیار کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ کس طرح بھوجائی کو یقین دلا دیا ہے کہ تم گوشت کھاتے ہو۔ سارا قصہ سنکر اٹھ بیٹھے۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بے حد رنجیدہ ہو کر بولے "پرسے ہو گئی۔" محض اس وجہ سے کہ نہ صرف بھوجائی بلکہ بدقسمتی سے میری بیوی بھی یقین کرتی ہے کہ گوشت کھاتے ہیں۔

کہنے لگے کہ "یار بڑا غضب ہو گیا۔ کیا سوچتا ہوگی؟" میں نے کہا "یہی سوچتی ہے کہ چھپ چھپ کر بکرے تو ہضم کر جاتے ہو نہ معلوم انکی ہڈیں چھوڑتے ہو کہ نہیں۔" بڑی فکر میں پڑے رہے۔ ایک یہی کیا غم تھا کہ گھر والی ان پر شبہ کر رہی تھی۔ میں نے کہا "یار اب سو رہو کل اٹھکر تردید کر دیں گے۔" مگر تردید مشکل تھی اس لئے کہ بھوجائی جی کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کی دوستی میں لوگ گوشت کھانے لگتے ہیں اور چھنگا کی

بدقسمتی سے اُن کے میکے میں اس کی کئی مثالیں تھیں۔

اب دوسرے دن لاکھ ترود کرتے ہیں مگر بھوجی چپ۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبح ناشتہ کیا۔ جانے کو تیار۔ کیسے کیسے میں نے روکا ہے اور کیسا کیسا ان کو سمجھایا کہ بھیا ایک روز اور ٹھہر جاؤ پر نہیں مانتے کہنے لگے کہ شگون روانگی کا بہترین ہے۔ پھر ایسا شگون مہینوں نہ آئیگا۔ میں نے دل میں کہا "ٹھہر تو جا تیرا شگون درست نہ کر دیا تو میرا ذمہ"

غرض شام کی گاڑی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے کہدیا تھا کہ شگون ٹھیک نہیں ہے نہ جاؤ مگر نہ مانے۔

دو تین اسٹیشن گئے ہوں گے کہ پولیس نے ان کو راستہ میں جالیا۔ اس الزام میں پکڑے گئے کہ پرائی عورت اندور سے بھگا کر لاتے ہو۔ گاڑی سے اتار لئے گئے۔ دیوتا کوچ کر گئے۔ ہوش جاتے رہے۔ پولیس والا ہے کہ ہتھکڑی ڈالے دیتا ہے قسمیں کھاتے ہیں میرا حوالہ دیتے ہیں۔ پولیس والے نے کہا کہ اگر مجھ سے تصدیق کرا دیں تو چھوڑ دیگا۔ تار پر وہ موذی کیا راضی ہوتا کہنے لگا نام بدل دیا ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ بھائی صاحب صبح کی گاڑی سے وارد اور کھڑا ہوا ہے تانگہ مع پولیس۔

خود سوچیے کہ میں بھلا کیا کرتا۔ میں نے کہا "میں ان سے واقف نہیں ہوں"۔

یہ سنکر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیران ہوکر بولے "ارے!" میں نے تخلیہ چاہا۔ سنجیدگی سے میں نے پوچھا "مرے یار ہم تمہیں ایسا نہیں سمجھے تھے۔ غضب کے شاطر نکلے۔ غضب کیا ہمیں بھی نہ بتایا!"

اب مع داڑھی چھنگا بھائی کی قسموں کا حال نہ پوچھئے۔ میں نے بھوجائی کو بھی بلایا اور اُن سے کہا "بھئی میں تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ بھلا اس بدتمیز داڑھی والے میں کیا رکھا تھا جو اس کے ساتھ بھاگیں"! یہ سنکر وہ بیچاری رونے لگیں۔ چھنگا نے مجھے مارنے کی دھمکی دی۔ خوشامد کی۔ میں نے کہا "یار بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک شرط ہے" بولے "وہ کیا؟" میں نے کہا "ہفتہ بھر ہمارے مہمان رہو" کہنے لگے "یہ ناممکن ہے" میں نے کہا "بہتر ہے، تم جانو تمہارا کام ہم کچھ نہیں جانتے۔" ادھر پولیس والے نے تقاضہ کیا۔ چار و ناچار راضی ہو گئے کہ ہفتہ بھر ٹھہریں گے۔ چنانچہ پولیس والے کو میں نے دفان کیا کہ بھئی میرے دوست ہیں اور میں ذمہ لیتا ہوں کہ یہ ان کی بیوی ہیں۔

اب اس لالہ کی بے ایمانی دیکھیے کہ دوسرے ہی دن بگڑ کھڑا ہوا کہ تم نے پولیس والے کو سکھا دیا تھا۔ کسی طرح نہ مانا۔ خلاف وعدہ بھاگ گیا۔ اور مثل سابق جو پولیس نے ریل میں پھر پکڑا تو اُسے مارا اور صاف نکل گیا۔

یہ تو سب کچھ مگر غور کیجئے بھوجائی جی کو کہ خط جو آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بھوجائی بیحد ہنستی ہیں۔ اور ایک دفعہ پھر آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اور اس چھنگا احمق سے خط برابر لکھواتی رہتی ہیں[1]

عظیم بیگ چغتائی

---

[1] تقریباً سال بھر سے چغتائی صاحب علالتِ مزاج کی وجہ سے ساقی کے لئے کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ پھر اُن کے مرض نے اتنی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی کہ وہ خطوط کے جواب بھی دینے سے معذور ہو گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اُن کی طبیعت سنبھل رہی ہے اور انشاء اللہ ہم ان کا مژدۂ صحت بھی جلد سنیں گے۔ چغتائی صاحب کے مضمون کی ایک کوئی اُمید نہیں تھی مگر ۱۴ دسمبر کو ایک لفافہ میں مندرجہ بالا خط یا مضمون ملا جس کے ساتھ چغتائی صاحب کا کوئی خط نہیں تھا۔ اسے سالنامہ ساقی کے لئے اُن کا تحفہ سمجھکر شائع کر دیا گیا ہے۔ اگر فی الحقیقت یہ ساقی کے لئے مضمون نہیں بلکہ محترمہ حیا کے نام چغتائی صاحب کا مکتوب ہے تو اسے شائع کرنے میں پہلے چغتائی صاحب اور پھر مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن یہ اگر غلطی بھی ہے تو بہت لطیف اور دلچسپ کہ سالنامہ ساقی میں ایک دلکش مضمون کا اس سے اضافہ ہوا

گفتارِ بیخود

مسخر کر لیا کرتی ہے وحشت عشق جاناں کی
بنیں تعویذِ بازو دھجیاں میرے گریباں کی

ستم کے بعد یاد آنا انھیں شامت ہے انساں کی
اجل بن جائیں گی یہ ہچکیاں بیمارِ ہجراں کی

ترے جلوؤں کی عادی ہیں نگاہیں اہلِ عرفاں کی
سمائیں گی نظر میں کیا بہاریں باغِ رضواں کی

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہار انکی
بہار آئی ہے گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

بنیں گی نور یہ تاریکیاں یوسف کے زنداں کی
دعائیں بہرِ آرائش چلی ہیں پیرِ کنعاں کی

کہاں سے میں کہاں پہنچا مری قسمت کا کیا کہنا
ارم سے کھینچکر لائی ہے مٹی کوئے جاناں کی

مرے قاتل نے کس پانی میں خنجر کو بجھایا تھا
لہو کے ساتھ کچھ ٹپکی ہیں بوندیں آبِ حیواں کی

خلافِ وعدہ کوئی آ گیا گھر ہو گیا روشن
ہوئی تقسیم زلفوں میں سیاہی شامِ ہجراں کی

نشانی میرے قاتل کی مری بخشش کو کافی ہے
الٰہی ٹوٹ کر رہ جائے دل میں نوک پیکاں کی

علاجِ وحشتِ دل اس سے بڑھکر اور کیا ہوگا
گلے میں ڈالکر نکلا ہوں میں زنجیر زنداں کی

نہیں مٹتی ہے دم بھر کو بھی یادِ رفتگاں دل سے
نظر کے سامنے تصویر ہے گورِ غریباں کی

تصور میں مرے کے آتے ہوئے تو خواب میں آتے
کششِ سے دل کی سٹی گم ہوئی انکے نگہباں کی

وہ پھر فاتحہ آتے ہوئے اب کیوں جھجکتے ہیں
کہ اب تو خاک بھی باقی نہیں تربت میں ارمانکی

امیدِ مرگ سے وابستہ تھی دیدار کی حسرت
خوشی دیکھے دمِ آخر کوئی بیمارِ ہجراں کی

ترے عاشق تو ناکامِ تمنا رہ نہیں سکتے
کہ صبحِ حشر نے کی ہے تلافی شامِ ہجراں کی

ہمارے سامنے اس حسنِ ظاہر کی حقیقت کیا
ہماری آنکھ تو نظارگی ہے حسنِ پنہاں کی

ابھر آئیگی کشتی بحرِ غم سے ڈوب کر بیخود
غلامی کا شرف حاصل ہے مجھکو شاہِ جیلاں کی

بیخود دہلوی

اُزومہ اُدوری

ٹوکیو میں گیشاؤں کی انجمن کی جانب سے سال میں دو مرتبہ ناچ دکھایا جاتا ہے۔ پہلا ناچ ماہ اپریل میں جب سکورا کی بہار ہوتی ہے۔ اسی کو "اُزومہ اُدوری" کہتے ہیں۔ دوسرا ماہ نومبر میں جب خزاں کی وجہ سے درختوں پر سُرخ رنگ کھلتا ہے۔ اسے "اُنشو کائی" کہتے ہیں پچاس سال سے یہ ناچ برابر ہو رہے ہیں۔ پہلے جب گیشاؤں کا اپنا تھیٹر نہیں بنا تھا تو مختلف تھیٹروں میں ناچوں کا انتظام ہوتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی انجمن نے "شمباشی اِمبُوجو" کے نام سے چومنزلہ تھیٹر تعمیر کر لیا تو اس میں ناچ ہونے لگے۔ اپریل و نومبر میں گیشاؤں کے ناچ ہوتے ہیں۔ باقی دس مہینے ڈرامہ دکھانے والی کمپنیوں کو کرائے پر دے دیا جاتا ہے۔

اس تھیٹر میں صرف علاقہ شمباشی کی گیشائیں کھیل کرتی ہیں جو فن کے اعتبار سے تمام ٹوکیو میں مشہور ہیں اور اپنی قدیم روایات کی حامل ہیں۔ گیشا کا فرض مردوں کی تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کسب کمانا اس کا پیشہ نہیں۔ پہلے زمانے میں مردوں کے ساتھ عورتیں باہر نہیں نکلتی تھیں۔ مرد کسی سیاسی یا سماجی ضرورت سے ایک جگہ جمع ہوتے تھے تو گا بجا کر ان کا دل بہلانے کے لئے گیشائیں طلب کی جاتی تھیں۔ عہدِ توکوگاوا (۱۶۰۳ء تا ۱۸۶۷ء) میں شوگن کا پایہ تخت "ایدو" یعنی موجودہ ٹوکیو رہا۔ احکام شوگن کے بموجب ہر نواب کو چھ مہینے اپنی جاگیر پر اور چھ مہینے ٹوکیو میں بسر کرنے پڑتے تھے۔ ان نوابوں کے جلسوں میں سیاسی بحثیں چھڑ جاتی تھیں اور سخت کلامی تک نوبت پہنچتی تھی۔ گیشاؤں کا کام تھا کہ ایسے موقع پر لطیفوں اور چٹکلوں سے جانبین کی توجہ اپنی جانب منعطف کر لیں۔ اس کے لئے بہت سمجھ کی ضرورت تھی اور گیشائیں بڑی خوبی سے یہ فرض انجام دیتی تھیں۔ گانے بجانے اور ناچنے کے ساتھ لطیفہ سنجی ان کی تعلیم کا اہم جُزو تھا اور اب بھی ہے۔

عہدِ توکوگاوا کے بعد شاہی عہد میں بھی گیشاؤں کا یہی کام رہا۔ مدبرینِ مُلک سیاسی مسائل پر بحث کرنے کیلئے اپنے دفاتر کے خشک کمروں پر شمباشی کے رسٹارنٹوں کو ترجیح دیتے تھے کہ یہاں سنجیدہ گفتگو کے ساتھ تفریح بھی ہوتی رہتی تھی۔ پچھلے تیس چالیس سال میں جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اخبارات بے انتہا اور اعلیٰ پیمانے پر جاری ہو گئے ہیں اور ہر شخص گھر بیٹھے دُنیا بھر کی خبر معلوم کر سکتا ہے۔ پہلے یہ حال نہ تھا۔ اُس زمانے میں گیشائیں تفریحِ طبع کے علاوہ معلومات بڑھانے کا بھی ذریعہ ہوتی تھیں۔ وہ ایک طرح کا اخبار تھیں اور مدبرین و عمائدین ان کے پاس خبریں حاصل کرنے آتے تھے۔ اخبارات کی روز افزوں اشاعت سے گیشاؤں کا بازار مندا ہو گیا۔ نا اہل گیشائیں پیٹ بھرنے کیلئے اپنے اعلیٰ معیار سے گر گئیں۔ یہی عام گیشاؤں کی بدنامی کا باعث ہوئی ہیں۔

گیشاؤں کے مکان پر کوئی مرد نہیں جاتا۔ یہ جاپانی رسٹارنٹوں میں یا جلسوں میں فرمائش پر بُلائی جاتی ہیں اور وہیں ان سے مُلاقات ہوتی ہے۔ دعوتوں میں یہ کھانا پیش کرتی ہیں اور ساقی کی خدمت بجا لاتی ہیں۔ حاضر جوابی سے حاضرین کو محظوظ کرتی ہیں اور گا بجا کر ان کا دل بہلاتی ہیں۔

شمباشی امبوجو زلزلہ ضامن اور آتش ضامن عمارت ہے۔ تین منزلوں پر تماش بینوں کی نشست کا انتظام ہے۔ ان کی تمام ضروریات عمارت تھیٹر کے اندر پوری ہوسکتی ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج ضروری کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک منزل میں کئی کئی رسٹارنٹ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ چوکولیٹ، سگریٹ وغیرہ کی دکانیں بھی ہیں۔ تین جانب وسیع برآمدہ ہے جہاں جگہ جگہ مخملی صوفے لگے ہوئے ہیں کہ لوگ بیٹھ کر سگریٹ پی سکیں۔ آڈیٹوریم میں قیمت کے لحاظ سے الگ الگ درجے ہیں اور ان میں نشستیں محفوظ ہیں۔ آڈیٹوریم کے باہر تھیٹر کے جملہ انتظامات سے ہر کس و ناکس یکساں مستفید ہوسکتا ہے۔ یہاں درجے کی کوئی تخصیص نہیں۔ تھیٹر میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کو مطبوعہ پروگرام جاپانی زبان میں مل جاتا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے انگریزی کا مختصر پروگرام مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طویل مصور پروگرام قیمتاً مل سکتا ہے۔ ایک دکان پر مندرج پروگرام ناچوں کی تصاویر کے کارڈ فروخت ہوتے ہیں۔

سامنے اسٹیج ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں آنے جانے کا راستہ ہے۔ آرکسٹرا اسٹیج پر نہیں ہے بلکہ آڈیٹوریم کی بغل میں ہے۔ دائیں جانب دو منزلہ آرکسٹرا ہے۔ بارہ گیشائیں نیچے بیٹھتی ہیں اور بارہ اوپر۔ نیچے کی منزل والیاں کچھ طبلہ بجاتی ہیں کچھ کندھے کی ڈھولک کچھ شامیسین اور کچھ بانسری۔ اوپر کی منزل میں چھ شامیسین بجاتی ہیں اور چھ گاتی ہیں۔ بائیں جانب والا آرکسٹرا ایک منزلہ ہے جس میں بارہ گیشائیں شامیسین بجاتی ہیں۔ سب کی نشست دوزانو ہے۔ دونوں آرکسٹرا باری باری سے بجاتے ہیں۔ جب ایک آرکسٹرا کام کرتا ہے تو دوسرے پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مغربی بینڈ بھی ہے جو دائیں آرکسٹرا اور اسٹیج کے درمیان واقع ہے۔ اس میں بھی کنڈکٹر کے علاوہ تمام باجے والیاں عورتیں ہوتی ہیں۔

آرکسٹرا کی ترتیب کے علاوہ اس تھیٹر میں ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ اسٹیج کے پہلوؤں کے سوا دو راستے اور ہیں جن سے اداکاریں آتی جاتی ہیں۔ دونوں آرکسٹروں کے سامنے یعنی آڈیٹوریم کی بغل میں راستے بنے ہوئے ہیں جو اسٹیج سے آڈیٹوریم کی پشت تک جاتے ہیں گویا کہ "نو" تھیٹر میں ایک پل ہوتا ہے یہاں دو ہیں۔ اداکاریں ان پلوں پر سے اداکاری کرتی ہوئی آتی ہیں اور اسی طرح حاضرین کی بغل میں سے اداکاری کرتی ہوئی پیٹھ کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔

کابکی تھیٹروں کی طرح یہاں بھی ایک تماشہ مہینہ بھر تک دکھایا جاتا ہے۔ امسال پروگرام میں بیس۲ ناچ تھے بعض ناچ ایک دوسرے سے غیر متعلق تھے تو منظر ختم ہونے پر تمام تھیٹر میں اندھیرا کر دیا جاتا تھا اور اداکاریں اندھیرے میں اسٹیج پر سے چلی جاتی تھیں اور پردے بدل جاتے تھے۔ اکثر ناچ ایسے تھے کہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے تھے تو حاضرین کے سامنے ہی پردے بدلے جاتے تھے۔ درخت کھنچے چلے آرہے ہیں۔ مکان کھسکے چلے جارہے ہیں۔ نیچے سے جنگل کے جنگل اٹھ رہے ہیں۔ اوپر سے مناظر اتر رہے ہیں۔ کوئی آدمی ان کو جاتا ہوا نہیں دکھائی دیتا کوئی ہاتھ انہیں سرکاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تمام کام کلوں سے ہو رہا ہے۔ اسٹیج والے حاضرین کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ جنگل لگا لگایا پیش کر دیا بلکہ دکھا دیتے ہیں کہ ہم جنگل کا منظر اس طرح بناتے ہیں۔ اسٹیج والوں نے آپ کو اپنا رازدار بنا لیا۔ بعض

تماش بین اس آشکارا راز کو دیکھ کر ہنس بھی دیتے ہیں۔ مناظر جمانے کی ترکیب کے ساتھ ساتھ ان کی خوبصورتی نہایت دلفریب ہوتی ہے۔ منظر نگاری میں جاپانی کسی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ صرف ایک پردے سے منظر نہیں بناتے بلکہ اس کے اجزا الگ الگ جما کر بڑا پیارا نظارہ مکمل کر دیتے ہیں۔

مناظر نگاری کے علاوہ جاپانی روشنی کے کام میں بھی استاد ہیں۔ روشنی کے لئے صرف اسٹیج کے آگے ہی برقی قمقمے نہیں ہوتے بلکہ پہلوؤں میں، آرکسٹروں کے اوپر، سامنے یعنی تماشائیوں کی پشت پر اور چھت میں طرح طرح کی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ کبھی پہلوؤں سے رنگین روشنیاں نکل کر اسٹیج پر رقص کرتی ہیں۔ کبھی سامنے سے روشنی کا ہالہ پڑتا ہے اور کبھی چھت میں سے نور کی چادر اترتی نظر آتی ہے۔ غرضیکہ روشنی کا اعجاز دکھاتے ہیں۔ تماشے کے دوران میں آڈیٹوریم میں اندھیرا ہوتا ہے۔ راستہ چلنے کے لئے فرش میں قمقمے لگے ہوتے ہیں۔

تماشے کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو"۔ اس کے دو حصے تھے۔ پہلے کا نام "حصہ قلم" تھا اور دوسرے کا "حصہ شمشیر"۔ پہلے میں نو ناچ تھے اور دوسرے میں گیارہ۔ تماشہ "ہنومارو۔ سمباسی" سے شروع ہوا۔ تین گیشائیں مردوں کے لباس میں آئیں اور آفتاب کے سامنے مبارکباد ناچیں۔ آفتاب جاپان کا قومی نشان ہے اور تمام جہان کو منور کرتا ہے۔ یہ ناچ مردانہ تھا اسی وجہ سے اس میں کچھ کرختگی تھی۔

اس کے بعد دو ناچ "مُراساکی شکیبو" سے متعلق تھے۔ یہ ایک درباری خاتون تھی جس نے گیارہویں صدی میں "گینجی۔ مونوگتاری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ جاپان کا پہلا ناول ہے اور کلاسیک مانا جاتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لئے اس نے ایک خانقاہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ جب وہ ختم ہو گئی تو اس کی خوشی میں ناچی ہے۔ پہلے ناچ کا نام "مندر میں چاند" ہے۔ نام کی مناسبت سے رات کا منظر تھا۔ چاند برآمد ہو چکا تھا۔ دو خادمائیں کشتی میں کتاب کی جلدیں لے کر حاضر ہوئیں۔ یہ اپنے حجرے سے برآمد ہوئی اور ان کے ساتھ جشن منایا۔ پہلے چاند کی پوجا کی پھر تینوں مل کر ناچیں۔ ناچ میں کتاب کا طریقہ اور لکھنے میں جو مشقت ہوئی اسے ظاہر کیا اور تکمیل پر اظہار مسرت کیا۔ دوسرا ناچ اسی کتاب کے ایک باب کی تفسیر تھا جس کا نام "اکاشی کا افسانہ" ہے۔ خلیج اکاشی پر شہزادہ گینجی اور شہزادی اکاشی سمندر کے کنارے نظر آتے ہیں۔ شہزادہ کسی مہم پر جا رہا ہے۔ دونوں الوداعی رقص ناچتے ہیں۔

چوتھا ناچ "کابکی ناچ" تھا۔ اوائل سولھویں صدی میں کیوتو کے قدیم اسٹیج کا منظر ہے۔ سکورا کی بہار ہے۔ "ازومو۔ اوکُنی" عورت اور "ناگویا۔ سنزا" مرد جو کابکی کے بانی ہیں ناچتے ہیں۔ چھ خوبصورت لڑکیاں بھی ناچ میں شریک ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کے ناچوں میں پھولوں کے مناظر تھے۔

پانچویں ناچ میں دو گل فروش نوجوان لڑکے پھولوں کی بہنگیاں کندھے پر رکھے اسٹیج پر آتے اور رقص کیا۔

چھٹا رقص آلوچے کے پھولوں کا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی قدیم زمانے کی کسبیوں کے لباس میں ناچی۔ منظر میں آلوچے کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

ساتواں ناچ سکورا کا تھا۔ چاروں طرف پھول کھل رہے ہیں۔ درخت لدے پڑے ہیں۔ یہ ناچ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اسکے دوران میں اوپر سے گل سکورا کی پتیوں کی بارش ہوا کرتی ہے۔ اس مرتبہ ایک جدت تھی۔ گیشاؤں کے ناچ میں سینما کی ٹیکنیک مخلوط کر دی گئی تھی۔ پتیوں کی بارش کی بجائے پردے پر اسی منظر کا فلم دکھایا تھا۔ پردے پر فلم اور اس کے سامنے اسٹیج پر ناچ کچھ ایسے ہم آہنگ ہوگئے تھے کہ لطف دوبالا ہوگیا تھا۔ ناچ میں ایک مرد سارنگی لئے ہوئے تھا اور ایک عورت شامیسین بجا رہی تھی۔ دونوں پہلے سازوں کے ساتھ ناچے۔ پھر انہیں رکھ کر۔

آٹھویں رقص میں وسٹیریا کے پھولوں کا منظر تھا۔ پھولوں کے لمبے لمبے گچھے جابجا درختوں میں لٹک رہے تھے۔ دو عورتوں نے ایک چھتری کے نیچے رقص کیا۔

نویں رقص میں گل داؤدی کا منظر تھا۔ باغ میں دُور دُور تک اس کے گملے لگے ہوئے تھے اور جابجا کھل رہے تھے۔ اس منظر میں گھروں کی نوکریں ناچیں۔ اس رقص کے ساتھ پہلا حصہ ختم ہوا۔

دوسرے حصہ میں گیارہ ناچ تھے اور سب میں فوجی عنصر موجود تھا۔ پہلا رقص "یاماتو۔ داماشی" تھا۔ بہت سی گیشائیں شمشیر کے مندر کے سامنے روحِ جاپان کے نغمے کے ساتھ ناچیں۔

دوسرے رقص میں ایک مشہور شمشیر ساز بھٹی کے سامنے تلوار بنا رہا ہے فصل کا دیوتا نمودار ہوتا ہے اور لوہار کی مدد کرتا ہے۔ اس کی امداد سے ایک متبرک تلوار بن جاتی ہے اور دونوں ناچتے ہیں۔

تیسرا رقص ایک مشہور تلوار کی تعریف میں تھا۔ ایک سورما جنگل میں چلا جارہا ہے کہ یکایک گھاس میں آگ لگ گئی۔ ذرا سی دیر میں پھیل گئی اور چاروں طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آگ میں گھر گیا۔ اس وقت اس نے تلوار کا رقص کرنا شروع کیا۔ اس کی برکت سے شعلوں کا زور کم ہوا یہاں تک کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہوگئی اور تلوار جیت گئی۔ آگ بجھانے میں جنگل کی پریوں نے سورما کا ساتھ دیا۔ شعلہ رنگ کپڑوں میں نمودار ہوئیں اور کھلے ہوئے دامنوں سے آگ بجھانے میں اس کی مدد کی۔ اس ہیبت ناک سماں میں پریوں کا ناچ ناچ کر دامن ہلانا بڑا پیارا منظر تھا۔

چوتھے رقص میں سپاہیوں کی حوصلہ مندی کا اظہار تھا۔ جب وہ جنگ پر جاتے ہیں تو کس طرح جان سے ہاتھ دھو کر نڈر بن کے گھر سے نکلتے ہیں۔

پانچویں رقص میں "ناگی ناتا" کی تعریف تھی۔ یہ ایک قسم کی تلوار ہوتی ہے جس کا دستہ ایک مٹھ کی بجائے نیزے کے برابر لمبا ہوتا ہے۔ "ہاچیمان" جنگ کے دیوتا کے مندر کے سامنے اس تلوار کا رقص کیا گیا۔

چھٹا رقص ٹواکے۔ کیو مارو" کی تعریف میں تھا۔ یہ پرانے زمانے کا ایک سورما تھا مصیبت کے وقت وفادار رہا اور جاپان کو ایک بڑی آفت سے بچا لیا۔ یہ اب جاپان کا محافظ دیوتا مانا جاتا ہے۔

ساتویں رقص میں دہقانی عورتیں ناچیں۔ ان کے شوہر اور بھائی سب لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ کاشتکاری کا تمام کام عورتوں کے سر پر آپڑا ہے۔ انہوں نے ناچ ہی ناچ میں کھیتی کا تمام کام کر دکھایا۔ زمین کھودنا اور برابر کرنا، بیج ڈالنا، کھیتی کاٹنا، دھان کے پودوں کے گٹھے باندھنا اور سکھانا، دھان کوٹنا اور پھٹکنا، تولنا اور بوریوں میں بھرنا، غرضیکہ

ہر عمل ناچ میں ظاہر کر دیا۔

آٹھویں رقص میں کارخانوں کی مزدورنیاں تھیں۔ اس میں جاپان کی صنعتی ترقی دکھائی تھی۔ پارچہ بافی کا کارخانہ ہے۔ مزدورنیاں سُوت کی چرخیاں لئے ناچ رہی ہیں۔ ناچ ہی میں تانے بانے ڈال کر کپڑا بُن رہی ہیں۔

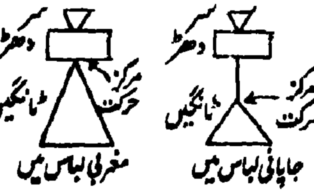
نویں رقص میں دُنیا کے مختلف ممالک کی عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں اسٹیج پر آئیں اور اتحاد کا رقص ناچا۔

گیارہواں رقص تمام تماشے کا لب لباب تھا۔ اس کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو" اس میں تمام گیشائیں جن کی تعداد تقریباً تین سو تھی اسٹیج پر مل کر ناچیں۔ اس منظر میں دراصل آپیرا کی ٹکنیک خلط ملط کر دی تھی کہ تمام ادا کاریں بیک وقت اسٹیج پر جمع ہو گئیں۔

گیشا کا ناچ مغربی ناچ سے اور ہندوستانی ناچ سے بھی بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس میں حرکت کم اور سکون زیادہ ہوتا ہے۔ ترت پھرت نام کو نہیں۔ خطوط اور زاویئے بنانے کا نام ناچ ہے جسے ہم بتانا کہہ سکتے ہیں۔ اس بتانے میں ایسی نزاکت اور لطافت ہوتی ہے جو دیکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ناچ میں کولھوں کے خم، بدن کے جھوک اور ہاتھوں کے اشاروں سے عجیب اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر حرکت نہایت سہولت سے انجام پاتی ہے۔ ناچنے والیوں کی بھولی ادائیں دل لُبھانے میں جادو کا کام کرتی ہیں۔

جاپانی پنکھیا ناچ کا اہم جزو ہے۔ کمونو کی لمبی آستینیں جاذبیت پیدا کرنے میں بہت مُمِد ہوتی ہیں۔ تمام ناچ بیانیہ ہوتا ہے جو گانے کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ بعض ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا مطلب اجنبی بھی سمجھ لیتا ہے۔ بہت سے ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا سمجھنا بغیر مخصوص اشاروں کے معنی جانے مشکل ہے۔ تاہم کوئی ناچ ایسا نہیں ہوتا جس میں بے حیائی کا شائبہ ہو یا جس سے جذباتِ اسفل برانگیختہ ہوں۔ بلکہ اُس کے دیکھنے سے مذاق میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے سمجھنے میں دقت ضرور ہوتی ہے کیونکہ بالکل اجنبی چیز ہے۔

مجھے اِس مرتبہ ایک ہی مہینے میں گیشاؤں کا ناچ اور آپیرا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیشاؤں کے ناچ سے میں اپنا دل لطیف جذبات سے پُر لے کر اُٹھا۔ آپیرا میں مغربی ناچ تھا۔ فوق البھڑک لباس، اکثر نیم برہنہ کپڑے، ناچ میں برق کی سی تیز رفتاری، لڑکیوں کی چونچالی، سب باتیں نظر فریب اور جذبات میں ہیجان برپا کرنے والی تھیں مگر وہ لطافت مفقود تھی۔



جاپانی ناچ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں کئی عناصر نظر آتے ہیں جو لطافت و نزاکت پیدا کرتے ہیں۔ ناچ میں انسانی جسم کے تین جوڑ اکثر حرکت میں آتے ہیں اوّل گردن، دوئم کمر، سوئم گھٹنا۔ ان میں بھی گھٹنا سب سے زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ مغربی اور جاپانی لباس میں اس لحاظ سے بڑا اہم فرق ہے مغربی اور ہندوستانی لباس میں عورت کی ٹانگیں وسیع دائرے میں گھوم سکتی ہیں۔ برخلاف اسکے کمونو بدن پر ایسا چُست ہوتا ہے کہ ٹانگوں کا گھماؤ بہت تنگ دائرے

میں ہوتا ہے۔ مندرجہ نقشوں سے واضح ہوگا کہ اوّل الذکر لباس میں مرکزِ حرکت بہت اوپر یعنی کولھوں کے قریب ہوتا ہے۔ جاپانی لباس میں یہی مرکز گھٹنوں کے قریب واقع ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاپانی عورت لمبا قدم نہیں ڈال سکتی اور وہ اپنے گھٹنوں کو بہت کم حرکت دے سکتی ہے۔ سُبک رفتاری اور نازک خرامی اس کے اجزائے لاینفک ہیں۔

دوسرا عنصر جاپانی عورت کی گردن اور گھٹنوں کا خم ہے۔ وہ کبھی اپنا سر بلند کرکے نہیں کھڑی ہوتی۔ اس کی گردن آگے کو جھکی رہتی ہے اور سر اور دھڑ میں تقریباً ایک سو ساٹھ درجے کا زاویہ بنتا ہے۔ یہ اس کی نزاکت کا اہم عنصر ہے۔



اسی طرح گھٹنے آگے کو جھکے رہتے ہیں اور اتنا ہی زاویہ پنڈلیاں رانوں کے ساتھ بناتی ہیں۔ اس حالت میں جسم کا توازن قائم رکھنا مشکل ہے۔ اس کا یہ تدارک کرتی ہے کہ پاؤں کے پنجے اندر کی جانب موڑتی ہے۔ قدم ڈالتے وقت اس کے پنجے ہمیشہ اندر کی جانب پڑتے ہیں۔ پنجوں کا خم اس کو لمبا قدم ڈالنے سے باز رکھتا ہے۔ اور سُبک رفتاری میں مُمد ہوتا ہے۔

تیسرا عنصر کِمونو کی لمبی آستینیں ہیں۔ مغربی عورت اپنے بازو وسیع دائرے میں گھما سکتی ہے۔ جاپانی عورت ڈھیلی ڈھالی آستینوں کی وجہ سے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اُٹھاتی ہے اور اُسے تنگ دائرے میں حرکت دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں جاپانی عورت کو ہر حرکت میں نزاکت دکھانے پر مجبور کرتی ہیں اور اس کی ہر ادا میں لطافت محسوس ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہے جو غالباً تمام مندرجہ عناصر پر غالب ہے۔ گیشا اپنے پرستاروں پر شوخیِ ادا کا جادو نہیں چلاتی بلکہ وہ سادگیِ ادا سے ان کے دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ اس کی سادہ ادائیں بھول پن کا اظہار کرتی ہیں جو اپنے اندر عجب اندازِ دلکشی رکھتا ہے۔

گیشا ٹھیٹھ جاپانی لباس میں اسٹیج پر آتی ہے۔ سر کے بال تاج کی صورت میں بنے ہوتے ہیں۔ پاؤں میں سفید جراب۔ تمام بدن کِمونو سے ڈھکا ہوا اور اس پر شاندار ادبی۔ اس کے ناچ تمام جاپانی ہوتے ہیں۔ ہر ادا جاپانی۔ وہ قدامت پرستی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مگر گیشائیں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ اپنے لباس اور ناچ میں تو قدیم روش کی پابند ہیں مگر اسٹیج پر تھیٹر کی ٹکنیک سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ تھیٹر کے پردے اور مناظر، برقی رنگین روشنی، سینما اور آپیرا کی ٹکنیک، یہ سب باتیں اپنے ناچ میں آمیزش کرکے اُسے ترقی دے رہی ہیں۔ ناچوں کے نام بھی اسی امر پر دلالت کرتے ہیں۔

نور الحسن برلاس

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے چھاتی پر مگر جلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی گل ریز رو کے ہر بستر کا شانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے سے اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
● جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں　　لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے　　اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں　　اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں　　میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں　　اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے　　سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں　　تاج پر اسکے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس "اندرسبھا" کا ساز و ساماں پھونکدوں　　اس کا گلشن پھونکدوں، اسکا شبستاں پھونکدوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونکدوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز
بی۔ اے۔ (علیگ)

سعید

"خدا جانے کتنا لمبا سفر ہے" تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں ایک مریض مسافر نے تنگی گنجائش سے عاجز آکر کہا۔

"میرے بستر پر یہ صندوقچہ کس نے رکھدیا" ایک موٹے تازے مسافر نے پوری سیٹ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں کوئی اسٹیشن آگیا اور غریب مسافر بھیڑ بکری کی طرح تھرڈ کلاس ڈبوں میں گھسنے لگے۔

"دیکھو اِدھر ماں بہنیں بیٹھی ہیں۔ تم کہاں گھسے جا رہے ہو" ایک غیور مسافر نے کہا۔ "بابا بیڑی اِدھر منہ کرکے پیو تمام دھواں میرے حلق میں جاتا ہے" ایک تمباکو بیزار مسافر نے احتجاج کے طور پر کہا۔

اوّل تو اس ڈبہ میں ویسے ہی جگہ نہ تھی اسٹیشن آنا قیامت ہوگیا۔ مسافروں کو جگہ کا خیال نہ تھا۔ بس کسی طرح ڈبے میں گھس پڑنا مقصود تھا۔ گارڈ صاحب سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں چلے گئے اُنہوں نے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی حالتِ زار پر نظر ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسی طرح اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ تھرڈ کلاس میں ایک پر ایک آدمی چڑھا ہوا ہے باہر نکل کر سیٹی دیدیا اور گاڑی چلدی۔ ٹکٹ چیکر صاحب چھلانگ مار کر پائیدان پر کھڑے ہوگئے اور ڈبہ میں گھسکر اطمینان سے ٹکٹ چیک کرنے لگے۔ مسافروں کی پریشانی کا غرض کسی کو احساس نہ ہوا۔

"کیوں بھئی اب دہلی کتنی دور ہوگی ؟" بیمار مسافر نے اپنے پاس والے مسافر سے [illegible]افت کیا۔

"ہنوز دہلی دور است" ایک برخود غلط ظریف صاحب بولے۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں" ایک مسافر نے بیمار مسافر سے دریافت کیا۔

"جہنم سے۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا" بیمار نے آخر جل کر کہا۔

"میاں گھبراؤ نہیں دو تین گھنٹے کا سفر اور ہے" ایک مسافر نے آخر جواب دیا۔

بیمار مسافر کی عمر مشکل سے بائیس۲۲ سال کی ہوگی۔ اسکے خدوخال نہایت اچھے تھے۔ خرابی صحت کے باوجود وہ وجیہ نظر آرہا تھا۔ ہاں لیکن اس کی ایک ایک حرکت سے تکدّر، اضمحلال اور آثارِ علالت ظاہر تھے مسلسل بیماری نے اس کی رُوح تک کو بیمار بنادیا تھا۔ زندگی کے حیات بخش جلوے اس کے سینے میں بجھ چکے تھے۔ افسردگی کی فروانی بھی بعض وقت انسان میں ایک نحیف سی جولانی پیدا کردیا کرتی ہے۔ بیمار نوجوان پر اس قسم کی جولانی کے اکثر "دورے" پڑتے رہتے تھے اور بعض دفعہ تو وہ اس قدر زندہ دل، پرگو شیریں گفتار بنجایا کرتا تھا کہ کوئی اسکو بیمار تصور کرہی نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک نہایت سیدھے سادے کردار کا مالک تھا۔ تصنع، نمود۔ منافقت وغیرہ سے اُسکو عار تھا۔ صاف باطن اور پاک ضمیر انسان تھا۔ نہ تو کسی کی خود غیبت کرتا تھا اور نہ سُننے کا روادار تھا۔ صاف گوئی کا مادہ تو اس میں اسقدر خطرناک حد تک تھا کہ اگر آپ کوئی راز کی بات بھی اس سے کہدیں تو اس کے اخفا کی آپکو توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ اس قسم کے کیریکٹر کے انسان کو عوام احمق یا سادہ لوح سمجھتے ہیں۔ بارہا اس کو

لوگوں نے اس کے منہ پر احمق کہا لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

وہ تقریباً پانچ سال سے مرگی جیسے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ علاج کی استطاعت نہ تھی۔ ایک دُور کے رشتہ دار نے ازراہ خُدا ترسی اس کا علاج و معالجہ کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا آخر اُسکو کشمیر بھیجا جانا تجویز ہوا۔ اب وہ چار سال کشمیر میں صرف کرکے دہلی آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلہ میں اب ذرا بہتر نظر آ رہی تھی۔

اتنے طویل سفر کے بعد اس کی جیب میں اب ایک پائی بھی نہ تھی۔ دہلی میں اُس کی دور رشتہ کی ایک خالہ رہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ملازمت نہ ملنے تک وہ اُن کے ہاں قیام کریگا۔ لیکن اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے کے بعد اس کی غیرت مقتضی نہیں تھی کہ ان کے پاس جاکر ٹھیرے۔ اس کے خالو دہلی کے نہایت معزز لوگوں میں سے تھے، وہ کب اس کی پریشاں حالی کے متحمل ہو سکتے تھے۔

آخر دہلی اسٹیشن آ گیا۔ سعید (مریض نوجوان) اُتر پڑا۔ اس کے پاس سامان کچھ نہ تھا۔ فقط ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسکو ہاتھ میں لیکر وہ سیدھا نواب فخرالدین علی خانصاحب (اُس کے دُور کے خالو) کی کوٹھی پر پہونچا۔ اور ملازم سے اپنے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ ملازم نے سر سے پیر تک سعید کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"معاف فرمائیے۔ نواب صاحب اس حالت میں آپ سے شاید ہی ملنا پسند کریں۔"

"آخر بیگم صاحبہ میری خالہ ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ نواب صاحب مجھے ٹالدیں۔ تم اطلاع تو کرو۔"

بادلِ ناخواستہ ملازم اندر گیا اور چند منٹ بعد طلبی کا پیام لے کر باہر آ گیا۔ سعید دل میں کچھ گھبراہٹ لیکن چہرے پر سکون لئے کمرے میں داخل ہوا۔ نواب صاحب بہت مصروف و کاروباری قسم کے انسان تھے۔ لوگوں کو ملاقات کا بہت کم وقت دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سعید کے سراپا پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سعید آداب کر کے بیٹھ گیا۔

"کہئیے؟" اُنہوں نے بغیر مُلاقاتی کی جانب دیکھے ہوئے کہا۔

"میرا نام سعیدالدین علی خاں ہے۔ اور بیگم صاحبہ سے ایک رشتہ کا بھی شرف رکھتا ہوں۔"

"افسوس آپ ایسے موقع پر آتے ہیں کہ میں آپکی اس وقت کچھ امداد نہیں کر سکتا۔" نواب صاحب نے خُشک لہجہ میں کہا۔ سعید کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ نواب صاحب نے اس کے تیور دیکھکر اپنی غلطی کا احساس کیا اور فوراً لہجہ بدلکر بولے۔ "معاف کیجئے۔ شاید میں نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی۔ کیا میں آپکی تشریف آوری کی غایت معلوم کر سکتا ہوں۔"

"میں آپ سے اور بیگم صاحبہ سے صرف نیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس ملاقات سے میری اور کوئی غرض وابستہ نہیں ہے۔"

"صرف ملاقات؟"

"جی۔"

"آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں سیدھا کشمیر سے آپکی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔" اس کے بعد سعید نے اپنی علالت و قیام کشمیر وغیرہ کے حالات تمام تر نواب صاحب سے بیان کئے۔ اُس نے کشمیر اور وہاں کی تفریحات کو اس خوبی سے پیش کیا کہ نواب صاحب اس کی تقریر میں بیحد دلچسپی لینے لگے۔

"آپ مصوّر ہیں۔ آپ نے کشمیر کا جیسا لفظی نقشہ کھینچا ہے اس سے آپکے تخیّل و زبان کی بے اختیار داد دینے کو جی

چاہتا ہے۔"

"واد تو اردو زبان کو دیجئے۔ جس میں یہ قدرت ہے کہ خیالات وجذبات کا وہ اس خوبی سے اظہار کرسکتی ہو۔"

"اچھا میں بیگم کو مطلع کرتا ہوں۔ اگر وہ تم سے ملنا پسند کرینگی تو ابھی طلب کرلیں گی۔" نواب صاحب نے کہا۔

دفعتہً کمرے میں ایک وجیہ نوجوان اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے داخل ہوا۔ وہ نواب صاحب کا حقیقی بھانجہ تھا۔ نواب صاحب اسکو دیکھتے ہی بولے۔ "اچھا ہوا حامد تم آگئے۔ یہ اپنے دُور کے ایک عزیز ہیں انکو بیگم کے پاس لیجاؤ لیکن پہلے دیکھ لینا کہ انکا مزاج برہم نہو۔" حامد نے ایک نظر حقارت سعید پہ ڈالی۔ اس کے لباس کی دقیانوسیت پر مسکرایا اور تضحیک آمیز لہجہ میں بولا "چلئے صاحبزادہ صاحب۔ آپکا کیا رشتہ ہی ہماری ممانی سے ؟"

"باعتبار رابطہ ہم سب ابن آدم ہیں۔ لیکن ؎

نازم بایں شرف کہ غلام محبتم
لاف نسب زنسبت آدم نمی زنم"

سعید نے سادگی سے مسکراکر اس کی حقارت ریز فقرے کے جواب میں کہا۔

"لیجئے ماموں میاں یہ "غلام محبت" جدید انکشاف ہے"

حامد نے ایک پُرحقارت قہقہہ لگایا اور سعید کو ساتھ لیکر بیگم صاحبہ کے کمرے کا رُخ کیا۔

بیگم نے ایک عجیب مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ رشتہ ناطوں کی وہ زیادہ قائل نہیں تھیں لیکن جب حامد نے ظاہر کیا کہ ملاقاتی علاوہ آپکا بھانجہ ہونے کے ایک اچھا خاصہ آلۂ تفریح بھی ہے تو انہوں نے سعید کو اندر آجانے کی اجازت دیدی۔

نواب صاحب کے تین نوجوان لڑکیاں تھیں۔ بڑی خالدہ بلند وبالا قد اور موزوں خدوخال کی مالک تھی۔ ناصرہ میں حسن ونزاکت کے ساتھ ایک خاص قسم کی جاذبیت بھی تھی اور راشدہ سب سے چھوٹی تھی۔ لیکن ہمہ خوبی، ہمہ رعنائی وزیبائی۔ تینوں بہنیں نہایت زندہ دل ہنس مکھ اور خوش طبع تھیں۔ راشدہ لیکن بیحد شوخ وطرار تھی۔ یہ مغرور حسن لڑکی اپنے ابا تک کو چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتی تھی۔ رکھ رکھاؤ میں اگرچہ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر تھیں لیکن راشدہ میں ایک خاص خودداری وپندار تھا۔ جب یہ تینوں کہیں جمع ہوجاتی تھیں تو بڑے سے بڑے صاحب عقل وشعور انسان کو بناکر رکھدیا کرتی تھیں۔

سعید جونہی کمرے میں داخل ہوا اُسکی ہیئت کذائی کو دیکھکر تینوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ پہلے تو وہ غریب بھی جزبز ہوا لیکن جلد اپنی حالت سنبھال کر بیگم صاحبہ کو آداب کیا اور تینوں لڑکیوں کی طرف معصومانہ دیکھکر بولا۔ "آپ شاید میرے لباس پر ہنس رہی ہیں۔ میں سیدھا ریل سے اتر کر یہاں چلا آیا ہوں۔"

"اجازت دیجئے کہ ہم آپکے نہلانے اور کپڑے بدلنے کا انتظام کریں۔" منجھلی نے ہنسکر کہا۔

"مگر سُنا ہے کہ یہ تو غسل کرنے کے عادی ہی نہیں ہیں۔" بڑی بولی۔

"آپ نے ایک غسل تو دُنیا میں تشریف لانے کے بعد فرمایا تھا اور ایک اس جہان سے تشریف لیجانے کے بعد فرمائیں گے۔" اسپر پھر تینوں نے قہقہہ لگایا جسمیں سعید نے بھی معصومانہ ہنسی سے شرکت کی۔

"چپ رہو۔ شریر کہیں کی۔ اپنے مہمان کا مذاق اُڑاتے ہوئے تمکو شرم نہیں آتی۔" بیگم صاحبہ نے غصّہ سے فرمایا۔

"ناخواندہ مہمان"۔ خُدا جانے تینوں میں سے کس نے فقرہ بلند کیا۔ اس کے بعد تینوں ہنسی کا گول گپا ہو کر رہ گئیں۔

"لیکن میں آپکے ہاں قیام کرنے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ آپنے اپنے کو میزبان تصوّر کرنے میں قبل از وقت علو ہمتی سے کام لیا ہے۔" اس سادہ لباس میں سے ایسی چبھتی ہوئی طنز سُننے کی کسیکو توقع نہیں تھی۔ تینوں دفعتہً خاموش ہو گئیں۔ بلکہ خالدہ کو تو اس کے سیدھے پن پر رحم سا آنے لگا۔ چنانچہ وہ تو بالکل چپ ہو گئی۔ لیکن راشدہ کی زبان برابر چلتی رہی۔

"میاں تم ان پگلیوں کی باتوں پر نجاؤ۔ بیٹھو تم بُرا تو نہیں مانو گے اگر میں پوچھوں کہ کیا تم اپنے کو میرا رشتہ دار ظاہر کرتے ہو؟ کیا رشتہ ہے؟"

"معاف فرمائیگا آپ سے کوئی علاقہ میری افلاس زدہ مگر شریف ہستی میں کسی تفاخر کا اضافہ نہیں کر دیگا۔ میں نے اپنی رشتہ کا ذکر نواب صاحب سے محض امر واقعہ کے طور پر کیا تھا۔ میں اس کا متمنی بھی نہیں ہوں کہ اس آستانۂ عالیہ سے اپنی فکر کنات کو وابستہ کروں۔ والدہ مرحومہ اکثر آپ کا ذکر کیا کرتی تھیں، مجھے بھی آپ کی زیارت کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ دہلی میں میرا چونکہ کوئی آشنا نہیں ہے اس لئے میں سیدھا یہیں چلا آیا تاکہ پہلے آپ سے نیاز حاصل کروں ـــــ"

"اور پھر اگر موقع لگ جائے تو یہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں"۔ راشدہ نے کھِل کھِلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ سعید بھی ہنس دیا اور بیگم بھی مُسکرا دیں۔ ناصرہ سے ہنسی ضبط نہیں ہوئی تو مُنہ پر ہاتھ رکھکر باہر بھاگ گئی اور پاگلوں کی طرح باہر خوب ہنسکر پھر اندر آگئی۔

"تم شاید اسعد علی خاں کے لڑکے ہو۔ میں نے اُن کو آج تک نہیں دیکھا لیکن نام ضرور سُنا ہے۔ تمہاری ماں میرے پھوپا کی بہن کی لڑکی تھی۔"

"کیا ہوائی رشتہ ہے یہ" ناصرہ نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے کون ہوئے امی" راشدہ نے خندۂ شوخ سے دریافت کیا۔

"ناخواندہ مہمان" سعید نے ہنسکر جلدی سے کہا۔

یہ فقرہ حسین راشدہ پر چپک کر رہ گیا۔ اس کے سُرخ رُخساروں پر دفعتہً ہلکی سی خفت کا خون دوڑ گیا۔ اپنی جادو بھری آنکھوں سے سعید کو دیکھتی ہوئی بولی "آخر آپنے یہ تو مان لیا کہ آپ ہمارے مہمان بننے کا تہیّہ کر چکے ہیں"۔

"کچھ رہی نہیں راشدہ یہ تو" ناصرہ نے کہا۔ راشدہ اپنے فقرے کی بے اثری پر اور زیادہ کھسیانی ہو گئی۔ اسکو توقع نہیں تھی کہ وہ ایک سعید جیسے سادہ لوح انسان سے یوں زک کھا سکے گی۔

"آپکو کشمیر میں سب سے زیادہ کس چیز میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی؟" خالدہ نے دریافت کیا۔

"گدھوں میں۔ میں نے ......"

"گدھوں میں؟" ناصرہ نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا جس سے اُسکا چہرہ گلنار ہو گیا۔

"گد ... گ ...... گدھوں میں" راشدہ نے ہنسی کے مارے لوٹتے ہوئے کہا۔ سعید بھی انکو ہنستا دیکھکر معصومانہ ہنسنے لگا۔ بڑی بی اسبار مُسکرا دیں۔ وہ سعید کے بھولے پن اور سادہ اطواری کو بہت پسند کرنے لگیں تھیں۔ عجیب ٹھنڈی مٹی کا انسان تھا کسی بات پر غصّہ ہونا یا ناک بھوں چڑھانا جانتا ہی نہ تھا۔

"آخر گدھوں میں ایسی آپکیلئے کیا کشش تھی؟" خالدہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"مگر ہم جنس ـــــــ" راشدہ نے شوخی سے کہا۔

"چپ رہو" بیگم نے اسکو ڈانٹتے ہوئے کہا لیکن سعید کی صورت دیکھکر انکو پھر ہنسی آگئی۔ بیگم کے ہنستے ہی طوفانِ خندہ کا بندھ ٹوٹ پڑا۔ تینوں پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئیں۔ چونکہ یہ خواہ مخواہ کی ہنسی تھی۔ سعید محرکِ خندہ شے کو اب تک سمجھا ہی نہ تھا چنانچہ وہ بھی بلا وجہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اُسکو ہنستا دیکھکر راشدہ کا تو مارے ہنسی کے دم اُلٹ گیا۔

جب یہ دیوانگی کا دور سب پر سے کم ہوا تو ناصرہ بولی۔ "آپ بیحد دلچسپ آدمی ہیں۔"

"گدھوں میں دلچسپی لینے والے انسان میں تم بھی دلچسپی لینے لگی ہو" خالدہ نے ناصرہ سے کہا۔

"حالانکہ دونوں میں بظاہر بیّن فرق ہو" راشدہ نے پھر فقرہ جڑا۔

"اس تجنیس شناسی پر میں آپکا بیحد ممنون ہوں کہ آپنے مجھے حقیقتِ حال سے بہت جلد آگاہ کر دیا۔ ورنہ میں تو خدا جانے کب تک اس ابہام میں مبتلا رہتا کہ اس جلوت میں کوئی نوعِ جنس بھی ہے ـــــــ"

"کس قدر مہمل تقریر ہے" ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جناب وہ گدھوں والا قصّہ تو رہ ہی گیا" خالدہ نے کہا۔

"کیا تمہارا یہ خیال ہے باجی کہ یہ ماہرِ نفسیاتِ خر ہیں؟" راشدہ نے پوچھا۔

"میں کشمیر کے گدھوں کی اسلیئے تعریف کر رہا تھا کہ وہ بڑے مضبوط و محنتی ہوتے ہیں۔"

"اور آپ بھی محنت و جفاکشی کو پسند کرتے ہونگے" ناصرہ نے سعید سے پوچھا۔

"یہ تو ظاہر ہے۔ گدھوں کے باب میں آپکی خوش مذاقی قایم اسی بنا پر ہے کہ اُن میں آپکی پسندیدہ صفت موجود ہے۔" راشدہ نے ہنسکر کہا۔ پھر سب پر ہنسی کا شدید دورا پڑا۔

"لیکن میری اس وقت کی مایوسی کا بھی تو اندازہ لگائیے جب میں اپنی پسندیدہ صفت کا انسانوں میں فقدان دیکھکر گدھوں کو انسانوں پر ترجیح دینے پر مجبور ہوتا ہوں۔"

"آپکی فطرت شناسی قابلِ داد ہے۔" ناصرہ نے کہا۔

"ہاں اس فن میں مجھے خاص ملکہ ہے۔"

"اچھا تو میری فطرت پڑھیئے۔" خالدہ نے اشتیاق سے کہا۔

"بہتر ہے۔ ذرا قریب آجایئے۔" خالدہ قریب کی کرسی پر آ بیٹھی۔ سب کا خیال تھا کہ اس باب میں بھی وہ اپنی کسی "حماقت گوئی" سے ہنسنے کا موقع دیگا۔ لیکن جب سعید نے خالدہ کی بالکل صحیح فطرت پڑھکر سُنا دی تو سب ایکدوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

"اچھا میرے متعلق کیا ارشاد ہے" ناصرہ نے کہا۔

"اچھی روح پائی ہے" سعید نے ناصرہ کی بڑی بڑی آنکھوں کے اعماق میں اپنی نظریں اُتارتے ہوئے کہا۔ "دل صاف ہے لیکن محرومی پسند۔ طبیعت تمرد کو چاہتی ہے لیکن فطری انکسار روک دیتا ہے۔ روح میں بیچارگی کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ طبیعت ماحول سے متاثر ہوکر مائل فرعونیت ہوتی ہے لیکن روحانی عجز آپ کی حالت قابلِ رحم بنا دیتا ہے۔"

"بیٹے میری طینت بھی پڑھو" بڑی بی نے اشتیاق سے

آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ناصرہ کے متعلق سعید نے جو کچھ کہا تھا لفظ بلفظ صحیح تھا۔ وہ اپنی صحیح فطرت سعید کی زبان سے سُنکر اسکی قابلیت کو دل میں مان گئی۔

سعید نے بیگم صاحب کی بھی فطرت پڑھی۔ اب راشدہ کی باری تھی لیکن جب اس کی جانب سے کوئی اشتیاق ظاہر نہ ہوا تو سعید بھی چُپ ہو گیا۔

"اچھا اب اجازت چاہتا ہوں" سعید نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے چائے پیتے جایئے" ناصرہ بولی۔

"لیکن اب تم جاؤ گے کہاں" بیگم نے دریافت کیا۔

"میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ کہاں جاؤں۔ جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے"

(بیس روپے کے نوٹ اُسکو دیکر) ابھی تم اس سے اپنا کام چلاؤ۔ ضرورت ہو تو اور طلب کر لینا" بیگم نے کہا۔

سعید نے بکمال بے تکلفی اس عطیہ کو قبول کر لیا۔

"اِن پیسوں کا آپ کیا کرینگے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو کچھ کپڑے بنواؤنگا تاکہ آئندہ مُلاقات پر میرے لباس پر آپکو ہنسنے کا مزید موقع نہ ملے"

"ہاں اچھا خیال ہے۔ لیکن میرا خیال ہے سب سے پہلے آپ کسی ماہر امراض دماغی سے ملئے۔ آپکا لباس اتنا نہیں ہنساتا ہے جتنا دماغ" راشدہ نے کہا۔

"بہت اچھا۔ لیکن کیا عجب ہے کہ میرا دماغ قہقہوں کی اعجاز آفرینی سے خود بخود درست ہو جائے۔ آپ ہنسئے اور مجھے اچھا کیجئے" سعید نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپکا دماغ اجتماعی قہقہوں سے درست ہوگا یا انفرادی سے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کا جواب آپ خود دیں تو اچھا ہے۔ آپ انفرادی طور پر اپنے قہقہوں کی سحر کاری سے خوب واقف ہونگی" سعید نے راشدہ کی جانب نظریں جما کر کہا۔

لیکن وہ اس انداز سے بیٹھی رہی گویا اس نے سُنا ہی نہیں ہے۔

"چائے کا وقت آگیا ہے۔ اب آپ چائے پی کر ہی کیوں نہ جایئے" خالدہ نے سعید سے کہا۔

"جیسی آپکی مرضی"

"انکو تو کسی چیز سے انکار ہی نہیں ہے۔ تم ناحق پوچھتی ہو" راشدہ نے کہا۔

"ہاں میاں اب تم چائے پی کر ہی جانا۔ اچھا میں اب ذرا غسل کر لیتی ہوں" یہ کہہ کر بیگم صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ساتھ ہی تینوں لڑکیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔ کمرے میں سعید تنہا رہ گیا۔

ابھی اُسکو تنہائی میں چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ دروازہ کھلا اور حامد نہایت احتیاط سے اندر داخل ہوا۔

"سعید مجھے اُمید ہے کہ میری اگلی گستاخی کو معاف کرو گے۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم اسکے اخفا کا وعدہ کرو" اُس نے چپکے سے سعید سے کہا۔

"اگر میں اس کام کو انجام دینے کے لئے آمادہ ہو گیا تو اسکو پردۂ راز میں رکھنا تو خود بخود میرا فرض ہو جائیگا" سعید نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس حقیر سی خدمت سے انکار نہ کرو گے" حامد نے لجاجت سے کہا۔

"آپ مقصد بیان کیجئے۔ زیادہ طول کلامی سے کیا فائدہ" سعید نے کہا۔

"یہ لو یہ رقعہ کسیطرح راشدہ کو دیدو۔ لیکن براہ کرم تم اسکو نہ پڑھنا"

سعید نے سادگی سے حامد کی طرف دیکھا۔ رقعہ لے لیا اور بولا۔ "اچھا آپکا رقعہ دیدیا جائیگا اور میں اسکو پڑھونگا بھی نہیں۔ اور کچھ ارشاد؟"

"بس شکریہ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چپکے سے چلا گیا۔ اسکو گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ زینے پر پیر کی چاپ ہوئی سعید نے جلدی سے رقعہ مٹھی میں دبا لیا اور بظاہر ایک اخبار پڑھنے لگا۔

پردہ ہٹا اور راشدہ اپنا کچھ کروشیا کا سامان لئے سیدھی الماری کی طرف چلی گئی۔ اس نے سعید کو اس طرح نظر انداز کر دیا گویا وہ کمرے میں تھا ہی نہیں۔ جب وہ الماری کے پاس پہنچ گئی تو سعید اٹھا۔ اس کا دل خود بخود نامعلوم کیوں دھڑکنے لگا۔ اپنی مشن کی تکمیل کی اسکو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر وہ الماری کے پاس جا کھڑا ہوا اور باندازِ استغنیٰ بولا "حامد صاحب مجھے یہ رقعہ دے گئے ہیں تاکہ اسکو آپ تک پہنچا دوں۔"

راشدہ اب بھی اپنے کام میں اسی قدر مصروف تھی گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ آخر سعید نے رقعہ الماری کے تختہ پر رکھدیا اور اپنی جگہ پر چلا آیا۔

"مسٹر سعید" چند منٹ راشدہ کی خشمگیں آواز کان میں آئی۔ سعید نے سادگی سے اسکی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر برافروختگی کے آثار دیکھکر حواس باختہ ہو گیا۔

"تم کو شرم نہیں آتی ——" وفورِ غیظ میں راشدہ کے کپکپاتے لبوں سے صرف اسقدر نکل سکا۔

"لیکن شرم کا یہاں کیا محل ہے خاتون" سعید نے سی سادگی سے دریافت کیا۔

"کمینہ۔ پاجی" راشدہ کی زبان سے نکلا۔

"کیا ان مبارک الفاظ کا شکار یہ خاکسار ہے؟" سعید نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں میں تم کو گالیاں نہیں دے سکتی۔ تم نے اس رقعہ کو پڑھا تو ہوگا۔"

"مطلق نہیں۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راز ابھی بالکل محفوظ ہے۔"

"مجھے تمہاری سادہ دلی سے توقع تھی کہ تم نے اس کو نہیں پڑھا ہوگا۔ لیکن تم کو اسے پڑھنا چاہیئے۔ تم کو دیکھنا چاہیئے کہ تم لوگ، تم مرد کس قدر ابلیسی ذہنیت رکھتے ہو۔"

سعید اس شوخ و طرار لڑکی کو اس طرح سنجیدگی سے گفتگو کرتے دیکھکر حیران کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ان حسین دشنام کا کیا مطلب ہے۔

"مگر نہیں۔ تم مجھے اتنے خطرناک نظر نہیں آتے جتنے اور بدتمیز مرد ہوتے ہیں۔ اچھا تم بیٹھ جاؤ اور اس رقعہ کو پڑھو۔" سعید نے معصومانہ رقعہ لے لیا اور بولا "لیکن مجھ سے کہدیا گیا تھا کہ میں رقعہ نہ پڑھوں۔"

"پڑھو جی۔ میں حکم دیتی ہوں۔" سعید نے اس حکمرانی پر غور کئے بغیر تعمیلِ ارشادِ حسین میں رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

"میری جان۔

تیرے گلابی ہونٹوں کی قسم میں دیوانہ وار تجھ پر عاشق ہوں۔ تیری پیاری زبان سے آج اقرارِ محبت ہو جائے تو میں اپنی منسوب لڑکی کو ابھی ٹھکرا دوں۔ میں تجھے جیت کر عیش کی زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ جب تجھ جیسی لڑکی ہاتھ آجائے تو دنیا، اس جہنم زار کا گہوارۂ مسرت و عیش بنجانا کچھ مشکل نہیں۔

سراپا تیرا "ح"

سعید نے بغیر کسی انقباض و اظہارِ غیظ کے رقعہ واپس دے دیا۔ "اگر تم اجازت دو تو میں سگریٹ پی لوں۔ معمولی سے سگریٹ پیتا ہوں ہیں۔ قیمتی کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں۔"

"تم عجیب حماقت کی حد تک سادہ لوح ہو۔ بے محل گفتگو شروع کر دی۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اس رقعہ کو پڑھکر کیا تم کو غصہ نہیں آیا؟"

"غصہ؟ نہیں۔" سعید نے نہیں پر سر ہلا کر کہا "آپ کے معاملات پر میں غصہ ہونے کا کیا حق رکھتا ہوں۔"

"مردہ رُوح۔ بیجان جذبات کا انسان۔" راشدہ نے غصہ سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ میری مُراد حامد سے ہے۔" سعید نے کہا۔ اس کی اس کوتاہ فہمی پر حسین راشدہ کو اور بھی غصہ آگیا۔ شعلہ نشاں آنکھوں سے اُسکو دیکھنے لگی اور پھر حقارت سے کچھ کہکر چلدی۔

"سُنیئے تو سہی۔ میں حامد سے کیا کہدوں؟" سعید نے اس کے تعاقب میں دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

"حامد سے؟" راشدہ نے دفعتہً مڑکر پوچھا "یہ" چٹاخ! ایک چپت کی آواز پیدا ہوئی اور سعید سمٹ کر رہگیا۔ ابھی وہ اپنے رُخسار کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ راشدہ جاچکی تھی۔

"کیوں تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" بیگم نے سعید کو سراسیمگی کی حالت میں دروازے کے پاس کھڑا ہوا دیکھکر کہا۔ سعید خاموش کھڑا رہا۔ اتنے میں چائے آگئی اور اُس کے ساتھ ہی خالدہ، ناصرہ اور راشدہ بھی آگئیں۔ راشدہ پھر وہی اگلی سی تیز و طرار راشدہ تھی گویا کوئی بات ہی نہیں گذری تھی۔

"آپ چائے پسند کرتے ہیں یا کافی؟" خالدہ نے پوچھا۔

"محض گرم پانی۔" راشدہ نے ہنسکر سعید کی جانب سے جواب دیا۔

"اگر کافی، چائے اور گرم پانی سے محض اکتسابِ حرارت مقصود ہے تو میں چانٹا، چپت، دھول وغیرہ وغیرہ کو بھی پسند کرتا ہوں۔" سعید نے مسکرا کر کہا۔ یہ فقرہ حالانکہ اس نے راشدہ کی جانب دیکھکر نہیں کہا تھا لیکن وہ اُسکو سُنکر کچھ بیچین سی ہوگئی اور ترحم آمیز نظروں سے بیقصور سعید کو دیکھنے لگی۔ اس کو احساس ہوا کہ غریب سعید کے ساتھ اُس نے سخت ناانصافی کی۔

"معلوم ہوتا ہو کہ مکتب میں آپکی کافی مرمت ہوئی ہو۔" راشدہ نے آخر بالجبر ہنسکر کہا۔

"جی مکتب کی کوئی تخصیص نہیں ہر شکستگی کے بعد مرمت ہوجاتی ہے۔" سعید نے ہنسکر جواب دیا۔

"پھر آپ کو تو ہر وقت معمار ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے۔" خالدہ نے کہا۔

"صاحب اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ہر جگہ معمار پیدا کردیتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے یونہی راشدہ کی طرف دیکھ لیا جس کی حسین آنکھیں سعید سے درخواست کررہی تھیں کہ بس اس سے آگے نہ بڑھو ورنہ میرا راز فاش ہوجائے گا۔

بعض منفی امور بھی کس طرح غیر متوقع طور پر خود بخود زندگی حاصل کرلیا کرتے ہیں۔ ہم سے بلا ارادہ ایک حرکت سرزد ہوجاتی ہے۔ لیکن مشاعر اس کے اثرات سے خواہ مخواہ جاگ اُٹھتے ہیں۔ کوشش کیجاتی ہے کہ اسکی اہمیت کو روک دیا جائے لیکن جب وہ بات اپنی ذات سے منتقل ہوکر

کبھی دوسرے انسان کی شخصیت کو بھی لپیٹ لیتی ہے تو ہم صرف اپنے تحفظِ شخصی کی خاطر اس کے اثرات کی نفی کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل بیکار کوشش ہوتی ہے۔ راشدہ کا سعید کے چپت رسید کردینا تو ایک عام بات سمجھئے لیکن اس کے "غیر مطلوب" اثرات کو دیکھئے کہ انہوں نے پیدا ہوکر راشدہ کو کیسے نامطبوع جذبات سے دوچار کردیا۔ چپت مار کر اس "رازِ چپت بازی" کے اخفا میں اس کی سعیٔ غیر مستقل، سعید پر خود بخود اسکو رحم آنے لگنا۔ اپنی چند فطری کمزوریوں سے (مغلوب الغضبی وغیرہ وغیرہ) دفعتہً اسکا خود بخود آگاہ ہوجانا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے وقوع کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ سعید پر رحم آتے ہی اس کے دل میں رحم اور رحم کی تمام متعلقہ صفاتِ حسنہ بیدار ہوگئیں۔ اور اسکو اس جذباتی مقام سے ہٹ جانا پڑا جہاں سے ہٹنے کا فی الحال اسکا کوئی قصد وارادہ نہ تھا! نفسیات کے گورکھ دھندے سے مفر نہیں ہے۔ ایک راشدہ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر انسان کو بغیر اپنی مرضی کے جگہ بدلنی پڑتی ہے ایک مرکز سے ہٹنا پڑتا ہے۔ تبدیلی کا شکار بننا پڑتا ہے!!

چند منٹ اور بیٹھکر سعید نواب صاحب کے مکان سے چلدیا۔ دہلی کے گلی کوچے تھے اور اسکا بوسیدہ جوتا۔ ایک مختصر سی کوٹھری کرایہ پر لے لی۔ جب تک بیس روپیوں کا گھٹتا ہوا سایہ سر پر قائم رہا گذر کرتا رہا۔ اس کے بعد پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں۔ خدا خدا کرکے کچھ عرصہ بعد اسکو دس روپیہ ماہوار کی ایک ٹیوشن مل گئی۔ اُسی کو غنیمت سمجھا۔ اس کی کوٹھری کے پاس ہی ایک مزدور رہتا تھا۔ جو اپنی دن بھر کی محنت کے بعد شام کو آتا تھا۔ اس کے بچے بیمار ہوتے تو سعید ہر طرح اُنکی دوا وغیرہ کا انتظام کرتا۔ خود بیمار تھا اسلئے بیماری کی مصیبت سے متاثر ہوتا تھا۔ خود غریب تھا اسلئے افلاس کی صعوبت سے آگاہ تھا۔ رحم وہمدردی ممکن ہے کسی شخص کی فطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کی جاتی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان خود مصیبت میں نہیں پھنستا وہ دوسروں کی مصیبت کو نہیں سمجھ سکتا۔ رحم ومروّت حقیقی جذبات نہیں ہیں مروّت تو بلکہ انسان میں ایک قسم کا عیب ہے لیکن رحم خواہ اعصابی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہو خواہ دوسروں کی تکالیف دیکھکر وہ دل میں رونما ہوگیا ہو اسے بہت اچھی چیز۔ معلوم نہیں سعید کا کیریکٹر اپنی علالت سے قبل کیسا تھا لیکن جب سے وہ خود شکارِ آلام و علالت ہوا تھا اس میں ایک عجیب قسم کی سپردگی، فتادگی، انکسار و ترحم پیدا ہوگیا تھا۔ اب اتفاق سے اِن صفات والے انسان کا ایک ایسی سوسائٹی میں گذر ہوگیا تھا جو بالکل برعکس صفات کی حامل تھی۔ بیگم کے گھر میں افلاس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ یہاں ایک حد تک زر کی فولادی قوت نے امراض کی راہیں بھی روک رکھی تھیں۔ اس ماحول میں خالدہ، ناصرہ اور راشدہ جیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ایک افسردہ دل کے افسردہ جذبات اپنی دائمی زندہ دلی کے جاں بخش اثرات کے باعث سمجھنے سے قاصر تھیں۔ مگر——

مگر ان تمام باتوں کے باوجود کیریکٹر، ایک معصوم کردار کا سہ دلوں میں نشان کئے بغیر نہ رہا۔ بیگم سعید کو اُسکے بھولے پن کی وجہ سے پسند کرنے لگیں تھی۔ خالدہ اس کی سادگی سے متاثر ہوچکی تھی، ناصرہ اس کی بے سروسامانی کی وجہ سے اُسپر رحم کھانے لگی تھی اور راشدہ——

راشدہ......؟ راشدہ جس کی فطرت سب سے زیادہ سخت تھی اپنی ایک غیر ارادی حرکت (چپت زنی) سے اپنی بعض عادتوں کی

اصلاح کا تہیّہ کرچکی تھی۔ یعنی سعید کے باب میں وہ بھی اپنی نسوانی پندار، غرورِ حسن، اور نخوتِ امارت کو ملائم دیکھ رہی تھی! یہ ہیں کردار کے کرشمے، ایک ٹھوس کردار کے کرشمے۔!

سعید کسی امتیازی کیریکٹر کا انسان نہ تھا بلکہ ایک نیچرل کردار کا مالک تھا۔ کیریکٹر تو ہر انسان کا نیچرل ہی ہوتا ہے لیکن سوسائٹی، ماحول، کتابیں اور دیگر متفرق باتیں اس پر دوسری قسم کا رنگ چڑھا دیتی ہیں۔ میرے اعتقاد میں انسان ایک بالکل بے عیب مخلوق کا نام ہے۔ فطرت کا منشا نہ تھا کہ شدّاد، نیرو اور ابوجہل وہ بنیں جو وہ بنگئے۔ انسان انسان کا شیطان ہے۔ شدّاد ایک صاحبِ جاہ وحشم انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ کتنی تملق مآب زبانیں اس کے دربار میں کھلتی ہونگی۔ اب اگر وہ اپنے کو خدا نہ منواتا تھا تو کیا نفسیاتی عوامل سے جنگ کرتا۔ نیرو کا ماحول اور اس کے معاصرین کے دور پر نظر ڈالیے۔ اگر اس میں خشونت، درندگی، تظلم، بربریت وشقاوت کے عوض رحم وکرم، محبّت وایثار، عدل وانصاف کا مادہ ہوتا تو ایسے ماحول میں پلے ہوئے انسان کو اتنے اچھے صفات کا انسان دیکھکر ہم وجودِ باری کے قائل رہ سکتے تھے؟

سعید اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ کیا دُنیا میں اُس نے صرف اس لئے جنم لیا تھا کہ وہ بیمار ومفلس کی سی زندگی ہمیشہ گذارتا رہے۔ آخر اس کی اس زبوں حالی سے قدرت کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ یا تو یہ انفرادی مصائب منجانب خدا نہیں ہیں اور اگر اسی کی جانب سے ہیں تو اتنی بیشمار مخلوق پیدا کردینے کے بعد وہ اپنے بندوں کی طرف سے بے پرواہ ہوجانے کا عادی ہے! شاید ہمارا خیال غلط ہو ہم ہر رمز کو سمجھ لینے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ سپردگی ہی میں ہماری بہبودی ہے سرکشی میں نہیں۔

سعید کو بیگم صاحبہ سے مُلاقات کئے چار ماہ گذر چکے تھے۔ اور اس چار ماہ میں وہ اپنی دس روپیہ ماہانہ کی قلیل آمدنی کے ذریعہ اُن کا نصف قرضہ ادا کرچکا تھا۔ انکا خیال تھا کہ بیس روپیہ کی معمولی رقم چند یوم میں صرف کرکے سعید پھر مزید مدد کے لئے ان کے سر پر آمسلط ہوگا اور عجب نہیں کہ یہ ایک مُستقل مصیبت ہی بنجائے۔ لیکن جب انکی خدمت میں سعید کا مرسلہ دس روپے کا منی آرڈر پہنچا تو وہ نواب صاحب اور ان کی تینوں صاحبزادیاں سعید کے متعلق اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

ایک روز وہ رات کو دس بجے کے قریب پڑھا کر چلا جارہا تھا کہ ایک کار اس کے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب آکر رُک گئی۔ وہ سر جُھکائے اپنے خیال میں غرق چلا جارہا تھا۔ کار کے پاس سے گذر گیا لیکن کسی نے اس کا نام لیکر پُکارا تو وہ ہوش میں آگیا۔ کار کے پاس گیا اور نواب صاحب کو دیکھکر سلام کیا۔

"اماں کہاں غائب ہو" نواب صاحب نے پوچھا۔

"تم نے تو اُس روز کے بعد سے صورت ہی نہیں دکھائی" بیگم صاحبہ کار کی پچھلی سیٹ پر سے بولیں۔

"آپ سنجیدہ کیسے کھڑے ہیں گویا اب آپکو دیکھکر ہم کو ہنسی آہی نہیں سکتی" تین قہقہوں کے درمیان کہا گیا۔

"سنجیدہ بن کر تو آپ خاصے دیوانے نظر آنے لگتے ہیں" حامد نے طنز کے طور پر کہا۔ اُس کا خیال تھا خالدہ، ناصرہ وراشدہ بھی اس کی طنز کی شریک ہونگی لیکن اس باب میں ان لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

"آجکل فرصت ذرا کم ہی ملتی ہے" سعید نے کہا۔

"اچھا۔ ہفتہ کو ضرور آؤ۔ ہم ایک ——"

"معاف فرمائیے" سعید وہاں سے معذرت کرکے فوراً ایک ... ے کی طرف لپکا۔ جو لکڑی ٹیکتا ٹیکتا نالی کی طرف چلا جا رہا ... اس کا ہاتھ تھاما اور رہبری کرتا ہوا اسکو صحیح راستے ... لے گیا۔

"عجیب آدمی ہے۔ گویا ہم سب گدھے ہیں اور اس اندھے ... مقابلہ میں زیادہ قابل اعتنا نہیں ہیں" نواب صاحب نے ... اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ حامد نے انکے فقرے میں ... تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیگم نے اور انکی ... ں لڑکیوں نے اسکی اس حرکت کا مطلق برا نہ مانا۔

ہفتہ کی شام کو آخر سعید بیگم کے ارشاد کے مطابق ... کی کوٹھی پر گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ وسیع باغیچہ میں چوطرف ... ھیرا تھا۔ صرف صدر دروازہ پر بجلی کا بڑا سا قمقمہ ... ہوا تھا۔ سعید گھاس کے تختہ پر سے گذر کر جب بیچ ... پاس پہنچا تو پیچھے سے کسی نے آکر آہستہ سے اس کا ... نہ تھپتھپایا۔ راشدہ تھی "آداب عرض راشدہ صاحبہ۔ ... یہ کیا ہو رہا ہے"

"سیر" راشدہ نے کہا۔

"خوب" سعید نے مختصر جواب دیا اور جانے لگا۔

"بات سنو۔ حامد بڑا برا آدمی ہے"

"خوب" سعید نے پھر مختصر جواب دیا۔

"سعید میں تم سے پوچھتی ہوں کیا تم میری مشکلات سے ... قف نہیں ہونے؟ تم یہ نہ سمجھنے لگنا کہ میں تم سے کسی امر ... طالب امداد ہوں"

"تو پھر آپکی نامعلوم مشکلات سے میرے متاثر ہونے ... سوال ہی غیر ضروری ہے"

"تم بھی بہت برے آدمی ہو" حسین لبوں سے ترشروئی کے ساتھ کہا گیا۔

"شاید"

"شاید نہیں یقیناً۔ میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں —— نہیں۔ مجھے تم سے ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ تم جیسے بیوقوف انسان سے"

"راشدہ اگر حامد تم سے محبت کرتا ہے تو تم کیوں نہیں اس کی محبت کا جواب دیتی ہو۔ اگر تم اس سے نفرت کرتی ہو تو کیوں نہیں جرات سے اسکو ایک دفعہ ٹھکرا دیتیں۔ اس کشمکش سے کیا فائدہ کہ کبھی میری نحیف رائے کی پناہ لو اور کبھی غرور سے خودسری کی لینے لگو"

"تم کو مجھ سے اس قدر آزادی سے گفتگو کرنے کا حق نہیں" راشدہ نے آہستہ سے کہا۔

"آئندہ نہیں کرونگا" سعید نے کہا اور قدم آگے بڑھایا۔

"سعید۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اُن سب سے اچھے جنکو میں جانتی ہوں"

"لیکن تم بہت خراب لڑکی ہو۔ اُن سب میں خراب جنکو میں نہیں جانتا"

"بیوقوف۔ پھول گئے اپنی تعریف سنکر۔ میں نے ایک گدائے بینوا سمجھکر یہ تم کو محض الفاظی خیرات دینی چاہی تھی"

"لیکن میں نے تم کو غیر راشدہ سمجھکر یہ بیضرر الفاظ کہے تھے"

"غیر راشدہ سے کیا مطلب؟"

"جب تم کو غصہ آتا ہے تو تم تم نہیں رہتی ہو۔ راشدہ وہ نہیں ہے جو وہ بن گئی ہے۔ وہ اس میں شک نہیں مغرور ضرور ہے لیکن اندھی مغرور نہیں بلکہ سمجھدار مغرور جو اپنے

ناز و غرور کے باوجود بھی اپنی پاک و منزہ رُوح کی بنا پر حُسن سلوک کی زیادہ عادی ہے۔ اگرچہ وہ دوگونہ فطرت کی مالک ہے، اگرچہ اُس کی قوت فیصلہ ضعیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے معتقدات تک سے روگردانی کی خوگر ہے لیکن اس میں متاثر ہونے کی صلاحیت ہے، وہ تاثرات سے مغلوب ہو سکتی ہے۔"

"سعید تم نے اُس روز سب کی فطرت پڑھی تھی۔ آج میری فطرت کا مطالعہ کر رہے ہو۔ تم نے جو کچھ کہا ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن مجھے بھی اجازت دو کہ تمہاری فطرت کو پڑھوں۔ تم بالکل جامد ہو۔ انسانی جذبات سے خالی۔ محبت سے ناآشنا۔ سادہ لوح لیکن صاف گو، ہمدرد۔"

"بس بس راشدہ۔ ممکن ہے تم میری تعریف میں غلطی کر جاؤ اور میں تمہاری زبان سے اپنے متعلق اچھی صفات سُنکر وہ نہ رہوں جو میں ہوں۔ تم کوٹھی میں چلتی ہو یا ابھی کچھ دیر یہیں رہو گی"

"تم چلو میں آتی ہوں" سعید چلدیا۔ ابھی وہ بڑے دروازے سے گذرا ہی تھا کہ گیلری کے اختتام پر ناصرہ سے بالکل اتفاقیہ مُلاقات ہو گئی۔

"کون سعید؟" اس کا ہاتھ تھامکر "سعید میں تم کو کسقدر یاد کرتی تھی"

"خوب"

"خوب کیا معنی۔ تم نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں یاد کرتا میں تمہیں"

"کیونکہ میں تمہیں یاد کیا کرتی تھی"

"لیکن میں کیوں اس سے متاثر ہوتا۔ تم غلطی کر رہی ہو ناصرہ۔ چلو۔ یہ جگہ بات چیت کے لئے موزوں نہیں"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچا۔ اُنھوں نے محبت سے اُسکو بٹھایا اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ چند منٹ کے بعد تینوں لڑکیاں بھی کمرے میں آگئیں۔ ان کا یکجا جمع ہونا تھا کہ پھر یہ کمرہ قہقہستان بن گیا۔ راشدہ و ناصرہ کی اِس وقت کی طنز و تحقیر سے اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ لڑکیاں چند منٹ قبل سعید کے ساتھ بالکل مختلف طریقے سے پیش آچکی ہیں۔

سعید کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا تھا مرگی کے مریض کے لئے آئینہ بینی بھی مُضر بتائی جاتی ہے۔ سعید کو دفعتہً کھانسی اُٹھی اس کے بعد اُسپر مرگی کا دورہ پڑ گیا۔ خُدا کی پناہ! اس کی اس وقت کی حالت دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چند منٹ پیشتر کا سعید ہے جو نہایت عاقلانہ باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے کمزور جسم میں رُوح لرز رہی تھی! ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سخت عذاب میں مُبتلا ہے۔ کرسی پر سے گر پڑنے سے اُس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔

جب اُسکو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ کمرے میں پڑا ہوا تھا اور اُس کے پاس راشدہ اور نرس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ راشدہ مُسکرا کر اُس کے سرہانے آئی اور بولی "کیوں اب تو تمہارا دماغ درست ہو گیا ہو گا"

"میں تم لوگوں کی غور و پرداخت کا تہ دل سے شُکریہ ادا کرتا ہوں۔ بیگم صاحبہ ——— نہیں خالہ اماں کہاں ہیں؟"

"ہونہہ جب سر پر پڑی تو خالہ اماں ہو گئیں۔ اُس روز تو اُس اندھے کے مقابلہ میں انکی ایسی تحقیر کی گئی۔"

"تحقیر؟ معاذاللہ۔ راشدہ مجھے تم سے توقع نہ تھی کہ تم بھی اس قدر تنگدل ہو"

"میں تنگدل تو تم سنگدل" راشدہ نے ہنسکر کہا۔

"کس طرح؟"

"جس روز سے میں نے تمہارے چپت رسید کیا اُس روز سے مجھے تم پر بڑا رحم آنے لگا ہے۔" اُس نے بات ٹالنے کے طور پر کہا۔

"خُدا آپکو اِس کا اجر دیگا۔"

"ہاں انسان ہی اجر دینے کا عادی نہیں ہے۔"

"آپ زیادہ بات چیت نہ کیجئے۔" نرس نے سعید سے کہا۔

"خاموش مر جانے سے تو گفتگو کرتے ہوئے مر جانا اچھا ہے نرس۔" سعید نے مسکرا کر کہا۔

سعید ایک ہفتہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو اُس نے اپنے مستقر پر جانا چاہا لیکن بیگم نے کہا۔ "تم بیمار ہو مناسب یہی ہے کہ یہیں رہو۔" مگر سعید اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بیگم محض از راہِ خدا ترسی اسکو قیام کی دعوت دے رہی تھیں اور وہ اس خیراتی نوازش کے لئے تیار نہ تھا۔ ممکن ہے کوئی اس کی اس حرکت کو ناسپاسی سے تعبیر کرے لیکن ہر شخص کا نظریہ جُداگانہ ہوتا ہے۔ جب وہ جانے لگا تو راشدہ نے پھر اُسکو باغ میں جا لیا۔ "تم ہمارے ہاں سے کیوں جارہے ہو؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ میں چلا جانا چاہتا ہوں۔"

"سعید میں حامد سے اب محبت کرنے لگی ہوں۔"

"خوب۔" سعید کا پھر وہی مختصر جواب تھا۔ راشدہ اس کے سامنے حامد کا بار بار تذکرہ کرکے اس میں جذبۂ رقابت پیدا کر دینا چاہتی تھی، لیکن سعید کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ راشدہ کے باب میں کسی سے رقابت پیدا کر سکتا ہے۔

"تم بہت بزدل انسان ہو۔ حامد سے ڈرتے ہو۔"

"ڈرتا تو نہیں ہوں۔ ہاں بچتا ضرور ہوں۔"

"اور وہ رات دن تمہاری تاک میں ہے۔"

"کیوں؟"

"میں کیا جانوں۔ تم نے شاید اس سے کہدیا ہوگا کہ میں راشدہ سے محبت کرتا ہوں۔" غریب سعید راشدہ سے محبت کرنے کا تخیل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس غیر ممکن الوقوع بات کو سُنکر اس کے ذہن میں اس خیال نے کروٹ لی کہ وہ بھی راشدہ سے محبت کر سکتا ہے۔ راشدہ کی ترکیب کامیاب ہو سکتی تھی (اُس نے سعید کے سینے میں محض بیداری محبت کے خیال سے ہی مرقوم بالا فقرہ کہا تھا) اگر سعید محبت آشنا دل کا مالک ہوتا۔

"لیکن راشدہ میرا تم سے محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیکس فرہاد کا شیریں کو چاہنا۔"

"ہاں ہے تو یہی بات۔ تم مجھے چاہو ہی کیوں؟"

"تو میں تمہیں چاہتا ہی کب ہوں۔" سعید نے کہا۔

"تم بزدل ہو محض بزدل۔ حامد سے ڈرتے ہو۔" اس نے پھر اُس کے جذباتِ مردانہ کو اُبھارنے کی نیت سے کہا۔

"راشدہ اگر مجھے تم سے کبھی محبت ہوگئی تو میں حامد تو کیا خُدا سے بھی نہیں ڈرونگا۔"

"لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگونگی؟"

"نہیں یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں آتی ہے۔"

"حالانکہ حامد جی اسی اُمید پر رہا ہے کہ میں اس سے محبت کر سکتی ہوں۔ تم بھی ایسی اُمید کیوں نہیں باندھ لیتے۔"

"موہوم اُمید سے کیا فائدہ۔ ہو سکتا ہے کہ تم کچھ عرصہ بعد اُسکو چاہنے لگو کیونکہ وہ دولتمند آدمی ہے۔ خوشرو ہے،

اگرچہ فطرت اچھی نہیں ہو۔"

"یہ آپ ہر شخص کی فطرت خوب پڑھ لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ کس قدر صحیح ہوتی ہے! میں دولت کو پسند نہیں کرتی ہوں"

سعید کو اس قدر توقعات دلانے کے بعد وہ پھر اسکو دور کرنے کے خیال سے بولی "مگر ہاں تم سے میں محبت نہیں کرونگی۔"

"مجھ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا ہے۔ میں مرگی کا مریض ہوں۔ افلاس زدہ ہوں۔ اور زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں۔ میرے اطوار دلوں کو موہ لینے کی قوت سے خالی ہیں۔ مجھے ریا آمیز گفتگو و حرکات نہیں آتیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو کہ تم سے کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ ناصرہ باجی میرا خیال ہے تمکو چاہتی ہیں۔"

"ایں!" سعید نے حیرت سے کہا۔ "ناممکن!" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"سعید محبت خواہ کوئی چیز نہو اور جسکو ہم محبت سمجھتے ہیں وہ خواہ "پسندیدگی" ہی ہو۔ شکار کے مختلف طریقہ رکھتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ دولتمند شوہر ملے۔ تم مجھے شاید اس آزاد گفتگو پر بے حیا سمجھوگے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ اس قسم کی آزاد بیانی لڑکی کے شایانِ شان نہیں۔ مگر تم جیسے انسان کے سامنے ہر لڑکی اسی طرح اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کر سکتی ہے۔ خیر تو ہماری بھی خواہش یہی ہے کہ دولتمند میاں ملے۔ لیکن آبا کے پاس بفضلہ دولت کی کمی نہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک غیر دولتمند مگر پسندیدہ انسان کو تو ٹھکرا دیں اور دولتمند مگر غیر پسندیدہ انسان سے شادی کر لیں۔"

"تم نے "ہم" استعمال کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا تم تینوں بہنوں کا یہی خیال ہے؟"

"کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"خیر میں اس مسئلہ میں چونکہ زیادہ معلومات نہیں رکھتا ہوں اس لئے تم سے کچھ بحث نہیں کر سکتا۔ اچھا اب جاتا ہوں۔"

"پھر کب آؤگے؟"

"ہفتہ عشرہ میں بشرطِ فرصت چکر لگا جاؤنگا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راشدہ وہیں کھڑی ہوئی اسکو دیکھتی رہی۔ ننھے سے دل میں نامعلوم کیا اندوہناک خیال آیا ایک دھیمی سی آہ بھری اور اندر چلدی۔

قسمت کے آپ قائل ہوں یا نہ ہوں مگر بعض دفعہ اتفاقی واقعات کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ جس بابو کے لڑکے کو سعید پڑھاتا تھا اُس نے زبردستی ایک ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ سعید کے سر بھی منڈھ دیا تھا۔ آپ تعجب کرینگے کہ پہلا انعام سعید کے نام ہی نکلا!

اب وہ بھی سینکڑوں رئیسوں سے کم نہ تھا لیکن فطرت کی سادگی کا کیا کرتا۔ اس کی عادتوں پر زر کی آشوبی قوت بھی کوئی شیطانی اثر نہ ڈال سکی۔ جو لوگ اسکی غربت و افلاس کی وجہ سے پہلے اس سے متنفر تھے اب اُس کی شناسائی کو باعث فخر سمجھنے لگے۔ نواب صاحب کی موٹر تو راتدن اس کے دروازے پر ہی رہتی تھی۔

اس نے اس دولت سے بہت سے رفاہی کام جاری کر دیئے وہ غربا و امراء دونوں طبقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ہزاروں بیوائیں سینکڑوں طلبا اور بیشمار سفید پوش مفلس شرفا اس سے پل رہے تھے۔

ناصرہ نے اپنی مبہم محبت کو آخر اب اسپر بالکل واضح کر دیا۔ اپنی حرارتِ محبت سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ دولت کی آنچ سے متاثر ہو کر۔ خالدہ اب بھی اسکو اسی قدر قابلِ رحم آلہ تفریح سمجھتی تھی۔ اور راشدہ اب بالکل خاموش تھی۔

"خالہ اماں میرے مکان کے پاس ایک لوہار رہتا ہے۔ میرا ارادہ اُس کی لڑکی سے شادی کرنے کا ہے۔ کیسی محنتی لڑکی ہے۔"

"مگر تم بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے شادی نہ کرنا!" بیگم نے کہا۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میرے مرض میں شادی سے افاقہ ہوجانے کی توقع ہے۔"

"کسی کمہار کی لڑکی سے شادی کرتے تو اچھا تھا۔ جہیز میں گدھے تو ملتے۔" راشدہ نے ہنسکر کہا۔

"کہی تو پتہ کی بات۔" ابھی وہ باتیں کرہی رہے تھے کہ چوکیدار گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ اُس کی بیوی کے سخت دردِ زہ ہو رہا ہے کوئی سنبھالنے والا نہیں ہو اُسکو شفاخانہ میں بھیجنے کا انتظام کردیا جائے۔

ناصرہ و خالدہ ہنسکر بولیں "خدا غریبوں کو بچے دینا ہی کیوں ہے کہ مفلسوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔" لیکن راشدہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور چوکیدار کی کوٹھری کی طرف چلدی۔

"راشدہ کہاں جاتی ہے۔ نہ بیٹی کنواری لڑکی زچہ خانہ میں نہیں جایا کرتی ہیں۔"

"امی کنواریں کی آبرو ایک غریب کی خدمت کرنے سے مجھ پر اور بھی فخر کرنے لگے گی۔" یہ کہہ کر وہ چلدی۔ اور جب تک بیمار عورت شفاخانہ میں نہ چلی گئی وہ ہر طرح اُسکی خدمت کرتی رہی۔ یہ تھی راشدہ کی اصل فطرت! ہر انسان کی اصل فطرت یہی ہوتی ہے۔ دوسروں کی تکلیف سے وہ ضرور متاثر ہوتا ہے، لیکن کبر، نمود تصنع اور شخصیت پرستی اسپر اسقدر موٹی غیر انسانی چادر لپیٹ دیتی ہو کہ وہ اپنے سے پست لوگوں کے کام آنے میں شرم و عار محسوس کرنے لگتا ہے۔

سعید راشدہ کی اس حرکت سے بیحد متاثر ہوا۔ اسکے ساکن قلب میں دفعتہً ایک جدید روشنی سی پیدا ہوگئی جسنے اُس کے سادہ دل کے گوشے گوشے کو منور کردیا۔ سینے کے ویران احاطہ میں ایک پری جلوہ گر ہوئی جو پہلے توبصد شوخی و ناز مصروفِ خرام رہی اس کے بعد راشدہ کی حسین و جمیل صورت میں منتقل ہوکر دورانِ خون کے ساتھ اس کی روح کے عمق میں پہنچ گئی!

صبح سعید اُٹھا تو اُسکو شدید بخار چڑھا ہوا تھا۔ یہ محبت کا بخار تھا۔ خواب میں لوہار کی لڑکی نے آکر اُسکی تکالیف کو کم کرنا چاہا لیکن سعید نے گرانی طبع میں کوئی شگفتگی محسوس نہیں کی۔ ناصرہ نے پیار کی باتیں آکر سنائیں۔ لیکن وہ بدستور بخار میں تپتا رہا۔ بیگم نے آکر مادرانہ محبت سے اُس کے سر کو تھپتھپایا لیکن وہ اسی قدر سرگرانی محسوس کرتا رہا۔ آخر شام کو اُسکا بخار تیز ہوگیا اور رات کو ایک سو چھ ڈگری سے بھی اونچا ہوگیا۔ اسپر بحران کی سی حالت طاری تھی۔ نواب صاحب۔ ڈاکٹر، بیگم۔ ناصرہ، خالدہ، راشدہ سب ہی کمرے میں موجود تھے اور وہ چیخ چیخ کر بخار کی حالت میں بک رہا تھا۔ "راشدہ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ حامد سے بھی نہیں ڈرتا۔ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ نواب صاحب سے بھی نہیں ڈرتا۔ میں تمہارے لئے حامد سے جنگ آزمائی کرونگا۔ کیونکہ میں تمہیں چاہتا ہوں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ایں! ہاں ہاں تم سے محبت شدید محبت کرتا ہوں۔ چوکیدار کی ماں (بیوی کے عوض) کے بچہ پیدا ہوگیا، وہ راشدہ اُسکو لئے بیٹھی ہو۔ میری راشدہ! ......"

نواب صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا بیگم نے نواب صاحب کی طرف۔ دونوں نے ایکدوسرے کو کچھ سمجھا دیا چنانچہ وہ باہر آگئے۔

حامد جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ جل کر چل دی۔ خالدہ حیرت سے مُنہ موڑ کر ہنسنے لگی۔ ڈاکٹر نے لپک کر لون واٹر پیشانی پر چھڑکا اور راشدہ شرماتی ہوئی محبت سے سعید کے سرہانے آ بیٹھی!

قیسی رامپوری؛

قطعات

اونگھتا ہے جب شہِ خاور شفق کی گود میں ۔۔ سینۂ دریا پہ یوں ہوتا ہے گلشن کا گُماں
جیسے آئینے پہ گرتا ہے عروسِ نو کا عکس ۔۔ صبحدم گلرنگ جلووں سے حسیں گلکاریاں

(۲)

گا رہی ہے ایک ٹیلے پر کوئی آتش نوا ۔۔ زمزموں سے پڑ رہی ہیں یوں ہواہیں سلوٹیں
بسترِ ناکامِ اُلفت کو وفورِ درد سے ۔۔ جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کروٹیں

(۳)

سایہ افگن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب ۔۔ جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زرّیں چراغ
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے ۔۔ مسکراتے ہیں کسی مہجور کے سینے کے داغ

(۴)

وصل کی شب ایک کمسن کے حسیں چہرے پہ یوں ۔۔ سرمئی زلفوں کی اک گُستاخ نے ڈالی نقاب
چلچلاتی دھوپ میں جیسے دُعا میخوار کی ۔۔ بڑھ کے خوں آشام سورج کو کرے زیرِ سحاب

(۵)

کر رہی تھی غُسل دوشیزہ لبِ آبِ رواں ۔۔ چاپ سُن کر پاؤں کی میرے سمٹ کر رہ گئی
رات کی دیوی کے کانوں میں سپیدی صبح کی ۔۔ نقرئی ہونٹوں سے جو کہنا تھا، جیسے کہہ گئی

(۶)

دیکھ کر تقدیر سے افلاس کی گُستاخیاں ۔۔ چل دیئے ہیں چھوڑ کر سب اسطرح الطاف کو
جسطرح گم کردہ منزل راہرو کا سایہ بھی ۔۔ شب کی تاریکی میں چُپکے سے کہیں جاتا ہے کھو

الطاف مشہدی؛

اُردو ڈراما کی ترقی کے ذرائع

ڈراما کی اہمیت

ادبیات میں ڈراما ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے دو پہلو ادبی اور تمثیلی ہیں اور جس کی وجہ سے وہ ضروریاتِ زندگی پر پوری طرح حاوی ہے۔ چونکہ یہ خصوصیت علم و فن دونوں کو اپنے دائرہ میں یکساں طور پر گھیر لیتی ہے اس لئے دُنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس کو انسانی زندگی کے عملی پہلو کے لئے خاص طور پر موزوں خیال کیا۔ یونانی عقلاء نے جس طرح اس کی اصلاح و ترقی کیلئے کوشش کی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے انگلستان نے اپنے ماحول کو ڈراما کیلئے حد درجہ موزوں پایا اور اس کے سدھارنے اور پھیلانے میں جتنی دلچسپی لی وہ ادبیاتِ انگریزی کا ایک اہم اور ناقابل فراموش باب ہے۔

دورِ جدید کو انقلابی دور کہا جاتا ہے اور جہاں زندگی کو ہر شعبہ میں جنگِ عظیم کے بعد اہم انقلابات نے دُنیا کی کایا ہی پلٹ دی۔ وہاں ادبیات کی تاریخ کا نیا صفحہ بھی اُلٹا گیا۔ تاریخ ادبیات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں ترقی یافتہ اور انقلاب پسند ممالک ڈراما کی ترقی و اصلاح پر کافی توجہ کر رہے ہیں۔ روس نے حکومت کا چولا کیا بدلا زندگی اور ضروریاتِ زندگی کی ہر پُرانی چیز نکال پھینکی مگر ڈراما کا یہاں بھی طوطی بولتا ہے۔ بلکہ سوویٹ نظام سے پہلے جو حالت تھیٹر کی تھی اب اس میں کئی گنا زیادہ خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے زار حکمران روس، اپنی ہوسناکیوں کی پیاس بجھانے کیلئے تھیٹر کے وجود کو باقی رکھتے تھے مگر اب تھیٹر ایک باضابطہ ادارۂ تعلیم بنا لیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کی بقا نہایت ضروری سمجھی گئی۔ انقلاب فرانس کے بعد پیرس کے اوپیرا کی مقبولیت بھی زیادہ ہو گئی۔ اطالیہ کا تھیٹر گو کہ آج "رومن تھیٹر"، کے مقابلہ میں نہیں لیکن اپنے ہمسایہ ممالک سے کسی طرح کم نہیں۔ جرمنی نے جنگ عظیم کے بعد سے جہاں مختلف شعبہ جات میں ترقی کی ہے اور اپنے آپ کو بہت جلد اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت کی ہمسری کر سکے وہاں اس نے تھیٹر کو نظر انداز نہیں کیا۔ اگر تھیٹر کو عیش و عشرت کا ہی محض گہوارہ خیال کیا جاتا جیسا آج بھی بعض تنگ نظر افراد سمجھتے ہیں تو جرمنی کبھی اپنے لئے گہوارہ تعیش تیار نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دُنیا ساری اس بات پر متفق ہے کہ اسٹیج کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے اور اگر پچھلے دس سال کی رپورٹوں کا مطالعہ کریں تو وہ ہر ملک جس نے تھیٹر کی بقا محض اسی خیال سے کی تھی آپ کو ایسے اعداد و شمار بتائیگا جس سے کہ اس کی کامیابی ظاہر ہوگی۔ سنہ ۱۹۲۶ء کی وہ رپورٹ جو انگلستان کی مجلس تعلیم بالغان کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس طریقہ کار کی کامیابی کی گواہ ہے۔

مسٹر برنارڈ شا "ڈرامائی تنقیدیں اور مضامین" میں لکھتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ میں جو اہمیت گرجا کو حاصل تھی وہی اہمیت بیسویں صدی میں تھیٹر کو حاصل ہے۔ بلکہ لندن کے گرجا کی جو اہمیت تھی اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر لندن کے تھیٹر کو حاصل ہے۔ "گرجا کو جانے کی بجائے" برنارڈ شا لکھتے ہیں "لوگ اب لندن میں تھیٹر کو جاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تھیٹر اس سے فائدہ اٹھا کر ٹھوس کام کرنے لگے۔ اور اپنے آپ کو اچھے خیالات پیدا کرنیکا کارخانہ، ضمیر کا مکبّر الصوت، سماجی قانون کا معمل اور تجرباتی تعلیم کی درس گاہ قرار دے لے۔"

ڈراما اور تھیٹر کا تعلق

یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ڈراما اور تھیٹر کا تعلق روح اور جسم کا سا ہے۔ روح بغیر جسم کے اور جسم بغیر روح کے بیکار ہے۔ ڈراما کے ادبی اور تمثیلی دونوں پہلوؤں میں تمثیلی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور بعض نقادوں کا خیال تو یہ ہے کہ ڈراما بغیر تمثیل کے بے جان ہے اور یہ بڑی حد تک حقیقت ہے ایسی کہ جس سے انکار مشکل ہے۔ اس لحاظ سے جہاں ڈراما کی ترقی کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں تھیٹر کی ترقی کا سوال خود بخود اٹھتا ہے۔ ترقی یافتہ تھیٹر کو دیکھکر اندازہ لگانے والے قیاس کر سکتے ہیں کہ یہاں ڈراما کی صنف نے بھی اسی مناسبت سے ترقی کی ہوگی۔ یہ خیال کوئی بیسویں صدی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم ہی سے یونانیوں نے اِسکی

ترویج کی۔ روما کے کھنڈرات میں تھیٹر کی جو عالی شان عمارت کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں وہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ یونانی ڈراما کی ترقی دراصل یونانی تھیٹر کی ترقی تھی۔ یہی حال ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے تھیٹر کا ہے۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں فن تھیٹر کی مادی ترقی کے وہ ذرائع مہیا نہ تھے جو آج ہم میں موجود ہیں۔ شکسپیئر کو بلاشبہ بیسویں صدی کا تھیٹر نصیب نہیں ہوا جہاں کہ وہ آرڈن کے جنگل کا سین پیش کر سکتا۔ طوفان، ابر و باد کا منظر دکھا سکتا، پریوں کو فضائے بسیط میں اڑتے ہوئے ظاہر کر سکتا۔ یا کنگ لیر کو پہاڑ کی اونچی چوٹی سے گرتے ہوئے دکھا سکتا لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے تھیٹر کی ترقی انگریزی سماج کے دوسرے شعبوں کے مقابل میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ تھیٹر میں چونکہ ڈراما کے ادبی پہلو کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس اہم شعبہ کی تکمیل کیلئے وہ مناسب ترقی کرے۔ ورنہ تمثیلی پہلو کی خرابی سے ادبی پہلو پر بھی حرف آئیگا۔ اس کے علاوہ ڈرامہ نگار چونکہ ہمیشہ تھیٹر کو پیش نظر رکھکر ڈرامہ لکھتا ہے اس سے ضروری ہے کہ ڈرامہ نگار کی منشاء کے مطابق تھیٹر ترقی یافتہ ہو ورنہ جو چیز فضا، مقام اور موقع کے ذرائع سے ظاہر کرنا چاہتا ہے واضح نہ کر سکے گا۔ ڈراما نگار کو تھیٹر کی جتنی سہولتیں مہیا ہونگی اتنا ہی زیادہ اچھا ڈرامہ وہ لکھ سکیگا اور اسی قدر سہولت کے ساتھ مصنف کا اصلی مقصد اور منشا جو کہ وہ حقیقت میں پیدا کرنا چاہتا ہے ظاہر ہو سکے گا اور جب تک ڈراما اور تھیٹر کا یہ باہمی تعاون نہ ہوگا اس وقت تک ڈراما صحیح معنوں میں تمثیلی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ڈراما نگار کے قطع نظر اداکار جو ڈراما کے تمثیلی پہلو پر گہرا اثر ڈالتے ہیں بہت کچھ تھیٹر کی ترقی پر دارومدار رکھتے ہیں۔ ترقی یافتہ تھیٹر ہر ملک اور ہر زمانہ میں اچھے اداکار پیدا کرنے کا کارخانہ سمجھا گیا ہے۔ تھیٹر ہی کی ضروریات پر اچھے اداکار ہوتے ہیں۔ اور اسی کی مناسبت و موزونیت سے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔

اوپر کے سارے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تھیٹر اور ڈراما کا چولی دامن کا تعلق ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب تک تھیٹر ترقی نہیں کرے گا ڈراما ترقی نہیں کر سکے گا اسلئے ہمیں اس بات پر غور کرنیکی ضرورت ہے کہ تھیٹر کیونکر ترقی کر سکتا ہے؟

تھیٹر کی ترقی کے ذرائع

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ تھیٹر کی بدنامی کو دور کیا جائے۔ ہمارے ملک میں تھیٹر اتنا بدنام ہو کہ سنجیدہ اور شائستہ طبقہ اس کے نام ہی سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے بدمعاشی اور عیاشی کا اکھاڑہ جانتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں کہ یہ خیالات ملک میں کیوں پیدا ہوئے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان سب کا اصل ہماری تھیٹریکل کمپنیوں کی بدترین سماج ہے۔ وہ جہلاء کے ہاتھوں میں ہیں اور سرمایہ دار عیاشوں کے دل بہلانے کا ذریعہ بنے ہوتے ہیں۔ اس کے ایکٹرز اور ایکٹرس نہ صرف جاہل ہیں بلکہ بداخلاق اور بد اطوار ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو ڈراونی اور بھیانک تصویر ہندوستانی تھیٹر کی معاشر کی عام طور پر پیش کی جاتی ہے اس میں مبالغہ کا جزو ہوتا ہے لیکن اسکی تہ میں حقیقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں ——— مالکان کمپنی یا عوام جو انکی سرپرستی کرتے ہیں؟ میں ذاتی طور پر دونوں کو اس کا مشترکہ ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کے اسباب و علل پر بحث کی جائے میرے پیش نظر یہاں صرف ان کی اصلاح ہے۔ ملک کے ہر طبقے میں تھیٹریکل کمپنیوں کی طرف سے عام بدگمانی پھیلی ہوئی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس خیال کو از سرِ نو بدل دیا جائے۔ کیونکہ ایک چیز کے متعلق جب کوئی خیال ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ بسا اوقات پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ جو مٹائے نہیں مٹتا۔ اس کے علاوہ اگر موجودہ تھیٹریکل کمپنیوں کے اعداد و شمار فراہم کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد بہت کچھ گھٹ گئی ہے اس کا سبب یقیناً فلم کمپنیوں کی بہتات ہے۔ اس لئے میرے خیال میں جتنی پرانی قسم کی تھیٹریکل کمپنیاں باقی رہ گئی ہیں ان سب کو بالکل ہی توڑ دینا چاہیئے۔ اور ان کے کھنڈر پر نئی تھیٹریکل کمپنیاں بنانی چاہئیں اور ایسی ہی صورت میں عوام کے خیالات کی کایا پلٹ ہوگی۔

فلم تھیٹر کا نعم البدل نہیں ہے

بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ فلم تھیٹر کا نعم البدل ہے اور یہ کہ فلم کمپنیوں کی موجودگی میں تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے اور فلم اور تھیٹر کے فرق کو محسوس کئے بغیر قائم کر لیا گیا ہے

میتک بولتے فلموں نے آنکھ کے ساتھ کان کی تواضع کا بھی انتظام کردیا لیکن کیا تصویروں کو حرکت کرتے دیکھنا اور تصویروں کو بولتے سننا اتنا ہی زندگی کے قریب ہے کہ جتنا کہ خود انسانوں کو گوشت اور پوست والے انسانوں کو حرکت کرتے ہوئے اور بولتے ہوئے دیکھنا اور سننا؟ دوسرے اور بے شمار اصولی اور فنی اختلافات کے علاوہ یہ فرق اتنا زبردست ہے کہ دنیا والوں نے محض اس کی وجہ سے یہ ضروری خیال کیا کہ تھیٹر فلم کی ترقیوں کے باوجود بھی ایک مستقل آرٹ کے طور پر علیحدہ باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ شہروں میں فلموں کی نمائش کے ساتھ تھیٹریکل ڈرامے بھی اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ اور عوام کی سرپرستیاں برابر دونوں کو کھینچے ہوئے ہیں۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے ڈراما کو جو وقعت حاصل ہے وہ فلم کو آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔

تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام

پرانی تھیٹریکل کمپنیوں کی کمزور عمارت کو گرانے کے بعد اس کی تعمیر از سر نو نئے طرز پر ہونی چاہئے۔ ہندوستان کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں متعدد تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام ضروری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے کہ سرمایہ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج کل فلم کمپنیاں بنانے کا مرض عام ہو چلا ہے اور ہر طرف یہی کوششیں ہو رہی ہیں اور باوجود اس کے کہ اب ہر فلم کمپنی کو مالی فائدہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں خسارہ برداشت کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے جاں کنی کی حالت میں ہیں مگر پھر بھی نئی کمپنیاں بنانے کا شوق روز افزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کچھ دنوں کسی نہ کسی فلم کمپنی میں حصہ لیتا ہے خواہ اداکار کی حیثیت سے ہو، خواہ کسی اور حیثیت سے وہ وہاں سے علیحدہ ہو کر فوراً ہی .. بزعم خود غلط یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ اس کو فلمی دنیا کا کافی تجربہ ہے اور اس کو فلم کمپنی قائم کرنی چاہئے۔ عوام کو گمراہ کر کے حصص فروخت کر کے چھوٹے سے غیر مستحکم سرمایہ کے ساتھ کمپنی قائم ہوتی ہے اور فضول ڈرامے پیش کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ کی فراہمی اس قسم کے اغراض کیلئے ابھی ہمارے ہاں زیادہ دشوار نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر منظم کوشش کی جائے تو وہ سرمایہ جو ٹوٹنے والی فلم کمپنیوں کیلئے فراہم کیا جاتا ہے۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے قیام کیلئے آسانی کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کمپنی کی بہ نسبت تھیٹریکل کمپنی کو سرمایہ بھی کم درکار ہے۔

سرمایہ کے بعد اداکاروں کی ضرورت زیادہ اہم ہے کوئی تھیٹریکل کمپنی عمدہ اداکاروں کے بغیر نام پیدا نہیں کر سکتی اس لئے ان کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جانا چاہئے۔ اداکاروں کے انتخاب میں کئی چیزوں کا خیال زیادہ ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں، ان کے اخلاق، عادات و اطوار قابل اعتراض نہ ہوں، جسمانی صحت اور دماغی صلاحیت اچھی خاصی ہو۔ شائستہ اور مہذب ہوں، اور ان سب سے بڑھکر ان کی فطرت میں اداکاری کی صلاحیت ان کے تمام خصائل میں زیادہ نمایاں ہوں۔ اگر کسی میں آخر الذکر خصوصیت نہیں ہے اور باقی تمام محاسن جمع ہیں تو میں ایسے شخص کو اداکاری کیلئے کبھی موزوں نہیں کہوں گا۔ اس فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ مشق اور محنت بھی لازمی ہے ورنہ لاپروا اداکار اکثر و بیشتر اپنی پوری چمک نہیں دکھا سکتا۔ اور اس کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جسکا کہ وہ فطرتاً مستحق تھا۔ اس قسم کی ایک دلچسپ مثال میں نے ایک جگہ پڑھی ہے۔ ایک ہندوستانی امیر ہالی وڈ گئے۔ اور ایک مشہور فلم اسٹوڈیو دیکھنے گئے۔ وہاں انھوں نے متعدد اداکاروں سے باتیں کیں اور اسی سلسلہ میں ایک شہرۂ آفاق ایکٹریس سے بھی ملنے کی خواہش کی۔ اس ایکٹریس نے جواب میں کہلوا بھیجا کہ گو کہ ابھی اس کی شوٹنگ کیلئے کافی وقت ہے لیکن شوٹنگ ختم ہونے تک وہ شاید ملنے کے قابل نہ رہے اس لئے معافی چاہتی ہے۔ فلم کے شوٹنگ کے ختم ہونے کے بعد وہ ملی اور مکرر معافی چاہنے کے بعد اس نے پہلے نہ ملنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کو اس دفعہ ایک حزنیہ پارٹ کرنا تھا اسی لئے وہ وقت سے بیشتر آکر حزنیہ تاثرات اپنے اوپر طاری کر رہی تھی۔ اور رو رہی تھی کہ نہ صرف اس کا دل بھر آئے بلکہ اس کے چہرے اور جسم پر حزنیہ تاثرات قبل از وقت ہی پیدا ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس قسم کا خلوص اور اتنی محنت نہ کی جائے اداکاری عروج کو نہیں پہنچتی۔

اداکار کیلئے میں نے تعلیم یافتہ ہونیکی شرط محض اس لئے لگائی کہ اداکاری دو خصوصیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک حرکات

اور دوسرے طرزِ ادا۔ اور ان دونوں کیلئے اداکار کا اپنے پارٹ کے نہ صرف مفہوم کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے بلکہ لفظوں اور جملوں کو اسی مفہوم کے لحاظ سے ادا کرنا لازمی ہے اور یہ غیر تعلیمیافتہ اداکار کے بس کی بات نہیں۔ ہاں ان غیر معمولی ذہین اور فربس اداکاروں سے بحث نہیں کر رہا ہوں جو بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ قسم سارے اصولوں اور قوانین سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ہر اداکار کیلئے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ضروری ہے کہ وہ ڈرامہ نگار کے مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنیکی صلاحیت اپنے میں رکھے۔ البتہ بڑا اداکار اس ضرورت کے سوا ایک خصوصیت یہ بھی رکھتا ہے کہ ڈرامہ نگار کے کردار کی پوری ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو انفرادی طور پر باقی رکھے۔ شاعر اپنے شعر میں جب کبھی فلسفیانہ نکات یا جذباتی نفسیات کا ذکر کرتا ہے تو صرف اشارہ ہی پر اکتفا کرتا ہے مگر اس کا شارح اپنی دماغی صلاحیتوں سے بال کی کھال کھینچ کر ان اشاروں کی ایسی وضاحت کرتا ہے کہ وہ خود بجائے ایک مستقل درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی حال ڈرامہ نگار کے کردار کا ہوتا ہے۔ وہ اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اداکار ان لفظی اشاروں کو حقیقت میں اس طرح بدل دیتا ہے کہ اس کی ساری تفصیلات پیشِ نظر ہو کر ایک خاص چیز ہو جاتی ہے۔ میں نے اداکار کے انتخاب میں اچھے کردار کے اصحاب کا ذکر محض اس لئے کیا کہ موجودہ دور میں تھیٹریکل کمپنی جس چیز کی وجہ سے زیادہ بدنام ہے وہ اداکاروں کی بد اخلاقی ہے لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کے دلوں سے یہ خیال نکالنے کے لئے اداکاروں کا انتخاب کرتے وقت خاص طور پر اچھے عادات، اخلاق کے اشخاص کا لحاظ رکھا جائے۔ بعض نقّاد جن کے مطمحِ نظر "آرٹ، آرٹ کی خاطر" ہے وہ ضرور اس طرزِ انتخاب کو دقیانوسی اور غیر ضروری سمجھیں گے لیکن اگر حالات کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ طریقِ کار کتنا اہم اور ضروری ہے۔ جب تک اس قسم کی کمپنیوں کی اخلاقی زندگی کا معیار بلند نہ ہوگا سنجیدہ اصحاب اس میں دلچسپی نہ لیں گے۔ اور اچھے کیریکٹر کے اداکار کبھی اپنے آپ کو اس زمرہ میں شامل نہیں کریں گے۔ اداکاری جب تک عوام کے ہاتھوں سے نکل کر صاحبِ ذوق، سنجیدہ، تعلیمیافتہ اور شریف طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچ نہ جائیگی اس کی پیشانی سے کلنک کا ٹیکہ دور نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ممالکِ غیر میں ڈراما اسی وقت ترقی کر سکا جب کہ اس کے اداکاروں کی وقعت لوگوں کے دلوں میں آرٹسٹ کی حیثیت سے قائم ہو گئی۔ زمانہ قدیم ہی سے وہاں یہ پیشہ کبھی بدنام نہیں ہوا۔ اور اسٹیج پر آنے کیلئے کسی ایسے شخص نے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہو کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اداکاروں کا وہی اعزاز کیا گیا جو دوسرے اعلیٰ درجہ کے پیشوں اور ان کے آرٹ کو اسی طرح سراہا گیا جس طرح کہ دوسرے فنون کو اور پھر ان کی شخصیت کی بھی ویسی ہی وقعت کی گئی جیسی کہ کی جانی چاہیئے تھی۔ انگلستان کے تھیٹر کے مشہور اداکار آج تاریخ ادب انگریزی میں باقی ہیں۔ اور انکی سماجی حیثیت بھی اتنی ہی بلند تھی جتنی کہ ان کی فن کاری۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں اداکاروں کی سماجی حیثیت بیحد پست ہے اور اس کے وہ خود بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ ان کی جہالت اور بد اخلاقی نے انھیں سوسائٹی میں کوئی درجہ حاصل نہیں کرنے دیا۔ یہ کوئی متعصبانہ بیان نہیں بلکہ امرِ واقعہ ہے کہ ہمارے نوجوان جو جہالت کی وجہ سے بدکاریوں کا شکار ہو جاتے اور جنہیں اپنے کرتوتوں کے سبب خود اپنے گھر میں رہنا دوبھر ہو جاتا ہے آوارہ گردی کے لئے سب سے پہلے اس قسم کے میدان تلاش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب اداکاروں نے اپنی فنی زندگیاں اسی طرح شروع کی ہیں بلکہ مجھے اس کا اقرار ہے کہ بعض صاحبِ ذوق افراد نے بڑے ایثار سے کام لیکر آرٹ کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے مگر انکی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بہرحال یہی وہ اسباب ہیں کہ جن کے سبب ہمارے اداکار بدنام ہیں۔ اور جب تک ان کا ازالہ نہ کیا جائیگا تھیٹریکل کمپنیوں کا دوبارہ قیام ناممکن ہو جائیگا۔ اور جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں بغیر تھیٹریکل کمپنیوں کے اردو ڈراما کی ترقی ناممکن ہے۔

اسٹیج

ڈراما کی کامیابی کے لئے اسٹیج کی وسعت و ترقی نہایت ضروری ہے۔ اداکار کتنے ہی عمدہ ہوں اور ڈراما کیسا ہی اچھا ہو لیکن اگر اسٹیج ڈراما کی ساری ضرورتوں کیلئے ناکافی ہے اور اداکار اور ڈرامانگار کو ممکن سہولتیں بہم نہیں پہنچاتا تو ڈراما کی ناکامی یقینی ہے۔

سب سے پہلے اسٹیج کا وسیع ہونا ضروری ہے اتنا کہ اگر ضرورت ہو تو اس پر راستہ کا منظر پیش کیا جا سکے، لوگوں کی آمد و رفت

کا انتظام کیا جاسکے۔ اور مجمع دکھایا جاسکے۔ ایک مشکل ڈراما کے دوران میں پیش آتی ہے کہ ایک سین اور دوسرے سین کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ تماشائیوں کو ناگوار گذرتا ہے لیکن اس وقفہ کے بغیر اسٹیج کا انتظام نہیں کیا جاسکتا اور دوسرے منظر کی ضروریات کی تکمیل ناممکن ہوجاتی ہے۔ اگر اسٹیج اتنا وسیع کیا جائے کہ ایک پردہ کے پیچھے دوسرا سین اور دوسرے پردہ کے پیچھے تیسرا سین قبل از قبل جما دیا جائے تو یہ مشکل ایک حد تک پوری ہوسکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ تجویز بھی کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتی کیونکہ پہلا سین تو یقیناً اسٹیج کے بالکل اگلے حصے پر ہوگا لیکن دوسرا اس کے پیچھے اور تیسرا اس کے پیچھے اس طرح پیچھے جمے ہوئے سین اسٹیج کے اتنے اندرونی حصے میں ہوں گے کہ اوّل تو تماشائیوں کو ممکن دکھائی نہ دے گا اور اگر بالفرض مکبر الصوت کا انتظام ہو اور سنائی بھی دے تو اسٹیج کا اگلا حصہ خالی رہ کر وہ بدنما منظر پیش کرے گا کہ جس کی کوئی انتہا نہیں اس لئے اس مشکل پر قابو پانے کیلئے دو طریقے رائج کئے گئے۔ ایک تو یہ کہ اسٹیج گھومنے والا بنایا گیا اور اتنا وسیع رکھا گیا کہ اس کے مختلف حصوں پر مختلف مناظر قبل از قبل بنا دیئے جاتے ہیں اور ایک منظر کے ختم ہونے پر اسٹیج گھما کر دوسرا منظر فوراً ہی پیش کردیا جاتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دو منزلہ اسٹیج بنایا گیا اور لفٹ کے انتظام کی طرح اس کے دونوں حصے اوپر نیچے کئے جاسکتے ہیں۔ جب تک ایک منزل تماشائیوں کے روبرو رہے دوسری منزل پر سین تیار کرلیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت فوراً پہلے کو ہٹا کر دوسرے کو پیش کردیا جاتا ہے۔

اسٹیج کی وسعت کے بعد منظر کی تکمیل ضروری ہے لیکن اس سلسلہ میں اہم ترین ضرورت روشنی ہے۔ اسٹیج کی روشنی دراصل منظر اور فضا تیار کرنے کا سب سے بڑا آلہ ہے۔ نہ صرف رنگ برنگ کی روشنی اسٹیج پر تماشائیوں کی نظروں کی ضیافت کا انتظام کرتی ہیں بلکہ کمی اور زیادتی سے خاص تاثرات پیدا کئے جاسکتے ہیں)۔ روشنی نہ صرف حقائق کو واضح کرتی ہے بلکہ جذبات کی بھی نمائش کرتی ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر صرف آپ کا کمرہ منور ہو اور باہر کی ساری فضا تاریک تو آپکے دل پر کیا گذرتی ہے؟ یا اس کی برخلاف آپکے کمرے میں اندھیرا ہو اور ساری آس پاس کی فضا منور تو جذبات کا رُخ کس طرح بدلتا ہے؟ ساری کی ساری فضا تاریک ہو ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا اور ایسے میں کبھی روشنی کی ایک آدھ جھلک پیدا ہوجاتی ہو تو آپ کے دل میں کس قسم کے خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ بجلی سے لٹکے ہوئے ننھے سے بلب شدتِ باد کی وجہ سے جب ہلنے لگتے ہیں اور ان کا سایہ دیوار پر متحرک ہوتا ہے تو آپ کا دل کیوں لرزتا ہے؟ اچھی خاصی روشن فضا جب یکلخت تاریک ہوجاتی ہے تو آپ کے منہ سے کیوں ہلکی چیخ نکل جاتی ہے جب تیز روشنی آنکھوں کو چکا چوند کردیتی ہے تو آپ کے چہرے پر کیا آثار رونما ہوتے ہیں؟ روشنی ناکافی ہو اور مقام دیکھا بھالا نہ ہو تو کیوں آپ ٹٹول کر چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں؟ ہلکی روشنی میں جب سایہ پھیلتا ہے تو کیوں ایک ڈراؤنا منظر پیش کرتا ہے؟ یہ سب روشنی کے سحر فریب کارنامے ہیں جن کو آسانی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کرکے حسب خواہش اثرات پیدا کئے جاسکتے ہیں۔

پیش کنندہ

ڈراما کی ترقی کے لئے پیش کنندہ (Pro-ducer) کا وجود ضروری ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں ڈراما نگار کیلئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کو خود اسٹیج کروائے اور یہ ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ مصنف کا اپنی کتاب خود شائع کروانا۔ ساری دُنیا میں مصنفین اور مؤلفین کے ساتھ ساتھ پبلشرز کا وجود بھی ترقی کرتا گیا ہے اور ان دونوں کا تعلق چولی دامن کا سا ہوگیا ہے ایسا کہ ایک کے بغیر دوسرا بے سہارے ہوجاتا ہے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری زبان کا کہ مصنفین اور مؤلفین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود پبلشرز کا فقدان ہے۔ ایک آدھ جو ہیں بھی برائے نام تو انھیں سوائے مصنف اور مؤلف کو لوٹنے، ستانے اور پست ہمت کرنے کے اور کچھ نہیں آتا۔ بالکل یہی حال ڈراما کا ہے اور چونکہ ہماری زبان میں ڈراما کی صنف ہی کمزور ہے اور ڈراما نگار کم ہیں اس لئے اس خصوص میں اس کی حالت اور زیادہ خراب ہے۔ پیش کنندہ کا وجود سرے سے ہی نہیں۔ یا تو ڈراما تھیٹریکل کمپنی کے سپرد کرنا پڑتا ہے یا خود مصنف کو اسٹیج کرانا۔ تھیٹریکل کمپنیاں اب تو اس حالت میں ہیں کہ ان کا رہنا اور نہ رہنا دونوں یکساں ہیں لیکن جب ان کی حالت قابل لحاظ تھی تو وہ بجائے ڈراما خریدنے کے ڈراما نگار کو خرید لیتی تھیں۔ ڈراما پیش کرنے کا یہ عجیب وغریب

طریقہ تھا۔ ڈرامانگار کمپنی کا ملازم ہوکر اس کا آلۂ کار بن جاتا تھا اور اپنی شخصیت کو اس میں فنا کردیتا تھا۔ اس نقص کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اگر ہم ڈرامہ نگاروں کی تصانیف کا شمار کرنا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ناممکن ہوجاتا ہے کیونکہ کمپنی میں ڈرامہ نگار کو کسی حیثیت سے بھی اہمیت دی ہی نہ جاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے نہ عوام کو اور نہ خواص کو اس کا علم ہوسکا کہ کون سا ڈرامہ کس کا لکھا ہوا تھا۔ اگر ڈرامہ نگار خود اپنا ڈرامہ پیش کرتا ہے تو اس کو اتنی مشکلیں پیش آتی ہیں کہ بیان سے باہر اور جس نے بھی کبھی اس کا ایک دفعہ تجربہ کیا ہے دوبارہ ہمت کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

ذریعہ معاش

آج کل دُنیا میں ایسے خدار سیدہ کم ہیں جو علم کو علم کی خاطر، فن کو فن کی خاطر اور پیشے کو خدمت کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ اب ہر شخص زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے اور نہ صرف حق بلکہ اس کی ضروریات بھی اور اس سلسلے میں علم، فن اور پیشہ کی مدد سے وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرتا ہے۔ پیشہ کوئی ادنیٰ و اعلیٰ نہیں ہے علم و فن میں کوئی بزرگی اور برتری کا سوال نہیں ہے۔ ہر علم علم ہے، ہر فن فن، اور ہر پیشہ پیشہ۔

کسی زمانہ میں بچوں کو پڑھاکر روپیہ کمانا بداخلاقی اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ محض اس خیال سے کہ درس و تدریس خدمتِ خلق ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا نازیبا۔ اسی طرح تصنیف یا تالیف کو فروخت کرنا اخلاقی جُرم سمجھا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ معاشی تقسیم نے پیشوں اور آمدنی کے ذرائع میں وسعت پیدا کردی اور اب ترقی یافتہ ممالک میں ادبیات کی ہر ہر صنف میں پیشہ ورانہ تخصیص آپ کو نظر آئیگی۔ کوئی ناول نگاری پر گذر کرتا ہے، کوئی شاعری کو ذریعہ آمدنی بناتا ہے اور کوئی ڈرامہ نگاری پر تکیہ کرتا ہے۔ تھیٹر کے فن کو بھی مختلف پیشوں میں تقسیم کردیا گیا۔ کوئی پیش کنندہ ہے، کوئی ڈرامہ نگار، کوئی تھیٹر کا مینیجر، کوئی اداکار، کوئی تنقید نگار، کوئی بہروپ بدلنے والا، کوئی اداآموز، کوئی روشنی کا انتظام کرنے والا، کوئی لباس تیار کرنے والا۔ کوئی اسٹیج کی زینت کا خیال کرنیوالا وغیرہ وغیرہ۔ اس تقسیم سے منجملہ اور فائدوں کے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ متعدد افراد کی اس سلسلہ میں کھپت ہوجاتی ہے اور تقسیم معاش کے ساتھ ساتھ روزگار حاصل کرنیکا میدان زیادہ وسیع ہوجاتا ہے۔ چونکہ روزگار کا سوال دورِ جدید کا سب سے اہم سوال ہے اس لئے جب تک ہمارے ڈراما کو ذریعہ معاش قرار نہیں دیا جائیگا اس کی ترقی ناممکن ہے۔

ادبیات میں یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنا پورا وقت اسی کی نذر کردے بلکہ وہ اپنے دوسرے مستقل پیشے سے بچا ہوا وقت اس پر صرف کرکے اپنی محدود آمدنی میں اضافہ کرسکتا ہے۔ ایسے افراد جن کی آمدنی کم ہے اور جنھیں اس کا شوق و ذوق ہے وہ اپنے آپ کو بیک وقت مشغول بھی رکھ سکتے ہیں اور آمدنی میں اضافہ بھی کرسکتے ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف ادبیات کے ذخیرے میں اضافہ ہوگا اور دوسری طرف آمدنی کے ذرائع بھی وسیع ہونگے ہمارے ملک میں اس طریقہ کار کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ عام طور پر ہماری آمدنی کم، محدود اور ناکافی ہے، اور پھر ہمارے ادبیات کی کوئی صنف مطور پیشہ اختیار نہیں کی جاتی اسلئے ضروری ہے کہ اس طرح مصنفین اور مؤلفین کے لئے کاروباری میدان مہیا کیا جائے گو کہ ہم پورے طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادبیات کی ہر صنف کو ہمارے مصنفین اور مؤلفین مستقل طور پر پیشہ بنائیں اور اپنا پورا وقت اس پر صرف کرلیں تاکہ ہمارا ادب ایسے دماغوں کی پیداوار سے مسلسل مالامال ہوتا رہے جو اس کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ دوسرا طریقہ کار بھی ان افراد کے لئے فائدہ مند سمجھتے ہیں جو ادبیات کیلئے اپنا پورا وقت نہیں دے سکتے۔

ہمارے یہاں طلبا کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنی عمر کا بہترین حصہ جامعات میں گذارتی ہے اور اس زمانہ میں یہ جماعت اپنے طور پر کسی قسم کی آمدنی، ذریعہ معاش یا معاوضہ کا کوئی انتظام نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ اپنے والدین، عزیز و اقارب اور سرپرستوں کی جیبوں پر بار ڈالتی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں اکثر و بیشتر آمدنی کے مواقع ہاتھ آسکتے ہیں مگر وہ توجہ نہیں کرتے تعطیلات میں جبکہ جامعات بند رہتی ہیں اس قسم کے مواقع ہمیشہ ملتے ہیں مگر اس کو لہو و لعب میں گذار دیا جاتا ہے یا پھر کالج کے اوقات کے بعد بھی اگر مستعدی سے کام لیا جائے تو تھوڑا بہت وقت کسبِ معاش کیلئے بھی نکل آتا ہے۔ والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم کے معاملہ میں جو زیر بار ہورہے ہیں اسے عام طور پر۔ جو

شکایات سُننے میں آتی ہیں کہ اولاد کی تعلیم میں والدین کا دیوالہ نکل گیا محض اُن کی سُستی اور کاہلی کے نتائج ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی سیانی ہونے کے بعد اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہونیکی کامیاب کوشش کرتی ہیں اور اپنا زیادہ بار طلباء خود ہی برداشت کر لیتے ہیں۔ میں یہاں ادبیات کی دوسری اصناف کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ صرف ڈراما کا۔ اگر کالج کے طلباء تھیٹر اور ڈراما میں گہری دلچسپی لینا شروع کریں اور اپنی فرصت کے لمحات معاوضہ لیکر اس کے مختلف شعبوں میں کام کریں تو یقیناً انھیں کافی مالی امداد کا ایک ذریعہ ہاتھ آئیگا اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمیافتہ جماعت کی تائید تھیٹر کو حاصل ہوجائے گی۔ اور ڈراما ترقی کرے گا۔

شوقیہ انجمنیں

ڈراما کی ترقی کیلئے نہ صرف پیشہ ورانہ تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت ہے بلکہ شوقیہ (Amateur) انجمنوں کی بھی ضرورت ہے تعلیمی ادارے درسگاہ، مدرسے اور ادبی ادارے نہایت آسانی کے ساتھ شوقیہ ڈرامائی انجمن قائم کرسکتے ہیں اور جب تک اس قسم کے ادارے ڈراما کی ترویج میں حصہ نہ لیں گے ڈراما کا شوق ملک کے عرض و طول میں نہیں پھیل سکتا۔ چونکہ ڈراما تعلیمی حیثیت سے نہایت مفید ہے اور اس کی افادیت میں اب کسی کو کلام نہیں رہا اسلئے ہر تعلیمی ادارے میں شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام لازمی ہے۔ دراصل یہی ادارے گہوارہ ہوتے ہیں جہاں ڈراما کا ذوق و شوق پرورش پاتا اور بڑھتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی مراحل میں جب طلباء اس کے فوائد سے آگاہ ہوجاتے ہیں تو آئندہ چل کر انھیں اس کو پھیلانے میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔

شوقیہ ڈرامائی انجمن نہ صرف تعلیمی اداروں میں ہونی چاہئیں بلکہ غیر تعلیمی اداروں کو بھی اس کی سرپرستی کرنی چاہئے۔ جس طرح سے لوگ شام کا وقت مختلف مصروفیات میں گذارتے ہیں اسی طرح اس قسم کی شوقیہ انجمنوں کا کام ہے کہ وہ عوام کی وقت گذاری اور دماغی تفریح کیلئے ڈرامائی دلچسپیاں مہیا کریں۔ فارغ التحصیل اصحاب جو مختلف پیشوں میں مستقل طور پر زندگیاں گذار رہے ہیں شام کے وقت تفریح کیلئے بے چین رہتے ہیں ابھی ہمارے ملک میں اتنے کلب نہیں ہوئے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے لوگ اور وہ بھی سب کے سب ان میں سما جائیں اس لئے وہ لوگ جو کلب نہیں جاتے دوسری مشغولیت اور مصروفیت ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام عمل میں آئے تو یقیناً بہت سے افراد اس کی طرف کھنچے آئیں گے۔

شوقیہ انجمنوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں وہ بُرائیاں جو پیشہ ورانہ کمپنیوں میں پیدا ہوجاتی ہیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ پیشہ ور اداکار شوق سے زیادہ روپیہ کمانے کی خاطر اداکاری کرتے ہیں۔ پیشہ ور ڈرامہ نگار جیب بھرنے کیلئے جلد سے جلد ڈرامے لکھتا ہے۔ پیشہ ور نقاد اس انداز سے تبصرہ کرتا ہے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ روپیہ ملے، پیشہ ور پیش کنندہ ایسا ہی ڈرامہ پسند کرتا ہے جس کی نمائش سے اس کو زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو۔ غرض یہ کہ ہر شعبہ میں پیشہ ور فن کو فن کی خاطر اور فطری دلچسپی کے لحاظ سے پیش نہیں کرتا بلکہ پیشہ ورانہ طمع و حرص اس میں داخل ہوجاتی ہے۔ برخلاف اس کے شوقیہ انجمنیں چونکہ روپیہ کمانیکا خیال ہی نہیں کرتیں اور محض اپنے ذوق و شوق کی نمائش کرتی ہیں اس لئے اس میں یہ کاروباری عنصر شامل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ڈراما کی ترقی کیلئے شوقیہ انجمنوں کا قیام ازبس ضروری ہے۔

بچوں کا تھیٹر

چونکہ تھیٹر کو آلۂ تعلیم بنایا جاسکتا ہے اس لئے بچوں کے تھیٹر کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بچوں میں نقالی کا شوق بہ نسبت عمر رسیدہ اصحاب کے زیادہ ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ نقالی کا مادّہ بچوں میں فطرتاً ہوتا ہے اور جس عمدگی اور سہولت کے ساتھ وہ اداکاری سیکھتے ہیں دوسرے نہیں سیکھتے۔ اس کے علاوہ اداکاری اور نقالی سے وہ جتنا اثر لیتے ہیں ہر شخص جانتا ہے۔

موجودہ تعلیمی رُجحان یہ ہے کہ بچوں کو اُن کی طبیعت کی اُفتاد پر چھوڑ دیا جائے اور اسی مُناسبت سے طریقِ تعلیم مُرتب کیا جائے تاکہ وہ اپنے ذوق و شوق کی مطابقت میں اپنی ذہنی نشوونما کی تکمیل کرسکیں۔ فروبل کا کنڈرگارٹن، اور منٹسوری کے کھلونوں کی مقبولیت اسی اصول کی وجہ سے ہوئی۔ ایسے حالات میں چونکہ تھیٹر میں بچہ فطری طور پر دلچسپی لیتا ہے اس لئے اس کے لئے خاص انتظامات نہ صرف نازیبا نہیں ہوں گے بلکہ بڑی حد تک ضروری۔ جس طرح بچوں کی تعلیم میں ریڈیو شامل کرلیا گیا ہے اور اس سے

تعلیمی فوائد مرتب کئے جا رہے ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ بچوں کے تھیٹر کا قیام بھی عمل میں آئے۔ اور اس کا انتظام اتنے وسیع پیمانہ پر کیا جائے کہ ہر مدرسہ کی عمارت میں تھیٹر داخل ہو۔

چونکہ فنونِ لطیفہ کا مذاق آج کل کی جدید تعلیم میں بچوں کے دلوں میں ابتدا ہی سے پیدا کیا جاتا ہے اور اسی سلسلہ میں موسیقی، مصوری وغیرہ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اسی لئے تھیٹر جو کہ فنونِ لطیفہ کا اچھا مرکز ہے مدرسہ کی زندگی کا اہم جزو بن جاتا ہے۔ طلبار یہاں ایک طرف موسیقی وغیرہ کی مشق کر سکتے ہیں اور دوسری طرف تعلیمی غرض و غائت کے مدِ نظر لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کر کے تعلیمی استفادہ کر سکتے ہیں۔ روس میں اس قسم کے تھیٹر کی نہ صرف بہتات ہے۔ بلکہ اس کو روز افزوں نئے نئے طریقوں سے ترقی دینے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ طلبار ہی کے حلقہ سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اپنی ضروریات کا اچھا اندازہ رکھتے ہیں اور کافی تجربہ بھی حاصل کر تے ہیں۔ اونچی جماعتوں کے طلبار نہ صرف اسٹیج کا انتظام کرتے ہیں ضروریات مہیا کرنے میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں بلکہ اداکاروں کو تیار کرتے ہیں اور طریقہ اداکاری سکھاتے ہیں۔ اکثر دفعہ ان چھوٹے چھوٹے تھیٹروں میں دنیا کے بڑے بڑے مصلحانِ تعلیم کے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ یہیں کے طلبار کے لکھے ہوئے۔ بچوں کے تھیٹر کا خیال نہ صرف روس میں ترقی کر چکا ہے بلکہ یورپ اور بالخصوص انگلستان نے بھی اس کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہے۔

حسنِ اتفاق سے ہمارے ملک میں آجکل تعلیمی اداروں کی ازسرِ نو تنظیم قومی نقطۂ نظر سے عمل میں آ رہی ہے اور ہر صوبہ میں تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا معقول انتظام کیا جا رہا ہے، ایسے میں اگر بچوں کے تھیٹر کا انتظام بھی درس گاہوں میں ہو جائے تو کتنا موزوں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے مصلحانِ تعلیم اور عہدہ دارانِ محکمہ اس خصوص میں غور کریں۔

دیہاتی تھیٹر

آج بھی ہم دیہات میں دیکھتے ہیں کہ "رام لیلا" کا کھیل یا مہابھارت کا تماشا کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے اور عوام اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ بغیر کسی سہولت کے وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر گھنٹوں یہ تماشا دیکھا کرتے ہیں۔ لیکن اب یہ کھیل تماشے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے تنِ بے جان میں نئی زندگی کے آثار پیدا کئے جائیں۔ دیہات میں تھیٹروں کا قیام اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شہروں میں۔ ان تھیٹروں سے دیہات سدھار اور تعلیم بالغان کا کام آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ اور لیا جانا چاہئے۔ دیہات میں چونکہ شہری زندگی کے مواقع حاصل نہیں ہوتے اور شہری رجحانات کا انھیں کوئی عملی رخ نظر نہیں آتا اسلئے ضروری ہے کہ تھیٹر کے ذریعہ انھیں اس سے روشناس کرایا جائے۔ اسکے علاوہ دیہات میں چونکہ زرعی اور صنعتی تعلیم کے سوا فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا انتظام کم ہوتا ہے اسلئے تھیٹروں کے قیام کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہے۔

ڈرامائی تنقید

ڈراما صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ فنی اور بے لاگ تنقید کا مذاق ملک میں عام نہ ہو جائے۔ اس کیلئے جہاں ڈراموں کی بہتات کی ضرورت ہے وہاں ڈرامائی فن کے موضوع پر عمدہ کتابوں کی اشاعت بھی لازمی ہے۔ ہماری زبان میں نہ ڈرامے ہی ہیں اور نہ ڈراموں پر تنقیدی ادب۔

کتابوں کے علاوہ تنقیدی ادب رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اصول اور فن کی صحیح ترویج اس طریقہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ ڈراما اور تھیٹر کی غلط کاریوں پر ٹوکا جا سکتا ہے اور انھیں صحیح راستہ پر لگا کر ضروریات اور لوازمات کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ صحیح اصول اور فن سے واقف کرانے کی اس وقت اس وجہ سے ضرورت ہے کہ عام طور پر ملک میں ڈراما اور تھیٹر کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں اور وہ ایسے ہاتھوں میں ہے جہاں کہ اس کو ترقی کے ذرائع مہیا نہیں کئے جا سکتے۔

فلمی ڈرامے

متحرک فلموں نے اوّل ہی سے تھیٹر کی رونق گھٹا دی تھی لیکن جوں ہی بولتے فلم میدان میں آئے تھیٹر کا کاروبار بالکل ہی سرد پڑ گیا۔ اس لئے اب ڈراما کی سرپرستی کے لئے لے دے کر ایک ہی جگہ رہ گئی ہے اور وہ فلم کمپنیاں ہیں اور ان کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ۔ جس طرح یہاں ڈراما کا خون ہو رہا ہے شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔ انھوں نے یہ عجیب و غریب ریکارڈ قائم کیا کہ آجتک کوئی ایک بھی ایسا ڈرامہ پیش نہیں کیا جو اصول اور فنی نقطہ نظر سے بے عیب سمجھا جا سکے۔ کیا بہ لحاظ افسانہ، کیا بلحاظ سیرت نگاری اور کیا بلحاظ مکالمہ کوئی اچھا ڈرامہ پیش نہیں کیا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ فلم کمپنیوں میں کوئی بھی ایسا ڈرامہ نگار نہیں ہے جو اصول اور فن کے ساتھ ساتھ زبان اور ادبیات پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ ہماری فلم کمپنیاں

پنارو پیہ صرف حسین طوائفوں پر صرف کرتی ہیں اور انھیں کسی اور ضرورت کا احساس نہیں ہوتا لیکن اگر ڈراما کو اس ملک میں ترقی کرنا ہے تو ڈراما سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ فلم کمپنیوں کے اس طریقہ کار پر صدائے احتجاج بلند کریں اور اس بات پر انھیں مجبور کریں کہ وہ ڈراما کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ کریں۔ اور مختلف صوبوں کے شہروں اور گاؤں میں ذیلی اور مرکزی انجمنیں قائم کریں۔ انجمنوں کے قیام اور ان کے الحاق سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہو سکے گا کہ ایک دوسرے کی وقتِ ضرورت مدد کر سکیں گے۔ ورنہ انفرادی کوششوں کے بارآور ہونے کے امکانات کچھ زیادہ نظر نہیں آتے۔

انجمنوں کا قیام ملک کے طول و عرض میں ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب تفصیلی دور

سیّد بادشاہ حسین
(حیدرآبادی)

حُسن

تو پیچ و خم ہے کاکل میں
تو رنگِ شگفتہ ہے گل میں
تو کیف ہے چشمِ ساقی میں
تو سوز ہے نغمۂ بلبل میں

تو ناز و کرشمہ خوباں میں
تو نشہ ہے ذوقِ رندان میں

اللہ ری خود بینی تیری
خود مست ہی رنگینی تیری
منکر نہیں جس کے دنیا میں
وہ دین ہے بیدینی تیری

جی بسکہ لبھا لیتا ہے تو
دنیا کو بھلا دیتا ہے تو

تو نور بنا ستاروں میں
تو رنگ بنا گلزاروں میں
گھنگھور گھٹائیں جب چھائیں
تو کیف بنا میخواروں میں

تو ساقی بھی میخانہ بھی
تو مے بھی اور پیمانہ بھی

ہے پھولوں کی رعنائی میں تو
معشوق کی ہی انگڑائی میں تو
پھولوں میں نہاں ہے لَے تیری
ہے صحرا کی تنہائی میں تو

تو سوز میں ہی تو ساز میں ہے
تو درد بھری آواز میں ہے

تو داغِ محبت لالے میں
تو سوز ہے دل کے چھالے میں
نظارۂ کیف افزا ہے تو
ہر چشم کو مہ کے ہالے میں

گھنگھور گھٹا کی جان ہی تو
دل والوں کا ایمان ہی تو

تو کاہکشاں کا جوبن ہے
تو قمری کا طوقِ گردن ہی
تو آرائش ہی رخساروں کی
تو شعلۂ وادیٔ ایمن ہے

یہ تو تھا مجنوں کے دل میں
یا لیلیٰ دل کے محمل میں

گلشن میں گلریزی تیری
کلیوں میں دلاویزی تیری
ہر پھول کا دامن رنگیں ہے
اے حسن یہ خوں ریزی تری

کیوں تجھ سے نہ ہو اُلفت مجکو
اس شوخ سے ہی رشتہ مجکو

نیاز قدرائی

قلعۂ معلّٰی کی ایک جھلک

زینت محل ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی بڑی چاہیتی ملکہ تھیں۔ گویا چراغ سلطنت کے شعلۂ محبت کی آخری بھڑک تھی۔ بڑے راؤ چاؤ تھے۔ ایک مرتبہ ان کا پنڈا ذرا پھیکا پھیکا ہو گیا اب کیا تھا قلعہ میں ادھر سے ادھر تک۔ کانا پھوسی ہونے لگی۔ قلماقنیاں۔ اُردا بیگنیاں جسولنیاں مُنہ بنائے ہوئے دوڑنے لگیں۔ جہاں پناہ کو اطلاع ہوئی۔ ہوادار حاضر ہوا۔ محل میں مزاج پُرسی کی تیاریاں ہو گئیں . . . شہزادیاں۔ سلاطین زادیاں جوڑے بدل بدل کر عیادت کو روانہ ہوئیں۔ ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ پہلے میں پہنچوں تاکہ حضور کی خوشنودی کا باعث ہو۔ چوبدار حکیم احسن اللہ خاں کو بلانے دوڑے۔ شہر میں خبر پہنچی تو اُمرا کی بیگمات اور نواب زادیاں پینسوں میں بیٹھ بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ گھنٹہ بھر نہیں گذرا تھا کہ بادشاہ بیگم کا محل مہمانوں سے بھر گیا۔ اتنے میں ڈیوڑھی کے باہر نقیبوں چوبداروں نے آواز لگائی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ رسول کی امان۔ دوست شاد دشمن پائمال۔ بلائیں رد۔" نقیبوں کے رد کرنے سے فوراً ہوادار شاہی کہاریوں نے اپنے کندھوں پر لے لیا۔ پھر چوبدار پکارے "خبردار" اندر سے جسولنیوں نے جواب دیا "اللہ رسول خبردار ہے!" بادشاہ سلامت محل میں پہنچے۔ مُنہ ہی مُنہ میں دعائیں پڑھتے ہوئے ہوادار سے اُترے دو رویہ بیگمات کے پرے تھے۔ سلام لیتے ہوئے زینت محل صاحبہ کی سکھ سیج کے پاس پہونچے۔ وہ دوشالہ تانے خاموش آرام کر رہی تھیں بیگس رانی ہو رہی تھی۔ جہاں پناہ کو دیکھتے ہی مجرے کیلئے اٹھنا چاہا۔ حضور نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا "مجرا معاف۔ اُٹھنے میں ہلکان ہو گی۔ اوہو! واقعی طبیعت بدمزہ ہے۔ آغا حکیم احسان اللہ ابھی تک نہیں آئے؟" جسولنی نے عرض کیا "مہابلی حکیم صاحب تو کب کے درِ دولت پر حاضر ہیں۔" "اچھا تو بلاؤ۔ دیر کا ہے کی ہے۔" پردہ ہوا۔ قناتیں لگ گئیں سکھ سیج کے آگے شفق کھڑی کر دی گئی۔ حکیم صاحب آئے۔ جھک جھک تسلیمیں کیں۔ مؤدب بیٹھے۔ نبض دیکھی۔ نسخہ تجویز ہوا۔ حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ اشارہ ہوا کہ ابھی حکیم صاحب کی نگرانی میں تیار ہو کر پیش ہو۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد بادشاہ سلامت مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ پیچوان لگا دیا گیا۔ بیگم کی خواص خاص نے خاصدان پیش کیا جس میں سونے چاندی کے ورق لگی ہوئی گلوریاں تھیں۔ مورچھل ہونے لگا۔ شاہزادیاں اپنے اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ لیکن حضور خاموش تھے کہ سامنے سے "الشافی اللہ الکافی" کی صدا آئی۔ دو قلماقنیاں آگے آگے۔ پیچھے مہری کے سر پر ایک خوان کمخواب کے تورہ پوش سے ڈھکا ہوا۔ عرض بیگی نے دعا دے کر عرض کیا "جام صحت حاضر ہے۔" حکم ہوا ملاحظہ میں لاؤ۔ تورہ پوش ہٹا کر کسنے کی مہر توڑی۔ خوان پوش ہٹایا تو بلوریں پیالے میں ٹھنڈائی تھی اور زہرمہرہ کی پیالی میں خمیرہ مروارید۔ بادشاہ نے آیات شفا دم کر کے اپنے دست مبارک سے پہلے خمیرہ کی پیالی بیگم صاحبہ کو دی پھر ٹھنڈائی کا پیالہ اور فرمایا "حکیم احسن اللہ کا ہاتھ بہت ہلکا ہے۔ خدا چاہے تو ابھی جی بحال ہوا جاتا ہے۔"

دوا کی تاثیر اور سلطانی عنایات چند ہی منٹ میں عُلیہ حضرت کے چہرہ کا تکدر جاتا رہا۔ مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔ محل میں امی جمی ہو گئی سب کے مُنہ پر جو قفل سے لگے ہوئے تھے کھل گئے۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ باہر شادیانے بجنے لگے۔ اندر ڈومنیاں۔ مراثنیں "جم جم راحت نت نت صحت۔ بادشاہ سلامت" گانے لگیں۔ ہر طرف چہچہے تھے اور قہقہے حضور مطمئن ہو کر تشریف لے جانا ہی چاہتے تھے کہ زینت محل صاحبہ نے دست بستہ عرض کیا "حضور نے جہاں اتنا کرم کیا ہے خاصہ بھی آج اس کفش خانہ ہی میں نوش فرمالیں تو زہے نصیب۔ لونڈی بھی جہاں پناہ کے تصدق میں دو چار لقمے کھالیگی۔" ارشاد ہوا "کیا مضائقہ ہے تمہاری خاطر سے ہمیں عذر نہیں۔"

حکم ہوتے ہی لونڈی باندیاں۔ پیش خدمتیں۔ بکاولنیں اہتمام میں مصروف ہو گئیں۔ دسترخوان بچھا گیا۔ کھانے چُنے جانے لگے۔ بادشاہ کی دعوت اور زینت محل صاحبہ کے ہاں کا خاصہ۔ شان ہی نرالی تھی۔ رنگ برنگ کی روٹیاں شیرمال۔ باقرخانی۔ کلچہ۔ تاؤ دیدہ۔ گاؤ زبان۔ عوض روغنی۔ نانِ پنبہ۔ نان تنکی۔ نان گلزار۔ نانِ قماش۔ قسم قسم کے میٹھے اور نمکین چاول۔ مزعفر۔ منجن۔ زردہ۔ شش رنگا۔ چوگنی کے چاول یخنی پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ نور محلی موتی پلاؤ۔ نرگس پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ رشتہ پلاؤ۔ یاقوتی۔ دودھ کا دُلمہ۔ ماہی بے آب۔ بادام کا

یہ۔ قورمہ۔ شامی کباب۔ ماہی کباب۔ مرغ کے کباب۔ شمسی قلیہ۔ حسینی کباب۔ نکتی کباب۔ سمی۔ بادشاہ پسند دال وغیرہ وغیرہ طرح طرح کے چار مربے حلوے۔ مٹھائیاں غرضکہ خاصا کیا اچھا چمن بندی کی گئی۔

کھانے سے فراغت پاکر حضور تو محل سرائے معلے کو تشریف لیگئے اور یہاں بیگمات اور شہزادیاں گاؤتکیوں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ومینوں نے منجھی ہوئی سُریلی آواز وں سے ہنکنا شروع کیا۔ غزلوں۔ ٹھمریوں۔ ٹپوں۔ خیالوں کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ نوجوان نوجوان پراُنہیں بڑے بڑے استادوں سے تعلیم پائے ہوئے۔ ٹپہ گایا تو شوری کی روح کو شرما دیا۔ ٹھمری شروع کی تو حسینی پیا۔ سندر پیا۔ چھل رنگ رشس رنگ۔ سدا رنگ اور قدر کو بھی مات کر دیا۔ سنبل چھیڑی یا قوالی کی دُھن باندھی تو استاد تان رس خاں کی پوری نقل اتار دی۔

اپنے اپنے میل جول کی بیگمات الگ الگ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کہیں شہزادیوں کی بولی ٹھولی کا مزہ آرہا تھا تو کہیں اُمرا کی خواتین کی گفتگو کے لُطف تھے۔ عجب بہار تھی۔ زینت محل صاحبہ صدر میں بیٹھی کبھی قلعہ والوں کی باتوں پر مسکرا دیتی تھیں تو کبھی شہزادیوں کے محاورات پر بیگانہ وار ہنسنے لگتی تھیں۔

رجبیں زمانی۔ توبہ۔ ایسا بھی کسی کا خون ہلکا ہو۔ سُنا ہے کہ شاموں شام حمام کر کے دھانی جوڑا پہن کر کھلے بالوں مہتاب باغ میں چلی گئی تھیں روزانہ چڑیل نے انہیں ٹوک دیا۔ بس اسی وقت سے دشمنوں بُرا چاہنے والوں کا مُنہ تمتا گیا۔

رجمند بانو۔ موتی کو ہنکاری کے حوالے نہیں کیا۔ ایسی سبز قدم خواصی کے لائق ہے۔

افروز۔ میرے کریاں بھی عمرشد زادے خدا جانے کہاں سے ایک جھل پائی کو پکڑ لائے تھے۔ نگوڑی صورت حرام۔ گل چمن نام رکھ کر بھی میں چھپاتی۔ مُردار اور پری کا سایہ بن گئی۔ نظر بھی کہ بلا جس کو کھاتے دیکھ لے بس زمین دیکھنی پڑی۔ آخر میں نے تو اُسے کھڑے کھڑے نکالا۔ الامتہ ایسی شکل صورت کو کوئی لیکر کیا چاٹے۔

خورشید جہاں۔ وہ تو حضور کو میاں نے نظر اتار کے کوئی دعا بخش دی ہے۔ دیکھا تھا نہ کہ ہوادار سے اترتے ہی کچھ پڑھتے ہوئے آئے تھے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دم کیا تھا۔ یہ عمل ایک پر ایک ہے۔ نظر ٹونا کالے جادو کی اس کے آگے کوئی اصل نہیں اُسی وقت سے چہرے کی ہوائیاں موقوف ہوگئیں۔

نسیم زمانی۔ آغائی کی اوڑھنی کی لپ پر میں بی مغلانی سے بیٹھی دھنک ٹنکوا رہی تھی کہ مرزا ٹلو سے نے خبر دی کہ حضرت زینت محل کو دورہ پار خلش ہوگئی ہے۔ سنتے ہی میرے تو اوسان جاتے رہے۔ جگر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دل شاد میرے لئے چمپا۔ موتیا۔ مولسری۔ چنبیلی اور جوہی کے پھول گوندھ رہی تھیں اسکو بھی جیب کا تیسا چھوڑ اور سکھپال لگوا فوراً حاضر ہوئی۔ چھائیں پھوئیں آپ بیگم کے بیری کی آنکھ میلی اور مریم گھر میں شہد رہے۔ اللہ کی کارسازی کے قربان کہ میں نے اس چاند سی صورت کو ہنستے دیکھ لیا۔

بیتی آرا۔ مجھے بھی صبح ہی ساری باتوں کا پتہ لگ گیا تھا۔ دُردانہ مالزادی کی زہریلی نگاہ کا حال میں نے شبو سے سُنا۔ چنڈالنی کی آنکھ ہے کہ ڈس کی گانٹھ۔ سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ یہاں آکر جو دیکھا تو تھوڑی ہی رنگ پایا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ رنگت پھیکی۔ صورت پر . . . . آگے کیا کہوں۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ پھر جب بڑے حضرت کی تیکھی چتون دیکھی ہے اور جن کڑوے تیوروں سے حضرت نے دُردانہ کو جھڑکتی دیکھا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب اس کا للھا پورا ہوا۔ مگر اس کی بھی کیا خطا ہے۔ آنکھوں میں شیطان گھس پڑے تو کیا کرے۔

خورشید لقا۔ زیب النسا کو تو آپ جانتی ہیں کیسی ضدن ہے اور جب سے میں نے اس کو بیٹی بنا لیا ہے وہ رہی سہی بھی آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ چراغ جلے ایکا ایکی اسے بیٹھے بیٹھے اُدھار اُچھلا کہ چاندنی مناؤنگی۔ ہرچند میں نے کہا کہ یہ کیا موقع ہے حضور کی اجازت کے بغیر سیر سپاٹے کرنا اچھے ہیں۔ سوسن جیسی پتنگ چھری سے بھی نہیں ڈرتی۔ یہ ایک ایک کی چار چار لگا کر بھی نہیں چھوڑیگی۔ لیکن اس بڑونگی نے ایک نہ مانی۔ کبھی روئے کبھی بسورے۔ کبھی ہاتھ جوڑے۔ غرض ایسے چوچلے بگھارے کہ میں موم ہوگئی۔ میرا ہاں کرنا تھا کہ گھٹنیوں چلتے بچوں سے لیکر اسی برس کی بڈھیوں کے دل چلنے لگے۔ دست بستے نکل آئے۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ مامائیں۔ سہیلیں۔ مہریاں۔ باری دائیاں۔ انائیں۔ چھوچھوئیں سب کی سب بناؤ میں مصروف ہوگئیں۔ سواریاں آئیں۔ اب اس نازو نے میرے تلوے سہلانے شروع کئے۔ اس کی عادت ہے اور سچ پوچھو تو ثریا نے ناز اُٹھا اُٹھا کر اُسے شوخ دیدہ بھی بہت کر دیا ہے۔ ہاں تو اس کی عادت ہے کہ جس بات کی دھت لگی بس لگی۔ مجال ہے کہ وہ

اپنی ہٹ سے باز آجائے۔ مجھ کو سوار کرا کے مانی۔

اب جو باغ میں پہنچے تو کیا کہوں کیسا سہانا سماں تھا۔ اوپر دالا اپنا نور بھرا طباق سا چہرہ نیلے پردے سے باہر نکالے پھولوں کو گھور رہا تھا۔ روشوں پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ میں۔ گوہر سلطان جن کا برسوں کی اللہ آمین کے بعد خدا خدا کر کے اب پاؤں بھاری ہوا ہے اور رہ مزی محلدار نی وغیرہ دس بارہ عورتیں تو خیر فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان جوان خون والیوں کے ساتھ کیا اپنی گیلی پھرتی۔ لیکن زیب النسا اور اس کے ساتھ دلشاد۔ نرگس کینگی۔ سمن بر۔ غنچہ دہن۔ شیریں۔ لیلیٰ نے تو ایسا اودھم مچایا کہ سارے باغ کو سر پر اٹھالیا۔ کیاری کیاری ڈوے ڈوے ڈنگے مچاتی اور کدکڑے لگاتی پھرتی تھیں نہ ان کم بختوں کو مرداری سے ڈر لگتا تھا نہ ماموں کی پرواہ تھی۔ وہاں تو شیطان اچھل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلے پاؤں کی بلیاں ہیں ٹک کر بیٹھنا جانتی ہی نہیں۔

کوئی آدھی رات آئی ہوگی کہ زیب النسا کو امریوں میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ کسی نے کہا چوٹی والا ہے۔ کوئی ڈالی والا۔ ابھی نگوڑیوں کے کورے پنڈے تھے بے آپے ہو کر بھاگیں۔ دہشت کے مارے برا حال تھا۔ میں پہلے ہی ذہن اوسان جاتے۔ بے لپ جھپ سوار ہوئے اور جب اپنے محل میں پہونچے تو ذرا دل ٹھکانے ہوا۔ لیکن زمین کی ساری چونچالی جاتی رہی۔ منہ فق فق ہو رہا تھا۔ رات بھر چونکتی رہی۔ مجھے بھی بیسیوں برے برے خواب دکھائی دیئے۔ صبح کو دیر سے آنکھ کھلی۔ ابھی چوکی پر بھی نہیں گئی تھی کہ خدا ماری بدخبری نے یہ شگوفہ چھوڑا۔ کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ سب کو اپنے حال پر چھوڑ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں آتے ہی پہلے دردانہ چمکو دکھائی دی۔ میں نے آنکھیں بدل کر کہا۔ بی تمہارے دیدوں میں رائی نون مجھے تو گھورو نہیں۔ تمہاری تو وہ مثل ہے کہ جس کا کھاؤ اسی کے نمک میں زہر ملاؤ۔ میں آپ ہی پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہوں۔ اور چمپا کے سے گذر کر اندر آگئی۔

شہر کی خاص خاص بیگمات۔ نواب زادیاں ڈھیلے پائچوں کے مشروع۔ زربفت۔ کمخواب کے پاجامے پہنے۔ کارچوبی۔ زردوزی۔ مسالے دار بھاری بھاری دوپٹے اوڑھے کسی کا آڑا انگل ہے تو کسی کا سیدھا۔ زیورات سے گوندنی کی طرح لدی علیحدہ ٹکڑی جمائے بیٹھی ہیں۔ پاندان سنہری روپہلی گنگا جمنی رکھے ہیں۔ پان پر پان چل رہا ہے۔

عالیہ بیگم۔ بہن! قلعہ کا یہ کیا وطیرا ہے کہ جو منہ چڑھ گیا نظروں سے اترتا ہی نہیں۔ ایسی کہاں کی ستیا ستی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نہ تخت کے والی اس کا چونڈا مونڈتے ہیں نہ بیگم کی ناک چڑھتی ہے۔

نوشابہ خانم۔ مجھ والی کے ہاں تُندرانہ بندی ہوتی اور ایسا کوئی سانحہ ہو جاتا تو ٹنڈیاں کھچوا دیتی۔ سپہدار خاں اس کو جیتا چھوڑتے! چھریوں کا غسل دلوا دیتے۔ ڈائن ہے نامراد پوری ڈائن۔

نواب دُولھن۔ ماموں شیریں کو آپ جانتی ہیں! ان کی سلیج ماشاء اللہ کیسی جہاں دیدہ عورت ہیں۔ سنتی ہوں اُن کے سر پر کوئی بزرگ میراں جی یا شیخ سدو بھی آتے ہیں۔ وہ ایک دن جو اماں جان سے ملنے آئیں تو انھوں نے میری اتون کی لڑکی ضیمہ کو دیکھا۔ اس کے گول گول لٹو سے دیدے ہر وقت پھرتے رہتے تھے اور جب کسی کو دیکھتی بس تو ٹکٹکی باندھ کر۔ انھوں نے صاف منہ پر کہہ دیا کہ بُوا اس لڑکی کا بھرے گھر میں آنا جانا رہنا سہنا اچھا نہیں۔ یہ نظر ہائی ہے اور والدہ سے کہا۔ باجی غضب خدا کا ایسی ساپنن کو تم نے پال رکھا ہے۔ اس کی نظریں تو زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور مجھ سے فرمایا۔ بچی۔ گھر سے جب کہیں باہر جاؤ پیر غیب کا دُونا مان کر جاؤ۔ جب نہاؤ نیا جوڑا بدلو۔ سات لال مرچیا سر سے پاؤں تک اتار کر چولھے میں ضرور ڈلوا دو۔ اس دن سے میں نے ان کی یہ بات آنچل سے باندھ لی۔

فصاحت جہاں۔ جی ہاں بڑی بوڑھیوں کی ہر بات آزمودہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے چونڈے دھوپ میں تھوڑی سفید کئے تھے صدقے دو۔ نذریں چڑھائیں۔ تعویذ گنڈے جیسے جیسے کم ہوتے جاتے ہیں ویسے ہی بچے ہیننگ بگ رہے ہیں۔ بیٹی نظر بد سے خدا بچائے۔ گولی کا مارا بچ جاتا ہے مگر نظر کا مارا نہیں بچتا۔ اس سے پہاڑ کھیل کھیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آٹا پیسنے ایک چماری آیا کرتی تھی۔ ایک دن جو وہ آئی۔ اور طبع کی کوٹھڑی میں گئی تو چکی کے گرنڈ میں کہیں سانپ بیٹھا تھا۔ پہلے تو وہ ڈرتی کہ کہیں جھبکی پھر آگے بڑھ کر اسے گھور کر دیکھا اور یہ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بڑی بیگم دیکھنا کیسی ملوک ناگن سو رہی ہے۔ میں نے شہزادی کی دوا سے کہا۔ دیکھنا ٹینگلو کیا بک رہی ہے۔ کیسی ساپنن۔ دوا ایک کچے دل کی عورت۔ ساپنن کا نام سنتے ہی صندلی پر چڑھ گئیں اور آنکھیں بند کر کے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو پڑھنے لگیں۔

تنے میں منگلو ہنستی ہوئی پھر کوٹھڑی میں گئی اور کیا دیکھتی ہوں کہ ایک کالے سنک سے سانپ کی دُم پکڑے اٹھائے لئے چلی آتی ہے۔ صحن کے تریے کے نیچے ڈال کر کہنے لگی "سرکار میری آنکھ سے آنکھ ملاتے ہی مرگئی"۔ مجھکو بڑا اچنبھا ہوا۔ میں نے پوچھا اری بگلی آنکھ سے آنکھ ملانے سے یہ کیسے مرگئی۔ بولی "بیگم جی میری آنکھوں میں کالی دیوی بستی ہیں۔ میں نے تو کتنے سانپ مار گیرے جس کو دیکھا پٹ سے مرگیا"۔ اب بتا بھی کہ یا تو یہ کوئی جھوٹی ہے یا اس کی نظر بُری ہے۔ بس بی بی وہ دن اور آج کا دن میں نے اُسے گھر میں نہیں گھسنے دیا۔

شائستہ النسا۔ تو بہت زمانی کا جب سے پہلوٹھی کا بچہ آترا ہے اور لوگوں نے نظر بتائی ہے میں تو ہر وقت چوکنی رہتی ہوں۔ جہاں کسی نے اپنا ہوا پرایا میت کے بچے کو ٹوکا۔ بنی سنوری کسی لڑکی کو ہوتا اور میں نے جلدی سے کہا ذرا بوا اپنی ایڑی کو دیکھنا کیا لگا ہے اور فوراً اس کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھا کر چولہے میں جلادی۔

نادر جہاں۔ پہلے ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ ایرے غیرے کے سامنے کھانا پینا تو کیا کنگھی چوٹی سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ آدمی پہلے پیر دیکھ لیتے پھر اس کے گھر میں رہنے کے روادار ہوتے۔ عورت ہو یا مرد بعض ایسا بھاگوان ہوتا ہے کہ اس کا قدم آیا اور گھر بھر گیا اسی طرح کوئی ایسا منحوس ہوتا ہے کہ جہاں جائے آفت آ پڑ جائے۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ نواب دولھا کے ہاں جاپا ہوا۔ دولھن میری شاہجہاں کی دوپٹہ بدل بہن ہے۔ سنتے ہی دوڑی گئی۔ میرے پہنچتے پہنچتے خدا رکھے بچہ تو ہو گیا تھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ برجیس جس کو دو دو پار کوک کا روگ لگا ہوا ہے۔ اوپر تلے پانچ بچے مرچکے ہیں پہل پہلوٹھی کی زچہ کے چپرکھٹ پر بٹھا رکھا ہے۔ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ اتنے میں نظر جو پڑی تو نصیبن دائی کل جتنی نیلی چوڑیاں پہنے بچے کو نہلا رہی ہے۔ بوا میں وہم کی پوٹ۔ میرے تو اوسان جاتے رہے۔ ایسے گھر میں مجھے کیا دخل بیٹھی مڑ مڑ دیکھتی رہی۔ پھر کان میں اذان دینے کو بارہ برس دادا مسجد کے موٹے کھوسٹ ملا کو بلایا۔ یہ تو خیر تھا ہی۔ سامنے سے مہترانی طشت صاف کرنے چلی آتی ہے۔ سوڑ میں زچہ کے پاس مہترانی کا کیا کام۔ اس نے آتے ہی طشت اٹھایا اور کہنے لگی بیگم صاحب ماٹی بھی دیدوں۔ ہے ہے بدشگونی کی حد ہوگئی۔ میرے تلووں سے جو لگی تو دماغ تک پہنچی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا کہ او غیبانی جھاڑو پھرے تیرے گھر پر۔ اس گھر کے دشمنوں پر مہترانی نہیں کہتی۔ اور دیکھ مُردار وہ کس کا بچہ ہے اس کے پاؤں میں مہترانی لگ گئی۔ ذرا سا کالا دھاگا کر توڑ ڈال۔ نہیں صاحب میں نے ایسی باتیں کب دیکھی تھیں۔ میرا تو خون کھول گیا۔ اسی وقت پالکی لگوا اپنے گھر آگئی۔

سلطانہ خاتون۔ ارے نواب دولھا کے یہاں کا یہ ہڈ ڈھاجا نار ہاہے۔ خدا بخشے سکندر جہاں بیگم کے وقت تک تو ان کے گھر کا سا قرینہ شہر بھر میں نہ تھا۔ ان کے سارے طور طریق پرانے زمانے کے تھے۔ ماشاء اللہ چار چار بہوئیں لائیں۔ چار بیٹیاں بیاہیں مگر کبھی آمنے سامنے کا منہ نہیں کیا۔ مجال ہے کہ کوئی بچہ ایک پاؤں میں جوتی گھسیٹے پھرے۔ کوئی جا رہا ہے اور کسی کو چھینک آگئی۔ جب تک پاؤں میں جوتی پیر پر کرنہ پہنوا دیتی تھیں ممکن ہے کہ وہ چلا جائے۔ کسی کی ناک کھجائی اور انھوں نے جوتی چھوائی۔ جہاں کسی بچے نے رات کو دانت چبائے۔ یا کسی لڑکی چول کی سٹی سوتے سوتے اس کے منہ میں ڈال دی۔ کسی نے قینچی بجائی اور بڑی بی نے ڈانٹا کیوں لڑائی ڈلواؤ گی۔ ماما نے ہنڈیا پر کفگیر رکھی اور انھوں نے لتے لئے "ہاں کر دو کھانا بدمزہ"۔ ایک دن کہیں میرا ہاتھ ان کی ناک کو چھو گیا۔ اور تو کچھ کر نہ سکیں۔ بڑا لحاظ تھا مگر پھر بھی ناک پر تھپکے بغیر نہ رہ سکیں۔ تھو تھو کر کے کہنے لگیں۔ اچھی بوا میں بھی تمہاری ناک ذرا چھولوں۔ تو دیکھ لو ان کے جیتے جیوں خوشیاں ہوئیں کبھی کوئی بجوگ پڑا۔ دلہنیں آئیں بھی اور گئیں بھی۔ خدا نے امی جمی ہی رکھی۔ زچہ خانے بھی سال میں تین تین چار چار ہوئے۔ نہ سوڑ بگڑی نہ کوئی بچہ چھیجا۔ ہم نے تو ان کے ہوتے کسی کی آنکھ دُکھتے بھی نہیں دیکھی۔

اصغری۔ (جماہی لیکر) اماں بیگم ہمیں تو نیند آرہی ہے۔ آنکھیں کڑوائی جاتی ہیں۔

ملکہ صغریٰ۔ بچی! منہ پر ہاتھ رکھ۔ ابھی ہوا لگ جائے تو دہانہ پھٹا کا پھٹا رہ جائے۔ کیوں بی زینب بیگم یہ لڑکی تو وہی ہے نا جس کو کوئی شتا ہم صاحب کے پچھواڑے ڈال گئی تھی۔ جبھی نکلے گی تو خوب مگر برا نہ مانو تو کہوں بدتمیز اٹھ رہی ہے۔

زینب بیگم۔ آپا آپ کو کیا خبر میں چنیٹیوں بھرا کباب ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے نہیں سنبھلتے یہ غریب کس گنتی میں ہے۔ یہ نیند کی بیاسو نے کو کہے تو کیا عجب۔ مجھ بوڑھی عورت سے نہیں بیٹھا جاتا۔ نیند آنکھوں میں گھل رہی ہے۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ خدا جانے کیونکر اپنے کو سنبھالے بیٹھی ہوں۔

فاطمہ صُغرا۔ اللہ خیر کرے۔ نہیں کیا ہو۔ خدانخواستہ کچھ طبیعت بدمزہ ہے یا کہیں خدائی رات منائی تھی۔

زینب بیگم۔ ہی کو تو خالہ جان کچھ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ کل قیصر بڑا جلد ہوا تھا۔ بیاہی بیٹی پندرہ برس بعد ابرار اوّل تو میں اسی کی دلوا دیتی کہ اپنے میکے میں وہ بالکل آپ سے فارغ ہو۔ ورنہ لگتے ہی ادھر مسہری لگ جاتی ہے تو آدھا دکھ۔ لیکن میاں شریف الحسن نہیں مانے۔ یہ چالیس دن بس حرج میں۔ نہ کھانے میں، میں ہی جاتی ہوں۔ یوں ہی گھنٹے جان سولی پر رہتی تھی۔ خیر خدا نے شرم رکھ لی۔ بی قیصر صحیح و سلامت بھری گود اٹھ بیٹھیں۔ ہ بی ش لی کوئی پانچ بجے ہوں گے قیصر کے سسرال جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مرزا آباد بخت کی صاحبزادی آ گئیں۔ قیصر سے ان کا بڑا میل جول ہے۔ میں تو مہمانداری کے کھکھیڑ میں لگ گئی وہاں وہ قیصر سے خوب گلے ملیں۔ بچے کو لپٹایا چمٹایا پیار کیا۔ بچہ اللہ رکھے ایسا پیارا پیارا اگل اگوتھا سا ہے کہ ان ہوئے کو پیار آ جائے۔ شامت کی مارکہ مرزا زادی کے ساتھ ان کی ایک سہیلی بھی تھی۔ وہ ایسی شوخ چلبلی کہ اللہ کی پناہ۔ کبھی بچے کو گدگدائے کبھی کندھے پر بٹھلائے کبھی سر سے اونچا اچھالے۔ منع کرنے والا کون تھا۔ وہ دونوں گویا برسوں کی بچھڑی ملی۔ ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ رمضان کی انتیس تاریخ تھی اس رقاصہ کو جو چاند دیکھنے کا خیال آیا بچے کو لئے کوٹھے پر چڑھ گئی۔ سوا مہینے کی جان جاڑوں کے دن۔ جھٹ پٹا وقت۔ بچے نے اوپر جاتے ہی ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔ کیا کہوں خالہ جان میں سچ سے میں تھی کہ سیدھی کھڑی ہوئی۔ کیسی نماز اور کہاں کا روزہ سینکڑوں ملا سیانے بلائے جس نے کہا یہی کہا کہ بچہ چھپیٹ میں آ گیا ہے کسی کی بری نہیں چلی۔ آخر میاں کو بلایا۔ انھوں نے جھاڑ افلیتے جلائے تو بچے نے آنکھیں کھولیں اور سب کی جان میں جان آئی ساری رات ست ہی ست میں گذری۔ صبح تڑکے ذرا سا دودھ بھی پیا اور اس کا چہرہ بھی بحال تھا۔ سوچ رہی تھی کہ جس طرح بنے دوپہر سے پہلے پہلے قیصر کو سسرال بھیج دوں۔ اتنے میں یہاں آنا ہو گیا۔

فاطمہ صُغرا۔ (دوسری بیگموں سے مخاطب ہو کر) اب اجازت لینی چاہیئے۔

نوشابہ خانم۔ سچ تو ہے ہم تو یہاں آ کر ایسے بیٹھ گئے جیسے اپنے گھروں میں۔

عالیہ بیگم۔ میں کسی خواص کو بلا کر اس سے عرض کرائی ہوں۔

• چنانچہ پہلے شہزادیاں رخصت ہوئیں اور جب ان کی بھیڑ کم ہوئی تو شہر کی بیگمات کے ٹھاٹ نے۔ پالکیاں لگنی شروع ہوئیں اور تھوڑی دیر میں حضرت زینت محل کا جلوت کدہ خلوت خانہ بن گیا۔

اشرف صبوحی دہلوی ——————

کوکن کی خارش

لذت آزار پیدا کرنے کیلئے شاعروں اور صوفیوں نے عشق و محبت کے مشغلے کو زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے۔ لیکن کیا ہر ایک کے قبضہ اختیار میں ہے کہ وہ بیمار عشق بن جائے؟ وحدت اللہ نیک نے عشق کی گولیوں کا اشتہار بھی دیا تھا لیکن اس کا نتیجہ بتانے پر وہ بھی رضامند نہ ہوئے کیونکہ اشتہاری ادویات دراصل مداری کے کرتب کی طرح ہیں۔ ادھر جسم نظر آیا اور ادھر حقیقت مجاز میں تبدیل ہو گئی بہرحال لذت آزار پیدا کرنے کے لئے دنیا میں عشق و محبت کے علاوہ دوسرے کئی ذرائع ممکن ہیں۔ جن میں سب سے آسان ترکیب کھٹمل زدہ پلنگ پر آرام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ میر تقی میر کے کلام میں جو درد اور سوز بہت پایا جاتا ہے۔ اس کھٹملوں ہی کی مرہون منت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

گرچہ بہتوں کو میں نے مل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے رات کو گھس گئیں پوریں — ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

تو شکاں ان کی گردوں ہی سے بھاگے — پڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹے

پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اگر آپ ان اشعار میں تھوڑا سا تصرف کر کے کھٹملوں کا لفظ نکال دیجئے اور ان کو ایک خاص لحن سے گنگنانا شروع کیجئے تو سامعین یہی خیال کریں گے کہ کوئی دل کا بیمار اپنی بھڑاس نکال رہا ہے۔ میں نے بھی کھٹملوں کے ساتھ راتیں گذاری ہیں لیکن شب بیداری میں نہیں بلکہ نیند خوابی میں۔ واقعہ یوں ہے کہ میرا خون میٹھا ہے اس لئے ان کی چھیڑ چھاڑ میں مجھے کوئی خاص لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں مجھ کو کوکن کی لذت آزار اب تک یاد ہے لیکن اس میں کھٹملوں کے بوسوں کے تاثرات شامل نہیں ہیں بلکہ یہ کچھ اور ہی لطف ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں کیونکہ اس کیلئے تجربہ شرط ہے۔ جس طرح ایک مست مئے گلفام ایک بدخشک سے حقارتاً کہتا ہے کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"۔ اسی طرح میں آپ سے عرض کرونگا کہ:۔

"آپ کوکن کبھی گئے ہی نہیں"

مغربی ساحل پر کوکن کا خطہ دراصل بہشت کا ایک ٹکڑا ہے لیکن جس طرح یہ حقیقت ہے کہ انسان اس خاکی پیرہن کیساتھ جنت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ حدود کوکن میں داخل ہو جانے کے بعد ایک پردیسی کو ایک نیا ہیولیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جلد میں ایک انقلاب واقع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی سطح کی جگہ ایک نئی سطح نمودار ہو جاتی ہے اور اس انقلاب کا عمل خارش کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ناظرین میں سے چند ہستیاں ایسی بھی ہونگی جو اس لذت آزار کا کافی تجربہ رکھتی ہونگی۔ لیکن کوکن کی خارش کے تاثرات بالکل انوکھے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس کے ظاہری اسباب پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے لیکن چونکہ ان کی نگاہ حقیقت بیں نہیں ہے اس لئے ان کی تحقیق قابل قبول نہیں کیونکہ باوجود ان تمام ترکیبوں کے جو حفظ ماتقدم کے طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ وہاں کی سرزمین پر خارش کا وجود پانی اور ہوا کی طرح عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے اور سمندر کا ساحل قریب ہی ہے۔ اس لئے یہ مرض کثرت سے ہوتا ہے لیکن کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ انہیں اسباب کی موجودگی میں بنگال، مدراس اور جاپان کے ساحلوں پر اس کی عام شکایت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "یونبل جیلی" کی جیو ہتیا کا اثر ہے۔ ہندوستان میں "اہنسا" کے اصول سے کسی جاندار کو اپنی غذا کا ایک جزو قرار دینا مہاپاپ خیال کیا جاتا ہے اور گوشت خور انسانوں کے معدوں کو جانوروں کے قبرستان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر سارے ملک میں "پنجرا پول" کا ایک نظام پھیلا ہوا ہے تاکہ جانور تندرست اور زندہ رہیں اور یہاں کے انسان اتنے مرتاض کہ ہمیشہ سرحدی پٹھانوں کے خیال سے لرزاں اور ترساں رہیں۔ بہرحال امراض کا یہ فلسفہ کہ "طاقتور انسانوں کو طاقتور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اور کمزوروں کو معمولی بیماریاں"

قابل غور ضرور ہے۔ اسی اصول پر کوکن میں بھی اس تحریک کیلئے کافی مواد موجود ہے کہ یہاں بونبل مچھلی کی رکھشا کیلئے شکار کرنا ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اور یہاں کے باشندوں کی غذا صرف اُبلے ہوئے چاول اور بھُنے ہوئے پاپڑ تک محدود کردی جاتے۔ اس طرح یقین ہے کہ خارش کے حملوں سے نجات ہوجائیگی۔ الیس محمد سالم ابریل

چونکہ اس مرض کو لباس کے ساتھ بھی گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ کوکن کے مزدوروں کا شتکاروں کا لباس اس قسم کا ہوتا ہے کہ جسمیں اعتدال پایا جاتا ہے۔ یعنی نہ تو سادھوؤں کی طرح جو دُنیا کے ساتھ، سوائے ایک لنگوٹی کے، لباس بھی ترک کردیتے ہیں۔ اور نہ اُن مسرف نوجوانوں کی طرح جو دھوتی کو شلوار اور لہنگا بنادیتے ہیں۔ ان کی کیفیت ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے۔ اسی لئے ہم ان کے اس مخصوص لباس کو نہ تو لمبی لنگوٹی کہہ سکتے ہیں اور نہ چھوٹی دھوتی۔ خصوصاً عورتوں کے مسئلہ میں تو اور بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ بہرحال لباس کا یہ اختصار حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔

ہندوستان کا مزدور اپنے سر پر بوجھ رکھ کر اپنے توازن کو قائم رکھنے کے لئے یا تو دونوں ہاتھوں سے مدد لیتا ہے یا اُن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے لیکن یہاں اس کا ایک ہاتھ وزن کو سنبھالنے میں مشغول رہتا ہے اور دوسرا ہاتھ کھجانے میں۔ اگر آپ اس کا ایک ہاتھ زبردستی جیب میں ڈال دیں تو وہ یقیناً چیخ مار کر گر جائیگا۔ خارش کا مرکز خصوصیت سے کمر کے اس حصے پر ہوتا ہے جہاں دھوتی کا بندھن ہوتا ہے اور یہ مقام ایسا نظر آتا ہے جیسے سوکھے تالاب کی تہ میں پپڑی جمی ہوئی رہتی۔

اب آپ خیال فرمایئے کہ لباس کے اس اختصار کے باوجود خارش کے حملے اتنے زبردست ہوتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں کی کیا کیفیت ہوگی جو اس گرم مرطوب آب و ہوا میں سرد منطقہ معتدلہ (انگلستان) اور گرم خشک ریگستان (عرب) کے لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ ان کی حالت یا تو خدا ہی جانتا ہے یا وہ خود۔ بہرحال "دھوتی کلچر" اور "لنگوٹی کلچر" کے مبلغین انھیں جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں پائجامہ اور پتلون کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ کیفیت اس سرزمین پر اتنی عام ہے کہ اب خارش جسم کا ایک عضو بن چکی ہے اور صدیوں کے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد مستقل حیثیت اختیار کرچکی ہے جسمیں مستثنیات کو کوئی دخل ہی نہیں رہے۔ یہاں پر وہ فرد جو خارش نہیں رکھتا یقیناً کسی خطرناک مرض میں گرفتار ہے۔ چنانچہ مجھ کو بھی ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد اپنی تندرستی کے متعلق شک ہوچلا تھا۔ لیکن چندروز کے قیام کے بعد میں بھی عام انسانوں کی سطح پر آگیا کیونکہ میرے جسم پر آہستہ آہستہ خارش کے آثار نمودار ہورہے تھے۔ یہانتک کہ چند دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ میرا تمام خون رگوں کے اندر دوڑنے کے بجائے جسم پر دوڑنے لگا اور دوڑتے دوڑتے تھک کر جم گیا۔ اب میرا تمام مجسمہ تازہ گوشت کی کٹی ہوئی بوٹی معلوم ہورہا تھا۔ اس کی توضیح اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ میرے دل نے سینہ کے اندر رہنا پسند نہ کیا بلکہ اس نے وسیع ہونا شروع کیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس شعر کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی اور میرا دل بحیرۂ عرب بننے سے باز رہا۔

دل میں آکر دیکھئے کیفیتِ سیلابِ غم ‏ بیٹھکر کشتی میں کچھ دم سیرِ دریا کیجئے

البتہ اتنا ہوا کہ میں خود دل بن گیا اور میرے دل نے جسم بنکر مجھے چاروں طرف سے ملفوف کرلیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں مجسم درد تھا اور مجسم لذت۔ گویا میں اب فلک کا محتاج نہ تھا۔ اب مجھے غالب کی طرح یہ شکایت نہ تھی کہ:۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ؞ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

ایسے حالات میں دوستوں نے میری غمخواری میں سعی فرمائیکی بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کا علاج خود ہی دریافت کرلیا۔ اس کا نسخہ مجھے غالب کے دیوان ہی سے دستیاب ہوا تھا۔ "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا" اور واقعی میں اب تمام معالجوں سے بے نیاز تھا۔ رات کا وقت، اکھڑا پلنگ، بڑھے ہوئے ناخن اور میں۔ کیا عاشقوں اور شاعروں کو ان تاثرات کے علاوہ کوئی چیز حاصل ہوسکتی ہے؟ پھر کیوں نہ میں بلاخوفِ تردید کہہ اٹھوں کہ عشق اور خارش دونوں مختلف صورتیں ہیں ایک ہی جذبے کی۔

سیّد ابوطاہرؔ

:((※)):

سچی کہانی

"جوانی کی شورانگیزیاں اللہ اللہ، جان دیدینا ایسا ہی معلوم ہوتاہے، جیسے ریل میں بیٹھ کر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک چلا جانا۔ جہاں کوئی ناکامی ہوئی اور مرنے کی سوجھی۔ خصوصاً ناکامیِ محبت کا علاج موت کے سوا نہیں۔ گولی مار کر۔ ریل کی پٹری پر لیٹ کر۔ دریا میں ڈوب کر۔ پھانسی لے کر۔ زہر کھا کر، غرض کسی نہ کسی طرح "نامُراد" زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتاہے، اسلئے کہ بقول مرزا اسداللہ خاں غالب ؎

تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں[1]

ہمیں بھی ناکامی ہوئی، ہم نے بھی جان دینے کی ٹھانی لیکن گھر میں نہ بندوق نہ تمنچہ، گولی ماری جائے تو کیوں کر۔ چھُری سے بھی کام لیا جا سکتا تھا لیکن گوسفندِ قربانی کے خاک و خون میں تڑپنے کا منظر بارہا آنکھوں نے دیکھا تھا' مُرغِ بسمل کا پھڑکنا بھی اکثر نظر سے گُذرا تھا۔ لہٰذا جسمانی اذیت کے خیال نے اپنے اوپر "خنجر آزمائی" سے باز رکھا۔ درحقیقت انسانی خون اور وہ بھی خود اپنا خون پانی کی طرح بہتے دیکھنا میرے لئے موت کی بھیانک صورت سے زیادہ روح فرسا تھا۔ رہا ریل کے نیچے لیٹ جانا تو یہ خود ایک طول عمل ہے۔ گھر سے میل ڈیڑھ میل چلو تو ریل کی پٹری ملے۔ پھر کوئی دیکھ لے تو سارا پروگرام غلط۔ یہی قباحت ڈوب مرنے میں ہے۔ کیونکہ نل کی بدولت بڑے بڑے شہروں سے کنوئیں تو اس طرح ناپید ہوگئے ہیں جس طرح آجکل کی تعلیمیافتہ لڑکیوں کے دل سے ماں بننے کی خواہش۔ رہا دریا تو وہ ہاتھ کے داؤں کہاں۔ پھانسی سے مجھے ہمیشہ سے نفرت رہی یہانتک کہ اس ہنگامی جنون کے عالم میں بھی پھانسی کا پھندا میری نظر میں نفرت انگیز ہی رہا۔ لہٰذا اب اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ "دردِ ناکامی کا" وہی علاج کیا جائے جو سوداگر کی بیٹی یعنی "زہرِ عشق" کی ہیروئن نے کیا تھا مگر وہی دشواری ہمیں بھی پیش آئی جو مرزا غالب کو پیش آئی تھی اور جس کا انہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں ذکر کیا ہے ؎

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اسلئے کہ جس طرح مرزا غالب کے زمانہ میں زہر پر لائسنس تھا (غالباً ہوگا) اسی طرح آج بھی ہے اور آج سے بارہ برس پہلے بھی تھا جب ہمیں مرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ مرنا بھی بہرحال ضروری تھا۔ سوچا اب کیا کریں۔ خیال آیا کہ آخر دُنیا میں ہر چیز کا بدل ہے۔ کیا ایسی اور کوئی چیز نہ ہوگی جو زہر کا کام دے اور بلا دقت دستیاب ہو جائے۔ آخر ایک بات سمجھ میں آگئی، خدا بخشے امی جان کو دادا کا ایک نہایت کامیاب مرہم نسخہ بتایا تھا وہ ہمیشہ بنایا کرتی تھیں اور ضرورتمندوں کو مُفت دیا کرتی تھیں[2]۔ ایکدفعہ وہ مرہم بہت دنوں تک رکھے رکھے خراب ہوگیا امی نے اُسے کوڑے پر پھینکدیا۔ ہمارے آنگن میں ایک بیری کا پیڑ تھا۔ ایک کوا اس پر بیٹھا تھا۔ اسکی جو شامت آئی تو تیر کی طرح لپکا اور گھی سمجھکر اس مرہم کی ایک چونچ بھرلی اور کھا گیا اور پھر پیڑ پر جا بیٹھا۔ چند منٹ گذرے ہونگے کہ دھڑ سے نیچے گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ اگرچہ کئی برس گذر چکے تھے لیکن یہ واقعہ مجھے یاد تھا اور اس مرہم کے اجزا بھی معلوم تھے یعنی خاص موم، تل کا تیل اور ہائیڈراجرائی ایمونیٹا۔ میں نے سوچا کہ لاؤ ہائیڈراجرائی ایمونیٹل سے سنکھیا کا کام لو۔ چنانچہ فوراً ایک پڑوس کے ڈاکٹر سے چار آنے کا ہائیڈراجرائی ایمونیٹا خرید۔ باریک

[1] دیوان غالب کا حمیدیہ ایڈیشن جس وقت شائع ہوا میں لاہور میں تھا۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ منگایا اور پڑھنا شروع کیا، رات کا وقت تھا، پڑھتے پڑھتے سوگیا۔ خواب میں دیکھا کہ دیوانِ غالب (حمیدیہ ایڈیشن) پڑھ رہا ہوں اور اس میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں جو آج تک کسی اور ایڈیشن میں نظر سے نہیں گذرے تھے ؎

آگ لگ جائے اگر گھر کو تو اندیشہ کیا — شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بُجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

صبح کو جب سو کر اُٹھا تو خواب مجھے یاد تھا اور اشعار بھی۔ فوراً دیوانِ غالب (حمیدیہ ایڈیشن) اُٹھا کر دیکھا مگر اس میں ان اشعار کا کہیں پتہ بھی نہیں وہی تین شعر زہر ملتا ہی نہیں الخ۔ درج تھے جو سب مروجہ ایڈیشنوں میں نہیں ملتے۔ حیرت تھی کہ خواب میں یہ دو شعر مجھے کیونکر یاد ہوگئے۔ وقتاً فوقتاً اکثر احباب کو سُنائے۔ مگر کسی نے اقرار نہ کیا کہ یہ اشعار کبھی کہیں نظر سے گذرے ہیں۔ (پریم پجاری)

[2] دادا کا یہ لاجواب مرہم جن صاحب کو درکار ہو ایڈیٹر ساقی کی معرفت مجھ سے بلا قیمت منگا سکتے ہیں۔ (پریم پجاری)

چیس کر پڑیا بنائی اور سرہانے رکھ لی۔ اسکے بعد چار خط لکھے۔ ایک اس "بانیٔ فتنہ" یعنی رشیدہ کے نام، ایک کوتوال شہر کے نام، ایک ابا کے نام جو اُن دنوں پردیس میں تھے۔ اور ایک امی جان کے نام۔ سب میں اپنے مرنے کی وجہ مختلف بیان کی تھی۔ وہ چاروں خط نہایت دلچسپ تھے اور ایک جنون زدہ دماغ کی اس کشمکش کی مکمل تصویر جو زندگی کے آخری لمحوں میں حسرت زیست اور آرزوئے مرگ سے پیدا ہوتی ہے۔

اب شام ہو چکی تھی۔ خطوں سے فارغ ہوکر ٹائم پیس میں ۲ بجے پر الارم لگایا اور اپنے ایک نہایت رازدار دوست "سید صاحب" سے ملنے گیا۔ یہی سید صاحب بعد کے واقعات سے ان تمام "ہنگاموں" کے ذمہ دار اور ایک کامیاب "حریف" ثابت ہوئے۔ میں نے انہیں سب حال بلاکم وکاست سُنادیا اُنھوں نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی "بظاہر" کوئی کوشش نہیں کی۔ گلے مل کر رو دئے اور کہا خدا انجام بخیر کرے ✦

رات کے دو بجے گھڑی نے الارم بجایا میں کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا گھبرا کر اُٹھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سینہ میں گوناگوں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا، مرگ و زیست کی تمناؤں میں آخری جنگ ہو رہی تھی۔ نامراد زندگی سے جی سیر ہو چکا تھا، پھر بھی جینے کی آرزو دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تھی جو بھیانک رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آفتاب کی ایک مضمحل کرن کی طرح کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی اور اسکی روشنی میں مستقبل کی بہت سی ناتمام تصویریں بڑی سرعت کیساتھ یکے بعد دیگرے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ یکایک ایسا معلوم ہُوا کہ دن نکل آیا۔ زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ میرا سرد مُردہ جسم بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ بہنیں، امی جان اور دوچار عزیز مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر آیا، نبض دیکھی اور کہا "افسوس خاتمہ ہو گیا"۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا۔ مرد سناٹے میں آگئے۔ امی جان غش کھا کر گریں۔ میری چھوٹی بہن انجم میرے گلے سے چمٹ گئی۔ مُنہ پر منہ رکھ دیا اور فریاد کرنے لگی "ہے ہے بھیا ہم سے خفا ہو گئے بولتے نہیں۔ میں نے آپکے لئے تکیہ کاڑھا ہے۔ دیکھئے کیسا خوبصورت ہے۔ انعام نہیں دو گے کیا؟ میں تو لے لونگی۔ ہائے بولتے نہیں۔ بھیا، ہائے بھیا۔ اپنی انجم سے نہیں بولتے کیا کروں۔ ہائے کیا کروں اللہ"

دفعتاً منظر بدلا۔ چاندنی کھلی ہُوئی ہے۔ آبادی سے دور "شہر خموشاں" کے ایک گوشے میں ایک نئی سفید قبر، چاند کی زرد زرد اُداس روشنی میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سفید ململ کی ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک نوجوان بیوہ تنہائی اور بیکسی کے عالم میں اپنے اُجڑ جانے والے سہاگ اور جوانی کا ماتم کر رہی ہے۔ اتنے میں ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دی۔ راستہ کے کنارے گاڑی ٹھہر گئی ہے، یہ کون؟ رشیدہ! تنہا۔ رات کیوقت۔ قبرستان میں۔ کیوں کس لئے۔ میرے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آئی اور قبر کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اسکے پاس کچھ پھول تھے۔ وہ اس نے قبر پر ڈال دیئے کئی منٹ خاموش بیٹھی رہی، پھر اُس نے لوح مزار کی طرف دیکھا اس پر لکھا تھا: "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ اسکی گردن جھک گئی پھر اُس نے سر اُٹھایا اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اسکی آنکھوں سے ڈھلک پڑے

ابھی ان جاگتے خوابوں کا سلسلہ جاری تھا کہ کلاک نے ادھا بجایا۔ میں چونکا۔ ارے ڈھائی بجگئے۔ دُنیا کی دلچسپیاں بار بار میرا دامن پکڑ کر کھینچتی تھیں۔ اور مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی تھیں لیکن ناکامی کی تلخیاں ہر بار میرے ارادہ کو استوار تر بنا دیتی تھیں۔ فرشتۂ مرگ کی بھیانک صورت اب مجھے بیوفا رشیدہ سے زیادہ مہربان نظر آتی تھی۔ گھر میں سب لوگ سوئے ہوئے تھے۔ میں آہستہ سے اُٹھا، دبے پاؤں آنگن میں گیا۔ صُراحی سے گلاس میں پانی اُنڈیلا۔ اور خاموشی کیساتھ اپنے بستر پر واپس آگیا۔ پھر ایک بار سب پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ مجھے اسوقت ایک چکر سا آرہا تھا، مجھے وہ الفاظ نہیں معلوم جو اس شخص کے جذبات کی ترجمانی کرسکیں۔ جسے چند لمحوں کے بعد موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانا ہو۔ پھر اپنی ذاتی کیفیت کیسے بیان کروں۔ میں نے لرزتے ہُوئے ہاتھوں سے تکیہ ہٹایا اور چادر کا کونا اُلٹا اور ہائیڈرا جرائی امونیا کی پُڑیا کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں ایک سناٹے میں آگیا۔ بالکل مبہُوت میرے حواس بالکل معطّل تھے۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ پھر لیٹ گیا اور کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو گئی۔ اس دوران میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جو عجیب و غریب، ممکن الوقوع اور مضحکہ خیز تدابیر میرے ذہن میں آئیں ان کا ذکر بیکار ہے اس لئے کہ عموماً ہر شخص کو زندگی میں ایکبار ضرور اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ہی بے سروپا افکار سے دوچار ہوتا ہے۔

دن بھر گذر گیا۔ اور میں کچھ فیصلہ نہ کرسکا کہ اب کیا کروں۔ ایک رات اور گذر گئی، اور میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا۔ دوسرے دن صبح کو سوکر اٹھا تو مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے میرے خیالات میں کوئی تغیّر ہو گیا ہے جس طرح عدالت عالیہ بعض اوقات ایک خونی مجرم کی جوانی پر ترس کھا کر اسکی سزائے موت کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیتی ہے اسی طرح میرے دل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ خودکشی کو جلا وطنی سے بدل دیا جائے۔ دراصل یہ عقل کی بات تھی مگر حیرت ہے کہ اُس وقت میرے دماغ میں کیسے آئی: "اخلاق جلالی" علم فلسفۂ اخلاق کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔ انہیں دنوں میں نے پڑھا تھا کہ "دور دراز کا

سفر اختیار کرنا "اس "مرض کا بہترین علاج ہے"۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر جاؤں تو کہاں جاؤں اور کس سلسلہ میں جاؤں۔ سیاحت، تجارت، ملازمت، آوارگی، آخر کیا کروں۔ ہر طرف نظر دوڑائی، آخر ایک دیرینہ دوست رشید کی طرف خیال گیا جنکے ساتھ میں نے مسلم ہوسٹل الہ آباد میں دو برس گذارے تھے۔ رشید بی، اے پاس کرنیکے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں سے آئی، سی، ایس ہوکر آئے اور اب دو برس سے بنگال میں کسی جگہ سب ڈویژن آفیسر تھے، ایک مرتبہ یہ بھی سنا تھا کہ کلکتہ میں ہیں۔ قبل اسکے کہ وہ ہندوستان میں واپس آئیں میری انکی خط و کتابت بند ہوگئی تھی۔ لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، کم از کم میرا یہی خیال تھا اور یہ خیال چھوڑے جا بھی نہ سکتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں رشید اور میں دو برس تک ایک کمرے میں رہے تھے۔ بارہا ایک پلنگ پر سوئے تھے، ایک گلاس میں پانی پیا تھا، ایک پلیٹ میں کھانا کھایا تھا۔ ایک دوسرے کے کپڑے پہنے تھے۔ ایکدوسرے کی کتابوں سے کام لیا تھا ایکدوسرے کا روپیہ خرچ کیا تھا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی "چوری" "نیز" "سینہ زوری" میں حصہ لیا تھا۔ غرض ہر حال میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔

رشید کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ کچھ گرم کچھ ٹھنڈے کپڑے اس میں رکھے۔ ہولڈال میں بستر باندھا اپنے کمرے میں چپکے چپکے انہیں تیاریوں میں مصروف تھا کہ اچانک امی جان آگئیں اور مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہوکر پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟" میں نے کہا "کہیں نہیں۔ ذرا لکھنؤ کا ارادہ ہے۔ پرسوں آجاؤنگا انشاءاللہ"۔ جس وقت یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کا اضطراب مجھ پر طاری تھا، قدم ڈگمگا رہے تھے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کانپور سے یہ میرا آخری سفر ہے۔ وطن واپس نہ آنے کا میں تہیہ کرچکا تھا۔ امی جان چلی گئیں۔ میں نے پھر اپنی چیزیں درست کرنی شروع کیں۔ میز کی دراز میں سے بٹوا نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں کُل پانچ روپے سوا دو آنے۔ دل دھک سے ہوگیا۔ چکر سا آنے لگا میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ دنیا کا سفر چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو عاقبت کے سفر سے کہیں زیادہ مشکل ہے، وہاں چار آنے کی سنکھیا میں انسان آخری منزل پر پہونچ جاتا ہے یہاں کلکتہ تک جانے کے لئے کم سے کم دس روپے چاہئیں۔ اسی سوچ میں سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اب کیا کروں اتنے میں دروازے پر کسی نے آواز دی۔ یہ ہمارے منشی جی تھے۔ دکانوں کا کرایہ وصول کرکے لائے تھے، اسّی روپے نقد انہوں نے میرے ہاتھ میں دئے۔ اسّی روپے یوں بھی اسّی ہی روپے ہوتے ہیں اور اسوقت تو مجھے اسّی اشرفیوں سے زیادہ معلوم ہوئے۔ رات کی گاڑی سے میں کلکتہ روانہ ہوگیا۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، بجز اسکے کہ ایک رفیق سفر کا لوٹا گاڑی میں سے فاختہ کی طرح اڑ گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ گاڑی کا پٹ کھولے دروازے کے کنارے پر بیٹھے منہ دھو رہے تھے اُٹھے تو لوٹا وہیں چھوڑ دیا میں برابر کی سیٹ پر لیٹا تھا۔ ریل پوری رفتار سے جا رہی تھی دروازہ کھلا دیکھ کر میں نے ہوا جو بھیڑا تو لوٹا آتش بازی کے انار کی طرح سرسراتا ہوا اڑا چلا گیا۔

دوسرے دن شام کو میں کلکتہ پہونچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے دن رشید کی تلاش میں نکلا معلوم ہوا کہ وہ چھ ہفتے کی چھٹی سے کرشیانگ گئے ہوئے ہیں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مگر قدرت کو یہی منظور تھا۔ اسلئے کہ اگر رشید اسوقت کلکتہ میں موجود ہوتے تو غالباً میری زندگی میں وہ خوفناک انقلاب کبھی رونما نہ ہوتا جس نے مجھے "اخلاقی دنیا" کا بدترین مجرم بنا دیا۔ میں نے گناہ کئے کر رہا ہوں اور کرتا رہونگا، انکی خوفناک سزائیں پائیں، پا رہا ہوں اور پاتا رہونگا۔ مگر اس سے میری ہمتیں پست اور میرے حوصلے شکست نہیں ہوئے ہیں جو کچھ کرتا ہوں جان بوجھکر کرتا ہوں اور اپنے کسی عمل پر کبھی متاسف نہیں ہوتا تکرار گناہ سے مرتے دم تک ہی طرح قدرت سے انتقام لیتا رہونگا۔ رشید نے خدا کرے قدرت نے میری روح پر جو عذاب مسلط کر دیا اُسے آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا، معمولی زخم ہو تو بھر جائے، ناسور کب بھرے، سینہ کے اندر ہر وقت سلگتی رہنے والی آگ اس وقت ذرا بھڑک اُٹھی ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اُسے توجہ سے سنئے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حالات اور خیالات سے واقف ہو جانیکے بعد آپکو بھی مجھ سے نفرت ہو جائیگی آپ مجھے سوسائٹی کے لئے ایک موذی مرض اور ایک مہلک بالقوہ کرنے لگیں گے۔ مگر مجھے اسکی پروا نہیں، ہزاروں بُرا کہنے والوں اور بُرا سمجھنے والوں میں اگر ایک آپ کی ذات بھی شامل ہو جائے تو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔

ہمارے ہوٹل کا "تختہ کار" منیجر بلا کا عیار تھا۔ میں یقین کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیطان کو اسکی شاگردی کا موقع مل جاتا تو وہ عمر بھر اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتا، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنیکے ہزاروں گُر اُسے یاد تھے۔ ریس (گھوڑ دوڑ) کا اُسے جنون تھا۔ مگر اس دیوانگی میں بھی اسکے ہوش کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ دوسروں کے روپیہ سے کھیلتا۔ ہار ہو تو روپیہ لگانے والے کی اور جیت ہو تو یہ بھی برابر کے شریک۔ اس بدبخت نے چند ہی روز میں مجھے اپنے رنگ پر لگا لیا میرے پاس اوّل تو روپیہ تھا ہی کتنا، خیر جس قدر بھی تھا اس میں سے کچھ تو "ریس بازی" کی نظر ہوا۔ کچھ ہوٹل کے "بل" میں چلا گیا۔ اب میں بالکل فقیر تھا۔ قرض پر زندگی کا مدار تھا جسکی مقدار ہر روز خوفناک طریقہ پر بڑھتی جا رہی تھی۔ منیجر کی "پُراسرار" عنایتوں کے باعث میری معمولی آسائشوں میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی میں اُسی کمرے میں مقیم تھا جس میں پہلے دن آکر ٹھیرا تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی اچھا کھانا ملتا تھا۔ حسب الفقد قیمت ادا کرنے والوں کو اور بھی جو چھوٹی موٹی ضروریات ہوتی تھیں اُن سب کا سرانجام منیجر کے ذمہ تھا۔ اُس نے

کبھی ایک لمحہ کیلئے مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا قرضدار ہوں۔ میں اپنی سادہ دلی سے اس غیر معمولی مہربانی کو اسکی شرافت اور نیکدلی پر محمول کرتا تھا مگر درحقیقت وہ محض "شیطنیت" پر مبنی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر اس قدر حاوی ہوگیا کہ اسکے ہاتھوں میں میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ اسکے حکم سے سرتابی کی مجھ میں مجال نہ تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کیلئے مسمریزم کے ایک معمول کی طرح استعمال کرے۔

اپنے گھر میں بچپن سے اپنے حسن و رعنائی کا تذکرہ سُنتا آیا تھا جب ہوش سنبھالا تو آئینہ نے اس روایت کی تصدیق کی اور جوانی آئی تو صنف نازک کے روز افزوں التفات اور غیر معمولی میلان نے اُس پر مہر توثیق ثبت کردی۔ مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ضرور تھا اور اس پر تھوڑا سا ناز بھی۔ مگر اپنے حسن و شباب کی تباہ کُن قوتوں کا صحیح اندازہ ہرگز نہ تھا۔ میں ایک جوہر تھا تراشیدہ، تابشوں سے معمور لیکن جلا کا محتاج۔ حسن و صورت کیساتھ ساتھ قدرت نے سحر گفتاری بھی عطا کیا تھا اور وہ تمام چیزیں جو شباب کی متوالی عورتوں کو دیوانہ بنا دینے کیلئے کافی ہیں۔ مگر ابتک ان قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اُنکے نشوونما کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت درکار تھی جو خدا نہ کرے کہ کسی کو نصیب ہو۔ "پختہ کار" منیجر نے جلد میری ان صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اُنسے کام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلے مجھے رس کا چسکا لگایا۔ پھر قرض دیکر ممنون احسان بنایا۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ میری خواہش، میرا ارادہ، میرا اختیار اسکی خواہش، اُسکے ارادے اور اسکے اختیار کے تابع اور مطیع ہوگئے۔ اس نے مجھے سکھایا کہ جھوٹ موٹ عورتوں سے عشق کس طرح کرنا چاہیئے، اُنہیں فریب دینے اور اپنی محبت میں مبتلا کرنیکے کیا طریقے ہیں۔ اُنکے بٹوے کس طرح خالی کرلئے جاسکتے ہیں۔

مثال بہت رکیک ہے مگر واقعہ کے عین مطابق جس طرح ایک نائکہ اپنی نوخیز نوچیوں کو "تماشبینوں" کے دل چھین لینے کے طریقے سکھاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح منیجر نے میری تربیت کی اور اسکے بعد میرے حُسن و شباب کو فروخت کرنا شروع کردیا۔ کلکتہ میں جس طرح عشرت پسند مرد خوبصورت طوائفوں اور دوسری پیشہ ور یا غیر پیشہ ور عورتوں پر اپنی دولت برباد کرتے ہیں اسی طرح وہاں عیش و عشرت کے گہواروں میں پلنے والی، مغربی آزادی کی فضا میں سانس لینے والی ایسی بہت سی "خوش مذاق" عورتیں بھی ہیں جو اپنے تنوع پسند ذوق کی تسکین کے لئے مردانہ حُسن و شباب کو بھاری بھاری قیمتیں دیکر خریدتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں یہ ضرور ہے کہ نسوانی حُسن کلکتہ میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے اور بہت اچھی قیمت پاتا ہے مگر وہاں کے "مہذب" و "شریف طبقہ نسواں نیز دولتمند طوائفوں میں مردانہ حُسن و شباب کے بھی کچھ گاہک نکل ہی آتے ہیں۔ رئیس کے سلسلہ میں منیجر کی بہت سے اونچے اونچے گھرانوں میں رسائی تھی اس نے ہر جگہ میری غیبت میں کچھ اس طرح میری تعریف کی کہ لوگ مجھ سے ملنے کے مشتاق ہوگئے۔ رفتہ رفتہ میرا حلقہ احباب جس میں بیشتر عورتیں تھیں کافی وسیع ہوگیا۔ کہیں بازار کے سودے کی طرح مجھے خرید لیا گیا۔ کہیں "نشست و برخاست" نے "بے تکلفی" کی صورت اختیار کی۔ بے تکلفی دوستی بنی۔ دوستی عشق و محبت میں تبدیل ہوگئی۔ نتیجہ بہرحال واحد تھا۔

منیجر کے حکم کے مطابق مجھے یہ سب روپ بھرنے پڑتے تھے منتیں کیں۔ آہیں بھریں، آنسو بہائے، قدموں پر سر رکھا، کیا کیا نہیں کیا۔ مگر میرے جذبات کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا۔ محبت کا بہروپ بھرتے بھرتے اور عشق عاشقی کی نقالی کرتے کرتے غالباً محبت کا احساس ہی میرے دل سے فنا ہوگیا تھا۔ میری حیثیت اُس بے جان ساز کی سی تھی جس میں کبھی ایسے غم انگیز نغمے نکلتے ہیں کہ سُننے والوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے کبھی ایسا آہنگ مسرت بلند ہوتا ہے کہ سامعین جوش نشاط سے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیت تاثر فقط سننے والے ہی تک محدود رہتی ہے خود ساز متاثر نہیں ہوتا نہ اُسے غم کا احساس ہوتا ہے۔ نہ خوشی کا۔ دوسرے رُخ سے دیکھئے تو میں گویا ایک مجسمۂ سنگین تھا جسکی پرستش کی جاتی ہے۔ پرستار اپنے جوش عقیدت میں کبھی ہاتھ جوڑ کر اُسکے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے، کبھی اُس کے قدموں پر سر رکھدیتا ہے کبھی فرط رقت سے آبدیدہ ہوجاتا ہے۔ کبھی گڑگڑا کے اس سے اپنی مُرادیں مانگتا ہے۔ مگر پتھر کی بے جان مُورت میں اُسکے جذبات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کہاں؟ وہ سمجھتا ہے کہ میرا بُت سب کچھ سُنتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ اور جو کچھ میں اس سے مانگتا ہوں، مجھے دیگا۔ مگر اس آرزو کا برآنا معلوم جسن اتفاق سے اگر کوئی مُراد پُوری ہوجائے تو وہ اسے اپنے "بُت" کی مہربانی پر محمول کرتا ہے۔ وائے نادانی! جس طرح فرط عقیدت میں انسان کی آنکھوں پر پردے پڑجاتے ہیں۔ اسی طرح جوش محبت بھی اُسے اندھا کردیتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہیں وہ چاندنی راتیں جب حسین آنکھوں نے میرے لئے آغوش میں آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔ آہ، مجھے خوب یاد ہیں۔ وہ رنگین خلوتیں جب حُسن کی ناز پروردہ جوانیاں محبت کی بھیک مانگنے کے لئے میرے قدموں پر سرنگوں ہوئی ہیں۔ آہ سب کچھ یاد ہے۔ مگر کیا یہ نیاز حُسن میرے قلب کو متأثر کرسکا؟ نہیں کبھی نہیں۔ ذرہ برابر نہیں۔ میرا دل ایک سنگپارہ سے زیادہ بے احساس ہوچکا تھا۔ ہائے میں نے کیسے کیسے معصوم دلوں کو محبت کے فریب دیئے۔ کس کس طرح اپنا دیوانہ بنایا اور جب یقین ہوگیا کہ حریف شکست کھا گیا۔ یعنی میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا تو پھر کیسا کیسا اُسے تڑپایا ہے۔ کس کس بیدردی سے اُسے ذبح کیا ہے، اسلئے ہرگز نہیں کہ کسی کو مبتلائے اذیت دیکھکر مجھے مسرت ہوتی تھی۔ نہیں میری رُوح ہنوز اس درجہ مسخ نہیں ہوئی تھی، میرا مقصد فقط اپنے حسن و شباب کی قیمت وصول کرنا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ جس قدر بھی وصول ہوسکے اور جس جس تدبیر سے وصول ہوسکے، منت سے یا ستانے سے۔ مجھے بہرحال اپنے

کام سے کام تھا۔

بعض اوقات جب کچھ اور ملنے کا امکان نہ ہُوا تو میں نے قیمتی ساڑیاں تک لے لینے میں دریغ نہیں کیا۔ غرض جھوٹی محبت کی مجھے ایسی ایسی بھاری قیمتیں دی گئیں۔ میرے فریب کی قربانگاہ پر ایسی ایسی گرانبہا قربانیاں پیش کی گئیں کہ اُنکی مثال شاید ہی مل سکے۔ مگر یہ سب کچھ منیجر کا "حق" تھا۔ قیمتی لباس، عمدہ کھانا، سجا ہُوا کمرہ، اور موٹر کی سیر، بس یہ میرا حصہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی ریس کھیلنے کے لئے دس بیس روپے بھی ملجاتے۔ یہ بدبخت منیجر شیطان کی طرح میری رُوح پر مسلط ہو گیا تھا۔ میں اُسکے اشاروں پر چلتا تھا، خدا جانے اُس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں کسی بات میں اُسکی مخالفت کر ہی نہ سکتا تھا۔ پہلے پہلے مجھے اس کام سے سخت نفرت ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ نفرت محض کراہت بنکر رہ گئی۔ کچھ مدت کے بعد یہ احساس بھی فنا ہو گیا اور اس قسم کا ہر عمل ایک مشین کی طرح مجھ سے صادر ہوتا تھا۔ آہ قدرت اگر شیدہ مجھے دغابازی پر آمادہ نہ کر دیتی تو کیا میری یہی حالت ہوتی؟ جسوقت یہ خیال آتا ہے تو میں غم و غصہ سے دیوانہ ہو جاتا ہوں اور جوشِ غضب میں اپنے اس عہد کی تجدید کر لیتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے گناہ کر کے قدرت سے اس بدسلوکی کا انتقام لونگا جس نے میری روح اور میرے جسم کی تمام راحتوں کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔ کہاں تک کہے جاوں۔ یہ مجذوب کی بڑ کہیں ختم ہونیوالی ہے۔

ہاں تو جوبات میں کہنے والا تھا وہ رہ گئی۔ جذبات کے ہیجان میں سب کچھ بھول گیا۔ ان دنوں میری خریدار ایک ایرانی "خانم" تھیں اُن کا سِن چالیس سال سے کم نہ تھا رخساروں پر غازہ کی سُرخی کے سوا جسے وہ کثرت سے استعمال کرتی تھیں اب جوانی کی اور کوئی نشانی اُن میں باقی نہ تھی۔ مگر بوالہوسی کے لئے عمر کی قید نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ ؎

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

جوش سے مُراد غالبًا فرطِ ہوس ہے۔ یہی حال اُن "خانم" کا تھا۔ مگر اُن کی ٹھنڈی گرمیاں جلد ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئیں، اسلئے میں نے اب وہاں نہ جانیکا تہیہ کر لیا تھا۔ منیجر میری اس "حماقت" سے سخت ناراض تھا، بہرحال میں نے اس سے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر انشاءاللہ اس سے زیادہ موٹا شکار پھانس کر دکھا دونگا۔ اسی فکر میں کئی دن سے سرگردان پھر رہا تھا، مگر ہنوز کامیابی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں ایک دن صبح کے وقت میں ہوٹل سے نکلا۔ کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا میں اپنے افکار میں اُلجھا ہُوا گرد و پیش سے بالکل بے خبر، سڑک پر خاموش چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر آتی ہُوئی دکھائی دی۔ میں بے خیالی میں اپنے داہنے ہاتھ کو ہٹ گیا، چشم زدن میں موٹر بالکل سر پر آ پہونچی، اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہُوا اور فی الفور میں نے پُوری قوت سے بائیں جانب کو جست کی۔ موٹر نکل گئی۔ میں بچ گیا۔ بس یہیں تک مجھے یاد ہے، اسکے بعد جو کچھ ہُوا اس کا حال دوسروں سے سُنا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی اور ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سارا بدن زخموں سے چُور، کپڑے خاک آلودہ خون میں تر اور، سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے بُرا حال تھا۔ میں نے ایک آہ کی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

کسی نے مجھ سے پُوچھا "کیا حال ہے"۔ یہ آواز نہ تھی، موسیقی کی ایک موج تھی جس سے میرے قلب میں ایک کیفیتِ اہتزاز سی پیدا ہو گئی، میں نے فوراً آنکھیں کھولدیں۔ ایک جوان خاتون میرے سرہانے کھڑی تھی؛ فرنگنوں کا سا گورا بھبوکا رنگ، سُنہری بال، مگر نقوش ہندوستانی، کالی ساڑی میں گورا مکھڑا ایسا پیارا معلوم ہوتا تھا جیسے آدھی رات کو چودھویں رات کا چاند۔ ساڑی پر سفید ستارے ٹکے ہوئے تھے تھوڑی سی دیر کے لئے میں اپنی تکلیف کو بھول گیا اور میں نے اسکے چہرہ پر نظر جما دی، وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے پھر اپنے دل میں ایک سنسنی سی محسوس کی مُسکرا کر میں نے کہا "اچھا ہوں"۔ میرے اس جواب سے وہ پھول کی طرح شگفتہ ہو گئی۔ گلابی ہونٹوں پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی، اسکے بعد ایک بڑے کمرے میں جہاں اور بھی کئی مریض تھے مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ نرس سے میں نے پُوچھا "یہ کالی ساڑی والی عورت کون تھی؟" اُس نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کی قاتل"۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ مجھے حیران دیکھکر نرس نے کہا "جسوقت آپ نے سامنے سے آنیوالی موٹر سے بچنے کے لئے بائیں جانب کو جست کی، پیچھے سے ایک اور موٹر آ رہی تھی۔ یکایک آپ اُسکے سامنے آ گئے۔ ٹکر ہوئی آپ ٹکرا کر گرے اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً ہی آپ کو اُسی موٹر میں ڈال کر یہاں لایا گیا۔ یہ اُس عورت کا بیان ہے۔ اب خدا جانے اسمیں کتنا سچ ہے، اور کتنا جھوٹ"۔

"مگر اس عورت کا اس حادثہ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ موٹر چلا رہی تھی اور آپ کو کچل دیا"۔ نرس نے ایک شوخ مسکراہٹ کیساتھ جواب دیا۔

"اچھا تو وہ خود ہی مجھے موٹر میں ڈال کر یہاں لائی ہے"۔

"جی ہاں وہ خود۔ بڑی رحمدل ہے بے چاری"۔

ہسپتال میں کوئی تین ہفتے مجھ پر سخت تکلیف کے گذرے۔ شدت کا بخار آیا۔ مگر جلد ہی میری حالت درست ہو گئی۔ سر کا زخم بھی جو بظاہر اندیشہ ناک تھا رفتہ رفتہ اچھا ہو رہا تھا۔ میری جسمانی اذیت منیجر کے لئے بظاہر صد درجہ اندوہناک تھی وہ ہر وقت میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا اور ہر طرح تسلی دیتا تھا۔ مگر درحقیقت وہ اپنے دل میں اس حادثہ سے بیحد مسرور تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا "بھیا! خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ نہ جانے اس میں اسکی کیا مصلحت تھی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس حادثہ اور مصیبت میں بھی ہماری کوئی بھلائی اُسکے مدِ نظر ہو اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ تکلیف کے بعد راحت لازمی ہے، دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے"۔

نرس کے بقول میری "قاتل" یعنی سیاہ ساڑی والی خاتون اس دوران میں کئی بار مجھے دیکھنے ہسپتال آئی۔ وہ اس حادثہ سے حد درجہ متاثر معلوم ہوتی تھی۔ منیجر نے مجھے بتلایا کہ وہ ایک لکھ پتی کی بیوہ اور ایک بہت بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی۔ منیجر کے اور میرے درمیان اب اکثر اُسکے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ہم نے اپنی مصلحتوں اور اسکی دولت کی مناسبت سے اس کا نام "لکشمی" رکھ لیا تھا۔ منیجر کو یقین تھا اگر میں نے اُسکے مشورہ پر عمل کیا تو ایک نہایت معقول رقم "لکشمی" سے وصول ہو جائیگی۔

کلکتہ کے دورانِ قیام میں کتنی ہی کافر جوانیوں سے میں کھیل چکا تھا، میرے نزدیک اُنکی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔ حُسن و شباب کی ساحرانہ قوتیں اب مجھے متاثر نہ کر سکتی تھیں، رشیدہ کی بیوفائی کے بعد محبت کو میں حماقت و دیوانگی کا مجموعہ اور فطرتِ انسانی کی بدترین کمزوری سمجھنے لگا تھا۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ مجھے فلاں سے محبت ہے تو میرے نزدیک اس کے معنی ہوتے کہ یا تو شخص خود کسی کو فریب دے رہا ہے یا کسی کا فریب کھا رہا ہے۔ محبت کرنے کی صلاحیت مجھ میں اتنی بھی باقی نہ رہی تھی جتنی ایک اندھے میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں امتیاز کرنے کی ہوتی ہے۔ میرے لئے صرف وہی عورت دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی جو میری گرمیٔ آغوش بھاری قیمت دیکر خرید سکتی تھی۔ مگر دُنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ صدیوں سرد و خاموش پڑے رہنے کے بعد بعض پہاڑ یکایک پھٹ جاتے ہیں اور شعلہ فشانی شروع کر دیتے ہیں، آگ کا ایک دریا اُنکے دہانے سے اُبلتا ہے اور جدھر رُخ کرتا ہے خشک و تر سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ ٹھیک یہی میری حالت ہوئی۔ میرا مُردہ اور بے احساس دل جو مدتوں سے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح سرد پڑا تھا اور محبت کی گرمی سے یکسر محروم ہو چکا تھا اب پھر ایکبار اس میں حرارتِ زندگی کی ایک موج پیدا ہوئی پھر اُس نے دردِ محبت کا احساس کیا۔ پھر اس میں نشتر کی ایک نوک سی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو دل کے گوشہ گوشہ میں انگڑائیاں لینے لگی اور اس انقلاب کا باعث وہی فتنہ گر تھی جس نے مجھے چند دن کیلئے زندگی سے دُور اور موت سے بہت قریب کر دیا تھا۔

پہلی بار جب میں نے ہسپتال میں اُسکی آواز سُنی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری روح کے بربط کا ہر تار اس صدائے نغمہ سے گونج اٹھا۔ پھر جب پہلی مرتبہ میں نے اُسکی صورت دیکھی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بہت سے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے جیسے میں سوتے سوتے جاگ اٹھا، میرا دل پتھر تھا مگر اس پتھر پر ایک نقش بن گیا گہرا نقش، آسانی سے نہ مٹنے والا۔ پہلے اس نقش کی حیثیت ایک "خاکہ" سے زیادہ نہ تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک رنگین تصویر بن گیا اور ہر وقت پیشِ نظر رہنے لگا، منیجر صاحب سے میں نے اس کو چھپایا۔ میں اس سے ڈرتا تھا۔ وہ لکشمی سے ایک معقول رقم "وصول کرنے" کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ بظاہر میں اسکی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا مگر میرا دل ہرگز اس "کمینہ پن" میں شریک ہونے کیلئے تیار نہ تھا۔

ایک دن جب کہ میں ہسپتال میں تنہا بیٹھا ہوا تھا لکشمی آئی اس نے کہا "شاہد صاحب! آج مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں۔ ایک التجا آپ کے پاس لیکر آئی ہوں اور مجھے آپکے اخلاق و شرافت سے توقع ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کرینگے۔ شاید آپ کو یقین نہ ہو مگر میں خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ اس حادثہ سے آپ کو جو کچھ تکلیف پہونچی اس کا مجھے بیحد افسوس اور صدمہ ہے۔ مگر ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ میں بالکل بے قصور ہوں میں نے موٹر کو روکنے اور بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر بدقسمتی سے آپ اتنے قریب اور اس طرح سامنے آگئے تھے کہ ٹکر ہوئے بغیر نہ رہی آپ کے چوٹ لگی اور بہت لگی اور اب اتنے دنوں سے آپ ہسپتال میں تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ مجھے آپکے نقصان کا اچھی طرح احساس ہے مگر میں پھر وہی عرض کرونگی کہ خطا میری نہیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ حادثات کو کوئی روک نہیں سکتا۔ بہرحال میں اسکے لئے بخوشی تیار ہوں کہ جس طرح آپ پسند کریں آپ کے نقصان کی تلافی کر دوں۔ آپکے منیجر صاحب کئی بار دیوانی و فوجداری میں مجھ پر دعوٰے

کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ پولیس نے الگ مقدمہ چلایا ہے۔ اور یہ بھی منیجر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نہ صرف پولس کو میری آزار رسانی پر آمادہ کیا ہے۔ بلکہ کچھ دے دلا کر دو تین جھوٹے گواہ بھی تیار کر لئے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حادثہ کی ذمہ دار میں ہوں Wrung side. Negligence. Rash driving. کونسا جرم ہے جس کا ارتکاب میں نے نہیں کیا۔ خیر پولس اور منیجر صاحب جو کچھ بھی کہیں مگر مجھے کم سے کم آپ کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ ایک بے قصور کو خطا دار نہ ٹھہرائیں گے۔ اور کل مجسٹریٹ کے سامنے وہی بات کہیں گے جو حق ہے۔ یہ ہرگز خیال نہ کیجئے میں الزام سے بری ثابت ہونیکے بعد اپنا وعدہ پورا نہ کروں گی۔ نہیں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُسکے لئے تیار ہو کر آئی ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں اسی وقت حاضر کرسکتی ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی عرض کردوں۔ آپ باور کیجئے کہ میں آپکے منیجر صاحب کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہوکر ہرگز یہ درخواست لیکر آپ کے پاس نہیں آئی ہوں۔ بلکہ مجھے آپکی تکلیف اور آپکے نقصان کا کامل احساس ہے اور اس کی تلافی جس طرح بھی ممکن ہو میرے نزدیک لازمی ہے۔ بالفرض میری غلطی ثابت بھی ہوجائے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ عدالت مجھ پر کچھ جرمانہ کردے مگر اس سے آپ کو کیا ملے گا آپ خود جو جی چاہے مجھ پر جرمانہ کردیجئے۔ میں بخوشی اُسے ادا کردونگی۔"

لکشمی جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھی میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لکشمی بے قصور ہے۔ خطا درحقیقت میری تھی مگر میں منیجر سے وعدہ کرچکا تھا کہ مجسٹریٹ کے روبرو لکشمی کو قصوروار ثابت کردونگا۔ ایک طرف منیجر کی شیطانی قوت میری روح پر پوری طرح مسلط تھی۔ دوسری طرف شرافت کا احساس جو مدت ہوئی مٹ چکا تھا۔ خدا جانے کس طرح پھر ایکبار میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہوگیا تھا اُسکے ساتھ ساتھ محبت کا وہ جذبہ بھی اپنا عمل کر رہا تھا جسے میں نے سب سے چھپا کر اپنے بے احساس دل کے ایک گوشہ میں جگہ دی تھی۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا اور تمام مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ "قصوروار کون ہے اس کا صحیح علم کم ازکم مجھے نہیں۔ رہ گیا تلافی کا سوال تو اسکے متعلق منیجر صاحب سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" لکشمی مایوس ہوکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں خود اپنے نامہربان جواب سے شرمندہ ہوگیا۔ دوسرے دن میں، لکشمی، منیجر، پولس کا داروغہ، سپاہی، جھوٹے گواہ، سب مجسٹریٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے جو بیان دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "غلطی سراسر میری ہے۔ لکشمی ہرگز حادثہ کی ذمہ دار نہیں۔" صرف میرے بیان نے مقدمہ کا خاتمہ کردیا۔ پولس کی شرمندگی، منیجر کی برہمی، لکشمی کی حیرت اور میری خوشی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس واقعہ نے آن واحد میں لکشمی کو مجھ سے اور مجھے لکشمی سے بہت قریب کردیا۔

دوسرے دن لکشمی نے مجھے اپنے یہاں چاء پر بلایا۔ نہ جانے آج کتنی مدت کے بعد مجھے حقیقی مسرت کے چند لمحے نصیب ہوئے تھے۔ لکشمی میرے سامنے بیٹھی تھی خدا جانے کیوں ہم دونوں خاموش تھے۔ میرا دل کسی قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جو میرے جذبات کی غمازی کرسکے مگر آنکھیں زبان کی قائم مقام بن کر دل کی ترجمانی کا فرض بخوبی ادا کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس کیفیت سے لکشمی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ مگر برابر اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ دل کی چوری کھلنے نہ پائے۔ آخر میں نے کہا "لکشمی دیوی! آپنے میرا قصور معاف کردیا؟" لکشمی نے حیران ہوکر پوچھا "آپ کا قصور؟ آپ نے کونسا قصور کیا ہے؟" میں نے کہا "میں سخت شرمندہ ہوں کہ پرسوں ہسپتال میں میں نے آپ کو مایوس کن جواب دیا اور اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ پردے پردے میں آپ کو قصوروار ٹھہرایا۔"

لکشمی نے کہا "شاہد صاحب! گئی گذری باتوں کا اب ذکر نہ کیجئے۔ مجھ پر آپنے جو احسان کیا ہے اگرچہ وہ آپ جیسے ایک شریف انسان کے ظرف کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر میری توقعات سے یقیناً کہیں بڑھکر ہے۔ اب آپ سے ایک التجا ہے۔ کیا آپ اُسے قبول کرینگے" میں نے کہا "بسر و چشم"۔ لکشمی یہ سن کر اُٹھی۔ برابر والے کمرے میں جاکر میز کی دراز میں سے کوئی چیز نکالی اور واپس آکر ایک لفافہ بند میرے سامنے رکھدیا اور کہا "یہ آپکی امانت ہے"۔ میں کچھ نہ سمجھا، لفافہ اُٹھا کر کھولا اس میں سو سو روپے کے کئی نوٹ تھے کتنے تھے۔ یہ نہیں معلوم۔ میں نے شمار نہیں کئے۔ لکشمی کا مطلب سمجھ گیا۔ گویا یہ روپیہ میری اس تکلیف کا معاوضہ تھا جو موٹر کے حادثہ سے مجھے پہونچی تھی۔ نہایت بے اعتنائی کے ساتھ وہ لفافہ لکشمی کے سامنے ڈالتے ہوئے میں نے کہا "مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی کہ آپ گھر بلاکر مجھے اس طرح ذلیل کرینگی۔" لکشمی اس جواب کے لئے تیار نہ تھی، وہ سخت مضطرب ہوکر بولی "نہیں نہیں خدا کے لئے آپ میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھئے۔ میرے ساتھ بے انصافی نہ کیجئے کیا اس کا امکان بھی ہے کہ میں آپ کو گھر بلاکر شرمندہ کروں۔ کیا میں آپکے نزدیک ایسی ہی ذلیل ہوں۔" لکشمی کے ان الفاظ نے مجھے لاجواب کردیا۔ کچھ دیر تک پھر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے آخر میں نے ہی ابتدا کی

تم نے کہا "لکشمی دیوی شاید آپ کو معلوم ہے کہ منیجر صاحب میرے صدر درجہ دوست، خیرخواہ اور محسن ہیں۔ مقدمہ خارج کرا کے میں نے اُنہیں بیحد ناراض کردیا ہے۔ پرسوں، مقدمہ سے پہلے مجھے نقصان کی تلافی کے طور پر ایک معقول رقم آپ مجھے دینا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے نہیں لی۔ غالباً آپ ان تمام باتوں کو میری شرافت اور نیکی پر محمول کرتی ہونگی۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں۔ کاش میری ذات میں اتنی شرافت اور نیکی موجود ہوتی۔ اپنی کمزوریاں اور عیوب کوئی دوسروں پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر بعض اوقات انسان اسکے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ یاد رکھیئے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ محض خودغرضی کی بنا پر تھا۔"

"مگر اس میں آپ کی کیا غرض تھی؟" لکشمی نے میرا قطع کلام کرکے کہا۔

"غرض یہ تھی کہ میری وجہ سے منیجر صاحب اور پولس نے آپ کو جو ذہنی اذیت پہونچائی تھی اسکی تلافی ہو جائے۔"

"اوہ، شاہد صاحب!" لکشمی نے صرف اتنا کہا اسوقت وہ تشکر و امتنان کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اسکے علاوہ ایک اور بات بھی تھی"

"وہ کیا؟"

لکشمی کے اس سوال کا جواب میں نے الفاظ میں نہیں دیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر لکشمی کا ہاتھ تھام لیا۔ پہلے اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر ہونٹوں سے۔ لکشمی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ایک لرزش سی اُسکے ہاتھ میں محسوس ہوئی۔ میرا خود تمام جسم کانپ رہا تھا، دل کی جو حالت اس وقت تھی۔ بیوفا رشیدہ سے جدا ہونیکے بعد آج پہلی بار مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور ہم ہر روز ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے منیجر کی برہمی ہمارے اس بڑھتے ہوئے ارتباط کو دیکھکر گھٹتی جا رہی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ جلد وہ مجھے اپنی راہ پر لگا لیگا۔ اور مقدمہ خارج کرا کے میں نے اسکا جو مالی نقصان کیا تھا، اسکی تلافی کی صورتیں نکل آئیں گی۔ لیکن میں تہیہ کر چکا تھا کہ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے مگر لکشمی سے ایک پیسہ نہ لونگا واقعہ یہ ہے کہ رشیدہ کی بے وفائی نے میرے قلب میں جو ناسور ڈالدیئے تھے لکشمی کی وفاپرستیوں نے اُنہیں مندمل کردیا جسمانی راحتیں اور روحانی مسرتیں اب قدم قدم پر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کمر تک پہونچنے والے لکشمی کے سنہرے بال جس وقت میرے بازو پر بکھرے ہوتے تھے اور اُسکی گداز مرمریں بانہیں میری گردن کے گرد حلقہ کئے ہوتی تھیں اس وقت میری کیسی حالت ہوتی ـــ آہ کن الفاظ میں بیان کروں کیسی حالت ہوتی تھی لکشمی کی دولت، لکشمی کا جسم، لکشمی کی روح ہر چیز میری ملکیت تھی۔ چند روز اس طرح گذرے۔ دولت، حسن، جوانی، محبت اور آزادی جب یہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر کونسی تمنا ہے جو پوری نہ ہو سکے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ سب کچھ مل جانیکے بعد اور رہ بھی کیا جاتا ہے جسکی انسان تمنا کرے۔ مگر افسوس، حصول آرزو کے بعد محبت کی زندگی شفق اور دھنک کی رنگینیوں سے زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی ہے۔ محبت کی آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی۔ نفس کی کمینگی جس پر تھوڑی سی مدت کے لئے شرافت نے غلبہ پا لیا تھا۔ پھر اُبھر آئی۔ پہلے مجھے خود لکشمی سے محبت تھی اب میں فقط اسکے روپیہ کو چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ لکشمی نے میری خاطر اپنی دولت پانی کی طرح بہائی۔ تقریباً ہر ہفتہ میں ریس میں کچھ نہ کچھ ہارتا تھا لکشمی مجھے بہت کچھ دیتی تھی اور اس طرح کہ گویا قرض ادا کر رہی ہے۔ احسان جتانا تو کجا احسان کرکے الٹی ممنون ہوتی تھی۔ بایں ہمہ میرے نفس کی دنائت روزافزوں ترقی پر تھی۔ آخر لکشمی کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ اس نے مجھے سنبھالنے کے لئے ہاتھ روک لیا میں اور بھی بگڑ گیا۔ اب اُسکو اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ اُسکے ہونٹ میرے لبوں کو چھو سکیں۔ میرا کھنچنا اُس کے لئے قیامت ہو گیا۔ خوابِ راحت کی خوگر آنکھیں جنہیں قدرت نے جادوگری کے لئے بنایا تھا اب جاگنے اور آنسو بہانے کے لئے وقف تھیں۔

ایکدن شام کے وقت میں لکشمی کے ہاں گیا وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسکے سنہرے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے چپکے سے اسکے منہ پر منہ رکھدیا وہ بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اُسوقت اسکی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت لوہا گرم ہے زور سے ضرب لگانی چاہیئے۔ وہ کسی طرح مجھ سے جدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ مگر میں نے بزور اُسے اپنے سے علیحدہ کیا اور کہا "لکشمی دُنیا میں ہر چیز قیمت سے ملتی ہے، میرے آغوش کی بھی ایک قیمت ہے۔ خدا نے تمہیں اس قابل کیا ہے کہ تم پوری قیمت دیکر اسے خرید سکتی ہو۔ میں ضرورتمند ہوں۔ اسلئے قیمت لینے پر مجبور ہوں ورنہ تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی اسکی پرواہ نہیں کی۔"

میرے یہ الفاظ سُن کر لکشمی یکایک سنبھل گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اسوقت کس قسم کے جذبات اسکے قلب میں موجزن ہیں۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ اس کا جوش سرد پڑ گیا۔ اسکی آنکھوں میں اور چہرے پر برہمی، نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے نہایت متانت سے کہا "کیا قیمت ہے تمہارے آغوش کی؟" میں سمجھا وار کاری لگا۔ دل میں سوچا کہ اب کیا مانگوں۔ وہ ایک

ہیرے کی انگشتری پہنے ہوئے تھی۔ بہت بڑا اور تابناک ہیرا۔ میں جوہری نہیں تاہم میرا خیال تھا کہ اس ہیرے کی قیمت ہزار بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔ انگشتری کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا "یہ انگوٹھی" لکشمی نے فوراً انگوٹھی اپنی اُنگلی سے اُتار کر میرے سامنے پھینک دی۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پہن لیا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا لکشمی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے اسکی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے آغوش میں لینا چاہا اس نے زور سے میرے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور نہایت غضبناک آواز اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا "نکل جا یہاں سے، پاجی، کمینے!" اتنا کہکر اُس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً آیا لکشمی نے اس سے کہا "شاہد صاحب کو ہوٹل پہونچا دو" میں سر جھکائے خاموش اسکے کمرہ سے نکل آیا۔ اس ذلت نے میرے جذبات غیرت کو ذرا سی دیر کے لئے برانگیختہ کیا۔ مگر دودھ کے اُبال کی طرح جلد ہی یہ عارضی طوفان فرو ہوگیا۔ منیجر کو میں نے کُل واقعات سُنائے۔ اس نے پوری داستان سن کر بہت کچھ میری تسلی تشفی کی اور کہا کہ "بھیا خدا روزی رساں ہے ایک دریچہ تو ستر در کھلے۔ خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے لکشمی جیسی ہزاروں چھوکریاں تمہاری جوتی کی نوک پر سے قربان ہیں" انگشتری دیکھکر وہ بے انتہا خوش ہوا اور کہا کہ پندرہ سو سے کم اس کی قیمت نہ ملیگی۔ اس خیال سے میرے بھی کچھ آنسو پُنچھ گئے کہ خیر جو ہُوا سو ہُوا ایک معقول رقم تو ہاتھ آئی۔ اگلے دن ہم دونوں وہ انگشتری فروخت کرنے ارادہ سے ایک بڑے جوہری کی دُکان پر گئے۔ بڈھے جوہری نے انگشتری کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا پھر مُسکرا کر بولا "بابوجی کسی نے خوب آپ کو بیوقوف بنایا۔ یہ تو امی ٹیشن (نقلی) ہے"۔

چند روز ہوئے میں کلکتہ گیا تھا۔ اُس شخص کو میں نے دیکھا جس کی عبرتناک داستان سچی کہانی کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ دیکھکر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص کسی زمانہ میں مردانہ حُسن کا مجسمہ رہ چکا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ زرد رنگت، پچکے ہوئے گال۔ لاغر جسم۔ پریشان بال، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اُلجھے ہوئے میلے کچیلے کپڑے۔ شراب کے نشہ میں چُور، ہوٹل کے برآمدہ میں ایک ٹوٹی ہُوئی چارپائی پر نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو واقفِ حال تھے اور خود اُسی کی زبانی اُسکی رام کہانی سُن چکے تھے، اسکے حالاتِ زندگی مجھ سے بیان کئے اُسی دیکھ کر اور اسکی داستانِ حیات سُن کر میرا دل لرز گیا۔ جہانتک واقعات و خیالات کا تعلق ہے میں نے مطلق تصرف نہیں کیا ہے۔ البتہ الفاظ میرے ہیں۔

پریم پجاری

ہم اور سینما

شام بھری تھی، آواز آئی — "جا جا، گاڑی جلدی لے آ"
ہم نے جانا، کام ضرورت سے — فوراً اُٹھ کر پان بنایا
ایسے آئے، ہولے ہولے — دل نے پکارا، جان ہو صدقا
ہے ہے، ایسی جلدی کیا ہے — جیسے کہیں ہو خزانہ ملتا!

ہاتھ کو پکڑا، موٹر بیٹھے — آن کی آن میں، ہم تھے، اندھیرا
گھنٹے گذرے، گھڑیاں گذریں — ہر ساعت اک سال تھی گویا
بارے شکر ہے، گھر کو پہنچے — کتنا خوش تھا چہرہ کسی کا
اپنی خوشی تو اس لئے تھی بس — پاس تھا اپنا من مکھ، پیارا
کس کو خبر، یہ ظلم بھی ہوگا — گھر چل کر ہے راستے بھی دینا

آتے ہی پوچھا خوش ہو، ہو کر — "فلم تھی کیسی، کیسا قصہ؟"
"کیا کہنے، کیا لطف ہو جیسے — کالی کوٹھڑی، اور کلکتا!"
جل کے کہا "کیا مطلب تیرا؟ — پڑھ کے بھی ہوا انسان، نہ طوطا"
"اب سے نہ لینگے ساتھ کبھی پھر — یوں ہی اگر ہے خرچہ کرنا"
"آپ کا احساں، آپ کی منت — آپ کا اُپکار، آپ کی کرپا!"

خط ہے کسی کا، اپنی منشا — ورنہ کھیل کی کس کو تمنا
وہ تو، جلوہ تھا بھی کسی کا — ورنہ گھٹ کر دم ہی نکلتا
ہم نے وہ دیکھا کھیل ہی نیارا — جس کے آگے ہیچ ہے دُنیا
اپنی فلم، اور اس کا تقابل! — راجہ بھوج اور تیلی گنگوا!
"ہم بھی تو دیکھیں، فلم وہ کیسی! — ہے وہ کیا آکاش کا تارا!"

"جی، نہیں بخشیں، یہ نہیں منشا! — آپ بھی اس میں لیں کچھ حصا!
جن کو پتلیوں سے ہو چسکا — اصلی فلم کا لطف انھیں کیا!
اس کا مزہ کچھ وہ ہی جانیں — جن پہ پڑی ہو ایسی بپتا!
"ہم بھی تو جانیں، بپتا کیسی! — کیسی فلم، اور کیسا قصا!
غیر برابر، اس کو مانیں — حکم ہمارا جس نے ٹالا!"

"اچھا، لیجئے، بتائیں سب کچھ! — یہ تو ہے، پر انصاف نرالا!
غیر کی فلم کو پیسے خرچے — اپنی فلم کو حکم چلایا!"
"واں تو مُفتی ہو نہ اک ٹُہنے — یہ لے، سارا خسارہ تیرا!"

دیکھئے! وہ اک عورت آئی — جس پہ ہے سارا زمانہ مرتا
کس نے اس کو کیا نہ سراہا — جگ کی کھلیں نہ زبانیں کیا کیا!

(آنکھ میں جادو، مُنہ میں امرت — لب پہ بجلی، رُخ پر تڑکا
گال پہ تیرے زلف، کہ تیرے — نور کے چشمے سانپ کا بچا
سینہ بھرا، اور ابھرا جوبن — طُور پہ دو ننھے سے موتا
رنگ و قامت باہم جیسے — چاند کی کرنیں ہوں مل بیٹھا
بات بہ شانِ اسمِ اعظم — چال بہ کامِ قسیمِ عیسا
ایک سراپا حُسنِ مجسم — ایک سراپا سحر کا پُتلا)

ہرا ساڑی پہنی، جیسے — سبزہ پہ، شام کی دھوپ کا جلوا
مُنہ پر شوخی، دل میں عفت — باطن موتی، ظاہر مونگا
اتنا غرورِ حُسن و خوبی — ہفت اقلیم کی گویا ملکا
لاکھ تمنا جس کے صدقے — سینکڑوں دل تھے جس کا تحفا
دل کیا تھا اک ادنیٰ غنچہ — توڑا، مسلا، پھینکا، روندا
مستِ خودی و محوِ عشرت — رنجِ دی، نے فکرِ فردا
اونچا گھرانا، عالی گوہر — علم و فضل و سیرت حُسنا
عزت جس کی مانے راجہ — دولت، جس کا ہو نہ احصا

اک دن، شام جو نکلی تفریح — باغ سا منظر، وقت سہانا
اُس پہ غضب، اک ظالم دیکھا — زیرِ نظر تھا جس کی پرچا
آنکھ جو جھپکی، دل کیوں دھڑکا — "ذرا سے خرکا کیوں موٹر پہیا"
جانے، اس کے سامنے یہ تھی — یا پھر اُس کے سامنے وہ تھا
نظریں زور سے چار ہوئیں، یا — دل کو پایا دو صد پارا
شرم نے باگ نظر کی موڑی — واپس لوٹی، موٹر پھیرا

وہ آگے اور پیچھے نظر تھی　　چلتی تھی گویا، رستہ آنکھا
(مطلب سعدی و بیگ، گو تھا　　پھولوں کے نظارے کا بہانا
گھر پہنچے کچھ ایسا　　پایا　　جیسے جواری کھوستا آیا
وز کی تفریح، داخلِ ایماں　　تفریح تھی یا فرضِ خدا تھا!
وہ آیا، اور یہ بھی پہنچی　　اسی طرح اک عرصہ گذرا
جتنا بھلایا، رفتہ رفتہ　　یاد کو اتنا بڑھتے　　پایا
دید میں گذرے، دل سی خوش خوش　　اُوٹ ہوئی، اور ظالم مچلا
کتنا ڈرایا، کتنا منایا　　پھر بھی وہی ضد اپنی انگوڑا!
کھائے کسی کا، گائے کسی کا　　بھاڑ میں جائے ایسا کمینا!
ہے ایسے، اسکو بتائے کیونکر　　غیر پہ کوئی یوں نہیں مرتا!
جیسے جیسے دن تھے گذرتے　　دل کا مرض تھا اتنا بڑھتا
دل کی دھڑکن دھیمی، دھیمی　　شوق کا اٹھتا اٹھتا شعلا
اٹھتے، بیٹھے، جاگتے، سوتے　　چین کسی کل، تھا نہیں پڑتا
حال پریشاں ہر دم، کوئی　　جیسے بھوت کے خواب سے اٹھا
بات سے نفرت، ملنے سے وحشت　　وہ تھی، اور اک تنہا کونا
حسن رخ دیکھو ایک ہی جلوہ　　جلوہ تھا، یا نظر کا دھوکا
وہ جو نہ آیا، نیند نہ آئی　　آہ کی تیغ سے رات کو کاٹا
جتنا کرب تھا، اتنی لذت　　جتنا درد تھا، اُتنا چسکا
اتنا بڑھایا سوزِ دروں کو　　دل پہ ہوا انگارے کا دھوکا
چور کو جیسے بچھو کاٹے　　کس کو سنائے دل کی بپتا
اتنا ستایا، اتنا ستایا　　تابِ ضبط، نہ سہنے کا یارا
درد ہی کو خود رحم سا آیا　　مونسِ غم جب کوئی نہ پایا
آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے　　دل کا برستا سوز بجھایا
حسن پڑا ماندِ عشق کے آگے　　ناز کو سارے نیاز نے لوٹا
ذہن میں ہمت، دل میں دھڑکا　　منہ پر بات، نہ کہنے کا یارا
یارب، وہ! اور اتنی بےبس　　کس عصیاں کا ہے یہ بدلا!

حال ادھر غیر اس کا اتنا　　اور ادھر وہ اتنا بگا تا
انساں تھا، یا کوئی فرشتہ　　تھا بھی دل؟ یا برف کا ٹکڑا؟
دل ہے جو اس کی کیوں نہیں سنتا　　مرد کے، یا پھر، دل نہیں ہوتا!
دل تھا اگرچہ اتنا کڑھتا　　روز کا جانا پر نہیں چھوٹا
روز نیا اک وارِ محبت　　روز نیا دل عقل کا جھگڑا
عقل کا منشا شرم و عزت　　دل کا کہنا "تو اور پیارا"

دل نے آخر عقل کو جیتا　　کتنا دانا! کتنا سیانا!
آنکھ پہ عقل کی پردہ ڈالا　　اپنا اندھا راج چلایا
کُل کی لاج کو خاک میں جھونکا　　نام کے نام و ننگ کو میٹا
اپنے پرائے طعنے، تشنے　　سب کو بلا پر اپنی قرارا
جی میں آئی، چل کر کہدیں　　لاج نے پھر بھی دامن تھاما
لکھ آخر، اک نامہ بھیجا　　واں سے جواب اُچٹتا آیا
کتنے نامے، کتنے پرچے　　کتنی گذارش، کتنی تمنا
گالے حرف، اور گالی جھڑکی　　پھر بھی یہ دل، اور اتنا ریجھا
عزت دھوئی؛ شرم کو مارا　　خود جا جا کر، ہارے، منایا
کتنا ضدی! کتنا ستمگر　　کتنا وہمی، گماں کا بندا
مان کے بھی کیں شرطیں لاکھوں　　اک اک پر اقرار کرایا

"جو کریں گے، ظلم کریں گے!"　　'آپ کی مرضی، اپنی منشا!'
"سب سے انوکھی اپنی طبیعت!"　　'اس کا علم ہے ہم کو پورا!'
"بننا بگڑنا کا ساتھ ہو کیونکر!"　　'ان میں تو ہے بس حق صفر کا!'
"اِس عزت کے ہم نہیں قابل"　　'دھن کا عزیب ہے، دل کا شہنشا!'
"مان لو، ہم عیاش بہت ہیں!"　　'آپ کی خاطر سب ہے گوارا!'
"پھر بھی وفا کا دعویٰ؟ کب تک؟"　　'جان نے جب تک ساتھ نہ چھوڑا!'
"اس کا یقیں پر آئے کیسے؟"　　'سر ہے جو یہ قدموں پر رکھا!'
اتنے جتن اور وعدے لیکے　　قدموں سے سر کو جلد اٹھایا
دیکھا پھر اک خاص نظر سے　　"پیاری" کہا، اور گلے لگایا،
وعدہ کیا آملنے کا دائم　　اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"

'پیاری' میں! اور قسمت میری!　　واری خدایا! صدقے مولا!
وعدہ! اور آملنے کا دائم　　اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"
بول ہیں یہ! یا امرت بوندیں!　　ہوش ہے یہ، یا میٹھا سپنا!
کیسی قسمت! کیسا مقدر!　　کیسا بخت! اور کیسا نصیبا!

لیجے! پوں پوں! موٹر آئی!　　موٹر کیا! وہ خود ہی آیا!
ناؤ کھیوتا، جیون سنگی　　دل کی جوت، اور من کا اُجالا
کتنا حسیں، اور کتنا پیارا　　کیسا نرالا، کیسا بانکا!
کتنی رسیلی آنکھیں، پریمی!　　پھول میں جیسے میٹھا بھونرا!
گال پہ گورے سُرخی، جیسے　　ہولی کھیلے ننھا بچا

کتنا بہادر! تیر، نہ تیغ   دل کے جیسے شیر کو مارا!
غم کی فوج نے آن جو گھیرا   تنہا مار کے ہم کو بچایا
دیر سے آکر کس نے رُلایا   ہاتھ سے کس نے آنسو پونچھا
کس نے نظر سے پھول جھڑائے   ہنس کر ہم کو کس نے ہنسایا
پیار کی باتیں کس نے سنائیں   دل کی لگی کو کس نے بجھایا
وہ نہیں، یعنی نور نظر جب   جگ میں ہو کیوں ساری اندھیرا
ساری خوبی، ایک خرابی   ظالم اتنا، جتنا اچھا
ظلم بھی اچھا، وہ جو اچھا   اس کے لئے ہے سب کچھ زیبا
کتنے خوف سے اس کو سنبھالا   جیسے بیتی کا ہو بچہ پیولا
کپڑے اتارے، سکھ سے بٹھایا   ہاتھ بھی جوڑے، کی بھی پوجا
اتنا پوجا، اتنا پوجا   خود دیوتا کو بندہ بنایا
پھر تو پریم کے غنچے چٹکے   غم کے جہاں کو خلد بنایا
دکھ کی کہانی سکھ سے بدلی   اسی خوشی میں سُننے گا نا:

کتنے چاؤ سے تو ہے سنوارا   نین کا آئینہ، پلکوں کا کنگا
زلفوں کی کملی، اشکوں کی مالا   پریم کی خوشبو، دل کا پھاہا
تم بن اجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا!
نین کی موٹر بیٹھے دکھاؤں   کتنی پیاری خیال کی دُنیا!
دکھ میں جہاں ہو عیش کی لذت   اک اک سال بھی پل ہے جہاں کا
تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا!
پیت کی چوٹی سب سے اونچی   جس پہ ہمارا دل ہو دھڑکتا
پھر تم آؤ، گود میں جھیلو   دل ہو دھڑکتا، پھر سے اُچھلتا
تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا!
نین کا ساگر بیٹھے کنارے   تم جو نہ آؤ اشکوں سے کھیلا
ہجر کا مارا تیرا کسی نے   ہم نے سمجھ کر تار اٹھایا
تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا!
دیکھے پرندی، چوں، چوں کرتے   پیار سے جن کا دل تھا اُمنڈتا
دھیان کے جادوگر سے مدد لی   ہم نے بھی اپنے پی کو بلایا

تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ آؤ، من کے بسیا!
ہم کو نہیں دُنیا سے غرض کچھ   سب سے الگ اک راج ہو بستا
نیک سے، بد سے پاک ہو دُنیا   پریم کی جنت کا ہو نقشا!
تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا
ہجر میں ہم کو مرتے نہ چھوڑیں   مار کے جاں دیں آپ خدارا!
جینا ہو وہ، سو جینے سے بڑھکر   جان کو قدموں پر جو وارا!
تم بن اُجڑے ساری نگری   آؤ، آؤ، من کے بسیا!

دیکھا! کتنا اچھا گانا   کیسا گیت، اور کیسا گلا تھا!
ہے ہے آنکھ میں آنسو یہ کیوں!   اس میں پایا اتنا اثر کیا!
ہنس کے کہا پھر "یوں ہی کچھ تھا   ہم بھی سنیں کیا نام ہے اسکا!"
ہم نے کہا ہے "عشق کی دنیا!"   بولے "فلم ہے یہ، یا قصا؟"
فلم ہے، خاکہ، قصہ، پردہ   برق ہے، گھر ہی جوت، اندھیرا
سب کچھ ہی یاں دلکش ساماں   چاہیے واں، اک دید بینا
عشق کی برق، اور دل کا گھر ہے   وصل ہی جوت اور ہجر اندھیرا
فلم ہے اک تصویر کسی کی   جس کا منظر سینہ کا پردا
جس کا ٹکٹ، اک نظر محبت   جس کا تماشا تنہا، اکا
زر کی نہیں یاں قدر کسی دن   لیجے، آپ کا کھوٹا رُپیا

سینہ سے جو دامن کو ہٹایا   نکلی اک موتی کی مالا
جس میں تھی وہ تصویر کسی کی   فلم تھی جو، اور اپنی دُنیا
اب نہ بتائیں اس کے آگے   فلم ہے کس کی، کس کا نقشا!
بات نہیں یہ کہنے کی، سمجھیں   خود ہی اگر ہے عقل کا دعوا،
ایسے ریجھے اتنا ہنس کر   مہر کا جیسے دریا اُمڈا
مست سی نظریں لپکیں، اٹھکر   ہاتھوں کا ہار گلے میں آیا
ختم ہوئیں جب باتیں نظر کی   ہنستے ہوئے پھر یہ فرمایا
"عقل کا ہو یاں کس کو دعویٰ   سحر عشق جو کر دے ابلا"
"ہم کیا جانیں ہو گی کسی کی   نیچے تو ہے، ہاں، شاکر لکھا!"

سید علی شاکر ایم اے

توجہ طلب

(۱) خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کیا کیجئے۔ (۲) جواب طلب امور کیلئے کارڈ یا لفافہ بھیجا کیجئے۔ مضامین کی واپسی کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

(منیجر ساقی دہلی)

سادگی

زندگی کی مسرتیں حقیقت میں اُسی کو حاصل ہیں جس نے طرزِ معاشرت میں اعتدال قائم رکھا اور سادگی کو اپنا مسلک قرار دیا ہو، ضروریات اور لوازماتِ زندگی میں ہمیشہ سادگی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اِس سے رفتہ رفتہ انسان کے خیالات خود بخود پاکیزہ ہونے لگتے ہیں ۔ زیب و زینت، آرائش و زیبائش اور تہذیبِ جدید کے نئے نئے طریقوں میں جو وقت برباد ہوتا ہے۔ معاشرت میں سادگی اختیار کرنے والے ان اوقات کو دوسرے مفید اور ضروری کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اُسکی قدر و قیمت کرنا سیکھیں۔ اور اُس کی اہمیت کو محسوس کریں ۔

ہم کو فطرتاً سادہ معاشرت کا پابند ہونا چاہیئے۔ مگر ہم پر اندھی تقلید کا بوہ اس قدر غالب ہے کہ بھول کر بھی ہم اُس مسلک کو اختیار کرنا نہیں چاہتے جس سے زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں جب تک ہم اپنی معاشرت میں سادگی نہ پیدا کریں۔ روپیہ اور وقت برباد کرنیوالے زیب و زینت کے طریقوں اور نت نئے فیشنوں سے احتراز نہ کریں، ہمیں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی ۔

وہ دولت مند اور متموّل حضرات جن کو ساری دنیا کی نعمتیں، عیش و عشرت، زیب و زینت، اور آرائش و زیبائش کے اَسباب حاصل ہیں کیا وہ واقعی ایسے قانع ہیں جیسا کہ اُنہیں ہونا چاہیئے؟ غور کرنیسے نہیں تو خود اُنہیں سے دریافت کر کے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں آخر اسکے اسباب کیا ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جس قدر نعمتیں اُنکو زیادہ میسر آتی جائینگی۔ اُسی قدر اُنکے تکلفات بڑھتے جائیں گے جتنی اُنکی خواہشیں پوری ہوتی جائینگی اُن سے دُونی پیدا ہوتی رہینگی۔ حقیقت میں زندگی کا لُطف اُسی کو حاصل ہے۔ جو معاشرت میں سادہ ہو۔ اِس قدر سادگی کی بھی ضرورت نہیں کہ مقدور ہوتے ہوئے پھٹے کپڑے پہنے، حیثیت ہو اچھا نہ کھائے اور فراغت ہو مگر تکلیف اُٹھائے ۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اِرتقائے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو واضح ہوگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ سادگی سے نظر پوشی کی گئی۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت انسان غاروں اور درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے، ہر طرف نیچر کی حکومت تھی، یہ آزاد میدانی زندگی صحت بخش، طاقتور اور بے لَوث ہونیکے علاوہ، اسمیں فکر، رنج، تکلیف اور نجاست کا کہیں نام و نشان نہ تھا، نہ اس کثرت سے بیماریاں آتی تھیں۔ نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں، نہ آزادی کے لئے کوششیں، صرف آزادی اور سادگی کی ہر طرف حکومت تھی، خیالات سادہ تھے، مگر وسیع اور متعلق۔ نہ وہ ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوتے، اسکے بعد آگ وجود میں آئی جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کر دیا اس آگ کے معلوم ہونیکے دن سے تہذیب و تمدّن کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت سے انسان کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ضروریات بیحد بڑھ گئیں اور ساری برکاتِ اوّلین غائب ہوگئیں ۔

اِس وقت ہم نے جو طرزِ معاشرت اختیار کر رکھی ہے اس کا اصول سادگی نہیں بلکہ از سرتا پا تکلف ہی تکلف ہے سادگی سے قطعی جُدائی ہمارا شعار ہوگیا ہے۔ اب ہمارا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو جس حالت میں پائیں، اُسے اُسکے برعکس بنادیں ۔

اگر ہم معاشرت میں سادگی پسند کریں تو اپنی آدھی سے زیادہ مشکلات پر غالب آسکتے ہیں، سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح سادہ ضروریاتِ زندگی، غرض کہ ہماری معاشرت میں سادگی کا دور دورہ ہو پھر دیکھیئے دُنیا مع اپنے سارے تکلفات کے ہم کو مغلوب نہیں کر سکتی۔ کیونکہ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے ۔

ہم نے اکثر بچوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اپنی اس حالت میں بہت زیادہ خوش و خرّم دکھائی دیتے ہیں اتنا زیادہ جتنا کہ ہم اپنے بیش قیمت لباس میں بھی نہیں ہوتے، ہماری تہذیب اُنہیں گندہ کہتی ہے، مگر یہ مسئلہ غور طلب رہتا ہے کہ آیا ہم زیادہ گندے ہیں یا وہ؟ جُوں جُوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ ہماری تہذیب اور معاشرت میں گرفتار ہوتا جاتا ہے۔ یہانتک کہ وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو عہدِ طفلی کی لغویات پر محمول کرتا ہے، سادہ اور حقیقی مسرت جو اسکے دل میں اُسکے اِرد گِرد کی چیزوں سے پیدا ہوتی تھی کم ہونا شروع ہوتی ہے، اور تھیٹر، سینما، راگ ورنگ، رقص و سرود اور ایسے ہی دوسرے تہذیبی تکلفانہ مشاغل تفریح میں مسرت حاصل کرتا ہے۔ غرض کہ اسکی معاشرت میں سادگی کے عوض تدریج

تکلفات جگہ پاتے ہیں۔ اور سادہ معاشرت کی جملہ خوبیاں اور آزادیاں تہذیب وتمدن کے بندھنوں میں مقید ہو جاتی ہیں۔

سادہ معاشرت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں۔ گھر کی سادگی، لباس کی سادگی، عادات کی سادگی، رسم و رواج اور دیگر ضروریات زندگی میں سادگی، اور غذا میں سادگی وغیرہ۔

گھر کی سادگی سے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مکانوں کو سادہ مگر صاف ستھرا رکھیں۔ جن مکانوں میں فضول چیزیں بھری رہتی ہیں، انکے مکینوں کی جان ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے، شب و روز ان کو ان چیزوں کی ترتیب اور تہذیب کی فکر لگی رہتی ہے اور ان کا سارا فرصت کا وقت ان غیر ضروری چیزوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ اوّل اوّل کچھ عرصہ تک آرائش و صفائی کا شوق رہتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ شوق سرد پڑ جاتا ہے جو چیزیں روزمرہ استعمال میں نہیں آتیں۔ ان پر گرد و غبار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ جو اشیا، اسلئے خریدی گئیں تھیں۔ کہ ان سے گھر کو آراستہ کیا جائے اب انہی آرائشی چیزوں نے گھر کو کباڑی کی دوکان بنا دیا ہے اور وہی آرائش و زیبائش کے عوض مکان کی بدنمائی کا باعث ہو رہی ہیں۔

آج کل اکثر حضرات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ خواہ ضرورت ہو نہ ہو، نیلاموں سے بغیر سوچے سمجھے بہت سی بیکار اور فضول چیزیں لاکر جمع کر لیتے ہیں۔ اور دوسروں سے مقابلے کے شوق میں بازار کی قیمت سے زیادہ قیمت پر سامان خریدتے ہیں۔ چند روز کے بعد جب طبیعت ان چیزوں سے سیر ہو جاتی ہے۔ اور انکے بے ضرورت ہونے کا احساس ہوتا ہے تو پھر نیلام میں بھیج دیتے ہیں۔ اسی خرید و فروخت میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جو اس مرض میں مُبتلا ہیں۔ اس موقع پر مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ناظرین ساقی کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

ایک صاحب کو جن کے والد کافی جائداد اور دولت چھوڑ گئے تھے فرنیچر اور دوسری آرائشی چیزیں خریدنے کا شوق ہُوا۔ ایکدن آپ کسی نیلام میں رونق افروز ہوئے اور اندھا دھند سامان خریدنے لگے، نیلامی نے جو یہ رنگ دیکھا، طرح طرح سے ان کو اکسانا شروع کیا، اگر انہوں نے ایک ہی وضع کی دو چیزوں میں سے ایک چیز خرید لی تو انہیں مخاطب کرکے کہدیا "جوڑی بگڑتی ہے" اگر کبھی کسی چیز کو زیادہ بولی کی وجہ سے چھوڑ دینا چاہا تو دز ا دز عنلا دیا کہ "یہ چیز تو آپ ہی کے لائق ہے، جہاں اتنا سامان خریدا اسکو بھی خرید لیجئے کہ دولت خانہ کی آرائش ہو"۔ غرض کہ اسطرح ہمارے ناعاقبت اندیش دوست نے تین چار ہزار کا سامان خرید لیا۔ گھر تھا پرانی وضع کا۔ اُس میں یہ طرز جدید کا فرنیچر اور اسباب آرائش کیا بھلا لگتا۔ چونکہ مکان کرایہ کا تھا۔ اس لئے دوست احباب کی رائے ہوئی کہ گھر بدلنا چاہیئے۔ فوراً اس مکان کو خیرباد کہدیا گیا۔ اس منتقلی میں بہت سارا چینی کانچ کا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا۔ میز کرسیوں اور الماریوں کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ الغرض یہ سارے اسباب آرائش کے ساتھ جس مکان میں منتقل ہوئے تھے وہ بھی کچھ قرینے کا نہیں نکلا، جب یہ آرائشی چیزیں اسمیں سجائی گئیں تو بعض احباب کی رائے ہوئی کہ اس نئے طرز فرنیچر اور سامان آرائش کے لئے یہ مکان بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں اس مکان کو بھی وداع کیا گیا اور ایک مکان معقول کرایہ پر لیا گیا۔ حالانکہ اب بھی سرمایہ اس قدر موجود تھا کہ ایک نہایت اچھا مکان بنا بنایا خریدا جا سکتا تھا۔ یہ مکان بھی بیش قیمت فرنیچر کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ مکانوں کی اس ردوبدل کی وجہ سے جو سامان ناکارہ ہو گیا اُس کو جب نیلام میں بھیجا گیا تو آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت ہُوا اور اس قیمت کا بھی کچھ حصہ نیلامی کے کمیشن کی نذر ہو گیا اور اس تقریب میں ہمارے دوست کو گھر بدلنے کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

مکان کی طرح ہمارا لباس بھی سادہ مگر صاف ستھرا ہونا چاہیئے۔ مرغ زریں بنے رہنے سے ہمکو بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، جو لوگ قیمتی لباس استعمال کرتے ہیں ان کو ہر وقت اپنے لباس کو ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا۔ ان کا دل دھڑک گیا۔ ہم کو چاہیئے کہ زرق البھرک لباس کی قید میں خود کو نہ پھنسائیں۔ لباس ایسا استعمال کرنا چاہیئے کہ تن پوشی کے علاوہ تراش خراش میں بھی اچھا ہو، تاکہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کو بھلا معلوم ہو۔

اسکی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں درجنوں سوٹ، شیروانیاں، شوز وغیرہ ہوں۔ ان اشیاء کی افراط انکی دیکھ بھال سے ہمیں بے نیاز کر دیتی ہے اور یہ قیمتی چیزیں برسوں کام دینے کے عوض مہینوں میں ناکارہ اور ناقابل استعمال ہو جاتی ہیں۔ شوز اتنے ہوتے ہیں کہ انکی صفائی اور پالش کے لئے ہمارے نوکر کو وقت نہیں ملتا، سکڑے چلے جا رہے ہیں۔ نوکر صاحب اگر ذرا چابکدست ہیں تو ہر مہینہ ایک آدہ چیز کم ہو رہی ہے، تعداد کی کثرت میں یاد بھی نہیں رہتا کہ کتنی چیزیں خریدی گئی تھیں اور اب کتنی ہیں۔ غرضکہ ہر چیز کی افراط ہر طرح کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

لباس میں فیشن کی لعنتوں نے شریک ہو کر اس کو انسانی صحت کے لئے مختلف طریقوں سے مضرت رساں بنا دیا ہے۔ فیشن کی نظر فریب اختراعات سے ہماری صحت اور خوش حالی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ فیشنیبل

جس کی خاطر ہم اپنی دوسری اہم ضروریات زندگی سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو محروم رکھتے ہیں۔

خیالات کی سادگی بھی بڑی چیز ہے، جس کو یہ حاصل ہوا اسکو پھر خوشی مسرت اور آزادی ہی آزادی ہے۔ بعض حضرات خواہ مخواہ اپنے دماغ کو بے جا خواہشات کا آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ انکی خواہشیں اس قدر بلند اور لامتناہی ہوتی ہیں کہ ان کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہونے پاتا۔ ایسی موہوم اُمیدوں کے خیالات اُنکے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں کہ اُن کا پُورا ہونا اس دنیا میں قرینِ قیاس نہیں ہوتا، وہ اُن آسائشوں اور مسرتوں کے حاصل کرنیکا خیال کرتے ہیں جن کے حصول کی اُمید خیال خام ہوتی ہے۔ "دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست" کا مقولہ ان لوگوں پر صادق آتا ہے۔ فضول اور لایعنی خواہشوں کے ہوائی قلعے نہ بنانا چاہیئے۔ سادگی اسی میں ہے کہ ہم ایسی خواہشوں کے حاصل کرنے کی فکر کریں جن کا حصول ممکن ہو اور جو ہمارے اور ہمارے ابنائے جنس کے لئے مُفید ہو سکیں۔ ایسے خیال اور اصول کو ہم اپنا رہبر بنائیں جو ہماری زندگی کے لئے مُفید اور ضروری ہوں۔ زندگی کو فضولیات اور خرافات سے آزاد رکھنا چاہیئے۔

عادت کی سادگی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی عادات و خصائل میں سادگی اختیار کریں۔ سادہ عادتیں ہماری زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور ہماری معاشرت کو کم خرچ بالانشین بناتی ہیں۔ عہدِ طفلی میں جو عادتیں گھر کر لیتی ہیں وہ تادمِ آخر برابر قائم رہتی ہیں۔ بچوں کی عادتوں کو سنوارنے اور اُن میں صلاحیت پیدا کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر ہماری خواتین کے سر ہے۔ کیونکہ ماں کی گود بچہ کا پہلا مکتب ہے اور اگر اس مکتب میں وہ بُری عادتیں سیکھ لے اور یہ بُری خصلتیں اس میں راسخ ہو جائیں تو پھر انکی اصلاح دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔

ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ بچوں میں ایسی سادہ عادتیں پیدا کرائیں جو اُنکی زندگی کے نظام میں آسانیاں مہیا کریں، اور اُنکی تکلفانہ معاشرت کی خاردار راہوں اور دُشوار گُزرگاہوں کو صاف اور ہموار بنا دیں۔ بچوں میں فطرتاً ہٹ اور ضد کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے اگر عہدِ طفلی میں اسکی روک تھام اور اصلاح نہیں کی گئی تو انکی آئندہ زندگی خود انکے لئے باعثِ عذاب اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ اُنکے رگ و ریشہ میں خودپسندی اور انانیت سرایت کر جاتی ہے۔ انکی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُنکی ہر خواہش اور ہر آرزو کسی طرح پوری ہو۔ خواہ اسمیں اُنکے والدین اور متعلقین کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

ہماری خواتین کو چاہیئے کہ بچوں میں ابتدا ہی سے سادہ مگر صاف ستھرا لباس اور سادہ زود ہضم غذا استعمال کرنے کی خُو ڈالیں۔ قیمتی لباس اور مُرغن غذائیں اُنکے دماغ اور اُنکے نظامِ جسمانی کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ ہماری بہنیں بچوں کی بُری عادتوں کو یہ کہکر ٹال جاتی اور برداشت کر لیتی ہیں کہ ابھی تو بچہ ہے۔

"آتے آتے آئیگا اُسکو خیال"

جب سمجھ آ جائیگی تو خود ہی یہ عادتیں چھوڑ دیگا۔ مگر جب بچہ میں یہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا چھوٹنا ایک طرف۔ بلکہ جہاں صرف چند عادتیں خراب تھیں وہاں کئی ایک نئی پیدا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بربادی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اپنے گھر اپنے خاندان اپنے دوست و احباب اور اپنے ملک و قوم کے لئے بھی اس کا وجود تباہ کن اور باعثِ ننگ و عار ثابت ہوتا ہے اور آخر میں وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

بے جا لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلنے والے بچے دُنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، ہماری بعض بہنیں بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیتی ہیں۔ بچوں کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اُنکی پرستش کریں۔ انکی ہر ادا اور ہر حرکت پر آمین کہیں اور اُن کو دُنیا کا آٹھواں عجوبہ "تصور" کریں۔ ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو اپنے لئے نہیں بلکہ دُنیا کے لئے اور اپنے ملک و قوم کے لئے تیار کریں۔

غذا کی سادگی سے یہ مُراد ہے کہ غذا مُرغن اور محرک نہ کھائیں۔ ہمارے ملک کی گرم آب و ہوا کے مدِ نظر ہمارے لئے مُفید نہیں ہو سکتیں۔ مُرغن غذائیں جسم میں چربی پیدا کر کے جسم کو فربہ اور بھدا بنا دیتی ہیں۔ تازہ دُودھ، روٹی، مکھن، انڈے، مچھلی وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے۔ گوشت پر ترکاریوں اور تازہ پھلوں کو ترجیح دینی چاہیئے۔ آج کل چائے کے استعمال کا رواج بہت ترقی پر ہے، ہر گلی کوچے میں چائے خانوں کی افراط ہے۔ یہ چائے خانے جن پر نام نہاد ہوٹل اور رسٹوران کے خوشنما سائین بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں اپنے اندر اقسام اقسام کی گندگیاں رکھتے ہیں۔ بڑی حیرت ان حضرات کے ذوقِ خورد و نوش پر ہوتی ہے جو ایسے گندہ مقامات پر چائے کی پیالیاں اُڑاتے گپ شپ میں گھنٹوں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ ضیافتِ شکم کے ساتھ ساتھ اُن کی ضیافتِ سمع کے بھی کچھ سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس بھول بھلیوں میں پھنس کر نہ انہیں گھر کی یاد ستائے، اور نہ زندگی کی دوسری مصروفیات کا خیال آئے، نہ صرف صحت بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہاں کی فضا نہایت مکدر رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چائے کی یوروپین کمپنیوں نے جو ہندوستان چائے کی تجارت کرتی ہیں۔ چائے کی فروخت کو ترقی دینے کیلئے ایک مشترک بورڈ قائم کر لیا ہے،

جو اقسام کے طریقوں سے پبلک کو چائے کی خوبیوں پر مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ سرد ممالک میں اگر چائے ضروریات زندگی میں شریک کرلیجائے تو مقام تعجب نہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے گرم ملک میں چائے کا استعمال قابل ستایش نہیں ہوسکتا بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ہے۔ چائے میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی جہاں وہ تکان دور کرتی ہے وہاں ان لوگوں کو جن کے گردے کمزور ہیں سخت نقصان پہونچاتی ہے۔ بعض حضرات چائے کو غذا کا اہم جزو سمجھتے ہیں، اور اس کو غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چائے کا استعمال ناگزیر ہی ہے تو اسکو ہلکی بنانا چاہئے اور اسمیں دودھ زیادہ ڈالنا چاہئے۔ غرض کہ ہماری غذا سادہ مگر کافی اور مختلف قسم کی ہونی چاہئے، روزمرہ ایک ہی قسم کی غذا کا استعمال اشتہا کو کم کردیتا ہے۔

توہمات اور فضول رسم ورواج بھی ہماری معاشرت میں سادگی قائم نہیں رہنے دیتے۔ غیر ضروری اور بیجا رسوم کی پابندیوں میں ہم نہایت بے دردی سے روپیہ صرف کرتے ہیں۔ خوشی اور غمی کی صدہا تقاریب اور موقعوں پر دولت کا اندھا دھند اسراف روا رکھا جاتا ہے۔ اگر کچھ پاس نہ ہو تو قرض لے کر ان لغویات اور خرافات کو پورا کیا جاتا ہے ہماری معاشرت میں بیہودہ رسم ورواج کے یہ بھونڈے داغ، جیتے نہایت بدنما ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کی سادگی کو برباد کرنیکے علاوہ ہماری دولت اور اخلاق کو بھی تباہ کررہے ہیں۔ ان فضول رسم ورواج کی پابندیوں نے خاندان کے خاندان تباہ کردیئے ہیں اور آئے دن ہماری دولت غیر اقوام کے قبضہ میں چلی جارہی ہے۔ ہماری روز افزوں مفلسی کے سدباب کے لئے ہماری معاشرت کے یہ رسم ورواج بڑی حد تک اصلاح طلب ہیں۔

ان فضول رسم ورواج اور توہمات کی اصلاح کا ہماری معزز خواتین سے زیادہ تعلق ہے۔ کیونکہ وہی ان لغویات میں جی کھول کر حصہ لیتی ہیں خوشی اور غمی کے موقعوں پر وہ ان مذموم رسوم کی اس حد تک پابند ہوگئی ہیں کہ ان کو صرف اپنی معاشرت ہی کا نہیں بلکہ اپنے مذہب و قومیت کا بھی ایک اہم جزو سمجھتی ہیں۔ ان کی توہم پرستی نے ہمارے بھائیوں کو ان مہمل رسوم کا پابند کردیا ہے۔ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹیوں کی خوشی کی خاطر مردوں نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے کبھی مخالفت کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے، مگر نازک امرار قوی "انکار" پر غالب آجاتا ہے۔ اور پھر وہی ہوتا ہے جو "صنف نازک" کے نازک مگر توہم پرست دل ودماغ میں لبا ہوا ہے اور وہ برملا کہتی ہیں۔

"ہم وہی آخر کریں گے جو ہمارے دل میں ہے"

غرض کہ ہماری معاشرت کی اصلاح اور اسمیں سادگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو صنف متفق و متحد ہوکر اس طرف توجہ کریں اور اپنی اصلاح کی مسلسل کوشش کرتے جائیں تاکہ ہماری معاشرت میں اعتدال قائم ہو اور ہم ان فضول رسم ورواج، وقت اور روپیہ برباد کرنے والے غیر مفید طریقوں اور تکلفات کے پھندوں سے نجات حاصل کریں+

مرزا سیف علیخاں
(حیدرآبادی)

فیوجل

فیوجل نے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کا آغاز قہوہ خانے کے نگہبان کی حیثیت سے کیا۔ بیچارے اُن بدقسمت چھوکروں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا جو پیتل کے بٹنوں والے سبز کوٹ پہنے افسروں کے تہدید آمیز احکام کی بجاآوری نہایت خندہ پیشانی سے کرتے ہیں۔

اسی قہوہ خانے میں وہ اپنی غلامانہ زندگی کے لمحات کو مستقبل کے بڑے بڑے امید افزا خواب دیکھ دیکھ بسر کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی روز وہ کسی بڑے ہوٹل کا ——— کسی تیسرے درجے کے ہوٹل کا نہیں جہاں تجارت پیشہ مُسافر ذلیل بستروں پر سوتے ہوں بلکہ اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل کا جہاں انگریز اور امریکہ کے کروڑپتی سونے کے ایک کمرے کا ہزار فرانک تک کرایہ ادا کرتے ہوں اور شراب کے ایک گلاس کے لئے پانچ لوئیس پیش کرتے ہوں ——— منیجر بن جائیگا! اس مقصد کی تکمیل کے لئے انگریزی کی تھوڑی بہت تحصیل ضروری تھی۔ اس لئے یہ زبان سیکھنے پر وُہ کمربستہ ہوگیا۔ اس نے اتنی رُکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کس طرح قہوہ خانے میں اکثر آتے جاتے مُسافروں سے لسانی رجحانات سیکھے؟ یہ ان اصحاب کے لئے ایک راز ہے جو فیوجل کی شخصیت سے آشنا نہیں۔ مگر اس کے دوستوں کے لئے یہ کوئی پیچیدہ معمّہ نہ تھا۔ فیوجل کو ہر مشکل اور محنت طلب کام بہت آسان معلوم ہوتا تھا اور ہر آسان کام اس کے لئے سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ فیوجل اِس خوفناک فطرت کا مالک تھا ———!

چنانچہ کچھ عرصے کے بعد انگریزی پر اُسے اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ چند مختلف حالات میں زندگی گذارنے کے بعد وہ لڑکیوں کے ایک تعلیمی سکول میں فرانسیسی زبان کا اُستاد متعین ہوگیا۔

دس بیس سال جو فیوجل نے اس کے بعد گذارے، اتنے پُراسرار ہیں کہ تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھنا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ یہ واقعہ جس کا ذکر صفحاتِ ذیل میں ہونے والا ہے۔ سکول کے عرصۂ ملازمت کے فوراً بعد اسے پیش آیا۔

سکول نے فرانسیسی زبان کے اخذ کرنے میں جو ترقی کی گو وہ معجزنما تھی مگر ساتھ ہی صرف و نحو کے قواعد کو افسوسناک طور پر نظرانداز کیا گیا تھا۔ سہ ماہی امتحان میں، جب پرچے کسی دوسرے اُستاد نے بنائے، نتیجہ نہایت حوصلہ شکن نکلا۔ لڑکیوں نے ترجمے میں عجیب عجیب غلطیاں کیں۔ بعض افعال گرامر کی لاعلمی کے باعث غلط استعمال کئے گئے۔ فرانسیسی تاریخ کے واقعات کو اس طرح خلط ملط کیا گیا کہ ممتحن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

غرضکہ جب ہیڈ مسٹرس کو شُبہ گذرا کہ فیوجل کے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے تو اس نے بذاتِ خود اس کی جماعت کا معائنہ کیا۔ کمرۂ جماعت میں عجیب سا منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ لڑکیوں نے تعلیم کے وقت میں اودھم مچا رکھا تھا۔ فیوجل فرطِ انبساط میں پلیٹ فارم پہ عجیب و غریب حرکات کررہا تھا۔ وہ جماعت کو ایک کہانی سنا رہا تھا۔ اور بیان کرتے وقت اس کا عضو عضو جنبش کررہا تھا۔ جونہی اس کی نظر ہیڈ مسٹرس کی مرعوب کُن شخصیت پر پڑی وہ دم بخود ہوکر رہ گیا۔ اور کہانی کی بقیہ تفصیل دہیں کی دہیں دھری رہ گئی۔ ہیڈ مسٹرس بولی "تم عجیب طریقے سے فرانسیسی پڑھاتے ہو!"

وہ کہنے لگا "مادام میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا طریقۂ تعلیم عجیب و غریب ہے مگر اس کے بغیر میں اپنے سبق کو دلچسپ نہیں بنا سکتا تھا۔"

ہیڈ مسٹرس نے کہا "اس طریقے سے لڑکیوں کو نہیں پڑھانا چاہئے۔ جماعت کو ذرا افعالِ ناقصہ کی مشق تو کرائیے۔"

تو ہیڈ مسٹرس کی شعلہ بار آنکھوں کے سامنے فیوجل نے افعالِ ناقصہ کا سبق پڑھایا۔ افسوس کہ اُسے گرامر سے قطعاً کوئی شغف نہ تھا۔ اس کا سبق ناکام رہا اور وہ ملازمت سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔

دسمبر کی ایک شام کو ایسٹن سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر فیوجل یاس و الم کی تصویر بنا کھڑا تھا جس پر صرف باہر سے آنے والی گاڑیاں آکر ٹھہرتی ہیں۔ اس کے پاؤں کے قریب ایک حقیر سا بقچہ پڑا تھا۔ ہاتھ میں اس نے پھولوں کا ایک بڑا سا ہار پکڑ رکھا تھا۔ یہ ہار ان طالبات کی طرف سے ایک خلوص آمیز پیشکش تھی جو اس کی علیٰحدگی کو بہت محسوس کررہی تھیں۔ قلی بوجھ اُٹھائے جلدی جلدی اِدھر اُدھر جارہے تھے۔ سٹیشن کے باہر اِکّا گاڑیاں کھڑی نظر آتی تھیں۔ کوچبان واٹر پروف کوٹوں میں ملبوس تھے۔ انکے کوٹ بارش میں بھیگ جانے سے چمک رہے تھے۔

اتنی بارش میں مجھے کوئی اِکّا گاڑی لے لینی چاہیئے۔ یا بقچہ ہاتھ

میں تمہارے یا پیادہ چل پڑنا چاہیئے! یہ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بڑا مستعد خادم جو اس کے پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا:-

"معاف فرمایئے! مجھے مسٹر سمتھ نے بھیجا ہے"

"خوب، خوب! مجھے بہت خوشی ہوئی"

"کیا آپ ہی وہ فرانسیسی ہیں جو مانچسٹر سے تشریف لائے ہیں؟"

"بالکل"

"تو مسٹر سمتھ نے آپکے لئے یہ گاڑی بھیجی ہے"

"اُن کی بڑی نوازش ہے!"

خادم بقچہ اُٹھا کر جلدی سے پلیٹ فارم پر سے نیچے اُتر آیا فیوجل اس کے پیچھے ہو لیا۔ خادم نے اسے بٹھانے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ فیوجل سوچنے لگا کہ میں گاڑی میں بیٹھ تو گیا ہوں مگر یہ مسٹر سمتھ ہیں کون؟ جنہوں نے اتنی ہمدردی سے مجھے گاڑی بھیجی ہے۔ پھر خود ہی دل میں کہنے لگا: "اچھا کوئی ہو، اب خود ہی جا کر دیکھ لونگا"

وہ گاڑی پر سوار ہو کر نرم نرم گدیلوں پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

گاڑی چل پڑی اور جلد ہی موسلا دھار بارش کے قطرے تڑاتڑ کھڑکیوں کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ فیوجل نے جل تھل گلیوں کو دیکھ کر اپنے آپکو اس آرام کی حالت میں پاتے ہوئے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے دل میں سوچا کہ جس سکول میں میں پڑھاتا تھا وہاں مس سمتھ نام کی دو چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ شاید یہ اُن ہی کا شریف باپ ہو جس نے مجھے بُلا بھیجا ہے۔ مگر مجھے اس بات سے کیا غرض کہ وہ ضرور میری ہی شاگرد لڑکیوں کا باپ ہو۔ اس نے خود مجھے بُلا بھیجا ہے۔ میرے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ یقیناً ایسا شخص کوئی کھاتا پیتا اور دلچسپ آدمی ہی ہوگا۔ اور لُطف یہ ہے کہ مجھے غائبانہ طور پر اب اس سے کچھ مناسبت بھی پیدا ہونے لگی ہے۔

گاڑی ایک ہیمپ سٹیڈ میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اور جہاں تک اندھیرے میں اُس کی نگاہ کام کرتی تھی، مکان کی ملحقہ زمین بہت ہی میں ٹھہرائی گئی۔ خادم نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور فیوجل کو اُتار کر سیڑھیوں پر لے آیا۔ ایک خادمہ نے ایک بڑے سے ہال میں اس کا استقبال کیا۔ اور اس کا کوٹ اور ہار اُتار کر کہنے لگی یہ مسٹر سمتھ ابھی تک شہر سے واپس نہیں آئے۔ ہاں مس کرسٹابیل ڈرائنگ روم میں موجود ہیں"

فیوجل بولا: "مجھے وہ ہار ذرا دیدیجئے"

خادمہ اُسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں ایک مہ لقا دوشیزہ ایک نازک سے سٹول پر جلوہ افروز تھی۔ فیوجل کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور ایک دلرُبا تبسم کے ساتھ اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔ "دوپہر بخیر، مسٹر بیرن! میں سوچ رہی تھی کہ تھامس تمہیں پہچان سکے گا؟ مگر خوش قسمتی سے اس نے تم کو پہچان ہی لیا۔ دیکھئے نا، نہ میں نے اور نہ اباجان نے اس سے پہلے تم کو دیکھا تھا۔ اس لئے ہم تمہارے حلیے کے متعلق اُسے کچھ نہ بتا سکتے تھے!"

فیوجل کو یہ بات پسند تو بہت آئی مگر اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اسے بیرن کے معزز لقب سے کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ انگریز لوگ اس لقب کو بہت مقبول سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا "مادموزیل! تھامس بہت ہوشیار آدمی ہے"

اس کے بعد کچھ لمحے سکوت رہا۔ مس کرسٹابیل کبھی فیوجل کی طرف اور کبھی اس کے ہار کی طرف دیکھتی۔ اور فیوجل کبھی کرسٹابیل کی طرف اور کبھی اپنے ہار کی طرف اور پھر کرسٹابیل کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس نے کہا: "مادموزیل! کیا تم یہ ہار قبول کرو گی؟"

کرسٹابیل نے ہار لے لیا اور ایک دلکش انداز میں شرما سی گئی۔!

اُس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ چھوٹی سی دلفریب ستواں ناک اور دُنیا بھر میں سب سے چھوٹا مُنہ تھا، کہنے لگی: "ایک فرانسیسی کو کبھی ایسا خیال نہیں آسکتا"

فیوجل یہ سنکر مسکرانے لگا۔ اور اپنا ہاتھ کانوں تک لیجا کر، جیسے تو بہ کہتے وقت لوگ عام طور پر کرتے ہیں، کہنے لگا: "ایک فرانسیسی کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ بڑا کشادہ دل ہوتا ہے"

کرسٹابیل یہ سنکر خوشی سے ہنسنے لگی اور اُسے آگ کے سامنے بٹھا کر چائے اور چپاتیوں سے اسکی خوب خاطر مدارات کی۔ اس میزبان لڑکی کے آزادانہ دلکش انداز کو دیکھکر فیوجل کے دل سے اس عجیب اتفاق کے تمام تاثرات دُور ہو گئے، جو مسٹر سمتھ کے گھر پہونچ جانے کے سلسلہ میں اُسے پیش آیا۔ یہ ایک الف لیلوی سحر تھا جس نے اُسے ایک یاس انگیز حالت سے اُٹھا کر اس معطر محل میں، جہاں کرسٹابیل جیسی شہزادی اس کی ہم جلیس تھی، لا بٹھایا۔ وہ آگ کے شعلوں کو اُس کے چمکیلے بالوں میں رقص کرتے اور ہنسی کو اُس کے چہرے پر کھیلتے دیکھکر یوں محسوس کر رہا تھا گویا وہ ہیمپ سٹیڈ کی بجائے بغداد میں بیٹھا ہے۔ اُس نے کہا "کرسٹابیل، تم تو کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہو!" کرسٹابیل بولی "ہاں ایک دفعہ بازار میں مجھے ایک شہزادی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ کیا ہی

اچھی شہزادی تھی!"

فیوجل نے کہا: "او ہو تم بازار میں پھرنے والی شہزادیوں کا ذکر کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں پرستان کی ایک شہزادی سمجھتا ہوں۔"

کرسٹابیل کہنے لگی: "تم نہیں جانتے اگر کوئی آدمی اس قسم کی محبت آمیز باتیں انگریز لڑکیوں سے کرے تو اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔"

فیوجل نے جواب دیا: "انگریز! ہاں مگر ان کی محبت تو ایک ہفتے یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک رہتی ہے اور پھر انڈے کی طرح گندی ہو جاتی ہے۔ ہم برِ اعظم یورپ کے رہنے والے، ہم تو حسن کو اپنے دل کی گہرائیوں سے خراج دیتے ہیں۔ ہماری محبت حقیقی اور گہری ہوتی ہے۔ اور جو چیز دل سے پیدا ہو اس کا مضحکہ نہیں اڑایا جاتا۔"

کرسٹابیل پھر ہنس کر بولی: "میں تو ہمیشہ یہی سنتی آئی ہوں کہ کسی فرانسیسی کو جس عورت سے بھی ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔"

فیوجل کہنے لگا: "ہاں، کیوں نہیں! اگر وہ کوئی حسین عورت ہو تو!"

کرسٹابیل جس کو آج تک یہ بات معلوم نہ تھی بولی: "خوب۔"

فیوجل بولا: "تو مجھے تم سے محبت ہے!"

"میں حیران ہوں کہ اگر میرے منگیتر کو اس بات کی خبر ہو جائے تو وہ کیا کہے گا؟"

"تمہارے ــــ؟"

"ہاں ہاں میرے ہی منگیتر کو! وہ دیکھو میرے قریب ہی میز پر اس کا فوٹو پڑا ہے وہ چھ فٹ کا ایک دراز قد نوجوان ہے اور عاشقِ صادق ہے۔"

"تو کیا یہ کوئی ترک ہے؟"

"میں تمہاری بات سے ناک بھوں تو نہیں چڑھاتی مگر میرے منگیتر کو ترک کہنا مناسب نہیں، وہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور مجھے بہت چاہتا ہے۔"

"اس خوش قسمت کا نام!"

کرسٹابیل نے اس کا نام بتایا ــــ ہیری رالسٹن ــــ یہ محض ہیری رالسٹن ہی نہ تھا بلکہ آنریبل ہیری رالسٹن تھا۔ بڑا امیر آدمی اور بڑی جائیداد کا وارث تھا۔ پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا۔ ہیمپ شائر میں اس کا ایک عظیم الشان مکان بھی تھا۔ جو آرٹ کے خوبصورت ترین نمونوں کا ایک مرقع تھا۔ کرسٹابیل کا باپ اور ہیری اکثر اکٹھے ہی تعلقات

صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ان دونوں میں گہرا رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔

کرسٹابیل نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو ہم نے یہاں کتنی نفیس تصویریں جمع کر رکھی ہیں۔"

فیوجل نے دیواروں پر نظر دوڑائی وہاں سونے کے فریموں میں جڑی ہوئی بہت سی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ ان دنوں فیوجل کا مذاق اتنا پختہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ چمکیلے بالوں میں سے جھانکتا ہوا کرسٹابیل کا پُرنور فردوسی چہرہ اس کے سامنے تھا اور اُسے گوارا نہ تھا کہ ایک جیتی جاگتی حقیقی تصویر سے نظر ہٹا کر دیوار پر کی مصنوعی تصاویر کو دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔ کرسٹابیل نے اس کی چھپتی ہوئی نگاہ سے متاثر ہو کر کہا: "میرا خیال تھا تم کوئی دقیق شناس آدمی ہو گے!"

فیوجل نے اپنی چمکیلی آنکھیں کرسٹابیل کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا: "کیوں نہیں؟"

وہ شرما سی گئی اور اٹھ بیٹھی، کہنے لگی: "مجھے کھانے کا لباس تبدیل کرنے کیلئے اب چلنا چاہیئے، شاید اب تم وہ کمرہ جو تمہارے قیام کیلئے مخصوص کر رکھا ہے، دیکھنا پسند کرو۔"

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر بولا: "مادموزیل! کیا میں نے کوئی گستاخانہ بات تو نہیں کی؟"

وہ کہنے لگی: "مجھے نہیں معلوم۔"

پھر خادم فیوجل کو دری بچھی ہوئی کشادہ سیڑھیوں پر سے خوابگاہ میں لے گیا۔ اس سے پہلے اُس نے اپنی زندگی میں ایسا کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ پردے، قالین، صوفے، ساٹن کے لحاف، اور لکھنے کی خوبصورت میزیں، سب اپنی اپنی جگہ پر مزین تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی نمودار تھی۔ انگیٹھی میں خوشگوار آگ جل رہی تھی۔ فیوجل کا اپنا سامان ترتیب سنگھار میز پر پڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوٹ کیس نہ تھا۔ خادم نے اس کا قیمتی فراک کوٹ اور پتلون کا فالتو جوڑا بستر ہی پر رکھ دیا۔ سرہانے پر اس کی رات کو پہننے والی قمیص پڑی تھی!

فیوجل نے ان تکلفات سے متاثر ہو کر دل میں کہا، اب مجھے نہا کر اپنا لباس تبدیل کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے یہی میرے سونے کا کمرہ ہے۔

فیوجل نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا ــ سفید ٹائی اور بادامی رنگ کے تقریباً نئے ہی بوٹ ــــ اور ڈرائنگ روم میں پہونچا۔ کرسٹابیل وہاں پہنچی تھی۔ آتشدان کے پاس ہی ایک گنجے سر والا، سُرخ چہرے والا،

انگریز بیٹھا تھا جس کی آنکھیں چھوٹی سی تھیں اور اخلاق پسندیدہ تھے، اس نے کھانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ اپنے بازو پھیلا کر کہنے لگا۔ "میرے دوست! میں تمہیں یہاں دیکھکر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں تمہارے متعلق کچھ سُن چکا ہوں۔ اور میری یہ لڑکی تمہاری بہت تعریف کرتی ہے!"

فیوجل بولا "مادموزیل بڑی مہربان ہیں"

مسٹر سمتھ نے کہا: "تم دیکھ رہے ہو ہم معمولی سے لوگ ہیں۔ مگر خیر، یہ لو اعلیٰ درجے کی شراب کی بوتل اور سگرٹ۔ تم جانتے ہی ہو کہ صرف انگلستان ہی میں پینے کے قابل اچھی شمپین اور سگرٹ مل سکتے ہیں۔ انگریزی وضع کا یہ مکان بھی ایک معقول جگہ ہے، میرا خیال ہے کہ فرانس میں ایسی جگہیں کہاں!"

فیوجل نے اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنے ملک کے خلاف ایسی غیر معقول باتیں سُنی تھیں کہنے لگا: "تو گویا فرانس میں سب آدمی قہوہ خانوں ہی میں رہتے ہیں"

مسٹر سمتھ نے بڑے شوق کے ساتھ جواب دیا: "بھائی، پھر بھی انگلستان ہی اچھی جگہ ہے۔ ہے نا؟ گو یہ ٹھیک ہے کہ پیرس بھی اپنی جگہ ایک دلکش شہر ہے!"

کھانے کا اعلان کر دیا گیا۔ فیوجل نے کرسٹابیل کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا۔ وہ نہ صرف اس لئے خوش تھا کہ اُسے کرسٹابیل جیسا اچھا ساتھی مل گیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فراک کوٹ، سفید ٹائی اور چمکدار بادامی بُوٹ پہنکر کھانے میں شریک ہو رہا ہے۔

وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ میزبان ایک خوشنما میز کے ایک سرے پر بیٹھا تھا۔ کرسٹابیل دائیں طرف تھی۔ فیوجل بائیں طرف بیٹھ گیا۔ کھانا ایک خوشگوار انداز میں شروع ہوا۔ سمتھ بڑا مسرور نظر آتا تھا۔ کہنے لگا۔

"فیوجل! تمہارے پُرانے دوست جیول کیسے ہیں؟"

فیوجل نے اپنے دل میں سوچا کہ جیول میرا دوست کہاں سے نکل آیا۔ مگر اس نے جرأت کر کے جواب دے ہی دیا: "اور تو سب طرح خیریت ہے مگر کبھی کبھی اسے وجع المفاصل کی شکایت ہو جاتی ہے"

سمتھ بولا: "مجھے بھی یہ تکلیف اکثر رہتی ہے۔ اسے چھوڑیئے!"

فیوجل نے کہا: "جیول بھی تمہاری طرح بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق اکثر ذکر کیا ہے"

اسکے بعد فیوجل فرانس کے متعلق عجیب و غریب باتیں سُنانے لگا۔ اس نے انہیں اس زمانے کی بہت سی باتیں بتائیں جب وہ سکول ماسٹر تھا۔ یہ سب باتیں سُنکر سمتھ بولا: "میں نے پہلی دفعہ ایک فرانسیسی کو اتنی پُر لطف اور پُر مزاح باتیں کرتے سُنا ہے" پھر کہنے لگا: "بیرن! میرا خیال تھا کہ تم نے اپنی زندگی اپنے پُرانے شاتو[۱] میں رہ کر گزار دی ہوگی —!"

فیوجل نے جواب دیا: "ہاں مسٹر سمتھ! میں بیرن ہوں پھر بھی اپنے اسی پُرانے شاتو میں رہتا ہوں"

کرسٹابیل نے پوچھا "کیا تمہارے شاتو کے پاس کوئی خندق، کوئی متحرک پُل اور کوئی چھوٹا گرجا بھی ہے"

فیوجل نے ذرا فخر کے ساتھ کہا: "ایک کیا دو گرجے ہیں"

کرسٹابیل کہنے لگی: "میں لینگوڈ کے متعلق بات کر رہی ہوں —"

لینگوڈ! یہ تو فیوجل کا اپنا ہی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہاں آنکھوں کا استقبال کرنے کو بہت سے مناظر موجود ہیں۔ فیوجل نے اس ہال کی تفصیل شروع کر دی جو اب تقریباً نابود ہو چکا تھا۔ اور جس کے قریب خندق، گرجا، متحرک پُل سب کچھ تھا۔ مگر یہ تو بالکل حقیر سی چیزیں تھیں۔ اس کے آراستہ کئے ہوئے راستے، اس کے برج، اس کی پناہ کی جگہیں، اس کے بے شمار کمرے، جن میں دو سو مسلح آدمی ایک ہی وقت میں کھانا کھا سکتے تھے۔ اور اس کا وہ خاص کمرہ جس میں جان آف آرک قتل کی گئی تھی — یہ تھیں قابل دید چیزیں! فیوجل نے اس جگہ کو کچھ ایسے انداز میں پیش کیا۔ کہ بھولے بسرے کی ساری یادگاریں سامعین کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح کتے، گائیں، بطخیں اور مرغابیاں وہاں محفوظ رکھی جاتی تھیں، اور کس طرح ایک بڑے تالاب میں کھانے کے لئے مینڈک پالے جاتے تھے۔

کرسٹابیل کپکپاتی ہوئی بولی: "میں تو مینڈک کھانا کبھی گوارا نہ کروں"

اس کا باپ کہنے لگا: "وہ لوگ تو گھونگے بھی کھاتے تھے"

فیوجل بولا: "ہاں میرے پاس بھی ایک خاص جگہ ہے جس میں گھونگوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ان جیسے دلچسپ جانور نہیں دیکھے۔ یہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔ اور اگر تم محبت سے کھانے کی کوئی

---

[۱] فرانسیسی وضع کا دیہاتی مکان!

چیز اپنے ہاتھ پر رکھ کر اٹھیں دو تو وہ تمہارے ہاتھ پر کھانے لگ جائیں گے۔"
مسٹر سمتھ بولا "فیوجل! تم ان تصویروں کے متعلق کچھ بہت بھول ہی گئے۔"
فیوجل نے اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا "ہاں ہاں تصویریں، گیلریاں ان سے بھری پڑی ہیں۔ وہاں سب کے شاہکار موجود ہیں۔"
اس نے ذرا توقف کیا — اس لئے نہیں کہ وہ ڈرامائی شان کے ساتھ کچھ بیان کرنے والا تھا بلکہ اس لئے کہ اور بہت سے مصوروں کے نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ وہ بولا "فی الحقیقت یہ ایک تاریخی شاتو ہے۔"
کرسٹابیل بولی "میں اسے ایک بار ضرور دیکھنا چاہتی ہوں۔"
فیوجل نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مادموزیل! یہ شاتو تمہارا اپنا ہی ہے۔ شادی کا زمانہ وہاں خوب وہیں گذارنا۔"
اب کھانا ختم ہو چکا۔ کرسٹابیل، سمتھ اور فیوجل کو شراب پینے چھوڑ کر خود چلی گئی۔ یہ شراب پرتگال کی تھی جس کی تعریف میں سمتھ رطب اللسان تھا۔ فیوجل پرتکلف کھانوں اور شراب سے سیر ہو کر قدرے لیسنگوڈ کے خوشگوار تصور سے دل کو مسرور کئے ہوئے اور ایک بڑا سا سگار منہ میں دبائے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ اسے مسٹر سمتھ سے جو ایک متواضع آدمی تھا، ایک طرح کا انس ہو گیا تھا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اس کے پاس ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا یوں سمجھئے کہ ایک سال تک رہ سکتا تھا!
قہوے اور شراب کے دور کے بعد سمتھ نے ایک تیز قمقمہ روشن کیا اور کمرے میں لٹکی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو ایک کیل کے سہارے آویزاں تھی۔ اس نے فیوجل کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور پردہ اٹھا کر تصویر کو نمودار کرتے ہوئے کہا "یہ دیکھو۔ کیا یہ تصویر حیرت انگیز نہیں؟"
یہ ایک تصویر تھی جس میں آسمان، پانی، اور درخت، سفیدی مائل سیاہ رنگ میں نمودار تھے۔ اور سامنے ایک چھوٹے آدمی نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔
فیوجل جو حسین چیزوں کے دیکھنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتا تھا چلا اٹھا "کتنی خوبصورت ہے کتنی شاندار ہے۔"
"کارٹ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہے، ہے نا؟"
"بیشک!"

سمتھ نے فیوجل کی پسلیوں پر تھپکی دی اور کہنے لگا "میں نے تمہیں حیران ہی تو کر دیا۔ کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ کالس چاک ایسی تصویر بنا سکتا ہے! حالانکہ یہ اسی نے بنائی ہے۔ جب تم یا کوئی اور شخص اسے کارٹ کا شاہکار کہہ دیتا ہے تو میں فرط مسرت سے دیوانہ ہی ہو جاتا ہوں ——"
فیوجل نے اس کے سرخ چہرے پر ایک تیز نگاہ دوڑائی۔ اسے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں فریب کی ایک جھلک نظر آئی۔
سمتھ بولا "اب تو سارا معاملہ صاف ہو گیا۔"
"ہاں ہاں بالکل۔" فیوجل نے کہہ تو دیا مگر یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔
سمتھ بولا "اب جبکہ تم نے اس تصویر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تمہارے خیال کے مطابق اس کی کتنی قیمت ہو سکتی ہے۔ میں نے تو دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان تجویز کی ہے۔ اب تم اس تصویر کے فرضی مالک ہو۔ تم نے سمجھ لیا؟ ذرا اسی طرح گاہک کے سامنے اسے پیش کرنا جس رنگ آمیزی کے ساتھ تم نے اپنی تاریخی شاتو کو پیش کیا تھا۔"
فیوجل نے متانت سے کہا "اس کی قیمت تین ہزار پونڈ ضرور ہو گی۔"
سمتھ کہنے لگا "وہ نوجوان جو اس کا خریدار ہے کہتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ مگر اسے کچھ بھی معلوم نہیں۔"
فیوجل نے عجیب اختصار کے ساتھ جواب دیا "خوب.....!"
سمتھ بولا "عجب نہیں وہ تین ہزار پونڈ ہی مان جائے —— اور یہی اس کی صحیح قیمت ہے —— ہے نا؟ بات یہ ہے کہ ہیری، اس کا خریدار، ایک بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ اور تین ہزار پونڈ اس کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں۔"
فیوجل بولا "مگر وہ تصویر کو دیکھ چکا ہے یا نہیں؟"
مسٹر سمتھ نے کہا "وہ تو اسے ایک شاہکار خیال کرتا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ مجھے تصویر کے سودے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کا مالک تو ایک فرانسیسی نوجوان ہے اور وہی اس کی قیمت مقرر کریگا۔"
فیوجل دل میں خیال کرنے لگا کہ یہ وہی آنریبل ہیری تو نہیں، جو کرسٹابیل سے منسوب ہے۔
سمتھ بولا "میں نے اسے بتایا تھا کہ ممکن ہے اس کی قیمت تین یا چار ہزار تک پہونچ جائے۔ یہ سنکر وہ ذرا گھبرا سا گیا تھا۔ میں نے

جب یہ دیکھا تو اُسے بتایا کہ شاید دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان ہی سودا چک جائے۔ چنانچہ میں نے تم کو یہی قیمت لکھدی۔ اب تم تین ہزار سے شروع کرنا۔"

فیوجل نے میز پر جاکر شراب کا ایک گلاس چڑھایا۔ اور بولا۔ "بہتر!"

سمتھ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو تیزی سے جنبش دیتے ہوئے کہا: "اب آؤ آپس میں فیصلہ کرلیں۔ ذرا انصاف سے کہو تمہارا کمیشن کتنا ہوگا؟ دیکھو بیرن، یہ سب حکمت میرے ہی دماغ نے اختراع کی ہے۔ ذرا خیال تو کرو مجھے کتنی تکلیف کا سامنا ہے۔ کہو چار سو پونڈ مناسب ہونگے؟"

فیوجل نے جواب دیا: "نہیں پانچسو!"

سمتھ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو ضرور اتنے اہم کام کے لئے ایک ہزار پونڈ طلب کرتا۔ اور میں خود بھی آٹھ سو پونڈ دینے پر تیار تھا۔

اُسنے کہا: "بات ہوچکی؟"

فیوجل بولا: "ہوچکی۔"

دونوں نے باہمی فیصلے پر مہر تصدیق لگانے کے لئے ایک دوسرے سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملائے اور کہنہ شراب کے دو گلاس چڑھائے۔ اسی اثنا میں ایک خادم اندر داخل ہوا، اور سمتھ کو ایک طرف لے گیا۔

سمتھ نے کہا: "معاف رکھنا بیرن! ایک منٹ کے لئے میں باہر جارہا ہوں۔"

فیوجل نے اپنے میزبان کا موٹا سا سگار سُلگایا اور آتشدان کے قریب بازوؤں والی چمڑے کی کرسی پر لیٹ کر خوشگوار خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ کبھی وہ اپنی عجیب و غریب حالت کو دیکھکر ہنسنے لگتا تھا۔ اسکے خیال میں مسٹر سمتھ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔

اس کے خوشگوار خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کا میزبان ایک بھورے رنگ کے عجیب چہرے والے خاصی عمر کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اُس کی مونچھیں سفید تھیں اور اُس کے اوورکوٹ کے بٹن کے سوراخ میں فوج کا امتیازی تمغہ لٹک رہا تھا۔

مسٹر سمتھ کا چہرہ فرط غضب سے سرخ ہو رہا تھا۔ فیوجل کے قریب جاکر کہنے لگا: "تم بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟"

فیوجل اپنے ہاتھ فراک کوٹ کے پیچھے رکھکر ہنستے ہوئے آتشدان کے قریب ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا: "دوست میں بیرن ہوں!"

سمتھ تیز آواز میں پوچھنے لگا: "تم تو کوئی بدمعاش معلوم ہوتے ہو۔"

فیوجل ذرا ملائم لہجہ میں بولا: "اور یہ شریف زادہ کون ہے جس کی ملاقات کا شرف ابھی تک مجھے حاصل نہیں ہوا؟"

اجنبی ذرا فخریہ انداز میں کہنے لگا: "میں موسیو پاترن ہوں۔ برن برجر کا ایجنٹ!"

فیوجل بولا: "میرا خیال تھا تم کوئی بیرن ہوگے۔"

سمتھ چلاکر کہنے لگا: "ٹھٹھا مخول نہ کرو۔ کہو تم بیرن ہو یا یہ؟"

فیوجل بولا: "میں دُنیا بھر کی دولت کے لئے بھی پاترن کا نام اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرا نام آرسٹائیڈ فیوجل ہے۔"

"تو تم یہاں آ کیسے گئے؟"

"تمہارے خادم نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر پوچھا: کیا تم ہی مانچسٹر سے آنے والے فرانسیسی ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ کہنے لگا۔ مسٹر سمتھ نے تمہارے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ میں نے سوچا یہ مسٹر سمتھ کوئی بڑا مہمان نواز شخص ہوگا۔ جس نے اتنی محبت سے گاڑی بھیجی ہے۔ میں اس پر سوار ہوگیا۔"

مسٹر سمتھ نے اپنا ہاتھ گھنٹی کے بٹن تک لیجاتے ہوئے کہا: "تو اسی وقت کمرے سے باہر ہوجاؤ۔"

فیوجل نے اس کی مشتعل طبیعت کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا: "بھائی میزبان، دیکھو باہر چھاجوں پانی برس رہا ہے۔ مجھے تمہارے پُرتکلف گھر میں بہت آرام ہے۔ میں یہیں رہونگا۔"

مسٹر سمتھ کا چہرہ زیادہ سُرخ اور وحشتناک ہونے لگا۔ اُس نے کہا: "اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو میں تمہارے لئے زندہ درگور ہوں۔ اب بتاؤ تم خود نکلوگے یا تمہیں پھینک کر باہر نکالا جائے۔"

فیوجل سگرٹ کا کش لگاکر کہنے لگا: "تم بھول گئے ہو کیا؟ کہ جب دلکش مس کرسٹابیل کے منگیتر کو معلوم ہوگیا کہ جس تصویر کے تم تین چار ہزار پونڈ مانگتے ہو، گوفس چاک کو صرف آٹھ پونڈ اُجرت دے کر بنوائی گئی ہے تو......"

"کیا کہنا تمہاری عقل کا!"

"تم ابھی دیکھ لوگے۔"

"ارے او بدمعاش، پاجی!"

"کتنی اچھی اور نیک مجلس میں میں بیٹھا ہوں"

"تو پھر تم باہر چلے جانے کے لئے کیا لوگے، یہ دیکھو چیک بک!"

یہ کہکر مسٹر سمتھ آتشدان سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ فیوجل بارڈوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "میں اندر رہنے کے لئے پانچ سو پونڈ لوں گا!"

"اندر رہنے کے لئے!" مسٹر سمتھ نے غضب آلود ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں اندر رہنے کیلئے۔ میرے بغیر تمہارا کام نہیں چلے گا تمہاری لڑکی اور تمہارے خادم مجھے ہی ہیرن سمجھتے ہیں"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہاری گردن توڑ دوں بخدا، اگر تم کو اندر ہی رہنے کی اجازت مل گئی تو تمہیں ایک شرائط نامے پر دستخط کرنے پڑینگے، میں اتنا بیوقوف نہیں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں"

"جو بھی تم چاہو!"

مختصر یہ کہ فیوجل اس سودے میں شریک کر دیا گیا۔ پلاٹ یوں تیار کیا گیا کہ فیوجل مالی مشکلات سے تنگ آکر اپنی یہ تصویر بیچنے پر مجبور ہے۔ مسٹر سمتھ کو اس بات کی اطلاع ملی ہے۔ اور اس نے ایک دوست کے ذریعے سے آنریبل ہیری — اپنے ہونے والے داماد کو، اطلاع دی ہے۔ قیمت کا فیصلہ کرنے کیلئے مالک خود آیا ہے۔ مسٹر پائٹرن، جو اتفاق سے اس وقت لندن میں ہے، اس قسم کے سودے چکانے میں بڑا ماہر ہے۔ وہ بھی مسٹر سمتھ کے ایما سے اس کے مکان پر آگیا ہے تاکہ تصویر کو اچھی طرح دیکھ کر اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کرے۔

فیوجل بولا "صحیح طور پر اس سودے میں مسٹر پائٹرن کا دخل انداز ہونا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ ابھی واپس چلا جائے!"

مسٹر پائٹرن بولا "میں اتنی بارش میں واپس نہیں جا سکتا۔ اسکے علاوہ میں کوئی ناخواندہ مہمان نہیں ہوں"

اس اثناء میں دروازہ کھلا۔ اور مس کرسٹابیل نمودار ہوئی۔ اجنبی پائٹرن کو دیکھتے ہی وہ حیران سی ہو کر رہ گئی۔ مسٹر سمتھ کے کبیدہ چہرے پر تبسم رقص کرنے لگا وہ بولا "میری پیاری بچی! یہ پیرس کے مشہور مسٹر پائٹرن ہیں جو اس تصویر کے متعلق اپنی رائے دینے آئے ہیں"

پائٹرن نے اپنا سر جھکا لیا۔ فیوجل آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "مادموزیل! تمہارا چہرہ دیکھکر مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پیاسا ریگستان میں نخلستان دیکھ لے"

کرسٹابیل دلفریب تبسم کے ساتھ باپ سے کہنے لگی "نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہیری آدھ گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اور تمہیں خبر ہی نہیں"

سمتھ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ جواب دیا "میری پیاری بچی۔ اسے یہاں لے آؤ۔ میرے یہ دوست اس کی ملاقات کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں"

لڑکی کمرے سے یوں جھٹ سے غائب ہو گئی جیسے کوئی روشن شمع فوراً بجھ جائے۔ اور یہ تینوں بدمعاش ایک دوسرے سے سر جوڑ کر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ کرسٹابیل جلدی سے واپس آگئی۔ اس کے ساتھ آنریبل ہیری بھی تھا — لمبا قد، کنگھی کئے ہوئے خوبصورت بال، اور مونچھیں، بڑی بڑی نیلی آنکھیں — اس نے سمتھ سے مختصر سے آداب و نیاز کے بعد فیوجل سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "ہیرن! یہ کتنی خوشنما تصویر ہے، نہ جانے تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کر دگے؟!"

فیوجل کی پشت کھانے کی میز کے ساتھ تھی۔ اس کی نگاہ شاہکار پر مرکوز تھی۔ کہنے لگا "ایسی بہت سی تصویریں میرے شاتو میں موجود ہیں۔ میرے باپ اور دادا اور خود مجھے ایسی چیزوں کے فراہم کا خبط ہے"

پائٹرن بولا "تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے معزز دادا نے براہ راست کارٹ سے یہ تصویر خریدی تھی"

فیوجل نے جواب دیا "ہاں ہاں میرے دادا کارٹ کے بڑے مداح تھے"

آنریبل ہیری نے کہا "کیا تمہیں یہ پسند ہے پیاری!"

کرسٹابیل نے بڑے اشتیاق سے کہا "ہاں تو، دیکھو یہ کتنی خوبصورت ہے۔ فیوجل! معلوم نہیں تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کروگے۔ یہ جو تم نے کہا تھا کہ میرے میں آکر سب تصویریں دیکھ لینا۔ کیا واقعی خلوص سے تم نے دعوت دی ہے؟"

فیوجل بولا "میرے لئے تمہاری ملاقات ایک سحر انگیز ملاقات سے کم نہ ہوگی"

کرسٹابیل نے آہستہ سے ہیری سے کہا "تو پھر مجھے وہاں ضرور لے جانا"

فیوجل نے کہا "موسیو کیا تم بھی آؤ گے؟"

ہیری بولا: "میں یہ تصویر تم سے چھین رہا ہوں۔ کہتے ہو تو اس کی معافی طلب کرنے کے لئے وہاں آجاؤں گا......... آہا کتنی دلکش چیز ہے"

فیوجل جو اب کرسٹابیل کی سحر طراز آنکھوں اور گلابی گلابی رخساروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا: اُسے ایک طرف کھینچ کر کہنے لگا: "کرسٹابیل تمہارا منگیتر تو بڑا خوبصورت آدمی ہے۔ اتنی بڑی جائیداد اُسے مبارک ہو"

مسٹر پاٹرن کی ناگوار آواز نے ان دونوں کی گفتگو کے طلسم کو توڑ دیا۔ کہنے لگا: "دیکھو، کارٹ نے اس تصویر کو اپنے آخری سٹائل کے مطابق بنایا ہے۔ اگر اسے نمائش میں رکھ دیا جائے تو یقین ہے کہ اس کی قیمت پانچ ہزار پونڈ سے کم نہ ہو"

ہیری نے متبسم ہو کر جواب دیا: "پانچ ہزار کی رقم تو بہت زیادہ ہے۔ اتنی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ مسٹر سمتھ تو کہتے تھے کہ تین اور چار ہزار کے درمیان سودا چک جائے گا۔ میں تین ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا"

مسٹر سمتھ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا: "ہیری! مجھے اس معاملے سے کیا تعلق، میں باہر چلا جاتا ہوں ہیرن خود تمہیں قیمت بتا دیگا"

ہیری نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا: "تو ہیرن کہو تمہارا کیا خیال ہے"

فیوجل میز پر بیٹھ گیا۔ تصویر اُس کے سامنے تیز برقی روشنی میں چمک رہی تھی۔ کہنے لگا: "میں اس کے لئے تین ہزار پونڈ کبھی نہیں لونگا۔ نہیں ہرگز نہیں!!"

پاٹرن بولا: "مسٹر فیوجل یقین جانو یہ مناسب قیمت ہے!"

فیوجل بولا: "یہ تصویر میری ذاتی ملکیت ہے"

سمتھ نے جواب دیا: "کیوں نہیں۔ کون کہتا ہے یہ تمہاری نہیں ہے!"

"تو پھر اب میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اور اسے فروخت کرنا نہیں چاہتا!"

سمتھ نے اپنی ہڈیوں کے مغز تک کانپتے ہوئے اپنے ابرو حیرانی سے اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا: "کیا! کیا؟ ارادہ بدل لیا ہے؟ تو اب تم اسے فروخت کرنا نہیں چاہتے!"

فیوجل بولا: "نہیں چاہتا، دوست! ذرا غور سے اس بات کو سنو! میں یہاں تمہارے سامنے اس بات کا اظہار کئے دیتا ہوں کہ مجھے مادموزیل کرسٹابیل سے اُلفت ہے!"

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ مسٹر سمتھ اپنے سرخ چہرے اور کھلے مُنہ کے ساتھ فیوجل کی طرف دیکھنے لگا۔ مس کرسٹابیل کے چہرے پر فرطِ حیا سے خون دوڑنے لگا۔ اور ہیری کی آنکھیں خون برسانے لگیں۔ اُس نے کہا۔

"کیا کہا جناب؟"

فیوجل نے اُس کی طرف مخاطب ہو کر کہا: "میں مادموزیل کو تم سے چھیننا نہیں چاہتا۔ میری محبت ایک اُمید موہوم ہے۔ مگر یہ اُلفت مرتے دم تک میری رُوح کو خوراک بہم پہنچائے گی اور اس ناکام محبت کی خوشی میں یہ تصویر تم کو تحفے کے طور پر مفت دوں گا"

وہ ایک ہیرو کی طرح اپنے بازو آگے بڑھاتے ہوئے استقلال سے کھڑا تھا۔ ہیری اور کرسٹابیل حیران و مبہوت ایستادہ تھے۔ اُس نے کہا: "یہ تصویر میری ہے اور میں ہی تمہیں دے رہا ہوں مجھے اس تحفے سے محض تمہاری مسرت مقصود ہے"

مسٹر سمتھ بگڑ کر بولا: "کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

ہیری بولا: "دوست! تمہاری یہ فیاضی بے نظیر معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اس تصویر کو تحفے کے طور پر قبول کرنے میں عُذر ہے!"

فیوجل نے ایک عجیب سے انداز میں آگے بڑھ کر کہا: "تو پھر میں اُسے بغل میں دبا گاڑی پر سوار ہو کر ابھی اپنے شہر کو واپس چلا جاتا ہوں!"

اور بالآخر انہیں یہ تصویر قبول کرنی ہی پڑی۔

اس تحفے کے بعد فیوجل ان دونوں —— ہیری اور کرسٹابیل کا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ان کی شادی پر بھی شامل ہوا۔

تصویر ابھی تک ہیری کے مکان کی زینت ہے مگر فیوجل کا تاریخی شاتو اس واقعے سے چند ہی روز بعد جل کر راکھ ہو گیا۔ نہ معلوم یہ کِس کا کام تھا؟

(یہ تلخیص از ڈبلیو، جے، لوکی۔)

طاہر قریشی۔ بی اے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ :-

"فسادی"

افرادِ ڈرامہ

عزت :- بائیس سالہ لڑکی، صندلی رنگ، معمولی نقشہ، بھولا بھالا چہرہ، کسی قدر حسین، بہت جلد ہر بات کا یقین کر لیتی ہے، نرا ڈرپوک، اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی زود رنج۔

الماس :- بیس سالہ گوری چٹی تندرست لڑکی، طبیعت میں چلبلا پن، ناک پر غصہ، بات بات پر روٹھنا اور آنسو بہانا، بول چال بند کرنے کی عادت، گانے کی شوقین، خوش آواز، عزت کی چچا زاد بہن۔

ایاز :- دُبلے پتلے، تیکھے نقشہ، متانت اور سنجیدگی کے مجسمہ، زود رنج مگر صابر، کم سخن، جلد گھبرا جانے والے، گورنمنٹ میں اچھے عہدے پر تازہ تازہ تقرر ہوا ہے۔ عزت کے بچپن کے منگیتر، الماس کے بھائی۔

نشاط :- اٹھارہ اُنیس برس کا جوان جو صرف پندرہ برس کا لڑکا معلوم ہوتا ہے، نحیف آواز کا، پیارا سفید رنگ، گربلا کی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، اور غضب کا چرب زبان اور خوش مزاج، کسی کو چلا نہیں بیٹھنے دیتا، ایاز کا چھوٹا بھائی۔

حورا :- دس گیارہ برس کی موٹی تازی سُرخ سفید لڑکی، ہر وقت اتراتی اور اماں کے لاڈ کی وجہ سے ٹھنکتی رہتی ہے۔

جولی :- آٹھ برس کا بچہ، لڑاکا اور شریر، بُری طرح چیختا اور بات بات پر لڑتا ہے۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے۔

اماں جان :- چالیس پنتالیس سالہ بھاری بدن کی بیوی، بہت غصیل، ڈبل چال، اور دبنگ آواز، ذرا چالاک، بیوقوف۔ بجھنے سے پہلے غصہ۔ پھولی ہوئی سانس مغرور۔

محمود :- خوش وضع جوان، سانولا، تندرست، ورزش کنندہ، بے فکر، تیل کا سوداگر۔ خوب امیر۔ الماس کا منگیتر۔

موسم :- آخری جاڑے۔

زمانہ :- بس یہی ہمارا اور آپ کا۔

پہلا سین

(عزت کا کمرہ، ایک کشادہ کمرہ جو ایک پلنگ، چند کرسیوں اور زمین پر چاندنی اور قالین کے فرش سے مزین ہے، ایک کونے میں

جھکی ہے۔ دو تین صندوق بھی ہیں۔ جن پر سلیقہ سے جانماز یا کوئی کپڑا بچھا ہُوا ہے۔ ایک کونے میں ایک لمبی سی کوچ جس کے پاس ہی کھڑکی ہے جس میں ایک چار کی خالی پیالی رکھی ہے۔ عزّت کوچ پر اس طرح لیٹی ہے کہ دونوں گھٹنے پیٹ میں اڑسے ہوئے ہیں اور کوئی کتاب غور سے پڑھ رہی ہے۔

ایاز :۔ (خاکوٹھی سے کمرے میں داخل ہو کر نرمی سے) عزّت میں نے تمہیں بار ہا منع کیا ہے کہ اس طرح روشنی کی طرف پیٹھ کر کے نہ پڑھا کرو مگر...

نشاط :۔ (صوفہ کے قریب والی کھڑکی سے چڑھتے ہوئے جملہ پورا کرتا ہے) تم مانتی ہی نہیں۔

ایاز :۔ (نشاط کی طرف ایک دم مڑتے ہوئے) نشاط احمد میں نے تم کو بار ہا منع کیا ہے کہ اس طرح اُچکوں کی طرح کھڑکیاں اور دریچے منہ پھلانگا کرو مگر.......

عزّت :۔ (آہستہ سے) تم مانتے ہی نہیں

نشاط :۔ قبلہ بھائی جان۔ میں نے آپ کو بار ہا منع کیا ہے کہ مجھے یہ اسمی مجھے قطعی پسند نہیں مگر آپ ہمیشہ نشاط "احمد" ہی کہتے ہیں۔ آپ مانتے ہی نہیں۔

الماس :۔ (جوٗلی کا ہاتھ پکڑے داخل ہو کر) ہم ایک دوسرے کا کہنا بالکل نہیں مانتے۔ یہ جوٗلی اپنے بھورے جوتے پر سیاہ پالش کئے بغیر نہیں مانتا۔ ذرا دیکھئے گا آپ کے جوتے کیسے بیہودہ رنگ کے ہو گئے ہیں۔

(جوٗلی اِترا اِترا کر پاؤں چھپانا چاہتا ہے۔ اور اس کوشش میں اپنے سفید نیکر کو سیاہ انگلیوں سے میلا کرتا ہے)

ایاز :۔ ارے جوٗلی! (ناصحانہ انداز میں) چچ چچ۔ اتنے بڑے ہو گئے اور اتنے بدتمیز! توبہ توبہ۔

نشاط :۔ (چائے کی چھوٹی پیالی اُٹھا کر ایاز کے سامنے کرتے ہوئے) ذرا پہلے ان محترمہ عزّت کو دیکھئے۔ "یہ سُگھڑاپا نہ ہے"۔ جوٗلی بیچارہ تو خیر بچہ ہے اور یہ مکرمہ تو ماشاءاللہ......

عزّت :۔ (شرمندہ ہو کر) اُونہہ تو اس میں کیا پھوہڑپنا ہے؟

نشاط :۔ (طعنہ سے) جی؟ یہ تو بہا سگھڑاپا ہے (ایاز سے) بھائی جان! قسمت پھوٹی سمجھو۔ جوٗلی غریب کو ڈانٹ رہے ہو اور عزّت صاحبہ کو کچھ نہیں کہتے۔ وہ بیچارہ چھوٹا جو ہے۔ مت رو جوٗلی۔ چچ چچ۔ بے چارہ روتا بھی تو نہیں۔ مت رو......"

(جوٗلی اپنی دردناک حالت کا احساس کر کے واقعی رونے لگتا ہے۔)

نشاط :۔ (پُچکار کر) مت رو۔ غریب کو ابھی تو بخار آیا تھا۔ جب بیچارے کے سوئیاں لگی تھیں اور اب ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ کیا کرے۔

(جوٗلی زور سے روتا ہے۔ ایاز کچھ کھسیانہ کچھ جھنجلایا کھڑا ہے۔ عزّت مُسکرا رہی ہے۔ الماس کچھ غضب ناک کچھ پریشان)

الماس :۔ (ایاز سے) واہ بھائی جان۔ اتنا کیوں ڈانٹتے ہیں۔ (جوٗلی کو پکڑ کر لے جاتی ہے)

ایاز :۔ نشاط تم بڑے وہ ہو۔ آخر ان باتوں سے فائدہ؟

نشاط :۔ (مُسکراتا ہوا عزّت کے بہت پاس گھس کر بیٹھ جاتا ہے) ہاں تو بھائی کہئے آپ کی قسمت پھوٹی یا رہی۔

ایاز :۔ (جل کر) چُپ رہو نشاط۔ (بڑے بڑے ڈگ بھرتے چلے جاتے ہیں)

نشاط :۔ (عزّت کے اور قریب سرک کر) عزّت آپا!

عزّت :۔ نشاط بھئی ذرا ہٹ کر بیٹھو۔ (ذرا ہٹ جاتی ہے)

(نشاط پھر قریب گھس کر بیٹھ جاتا ہے)

عزّت :۔ اُونہہ کھا لیا نشاط تم نے تو (اُٹھ کر کُرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

نشاط :۔ (فوراً کُرسی کے ہتّے پر بیٹھتے ہوئے) ابھی کہاں کھایا۔ ابھی تو چبا رہا ہوں۔

عزّت :۔ (دھکیلتے ہوئے) ہٹ بھئی یہاں سے۔

نشاط :۔ تو خود ہٹ یہاں سے۔

عزّت :۔ دیکھو نشاط میں تم سے بڑی ہوں۔ خبردار جو تُو کر کے بولے۔

نشاط :۔ جی۔ ہوئیں بڑی۔ ایسے بڑے بہت دیکھے ہیں۔

عزّت :۔ بدتمیز کہیں کا۔ میں تجھ سے بہت بڑی ہوں۔ چار برس کے قریب۔

نشاط :۔ ہُوا کرو۔ مگر عقل تو نہیں ہے۔

عزّت :۔ (جل کر) تم تو بس نہ معلوم عقل کے پُتلے ہی ہو نا؟

نشاط :۔ پُتلی وُتلی تو ہو گی تم۔ ہم تو سیدھے آدمی ہیں۔

عزّت :۔ ہو گے۔

نشاط :۔ ہو گے کیا۔ ہیں ہی۔ یہ "مستقبل کی چیزیں" تم ہی ہو۔ تم ہی بس اس آسرے پر ہو کہ نہ معلوم کیا کیا۔ ہو گی۔ ایاز کی بیوی ہو گی۔ میری خدا نہ کرے بھاوج ہو گی۔ رام سرنا کی .....

عزّت :۔ (تھپڑ مار کر) بس چُپ۔ اُلّو کہیں کا۔ زبان ہے کہ قینچی۔

نشاط :۔ دیکھو اگر ہم ماریں گے تو اپنی بزرگی لے کر آؤ گی۔

عزّت :۔ بھئی نشاط کیوں دق کرتے ہو۔ جاؤ نا۔

نشاط :۔ ہوں۔ اور جب غرض پڑتی ہے تو؟

عزّت :- بھیا میرا دماغ مت چاٹ ۔ خدا کے واسطے جا ۔ یا اللہ ۔
نشاط :- (طعنہ سے) یا اللہ بیچاری کو اپنا گھر یاد آرہا ہے ۔ وہاں تو کوئی بھی دماغ نہیں چاٹتا ۔ مت رو ۔ ہم اب تجھے دق نہیں کرینگے ۔
عزّت :- پھر وُہی تو تڑاق ۔ نشاط مہربانی سے میرے کمرے میں سے نکلو ورنہ ..
نشاط :- کیا ۔ کیا ۔ ورنہ .... ورنہ تم منگو سے شکایت کردوگی ؟
عزّت :- (چڑکر) ہائے خدا تم نہیں جاؤ؟ میں خود ہی غارت ہوجاؤنگی
نشاط :- "بسم اللہ"
(عزّت بھناتی ہوئی جاتی ہے)
نشاط : اچھا نہیں ۔ اب نہیں ۔ عزّت آپا! (جھک کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) آپا! آپا!! (آہستہ سے پیار کرلیتا ہے اور چلا جاتا ہے ۔ لیکن دروازہ ہی سے لوٹتا ہے) ارے سُنو تو عزّت !
عزّت : (دھیان نہ دیتے ہوئے) کیا ہے بھئی ۔
نشاط :- سنو ۔ کیا تمہیں یہ لمدراز خاں پسند ہیں؟
عزّت :- (چند ھیا کر) کون لمدراز خاں ۔
نشاط :- (ہاتھ نچاکر) کیسی بنتی ہو ۔ اے وُہی جو تمہارے گلے پیدا ہوتے ہی باندھ دیئے گئے ۔ چڑی کے غلمٹے کی شکل ۔ کیا خوب نام ہے ایاز؟ غلمٹے!
عزّت :- (ہنسی کو دباتے ہوئے) اپنی تو شکل دیکھو سُوئے جیسی ناک مرنگوڑ کہیں کے ۔
نشاط :- میری غریب کی تو ناک آنکھ کا سوال ہی نہیں مگر پھر بھی خاکسار کی ناک انکی بٹے جیسی ناک سے بدرجہا بہتر ہے کیوں جھینپتی ہو ۔ کہدو "قائل ہوگئی" ناک واقعی خطرناک جسامت کی ہے ۔
عزّت :- کوئی نہیں ۔
نشاط :- اے ہم خوب جانتے ہیں ۔ وہ خود تم سے نفرت کرتے ہیں ۔ اجی وہ کیا تم پر مرتے ہیں وہ تو چچی جان کا دل رکھنے کو مجبوراً تمہیں قبولیں ہی قبولیں ۔ مرتا کیا نہ کرتا ۔ ورنہ انکی تو کالج میں مس پر تہبا کر سے بہت ہی ....
عزّت :- (بے طرح ذلیل ہوکر) تو یہاں کون مرتا ہے اُن کے لئے ۔ اُن کی مس پر تہباکر ہوں یا کوئی ہوں ۔
نشاط :- بھئی چچی جان کی دل شکنی کا خیال ہے ۔
عزّت :- (خودداری سے) معاف کیجئے گا ۔ چچی جان کا دل خاک نہیں ٹوٹے گا ۔ وہ ہزار دفعہ انکار کردیں ۔ اونہہ ۔
نشاط :- جی معلوم ہے بس رہنے دیجئے ۔
عزّت :- نشاط (غصہ سے کھڑی ہوجاتی ہے)
نشاط :- عزّت (کھڑکی والے صوفے پر دراز ہوجاتا ہے)

(عزّت کتاب اُٹھاکر ساری سنبھالتی ہوئی تیزی سے باہر نکلنے کے لئے بڑھتی ہے ۔ دروازہ پر گھبرائے ہوئے ایاز سے ٹکر ہوجاتی ہے ۔ کھسیانی ہوکر لوٹ آتی ہے)
(نشاط منہ اور ناک بچوں کی طرح چھپا چھپا کر ہنستا ہے)
ایاز :- عزّت تمہارا قلم ملا؟
عزّت :- (نرمی سے) نہیں! نشاط کہتے ہیں ...... (نشاط کھڑکی میں سے کود جاتا ہے کہ اُنہوں نے آپ کو دیدیا ۔
ایاز :- مجھے ۔ ارے ...... ارے بھئی نشاط ... لو وہ غائب ہوگیا نشاط احمد ....
(دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے)
نشاط :- (کھڑکی میں نیم دراز) ہوں .... (معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) کردی شکایت اپنے چہیتے سے؟ (ہاتھ چلاکر) کیا کرلیا اُنہوں نے ۔ بڑے ۔ گولی ہی تو ماردی نہ ۔
عزّت :- (مجرمانہ لہجہ میں) میں نے شکایت تو نہیں کی تھی ۔
نشاط :- (منہ بناکر) "میں نے شکایت تو نہیں کی" بڑی معصوم بنتی ہیں ۔ کون سخرہ ان سے ڈرتا ہے (اندر آکر) جاؤ سو دفعہ شکایت کرو ۔ نہیں دیتے قلم ۔ کرلو کچھ ۔
عزّت :- بلا سے مت دو ۔ مگر میری جان چھوڑدو ۔ (بے توجہی سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے)
ایاز :- (دروازہ سے) ارے نشاط تم نے مجھے تو عزّت کا قلم نہیں دیا ۔
نشاط :- (مصنوعی حیرت سے) نہیں دیا؟ ارے تو شاید عزّت آپا کو دیا ہوگا ۔ میں نے دیا کسی کو ضرور ہے ۔
(عزّت نشاط کی مکاری پر حیرت سے مسکراتی ہے)
(جوکی دوڑتا ہوا آتا ہے اور ایاز کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا ہے ۔ حورا نیم گریاں ٹھنکتی ہوئی پیچھے پیچھے آتی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کو گھسوٹنے لگتے ہیں)
نشاط :- یں ۔ یں ۔ اے حورا دیکھ ...... بس ...... بس .... ددست جوکی بھئی ایکے ! ! اور بس ۔ نہیں تو میں ٹھونکا ۔ اے بس ۔ با ۔ آ ۔ آ ۔ س ۔
(بیچ بچاؤ ہوجاتا ہے)
ایاز :- تم دونوں کیوں لڑرہے ہو ۔
حورا :- پہلے اس نے .... آں ...... آں ۔ ۔ ... پور ڈالٹ دیا اور لیکے ..... "
جوکی :- (تیزی سے) ہے گپّن .... خود تو مارا .... آپی تو اُلٹا

اور چھوٹا نام بہار لگا رہی ہیں ..... ، ہم نے تو........ واہ ......آن ...

حورا :- نہیں۔ نہیں ..... ہم اسے مار کے رہیں گے۔ چاہے کچھ ہی ہو جائے اس نے مار ہی کیوں (جھپٹتی ہے)

نشاط :- (دونوں کو علیحدہ کرتا ہے) ارے رے رے کیوں کھٹے لیتے ہو۔

اماں جان :- (ایک غمناک چنگھاڑ سنائی دیتی ہے) ارے یہ کیوں حورا ڈکرا رہی ہے۔ ہیں! (ساس تھیلی ہوئی دروازہ میں نظر آتی ہیں) ۔میں کہتی ہوں یہ......

حورا :- اماں ۔ن ۔ یہ جوکی نہیں مانتا .. .. (دُکھ بھری آواز سے روتی ہے)

نشاط :- بیٹا جوکی آگئی تمہاری موت ۔ اُڑو ..... (چٹکی بجاکر) ۔چل ......بھاگ ۔

(جوکی تیر کی طرح دوسرے دروازہ سے غائب ۔ اماں جان حورا کو گھسیٹتی اور سارے گھر پر بڑبڑاتی چلی جاتی ہیں۔ ایک سکون سا کمرے پر چھا جاتا ہے گویا مطلع صاف ہوگیا۔)

دوسرا سین

(نشاط کا کمرہ ۔ایک پلنگ پر نشاط چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ آہٹ پر سوتا بن جاتا ہے، عزت دبے پاؤں آتی ہے ۔اور آہستہ آہستہ تازہ اخبار کے ورق اُلٹنے لگتی ہے ۔ دوسرا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے، اور ایاز پنجوں کے بل داخل ہوتا ہے، اور عزت کی پشت پر سے جھک کر اخبار دیکھنے لگتا ہے ۔عزت چونکتی نہیں ۔ایاز کا بایاں رخسار عزت کے بالوں سے چھو رہا ہے، اور عزت کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ کے ناخون سے ایاز نادانستہ کھیل رہا ہے ۔ایاز کچھ جھک کر کان میں کہتا ہے جس کا جواب عزت بہت آہستہ سے دیتی ہے ۔ دونوں مسکراتے ہیں ایاز کچھ اور کہتا ہے جسکا جواب عزت صرف نظروں سے دیتی ہے ۔نشاط کی چھپلی آنکھ بار بار جھپک رہی ہے ۔کبھی ایک کبھی دوسری ۔ الماس کے بھاری قدموں اور گنگنانے کی آواز آتی ہے ۔ ایاز واپس اسی دروازہ سے باہر چلا جاتا ہے۔ الماس ایک کھٹکے کے ساتھ داخل ہوتی ہے ۔)

نشاط :- اوہ .... (گویا الماس کے گانے سے بیدار ہوا ہے) اُنہوں دماغ اُڑا دیا۔ کئی آپا کئی دفعہ کہا کہ خدا کے واسطے یوں نہ لہکا کرو۔ جگا دیا نا کیسے۔

الماس :- (مجرمانہ گر مسکرانے کے انداز سے) لو........ واہ میں نے بچا لیا۔ (سُر پھر ہلکی لہروں میں شروع کر کے)

نشاط :- (اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے) اے آپا تم نے جگا دیا شکر ہے .... ورنہ آج تو ختم ہی ہوگئے تھے ۔

الماس :- کیوں (گیت برابر نہایت مردہ سُروں میں جاری ہے)

نشاط :- بڑا ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھا کہ میرے کمرے میں ایک چڑیل گھس آئی، اور کاغذوں کو بڑ کھڑ بڑ کرنے لگی ۔ اتنے میں ایک بھوت بھی آگیا۔ اور دونوں میں وہ خاؤں خاؤں لڑائی ہوئی کہ خدا کی پناہ ...... اتنے میں تم نے گانا شروع کردیا ۔

(عزت سب کچھ سمجھ کر گویا سُنا ہی نہیں)

الماس :- (کچھ نہ کچھ سمجھ کر) ہٹو...... جانے کیا بک رہے ہو۔

نشاط :- سچ کہتا ہوں آپا۔ تمہارے بابوجی کی قسم۔

الماس :- (ذرا تنک کر) ذرا ہوش میں! کون میرے بابوجی۔

نشاط :- ارے خدا کے لئے آپا بچاہئے بابوجی کو نہ بھول جانا ۔ورنہ بے موت مر جائیں گے ۔ ارے وہی تمہارے والے بابوجی ۔ وہی جنکے پاس صرف ایک پتلون ہے، جو کہ پہلے سفید تھی ۔مگر اب نہایت شک کشمشی رنگ کی ہوتی جارہی ہے ۔لو.. ..اب بھی نہیں سمجھیں؟ وہی جو تیل بیچتے پھرتے ہیں بابو محمود خاں؟ تمہارے منگیتر۔ آپا! مار ڈالے گا ۔یاد رکھنا بھوکا رکھے گا۔ کنجوس

الماس :- بے طرح چراغ پا ہو کر، واہ جیسے خود تو بڑے لاٹ صاحب ہیں نا۔ بڑے رئیس اعظم گھر کے ۔ وہ تیل کے مرچنٹ ہیں .... بیچتے پھرتے ہیں؟ ہنہ ۔

نشاط :- چولہے میں ڈالو اس تیل والے کو آپا۔ بڑا کنجوس ہے ۔ایک سگرٹ نکال لو تو فوراً کھٹ کھٹ گن لیگا۔ آپا ایک ساڑھی میں سال بھر پکڑا دے گا۔ بڑا گرو ہے وہ چالاک!

الماس :- (جل کر) تم خود بھاڑ میں جاؤ...... اُلو....... (بھناتی ہوئی چل دیتی ہے)

عزت (جاتے ہوئے) توبہ ہے نشاط ۔ بیچاری الماس کو خفا کردیا۔ محمود تو ایسا اچھا آدمی ہے ۔

نشاط :- تو پھر تم محمود سے ہی کیوں بیاہ نہیں کرلیتیں؟ چھوڑ دو ان سارس صاحب کو!

عزت :- (اپنی آفت آتی دیکھ کر) نشاط تمہاری عقل تو خراب ہوگئی ہے (تیزی سے چلی جاتی ہے ۔ نشاط زور کا قہقہہ لگاتا ہے ۔)

تیسرا سین

(عزت کا کمرہ۔ عزت کرسی پر بیٹھی آگے پیچھے جھول رہی ہے تصویروں کا ایک البم گھٹنوں پر کھلا رکھا ہے۔ نشاط مقررہ کھڑکی سے چڑھتا ہے۔)

نشاط :۔ (کھڑکی میں سے گلدان ایک طرف پھینکتے ہوئے) یہ راستہ میں کیا کمبخت آگ لگا رکھا ہے؟

عزت :۔ یہ راستہ ہے؟ بندروں کا راستہ کھڑکیاں اور روشندان ہوتے ہیں۔

نشاط :۔ اور اُونٹ کا؟

عزت :۔ (فوراً سمجھ کر ہنستے ہوئے) کیسا اُونٹ!

نشاط :۔ اب الماس کی طرح آپ غریب اُونٹ کو بھی بھول گئیں؟۔ دلاؤں یاد؟

عزت :۔ نشاط جاؤ بس فوراً جاؤ۔ چلو میں تمہاری ایک بات نہیں سنتی۔

نشاط :۔ (بہت ہی قریب ہو کر بیٹھتے ہوئے) یہ لو۔ ایک کتاب دینی ہے؟

عزت :۔ (سب بھول کر) ارے کہاں سے لائے۔ (ہاتھ بڑھاتی ہے)

نشاط :۔ (دکھائی سے) کیسی مطلبی؟ ارے منہ دُھو جاکے پہلے کس سے پھر آنا۔

عزت :۔ (ذرا ہٹ کر) اتراتے کیوں ہو۔ کہاں سے لی؟

نشاط :۔ (کتاب دیتے ہوئے) کہاں سے لی؟ تمہیں کیا اس سے؟ اجی سارے شہر میں ڈھونڈی۔ لائبریری سے لی۔ سارا دن سائیکل پر رگڑا ہوں تب ہاتھ آئی ہے۔ تمہارے وہ (کندھے جھٹکا کر منہ چڑاتا ہے) بھلا تمہارے لئے اتنا دوڑتے۔ خیر اُنکی کیا، وہ تو بچارے مجبور ہیں۔ میں نے مس پر تھاکر کو دیکھا ہے۔ اس قدر اسٹائلش لیڈی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔

عزت :۔ اُونھ ہوا کریں۔

نشاط :۔ جی ہاں۔ ہوا کریں۔ اب تو غریب بھائی جان کی قسمت پھوٹ ہی گئی۔ چچی جان کا دِل رکھنے کو....

عزت :۔ نشاط میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ کسی کا دِل وِل نہیں ٹوٹا کرتا۔ ...... معاف کرنا میری اماں ایسی گری پڑی نہیں ہیں۔ چچی نے ہی خوشامد کی تھی۔

نشاط :۔ ہاں۔ ہاں۔ میں کب کہتا ہوں..... چچی ہی تو اپنے بیٹے کی دشمن ہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ اماں جان بھائی جان سے بہت کم محبت کرتی ہیں۔

عزت :۔ (اپنی ہتک کی انتہا محسوس کرتے ہوئے) ایاز میں ایسے کون لعل جڑے ہیں۔ کیا دُنیا میں دُوسرا کوئی ہے ہی نہیں؟

نشاط :۔ بے شک بے شک۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تم خود اُن سے نفرت کرتی ہو۔ دوسرا "بے شک ان سے بہتر ہے" (اپنے سینے پر اُنگلی رکھتا ہے)

عزت :۔ اس کا مطلب سمجھ کر ہنستی ہے، چل بدتمیز

ایاز :۔ حورا کا ہاتھ پکڑے آتا ہی عزت بھئی آج فلم دیکھنے چلوگی؟

نشاط :۔ آپ کا حکم اور یہ نہ مانیں؟ مجال نہیں۔

ایاز :۔ اپنے مطلب کو اُلٹے معنوں میں لیتا دیکھ کر، میرا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ضرور ہی جائیں۔

نشاط :۔ (ہنسی ضبط کر کے) ہاں کوئی خاص ضرورت تو نہیں۔ بس یہ بہانہ کر جائیں گی؟؟۔

ایاز :۔ (مسکرا کر) ہاں شاید مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔

(عزت کا چہرہ تمتما جاتا ہے)

ایاز :۔ بھئی حورا نے مجبور کیا ہے کہ اس فلم میں اُنکی روحانی دوست شرلی کام کر رہی ہے۔ لہذا وہ ضرور جائیگی۔

نشاط :۔ تو بھئی عزت تو جائیگی میرا کچھ ٹھیک نہیں۔

عزت :۔ (بھی کٹی آواز میں) جی نہیں میں نہیں جاؤنگی۔

ایاز :۔ (عزت کے لہجہ سے چونک کر) کیوں آخر وجہ؟

عزت :۔ (کڑک کر) اپنا دِل۔ کیا کوئی زبردستی ہے۔

ایاز :۔ (چڑ کر) زبردستی کی نہ ضرورت اور نہ کسی کو شوق۔ ہر ایک کو اپنے اُوپر پُورا اختیار ہوتا ہے۔

عزت :۔ (طعنہ سے) ہوتا نہیں ہے۔ بلکہ ہے۔

نشاط :۔ بھئی میرے پاس تو ایک پائی بھی نہیں جو سینما جاؤں۔

حورا :۔ (چونک کر ایاز سے) بھائی جان میری پائی۔

ایاز :۔ ارے..... تمہیں کو تو دیدی تھی ...... یہیں تو تھی میں ابھی اُچھال رہا تھا۔

حورا :۔ واہ ہمیں نہیں دی۔ ہماری پائی (ٹھنکتی ہے)

ایاز :۔ (ڈھونڈتے ہوئے) ارے بھئی نہ معلوم کہاں گئی، ابھی تو تھی۔ اچھا حورا ہم دوسری لا دینگے۔

حورا :۔ (مچلنے کی دھمکی دیتے ہوئے) آں ..... آں ہم تو وہی سی لینگے اپنی چمکتی والی۔

نشاط :۔ نہیں بھئی حورا ضد نہ کرو، بیکار ہے۔ اب تو وہ جھلملاتی ہوئی تمہاری عمدہ والی کھو گئی۔ اب تم کالی ہی لے لینا۔ دوسری..... کالی، ...... مت رو۔ غریب جھنکتی بھی تو نہیں۔ ہائے ..... کیسی چمکیلی تھی، جیسے ستارہ۔ اس نے صبح سے زمین پہ ایڑیاں رگڑ رگڑ چمکائی تھی۔ چپ رہ حورا۔

نورا :۔ (دردناک آواز میں دہاڑتی ہے) آں ہماری پائی۔ ہم تو آپ سے لیں گے۔

ایاز :۔ کہتا تو ہوں کہ دوسری لادونگا۔

نشاط :۔ مگر وہ اُس چمکتی ہوئی کو کیسے بھولے۔ خیر اب وہ کالی ہی لیلیگی لے لو حورا کالی کلوٹی ہی لے لو..... (چمکاتا ہے۔ حورا دہاڑوں دہاڑ روتی ہے۔ ایاز پریشان کھڑا ہے)

اماں جان :۔ (دبنگ آواز سُنائی دیتی ہے) ارے یہ کون حورا کو مارے ڈالتا ہے۔ چین نہیں لینے دیتے۔ (دروازہ میں سے) یہ کیا قصہ ہے (دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے) میں کہتی ہوں میری قسمت کا چین ہی اُڑ گیا ہے۔ ہوا کیا؟

نشاط :۔ (جلدی سے) اماں جان حورا کی چمکتی ہوئی پائی بھائی جان نے میلے ٹھیلے نہ معلوم کہاں کھودی۔ اب اُسے کالی دے رہے ہیں۔ وہ ذرا رنجیدہ ہے۔

اماں جان :۔ (جھلاکر) ایاز میاں بوڑھے ہو گئے۔ مگر بچوں کی چیزوں کی اب بھی ضرورت ہے۔ آج کو پائی چھینی کل کو نغی کی جُسنی چھین لینا۔

ایاز :۔ (جزبز ہو کر) اماں جان...... آپ تو خواہ مخواہ ....

نشاط :۔ بھائی جان گستاخی معاف۔ بزرگوں کو اس طرح نہیں دھمکاتے خواہ مخواہ۔ بھلا اماں جان خواہ مخواہ آپ کو کیوں دق کرینگی۔

ایاز :۔ چُپ رہو نشاط؟ تمہاری بک بک ہر جگہ......

نشاط :۔ جی ہاں؟ بزرگوں سے زبان چلانے سے روکوں تو بک بک ہے!

اماں جان :۔ (روہانسی ہو کر) ارے میاں (سرد آہ بھر کر) مجھے یا ذلیل کر دئے۔ اللہ نے چاہا خود رسوا ہو گے تمہارے چھوٹے تمہارے لاتیاں لگائیں گے (بھناتی ہوئی چلی جاتی ہیں)

(ایاز کچھ جھلایا کچھ شرمندہ کچھ سراسیمہ بیٹھا رہ جاتا ہے)

نشاط :۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں) ہاں تو بھئی عزت سینما جاؤگی؟ پہلے شو میں یا .....

عزت :۔ (تیزی سے) میں نے کہدیا میں قطعی نہ جاؤنگی۔

نشاط :۔ تو بھائی جان پر کیوں غصہ ہوتی ہو۔ انہیں ویسے ہی اماں جان نے کیا کم ڈانٹا ہے۔

ایاز :۔ (عاجز آ کر) نہ جاؤ کون کہتا ہے (بڑبڑاتا چلا جاتا ہے)

نشاط :۔ بھائی جان کا غصہ بہت بڑھ گیا ہے۔ بیچاری عزت کو کیسا ڈانٹا۔

عزت :۔ (ضبط سے) ہوئے غصہ تو میرا کیا بگاڑ ہیں گے۔

نشاط :۔ اور کیا۔ عزت کا کون کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ کیوں ہے نا....

(جھک کر اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا ہے) عزت آپا رو رہی ہو۔ واہ بھئی واہ .... (جھک کر اُسکے بالوں کو چوم لیتا ہے) اُف رُخسارِ عزت کے آنسو!!!"

چوتھا سین

(عزت اپنے کمرے میں صوفے پر لیٹی ہے، کمرے میں صرف ایک ہلکا بلب جل رہا ہے، قریب میز پر ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے بھرا رکھا ہے جس میں سے کبھی کبھی عزت ایک گھونٹ پی کر ویسے ہی رکھدیتی ہے)

نشاط :۔ (آہستہ سے داخل ہو کر ایک دم بجلی بجھا دیتا ہے) لو اب پڑھو چین سے۔

عزت :۔ (گھبرا کر) ارے میرا دل اندھیرے میں بہت گھبراتا ہے بھئی خدا کے لئے بجلی جلاؤ۔

نشاط :۔ (بجلی جلا کر) تو پھر تم لیمپ سے کیوں نہیں پڑھتیں (دوسرے کمرے سے لیمپ لا کر رکھدیتا ہے۔ گلاس ہٹا کر صوفہ پر رکھدیتا ہے)

عزت :۔ آج تم نے شاباشی پانے کا کام کیا ہے۔

نشاط :۔ کیا پڑھ رہی ہو؟ ہمیں بھی سُناؤ۔ ذرا سی جگہ میں صوفے پر لیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ (گلاس اُلٹ جاتا ہے اور دونوں بھیگ جاتے ہیں۔)

عزت :۔ اوف۔ بیوقوف کہیں کے۔ سارا بھگو دیا۔

نشاط :۔ میرا نام لگا دو۔ میں نے بھگویا ہے؟ کہدو ہاں!

عزت :۔ (اُسکے جھوٹ پر متعجب ہو کر) نشاط۔ اور پھر کس نے پانی کا گلاس یہاں رکھا۔

نشاط :۔ تم نے عزت۔ ارے کیا اسقدر جلدی باتیں بھول جایا کرتی ہو۔

عزت :۔ انتہا ہے تمہارے جھوٹ کی۔

نشاط :۔ اچھا ٹوس کر لو کہ کس نے گلاس رکھا۔ (جیب سے پائی نکالکر) بولو ہیڈ یا ٹیل؟

عزت :۔ (مذاق سمجھ کر) ہیڈ۔

نشاط :۔ (پائی اُچھالتا ہے) آہا ہیڈ۔ گلاس تم نے گرایا۔

عزت :۔ (ہنستی ہے) ارے نشاط یہ پائی تو حورا کی ہے۔

نشاط :۔ خوب! میری ہے۔

عزت :۔ چل جھوٹے۔

نشاط :۔ چل جھوٹی۔

عزت :۔ نشاط۔ میں تم سے بہت بڑی ہوں تمہیں میرا ادب کرنا چاہیے۔

نشاط :- بالکل غلط۔ ہم ایک سرے سے تمہاری بزرگی کی تھیوری ہی نہیں مانتے۔ کون کہتا ہے کہ تم مجھ سے بڑی ہو۔ بالکل غلط۔

عزت :- تمہارے کہنے سے چھوٹی ہو جاؤں گی؟ جاؤ اب میں پڑھوں گی۔ جاؤ

نشاط :- (دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) ہم باجا بجائیں گے۔

عزت :- (کتاب ڈھونڈتی ہے۔ صوفہ پر، میز پر اور کتابوں میں صوفہ کے نیچے۔ اِدھر اُدھر نہیں ملتی ہے) ارے میری کتاب کہاں گئی؟ نشاط۔

نشاط :- (دوسرے کمرے میں باجا بجاتے ہوئے) خاموش سُنو کتنا عمدہ ریکارڈ ہے۔

عزت :- خاک بھی اچھا نہیں۔ مگر میری کتاب؟

نشاط :- (باجا اُٹھا کر لاتا ہے) تو تم ہی کوئی اچھا سا بجا دو۔

(عزت بڑی احتیاط سے ایک ریکارڈ لگاتی ہے۔ نشاط اسکی سُریلی آواز پر رقص کرتا ہے۔ عزت داد طلب نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ نشاط رقص کرتا کرتا عزت کے پاس آتا ہے، اُسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر رقص کرتا ہے۔ عزت ہنس رہی ہے، ایکدم اُسکے دونوں ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے زور سے بھینچ لیتا ہے۔ عزت تھوڑی دیر ہچکچاتی ہے، پھر آہستہ سے اُسکے ہاتھ اُٹھ کر نشاط کی پیٹھ پر جاتے ہیں اور ایک پل کے لئے اُس سے چمٹ جاتی ہے۔ لیکن فوراً بچھو کی طرح کوئی ڈنک سا اُسکے دل میں مارتا ہے، اور نشاط کو زور سے دھکا دے کر فوراً دوسرے کمرے میں بھاگ جاتی ہے۔ نشاط زور سے تالی بجا کر ہنستا ہے۔ عزت تھوڑی دیر کے لئے قائل ہو جاتی ہے۔ کہ نشاط اُس سے بڑا ہے بڑا ...... بہت بڑا ......)

پانچواں سین

(عزت کمرے میں بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے نشاط کھڑکی میں سے چھلانگ مار کر آتا ہے۔ عزت چونک پڑتی ہے)

نشاط :- (عزت کو چُپ دیکھکر) ہم سمجھ گئے۔ بولو بتائیں۔

عزت :- (ڈھٹائی سے) کیا سمجھ گئے۔ کچھ ہو بھی۔

نشاط :- بھوکی ہو!۔

عزت :- ہٹو بھی۔

(جوکی بسکٹ ہاتھ اور مُنہ میں لئے آتا ہے۔ نشاط اسے شکاری نظروں سے دیکھتا ہے)

نشاط :- ارے جوکی بس بھکے جاتا ہے۔ ایک دن تیرا پیٹ ضرور پھٹے گا۔

جوکی :- (اترا کر) آج ہماری اُنگلی تو آپا نے بچا دی تھی۔

نشاط :- ہوں... تو اب یہ تو زخم پر مرہم تھوپ رہا ہے (لہجہ بدلکر) بھئی ہمارا جوکی تو بس لاکھوں میں ایک ہے۔ یہ عزت آپا بچاری بھوکی ہیں۔ انہیں سب بسکٹ دیدے گا۔ جوزا کبھی نہیں دیتی بڑی کنجوس ہے، عزت تم نے یہ نہیں دیکھا کہ بے مانگے پیر دے دیتا ہے۔ اب یہ بسکٹ جو لئے ہے وُہ ہمیں بے مانگے دیدیگا، اور خود اور لے آئیگا۔ خود دیدیتا ہے۔ مانگنے کی ضرورت کب ہے؟

جوکی :- (اکڑ میں آکر) لیجئے۔ ہم اور لا دیں۔ ہیں؟ نا دیں؟

نشاط :- وُہ تو تم لا ہی جو دو گے! کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جوکی غضب کا تیر ہے، وہ چلا۔

(جوکی شیخی میں آکر بے تحاشہ دوڑتا ہے۔ دروازہ پر بہت زور کی چوٹ لگتی ہے اور گر پڑتا ہے رونا چاہتا ہی ہے کہ نشاط کہتا ہے)

نشاط :- جورا صاحبہ گرتی ہیں۔ فوراً بہیں بہیں روتی ہیں۔ جوکی چاہے کتنے زور کی چوٹ لگے کبھی نہیں روتا، وہ اُٹھ بھی بیٹھا، وہ کھڑا ہو گیا بھی۔ ہنس بھی رہا ہے۔

(جوکی ضبط کر کے اُٹھتا ہے، زبردستی کی ہنسی ہنستا ہے اور چلا جاتا ہے، عزت بے تاب ہو کر ہنستی ہے۔)

نشاط :- عزت کہو کیسا شکار کیا ہے۔

عزت :- ہٹ۔ بچے سے چھین لیا۔ فریبی۔ میں تو نہیں کھاتی۔

نشاط :- اپنے بس نہ کھاؤ گی (زبردستی بسکٹ ٹھونس دیتا ہے۔ سارا بسکٹ کا چورا عزت کے منہ پر لگ جاتا ہے۔ جو ہنس بھی رہی ہے اور غصہ بھی ہے)

اماں جان :- (دکھ بھری آواز میں) بھاڑ میں جائیں بسکٹ تیرے باوا نے دُکان لگا دی ہے جو ہر وقت بسکٹ بسکٹ! ابھی جو دیا تھا۔ .... کیا نشاط نے لیا؟ اوئی یہ نشاط کا دماغ کیوں چل گیا۔

(دندناتی ہوئی داخل ہوتی ہیں) نشاط بیٹا یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ...

نشاط :- (نہایت سُلجھی ہوئی آواز میں) اماں جان ذرا پہلے میری سنیئے۔ عزت کو بھوک لگ رہی تھی اُنہوں نے ذرا سا بسکٹ لے کر کھا لیا۔

اماں جان :- (چونک کر، بسکٹ کا چورا مُنہ پر دیکھکر ہونے والی بہو کے اچھے اطوار نہ دیکھ کر) اوئی۔ عزت نے جوکی سے بسکٹ کیوں لیا۔ کیا گنجینہ میں تالا پڑا ہے۔ خود نکال لیں۔

نشاط :- اماں جان وہ بیچاری تکلف کرتی ہیں۔ آپ کھانے پر اُنہیں اس قدر کم کھلاتی ہیں۔ اُنہیں بھوک لگتی ہے۔

اماں جان :- (بے بات کے الزام سے چراغ پا ہو کر) لو اور اندھیر سُنو

ہم کیوں کم کھانا دیتی۔ وہ آپ ہی کم کھاتی ہیں۔

نشاط :- ہاں اصل میں بسکٹوں سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ بھائی جان ہمیشہ لا دیا کرتے ہیں۔ آجکل وہ بھی نہیں لاتے۔

اماں جان :- (ہونے والی بہو کی منگیتر سے بسکٹ منگا کر کھانے والی بات کو سخت معیوب سمجھ کر) اُوئی یہ نگوڑہ بسکٹوں کا کیا شوق ہے۔ جی چاہا تھا تو گنجینہ میں سے لئے ہوتے۔ (چلی جاتی ہیں۔ عزت جسے بولنے کا اماں اور بیٹے نے بالکل موقع نہ دیا حیرت سے مُنہ کھولے دیکھتی رہتی ہے۔ نشاط کی ہنسی سے چونک کر موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے لگتی ہے)۔

چھٹا سین

(ڈرائنگ روم مُنا کمرہ جس میں دو پلنگ پانچ چھ کرسیاں اور زمین پر فرش ہو رہا ہے۔ ایک نچی سی کوچ پر الماس بیٹھی کچھ سی رہی ہیں۔ محمود نیم دراز بظاہر تاشوں کی گڈیاں لگا رہا ہے۔ لیکن الماس سے سرگوشیاں بھی کر رہا ہے۔ اماں جان پلنگ پر لیٹی پیر دبوا رہی ہیں اور آنا کے شوہر کے معشوقانہ مظالم بھی سُن کر ناقدانہ رائے پاس کر رہی ہیں۔ جوگی اماں کے کولہے سے لگا مُنہ سے فٹ بال میں ہوا بھرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور ہر سانس پر ٹھنکنے لگتا ہے۔ بیچوں بیچ قالین پر حورا اور ایاز کیرم کھیل رہے ہیں۔ عزت چوکی کے کونے پر ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھے کسی خیال میں غرق ہے۔)

حورا :- واہ...... آن ...... آن۔ بے ایمانی۔ آپ تو سیدھے ہاتھ سے کھیلتے ہیں۔

جوگی :- اُونھ، ہنک ہنک یہی پھر ہوا ختم ہوگئی۔ کیا کریں جنے؟

الماس :- میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ زرد پر سوائے کالے کے کچھ اچھا نہ لگیگا (عزت سے) کیوں نا عزت آپا۔ (کچھ دکھاتی ہیں۔ عزت وہیں سے سر ہلا دیتی ہے)

نشاط :- (دبے دبے آتے ہیں اور فرمانبردار بیٹے کی طرح اماں جان سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں)

محمود :- ارے بھئی..... کچھ دال میں کالا ہے۔ عزت اور نشاط کی جنگ ہوگئی۔ کیوں بھئی عزت؟

عزت :- جی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔

نشاط :- مجھے سوکی کی سیر تو کرنی نہیں جو لڑتا پھروں۔

محمود :- مگر ہوئی ہے لڑائی۔ سُنا ایک بسکٹ کے ٹکڑے پر جوتا چل گیا۔ عزت بے چاری نے بڑی مصیبت سے جوگی کو پھانس کر بسکٹ چھینا، اس پر نشاط کی نیت آگئی۔ سُنا ہے مارکٹائی تک نوبت پہونچ گئی۔

نشاط :- آپ سُنا بہت کرتے ہیں۔ کون سے کان سے سُنتے ہیں۔

محمود :- (الماس کی طرف اشارہ کرکے) انہوں نے....

نشاط :- (قہقہہ لگا کر) بھئی خوب۔ اس کان کو تو خوب مروڑیئے ابھی بالکل گنگ ہو گیا ہے۔

الماس :- (ذرا چڑکر) میں نے تو نہیں کہا کہ جوتا چلا یا کیا ہوا۔

نشاط :- آپا کچھ بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ تیل کا بھاؤ گر رہا ہے۔

نشاط :- جوگی بھیا یہ تو کب تک ہوا بھرے گا۔ لاؤ میں بھردوں (ہوا بھرنے لگتا ہے)

محمود :- بھئی ہم بھی کیرم کھیلیں گے۔ آؤ الماس ہم تم ایک طرف۔

الماس :- ذرا ٹانکہ ختم کرلوں جب تک عزت کو لے لو۔

محمود :- آؤ عزت۔

عزت :- جی نہیں۔

محمود :- نہیں کیسے (زبردستی پکڑ کر بٹھا لیتا ہے، کھیل شروع ہوتا ہے۔)

نشاط :- آؤ جوگی ہم تم فٹ بال کھیلیں۔ لیکن بھئی ہاتھوں کی ہے۔

جوگی :- ہاں بھئی۔

(نشاط اور جوگی بیچ میں گیند اُچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ بال بار بار عزت کے اُوپر گرتی ہے، دو ایک دفعہ اس کا پیر بھی نشاط سے بھولے میں کچل جاتا ہے۔ جسکی وہ بہت رُکھائی سے معافی مانگتا ہے۔ ایک دفعہ عزت گیند لے کر دُور پھینکدیتی ہے۔ نشاط جل کر کھیل بند کرکے کیرم دیکھنے لگتا ہے)

نشاط :- واہ بچاری حورا ہار رہی ہے۔ بے ایمانی ہو رہی ہے صفا۔

حورا :- آن ... . بے ایمانی۔

نشاط :- جناب وہ آپکے ساتھ نہیں کھیلے گی۔ بلکہ ہمارے ساتھ کھیلے گی۔ وہ بورڈ اُلٹ دیگی۔ (حورا شیخی میں آکر بورڈ اُلٹ دیتی ہے۔ دوسرا کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ ایاز اور نشاط، عزت اور محمود۔ تین دفعہ عزت کی اُنگلی میں نشاط سے اسٹرائکر لگتا ہے۔ اور دُو دفعہ بورڈ کے نیچے پیر دب جاتا ہے۔ عزت روہانسی ہوکر ہٹ جاتی ہے)

عزت :- میں نہیں کھیلتی۔

نشاط :- ہارتے وقت جوگی بھی یہی کرتا ہے۔ (مُنہ چڑاکر) ہم نہیں کھیلتے!

محمود :- اچھا بھئی اب کے کچھ گڑبڑ نہ ہوگی۔ عزت یہ بازی ختم کر دو۔ (کھیل شروع ہوجاتا ہے)

عزت :- (اپنی دانست میں بورڈ ختم کرکے) یہ لیجئے بس۔

نشاط :- (تلخ لہجہ میں) اور یہ۔ یہ۔ ان دُو بدنصیب گوٹوں کو کون ڈالیگا۔ میں؟

(عزت شک کی نظروں سے نشاط کو دیکھتی ہے، اور کونے میں رکھی ہوئی گوٹوں کو ایک ہی وار میں ڈال دیتی ہے۔ نشاط جوتی کے گڈگڈی کرتا ہے۔ گویا اُس نے کچھ دیکھا نہیں)

جوتی :- ہمارے یہاں دو گوٹیں نکال کر رکھدی تھیں۔

عزت :- بے ایمان آدمی کے ساتھ میں نہیں کھیلتی۔

نشاط :- شکریہ۔ تو پھر کیجئے (دہرے کالا منہ، آپ وہاں بیٹھیں گی۔

عزت :- تم خود کالا منہ کرو۔

نشاط :- جی! میری اور آپ کی بول چال بند تھی یعنی حد کر [illegible] اُنہوں نے بھی ڈھٹائی کی۔ میں منہ لگاتا نہیں اور آپ ہیں کہ بولے چلی جاتی ہیں۔

عزت :- اور یہ جو بار بار گیند آکر میرے ہی اُوپر گر رہی ہے یہ کیا ہے؟ آخر میری ہی انگلی میں تمہارا اسٹرائکر بار بار کیوں لگ رہا ہے۔ بولتے نہیں تو غنیمت ہی تھا۔

نشاط :- یہ تو سب اتفاق سے لگ جاتی تھی۔

عزت :- لعنت تمہارے اتفاق پر کہ وہ بس میرے ہی لئے رہ گیا ہے۔

نشاط :- (آگے جھک کر) تو پھر ملاپ کر لو نا۔ بولو!

عزت :- میں تم سے لڑی کب تھی؟

نشاط :- پھر یہ منہ کیوں کپا ہو رہا ہے۔ (گال پھلا کر نقل کرتا ہے)

(عزت ہنس دیتی ہے)

نشاط :- ہاتھ ملالو۔

(عزت ہاتھ بڑھاتی ہے۔)

نشاط :- (جھجک کر اُسکے ہاتھ کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس میں کوئی غلاظت بھری ہے) ٹھیرو بھئی ہم ویسے ہاتھ نہیں چھو سکتے (ہاتھ کو کرتے کے دامن میں لپیٹ کر) لو اب ملاؤ۔

عزت :- (بگڑ کر) جب میرے ہاتھ ناپاک ہیں تو پھر ملانے کی ہی کیا ضرورت ہے۔

(پھر لڑائی ہو جاتی ہے)

نشاط :- اچھا نہیں (دونوں ہاتھ ملاتے ہیں۔ نشاط زور سے اس کا ہاتھ دباتا ہے اور خوب جھٹکتا ہے)۔ (محو ہوتے) محمود بھائی میں سمجھتا تھا کہ عزت میں ذرا تو خودداری ہوگی یعنی کمال کی بے حیا ہیں۔ ادھر لڑیں اور ادھر خوشامد کرلی۔

عزت :- چل ہٹ۔

نشاط :- (اور قریب آتے ہوئے) سچ بتاؤ مجھ سے لڑ کر اُداس تو بہت تھیں۔

عزت :- میں؟ ارے ہٹ بھی۔ مجھے تیری خفگی کی کیا پروا ہوگی؟

نشاط :- بھئی یہ تو تم ہی خوب جانتی ہو۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ساتواں سین

(عزت گرم شال اُوڑھے پلنگ پر لیٹی ہے۔ منہ تمتمایا ہوا ہے۔ حرارت اور زکام ہے۔ کبھی کبھی کھانستی ہے۔ ایاز جنوبی دروازے سے داخل ہوتا ہے اور عزت کے پلنگ کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

ایاز :- (نہایت نرم آواز میں) عزت کیسی ہو؟

عزت :- (جواب میں کھانستی ہے اور اپنا ہاتھ ماتھے پر لے جاتی ہے۔) درد ہے۔

ایاز :- (محبت سے اُسکے بالوں پر اور پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے) تم ایک ہفتہ میں تو اچھی ہو جاؤ گی؟ کیوں۔ (جواب کے لئے اُسکی آنکھوں کو دیکھتا ہے)

(عزت سر ہلاتی ہے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو ہیں۔)

ایاز :- (کچھ سراسیمہ ہو کر بہت ہی آہستہ سے) کیوں؟ کیوں؟

عزت :- کچھ نہیں۔ (بے چینی سے کروٹ لیتی ہے)

نشاط :- (کی آواز باہر سے) جی ہاں۔ عزت کے پاس بیٹھے ہیں۔

(ایاز کچھ گھبرا کر خفیف ہوتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور بغیر کچھ کہے باہر نکل جاتا ہے)

نشاط :- (اطمینان سے سیٹی بجاتا آتا ہے) ارے تو کیوں اس قدر ٹھونس جاتی ہو جو مرنے لگتی ہو؟

(عزت کچھ چڑ کر مسکرا دیتی ہے)

نشاط :- (پلنگ پر اس طرح بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہاتھ عزت کے اوپر سے لیجا کر دوسری طرف پلنگ کی پٹی پر رکھے ہے) بہت گال پھول چکے تھے (گال ہلکے سے نوچتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اب بھی تو مجھ سے چوگنے ہیں۔

عزت :- دیکھو میں اُٹھ کر چلی جاؤں گی اگر تم نے مجھے دق کیا۔

(اُٹھنا چاہتی ہے)

نشاط :- (نہیں اُٹھنے دیتا اور جھک کر گال پر پیار کرتا ہے۔ خاموشی سے اُسکے رُخسار پر رخسار رکھدیتا ہے) عزت۔ میری عزت۔ عزت۔ عزت

(عزت کچھ مسحور سی آنکھیں پھاڑے خلا میں گھور رہی ہے)

(نشاط عزت کی ٹھوڑی پکڑ کر اُسکے ہونٹ چوم لیتا ہے۔ عزت کانپنے لگتی ہے)

الماس :- (گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ اور دروازہ میں آکر) نشاط تم تو کہہ رہے تھے کہ محمود عزت کے پاس بیٹھے ہیں؟

نشاط :- (ذرا بھی نہ گھبرا کر) میں کہا گیا اُن کو۔ ارے چلے بھی گئے وہ تیرے آنے سے پہلے۔

(الماس جلتی ہوئی بڑبڑاتی چلی جاتی ہے)

ایاز :- (دوسرے دروازہ سے آکر) نشاط میں سمجھا تم میرے لئے کہہ رہے

تھے کہ عزت کے پاس بیٹھا ہوا ہوں۔

نشاط:- کب؟ (مکاری سے) تو کیا آپ بیٹھے تھے؟ ہوا کیا اس میں۔

ایاز:- اماں جان ذرا معیوب سمجھتی ہیں۔

نشاط:- (جلے کٹے لہجہ میں) اماں جان کس بات کو معیوب نہیں سمجھتیں؟ اس دُنیا میں سب ہی ہر بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اب اگر بجائے آپکے مَیں عزت سے شادی کرنا چاہوں تو سب معیوب سمجھیں گے۔ (ایاز کو بے طرح حیران دیکھکر) اگر الماس محمود کی بجائے سعید اُنکے بڑے بھائی سے شادی کرے تو کون معیوب نہ سمجھے گا حالانکہ سعید محمود سے ۹۹ فیصدی زیادہ انسانیت رکھتے ہیں۔ یہ دُنیا تو سب باتوں کو معیوب سمجھے گی! آپ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے ابھی عزت کے رُخسار اور ہونٹ چومے تھے تو آپ اسے معیوب سمجھیں گے (ایاز کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے) معیوب سمجھنے کی خوب کہی۔ اب عزت جو آپ کی بہ نسبت مجھ کو زیادہ پسند کرتی ہے تو کیا معیوب بات نہیں کرتی؟ بالکل معیوب! قطعی معیوب! اُسے کیا حق کہ مجھے زیادہ پسند کرے اور آپ کو کم۔ یا بالکل نہیں؟

(عزت گویا کچھ کہنے اور سُننے کی اس میں طاقت بھی نہیں)

ایاز:- (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) نشاط تم کیا کہہ رہے ہو؟

نشاط:- میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو آپ نے سُنا اور سمجھے۔ مگر میں معیوب اور غیر معیوب ہونیکے سوال کو ہی بیہودہ سمجھتا ہوں۔ یہ سر سر غلطی تھی کہ عزت کے پیدا ہوتے ہی اُسے آپکے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ کیا یہ معیوب نہ تھا؟ عزت کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ بیچاری جب وہ بڑی ہوئی۔ آپ کو ہی شوہر کے لئے مقرر کیا ہوا پایا۔ لیکن وہ بھی تو انسان ہے۔ اسکی خودی بھی تو کوئی آزاد ہے ہی۔ وہ مجھے پسند کر سکتی ہے۔ خواہ ہفتہ بھر بعد وہ تمہاری قانوناً بیوی ہو جائے۔

ایاز:- (پراگندہ خیالوں کو یک جا کرتے ہوئے) تو نشاط کیا تم سچ کہتے ہو؟ کیا تم عزت کو پسند کرتے ہو؟ تم بچے ہو، عزت سے چار سال چھوٹے ہو۔ تم ابھی ایک طالب علم ہی ہو۔

نشاط:- (تلخ ہنسی ہنس کر) یہی تو معیوب بات ہے ایک عمر میں چھوٹا طالب علم، اور ایک بڑی لڑکی سے توبہ توبہ۔ اپنے سے بڑے سے تو محبت ہی نہیں کی جا سکتی۔ جب ہی تو عزت آپ سے محبت نہیں کر سکتی۔ (گویا عزت کمرے میں ہے ہی نہیں)

ایاز:- مگر نشاط ذرا سوچو تو کیسی عجیب بات ہے۔ میری عقل......

نشاط:- "یہ دوسرا لفظ "عجیب" اور بھی گھناؤنا ہے۔ بھائی جان آپ تو دُنیا کے غلام ہیں۔ آپ وہی سوچ سکتے ہیں جو دُنیا سوچتی ہے، آپ کے خیالات تک دوسروں کے غلام ہیں۔ آپکی عقل اپنی نہیں "اتا جی" اور دُنیا کے دوسرے اُستادوں کی عقل کی نقل ہے۔ آپ بڑے بیٹے ہیں، اماں سکار مائوں کی آماجگاہ ہیں۔ برسر روزگار ہیں۔ تندرست ہیں، عزت کے منگیتر ہیں۔ اور میں ایک کمزور چھوٹے سائز کا جو ابھی صرف طالب علم ہی ہوں جو بقول عزت "پیلا مینڈک" "روزکاروگی"۔ لیکن معاف کیجیے گا میرے خیالات خود میرے دماغ سے نکلتے ہیں اور وہ آپکے چھوٹے واہموں سے زیادہ سچے۔ زیادہ بلند مگر زیادہ "معیوب" اور زیادہ "عجیب" ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ ایک عقلمند لڑکی میرے دماغ کی قدر نہ کرے، اور آپ پر مجھے ترجیح نہ دے۔ مگر پھر وہی معیوب ہونے کا سوال بیچ میں آتا ہے۔

ایاز:- (بے طرح مجروح ہو کر بھاری آواز میں)۔ نشاط تم نے میرا دماغ پریشان کر ڈالا۔ اُف (سر کو دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑتا ہے) کل تک..... نہیں ابھی ابھی ...... اُوہ...... (عزت سے) عزت نشاط کیا کہہ رہا ہے۔ بولو کیا سب سچ ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی جگہ نہیں۔

(عزت دبی سسکیوں سے رونے لگتی ہے۔)

نشاط:- عزت! (مذاق کے لہجہ میں) یہ سب معیوب ہے۔ تم خواہ کسی کو چاہو۔ مگر منگیتر ازل سے ابد تک تم ایاز کی ہی ہو۔

(عزت تڑپ کر اُٹھتی ہے اور دوسرے کمرے میں جھپٹ کر چلی جاتی ہے)

نشاط:- عزت یہ سب معیوب ہے۔ (زور سے ہنستا ہے ایاز مجروح اور پراگندہ کُرسی کا ہتہ پکڑے کھڑا ہے)۔

آٹھواں سین

(عزت کا کمرہ۔ الماس، عزت کے کپڑے طے کر کرکے صندوق میں رکھ رہی ہے، سامان سفر نظر آتا ہے، چاروں طرف کپڑے بستر جوتے موزے بکھرے ہوئے ہیں۔ اُداسی چھائی ہوئی ہے)

الماس:- عزت آپا، آخر ایسی جلدی جانے کی کیا تھی؟

عزت:- الماس میرا دل بہت ہی گھبرا رہا ہے، اماں کو دیکھنے کے لئے بہت دل چاہتا ہے۔ (آنسو بھر آتے ہیں)

الماس:- تو تم نے تار کیوں دیا۔ بھائی جان کو کچھ پتہ نہیں، وہ تو کل شام کو ہی اپنے دوستوں کیساتھ چلے گئے۔

عزت:- ہوں۔ (کسی خیال میں پڑ جاتی ہے)

نشاط:- آج پہلی دفعہ رنج کے آثار چہرے پر لئے ہوئے آتا ہے اور الماس اور عزت کے قریب والی کُرسی پر بیٹھ جاتا ہے) دُنیا نہ معلوم اتنی بزدل

کیوں ہے۔ کیوں اتنا "ڈر" سب پر چھایا ہوا ہے۔ ابھی ابھی انسان ایک بات کہتا ہے۔ اور دوسرے لمحہ میں ڈر کر چپ ہو جاتا ہے۔ ساری ہمت رخصت۔ آجکل بھی پڑھ لکھ جانیکے بعد لڑکیاں کتنی بزدل ہیں ......

ہوں ...... ذلیل۔

(عزت رحم طلب نگاہوں سے نشاط کو دیکھتی ہے اور پھر کپڑے طے کرنے لگتی ہے۔)

نشاط :- آپا الماس کبھی تم نے بھی محمود سے کہا ہے کہ تم اُسے چاہتی ہو، اور پھر مُکر گئیں!

الماس :- (منہ شرم سے لال کرکے) واہ ..... چل بدتمیز .... دماغ ہی چل گیا ہے۔

نشاط :- (ہنس کر) تو اتنی غصہ کیوں ہوتی ہو۔ سچ بتاؤ اُسے چاہتی ہو؟۔

الماس :- نشاط میں اماں جان سے کہہ دوں گی کیسی بُری باتیں کرتا ہے۔

نشاط :- معیوب نا؟..... پھر وہی بے ہُودہ لفظ معیوب!.... اُفوہ ..... آپا تمہیں محمود کی قسم جو تم نہ بتاؤ کہ محمود کو چاہتی ہو یا نہیں۔

محمود :- دروازے میں سے جھانک کر) ہم بتائیں۔

(الماس بھن بھناتی ہوئی اُٹھ کر جانے لگتی ہے۔)

محمود :- غصہ کیوں ہوتی ہو۔ بھئی ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ کہا ہے ور دو دفعہ کہا ہے اور مُکری نہیں۔

نشاط :- آہا پھر بھلا میں کہوں تو کیوں بھائی جان خودکشی کی دھمکی دیں ...... اگر میں کہوں کہ میں عزت کو چاہتا ہوں تو کیوں عزت صرف دکھا دے کو ہاں، صرف دکھا دے کو مسوری تار دے کر چلدے۔ بتاؤ نا آخر وہ بھی تو مجھے چاہتی ہے۔ محمود بھائی کیا یہ کچھ جھوٹ ہے۔

(الماس اور محمود حیرت سے مُنہ پھاڑے نشاط کو دیکھ رہے ہیں جو روتی ہوئی عزت کو اعتراض کی نظروں سے دیکھ رہا ہے)

محمود :- نشاط یہ بہت بُری باتیں ہیں۔

نشاط :- (جل کر) بہت بُری باتیں ہیں! اور تم جو کہو تب؟

محمود :- ہماری منگنی تو بزرگوں نے کی۔

نشاط :- ہاں تم لوگ بیل گائے جو ٹھیرے۔ اُنکی شادیاں بھی ایسے ہی ہوتی ہیں۔ تمہارے حقوق صرف اس وجہ سے وسیع ہیں کہ وہ تمہاری عقل سے نہیں ملے ہیں بلکہ دوسروں نے دیئے ہیں۔ اور میرے ..... میرے چونکہ خود مختاری پر مبنی ہیں۔ وہ .....

محمود :- مگر نشاط ...

نشاط :- عزت بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہے۔ لیکن خود سے نہیں۔ اسی لئے تو مجھے اس سے ہمدردی ہے خواہ تم لوگ اُسے ایک ہفتہ بعد ہی ایاز کی بیوی بنادو۔ کچھ فرق نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہی ایاز کی بیوی بننے کے لئے مقرر کردی گئی۔ وہ عادی ہے کہ صرف ایاز کی ہی بیوی رہے خواہ وہ نشاط کو چاہے۔ دُنیا ڈرپوک ہے اسی لئے وہ بھی ڈرتی ہے۔ اعتراض سے ڈرتی ہے۔ "اعتراض" یہ ایک تیسرا گھناؤنا لفظ ہے۔

نوکر :- چلئے گاڑی کا وقت آگیا۔

(الماس اور محمود حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ عزت باربار آنسوؤں کو پونچھ رہی ہے۔ نشاط جمے ہوئے قدم رکھتا ہوا عزت کے پاس جاتا ہے اُسے محبت سے چمٹا کر پیار کرتا ہے۔)

نشاط :- "خدا حافظ"۔ پھر ملیں گے کب؟ دیکھنا ہے!

(عزت خاموشی سے آنسو پونچھ رہی ہے)

عصمت چغتائی
بی، اے

پریم کہانی

(۱)

دس سال پیشتر کا واقعہ ۔۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کا ذکر ہو۔ میری شادی کی پہلی سہانی دُولن فریب رات تھی۔ بہار کا موسم تھا اور فطرت کی اُمنگیں جوش پہ تھیں۔ میں اور میری نوجوان بیوی زبیدہ اپنے عالیشان مکان کے سامنے باغ میں سیب کے ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ رنگا رنگ کے شگفتہ پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے اور اُن کی خوشبو سے فضا عطر بیز ہو رہی تھی۔ چودھویں کا چاند نیلے آسمان پر پُوری دلفریبی سے جلوہ گر تھا۔ اور اس کی نقرئی کرنیں پتوں میں سے چھن چھن کر ہمارے کپڑوں پر پڑتی ہوئی عجیب و غریب شکلیں بنا رہی تھیں۔ زبیدہ عنابی رنگ کی ایک بیش قیمت ریشمی ساڑھی میں ملبوس اپنے لاثانی حُسن سے حوران فردوس کو شرما رہی تھی۔ اُس وقت ہم محبت کے نشے میں چور خود فراموشی کے عالم میں کھڑے تھے اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سیب کے درخت سے سفید پھولوں کی پتیاں بارش کے قطروں کی طرح ہم پر گرنے لگیں۔ میں نے سبزہ پر پڑے ہوئے ننھے ننھے پھولوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر محبت بھرے لہجہ میں زبیدہ سے کہا "دیکھو زبیدہ جس جگہ تمہارا مبارک قدم پڑتا ہے وہیں سے پھول اُگنے لگتے ہیں"۔

ایک ہلکے تبسم سے اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور میں نے اُسے آغوشِ محبت میں لیتے ہوئے اپنے بازو کی گرفت کو زیادہ مضبوط کر لیا ۔ زبیدہ کے دل و دماغ پر بھی ایک سرمدی کیفیت طاری تھی اور وہ میری محبت میں از خود رفتہ معلوم ہوتی تھی۔ انتہائی اُلفت آمیز انداز سے اُس نے اپنی نرم و نازک باہیں میری گردن میں حائل کرتے ہوئے کہا "پیارے نصرت! محبت کا سمندر بے پایاں ہے اور اسکی تلاطم خیز امواج کے سامنے ہماری ثابت قدمی کوئی ہستی نہیں رکھتی۔ زمانہ کے حوادث ہمارے پاؤں ڈگمگانے کی کوشش کرینگے مگر ہمیں وعدہ کرنا چاہیئے کہ ہر مشکل میں آج کی رات کو یاد رکھیں گے اور ہمیں جس قدر ایک دوسرے سے والہانہ اُلفت ہے اُسے تمام عمر نہیں بھولیں گے ۔۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ محبت دُنیا کی تمام قوتوں سے زبردست ہے"۔

"میں سچے دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اِس شب محبت کو ہر مصیبت میں یاد رکھونگا"۔ میں نے زبیدہ کی تائید کی۔ گویا یہ حلفِ وفاداری تھا ۔۔ ہمارے رشتۂ محبت کو مستحکم کرنے کے لئے ۔

کتنی دیر تک ہم ایک دوسرے کو گلے لگائے خود فراموشی کے عالم میں کھڑے رہے ۔

(۲)

میرے والد بمبئی کے ایک دولت مند اور ہر دل عزیز تاجر تھے، اور میں نے حال ہی میں وکالت کا امتحان پاس کر کے پریکٹس شروع کی تھی۔ خوش قسمتی سے میرا کام جلد ہی چل نکلا اور دو تین سال کے قلیل عرصہ میں میرا نام بمبئی کے کامیاب وکیلوں میں شمار ہونے لگا۔ ہماری ازدواجی زندگی کے پانچ سال نہایت مسرت میں گزرے ۔ اِس عرصہ میں مَیں دو بچوں کا باپ بھی بن چکا تھا۔ میری بیوی نہایت ہونہار اور دانش مند عورت تھی۔ وہ میری زندگی کو ہر پہلو سے پُر مسرت بنانے کی کوشش کرتی ۔ جتنی مجھے ایک اچھا شوہر بننے کی خواہش تھی۔ اُسی قدر زبیدہ ایک فرمانبردار اور کار آمد بیوی بننے کی شوقین تھی۔ لیکن اِن تمام خوبیوں کے باوجود اُس میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت بہت کم تھی، جس طرح وہ میری محبت میں کھوئی ہوئی تھی اُسی طرح مجھے بھی پرستارِ محبت دیکھنا چاہتی تھی یہاں تک کہ کسی غیر عورت سے میرا بات کرنا بھی اُسکے دل پر شاق گزرتا تھا۔ وہ اِس بارے میں حد درجہ حاسد تھی ۔

زبیدہ کی خوشنودی کے پیش نظر میں بسا اوقات ایسے مقدمات کی پیروی سے انکار کر دیتا جن میں مجھے زیادہ تر عورتوں سے ملاقات کرنی پڑے۔ کیونکہ میں ابتدا ہی سے معلوم کر چکا تھا کہ ایسے مقدمات کے حالات سُن کر وہ حد درجہ ناخوش ہوتی تھی۔ تاہم مجھے اُمید تھی کہ زبیدہ جلد ہی اپنی عادت کو سُدھار لے گی اور ایسی طفلانہ باتوں کو چنداں اہمیت نہ دیگی۔ لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، اُس کے دل میں حاسدانہ جذبات زیادہ ترقی پکڑتے گئے حتیٰ کہ وہ اکثر مرتبہ مجھ سے خفا رہنے لگی ۔

(۳)

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہُوا مقدمات کے متعلق کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ میرے والد کے ایک دیرینہ دوست میرے پاس تشریف لائے اُن کا نام مسٹر اشرف تھا اور وہ کافی عرصہ تک اپنی اکلوتی بیٹی زہرہ کے ساتھ ہمارے ہمسایہ میں رہ چکے تھے۔ اُنکی نوجوان لڑکی کے خلاف چوری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ میں اُس مقدمہ کی پیروی کروں ۔ اپنی بیوی کی حاسدانہ طبیعت سے واقف ہوتے ہوئے میں اُس مقدمہ کو ہاتھ میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ مگر مسٹر اشرف سے اپنے خاندان کے دیرینہ تعلقات اور دوستی کی بنا پر میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نیز میں زہرہ کو بچپن سے جانتا تھا اور اُس کی

خاندانی شرافت کا قائل تھا۔ لہٰذا میں نے مقدمہ کی پیروی کا وعدہ کر لیا۔

میں اپنی بیوی کو کسی قسم کا دلی رنج پہونچانا اپنی ازدواجی زندگی کے لئے سخت مضر سمجھتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنی ترقی و شہرت کا بھی خیال تھا کیونکہ زبیدہ کے غیر ضروری اور بے جا حاسدانہ جذبات کی بدولت میں اپنے پیشے میں اتنا نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ مجھے خواہش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پیشے میں مطلق مخل نہ ہو اور مجھے جنسی خوشی عورتوں کے مقدمات کی پیروی کرنے دے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ زبیدہ کے ہوتے ہوئے کسی غیر عورت کا جادو مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔

اس رات میں نے زبیدہ سے اپنی مشکلات کا ذکر کیا، اور اسکے غیر معمولی حاسدانہ جذبات کی شکایت کرتے ہوئے زہرہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کرنیکا ارادہ ظاہر کیا۔ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بجائے اسکے جذبات یکدم مشتعل ہوئے اور وہ برافروختہ ہو کر کہنے لگی کہ مجھے اس مقدمہ کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیئے کہ جن لوگوں نے زہرہ پر چوری کا الزام لگایا تھا، وہ سخت خطرناک تھے اور مفت میں میرے دشمن بن جائینگے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ میں مسٹر اشرف سے وعدہ کر چکا ہوں اور یوں بھی ایک بے گناہ لڑکی کو بچانا میرا فرض ہے۔ تو وہ سخت چیں بجبیں ہوئی اور خفگی کے لہجہ میں کہنے لگی "اگر تمہیں میری محبت کا احترام ہے تو اس مقدمہ کے پیچھے نہ پڑو ورنہ میں سمجھونگی کہ تم مجھے اپنا دشمن تصور کرتے ہو۔" وہ غصہ میں بھرائی ہوئی اٹھکر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے اس قسم کی دھمکی دی تھی۔ میں بھی سونے کے لئے اٹھکر اپنے کمرہ میں چلا گیا مگر تمام رات پریشانی سے مجھے نیند نہ آئی۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی میں زبیدہ سے بغیر ملے دفتر چلا گیا۔ اور زہرہ کے مقدمہ کی نسبت تیاری کر کے تاریخ پیشی پر حاضر ہونے کیلئے کچہری چلا گیا۔

رات کو جب میں گھر آیا تو زبیدہ نے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کیا اس نے مجھے بتایا کہ چونکہ بچپن میں زہرہ کے ساتھ میرے تعلقات نہایت دوستانہ تھے اکثر لوگوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ ایک وقت میں زہرہ کو اپنی بیوی بنانے کا خواہش مند تھا۔ اس لئے ان حالات کے پیش نظر اس جذبہ رقابت نے جو عورتوں کے دلوں میں فوراً شعلہ پذیر ہو جاتا ہے۔ اسکے دل میں میری محبت کو نفرت میں بدلنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زبیدہ کو اصل حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ زہرہ کا والد میرے باپ کا دوست تھا اور کافی عرصہ تک ہمارے ہمسایہ میں رہ چکا تھا۔ زہرہ بچپن میں میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتی تھی اور اکثر اوقات ہم اکھٹے کھیلتے تھے۔ میری شادی سے چند سال پیشتر مسٹر اشرف کو کاروبار میں متواتر نقصان اٹھانے کی وجہ سے نہایت تنگی ہوئی اور انہیں مجبوراً مکان فروخت کر کے کرایہ پر رہنا پڑا۔ زہرہ کے لئے مزید تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ اور وہ قلیل معاوضے پر کسی کے ہاں بچوں کو تعلیم دینے پر ملازم ہو گئی جس شخص کے بچوں کو وہ پڑھایا کرتی تھی، اسکے ہاں اتفاقاً چوری ہو گئی اور شک میں زہرہ پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔ چونکہ مجھے زہرہ سے خاص واقفیت تھی اور اسکی شرافت کو خوبی سمجھتا تھا اس لئے میرا فرض تھا کہ میں اس مصیبت میں اسکی مدد کروں۔

زبیدہ نے میرے احساسات کو سمجھتے ہوئے کہا: "نصرت! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارے جذبات کو مجروح کیا۔ میں آئندہ تم پر مکمل اعتماد رکھنے کی کوشش کرونگی۔ اور تمہارے معاملات میں دخل نہ دونگی۔ یقیناً تم ایک قابل پرستش شوہر ہو۔"

اب ہم پھر پُر مسرت ایام بسر کرنے لگے اور ہماری غیر فانی محبت نے ان نامعلوم احساسات پر قابو پا لیا جو ہماری ازدواجی زندگی کو تلخ بنانا چاہتے تھے۔ گویا یہ ہماری محبت کی فتح تھی جس کا ہم نے شب اوّل اقرار کیا تھا۔ زہرہ کے خلاف کافی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے عدالت نے اسے بری الذمہ قرار دیکر چھوڑ دیا۔

(۴)

میں اپنے کام میں زیادہ محنت اور تندہی سے منہمک ہو گیا اور زہرہ کا خیال میرے دل سے قریب قریب محو ہو چکا تھا۔ ایک دوست کے ذریعے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ مسٹر اشرف کی ناگہانی موت کے بعد وہ نہایت مفلسی کی حالت میں گزارہ کر رہی ہے۔ اور کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹائپ اور خط و کتابت وغیرہ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ غرض میری زندگی کے اور دو سال سکون اور اطمینان میں گزر گئے۔

سوامی میونسپل کمیٹی کے سہ سالہ انتخابات قریب آ رہے تھے۔ اپنے حلقہ انتخاب سے میں بھی امیدوار تھا اور میرے اثر و رسوخ کی بدولت میرے حق میں خوب زور شور سے پروپیگنڈہ جاری تھا۔ ایکدن میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا اپنی آئندہ کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ خلاف توقع زہرہ کمرہ میں داخل ہوئی میں نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے مقابل میز کے قریب بیٹھ گئی۔ اسکی آنکھوں میں افسردگی کی جھلک تھی اور چہرے پر پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔

"کہو زہرہ! اتنی مدت کے بعد آج پھر کیسے آنا ہوا؟" میں نے بالآخر پوچھا۔

اس نے میرے چہرہ پر نگاہیں جماتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ کو دفتر میں ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھے اس خدمت پر مامور کریں تو تمام عمر آپ کی احسان مند رہونگی۔ یہ دیکھئے میرے

ں ٹائپسٹ کی سند بھی موجود ہے "
یہ کہکر اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک سرٹیفکٹ میز پر رکھ
ا جو اُسے مقامی کالج کی طرف سے بطور سند ملا تھا۔

یکدم تمام خیالات بجلی کی سرعت کیساتھ میرے دماغ میں پیدا ہوئے
شبہ مجھے ایک جونیئر ٹائپسٹ کی ضرورت تھی۔ مگر کسی عورت کو ملازم رکھنے کے
ں سخت خلاف تھا کیونکہ ایسے واقعات سے عموماً لوگوں میں بدظنی پھیل جاتی تھی
یہ براں میری زندگی کے تمام پہلو اُنکے سامنے آچکے تھے، اور زہرہ کو دفتر میں
زمت دینے سے بہت ممکن تھا کہ لوگ میرے چال چلن کو مشتبہ نظروں سے
ے لگیں اور جھوٹی افواہیں اُڑا کر مجھے الیکشن میں نقصان پہونچانے کی کوشش
ں۔ زبیدہ کی طرف سے بھی میں مطمئن نہ تھا کیونکہ وہ زہرہ کی نسبت مجھ سے
بار گفتگو کر چکی تھی اور بہت ممکن تھا کہ اُسکے رقیبانہ جذبات پھر مشتعل ہو جائیں
دیر تک میں صورت حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ زہرہ میز پر کہنیاں
ے نہایت مغموم حالت میں بیٹھی تھی۔ اُسکی بے تابانہ نگاہیں اُسکے دل کا راز
ہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زندگی کے نہایت پُرآشوب دور سے گزر
ہے۔ اُسکی آنکھوں میں مایوسی و ناامیدی ناچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ کس
ٹنگ دستی اور مفلسی کی حالت میں تھی۔ میں حالت اضطراب میں سر سے پاؤں
انپ اُٹھا۔ آہ! اِس بات کا تصور ہی کتنا اذیت کوش تھا کہ شریف گھرانے
ب باعصمت اور حیا پرور عورت اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے میری
محتاج تھی۔

ہم دیر تک ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھتے رہے، اور
میں نے اپنے دلمیں فیصلہ کرتے ہوئے اُسے ملازمت دینے کا یقین دلا دیا تو مجھے
آواز کمرے میں گونجتی سنائی دی۔ ایک لمحہ کے لئے زہرہ کے چہرے پر خوشی کی
ہلکی سی سُرخ لہر نمودار ہوئی۔ وہ کرسی سے اُٹھی اور شکریہ کے طور پر میرا ہاتھ
ے نرم و نازک ہاتھوں میں لیکر زور سے دبایا، پھر وہ یک لخت پھوٹ پھوٹ
ے لگی "زہرہ صبر کرو" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا "میں ہر طرح
ہی مدد کروں گا" اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور آنسو پونچھتے
ے دوبارہ میرا شکریہ ادا کیا۔ اُسکے جانیکے بعد میں دیر تک خیالات کے بھنور
میں مستغرق رہا۔

جب میں نے زبیدہ سے اِس بات کا ذکر کیا کہ میں زہرہ کو ملازم رکھنا
ہوں اور ساتھ ہی میں نے اُن واقعات کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی جو مجھے
ں پیش آئے تھے تو اُس نے نہایت متانت اور خاموشی سے سب کچھ
ن گذار کیا۔ مگر میری باتوں پر ہلکے تبسم کا اظہار کر کے موضوع گفتگو کو فوراً بدل
اگرچہ اُس وقت یہ ہنسی مجھے بہت بُری معلوم ہوئی تاہم میں خوش تھا کہ

زبیدہ نے اِس معاملہ پر مزید بحث نہیں کی۔ لیکن بہت دیر بعد مجھے اِس بات کا
علم ہوا کہ اپنے رقیبانہ جذبات کا کھُلم کھُلا اظہار کرنے کی بجائے اُس نے خاموش
رہنا پسند کیا اور اندر ہی اندر حاسدانہ جذبات کی آگ میں جلنے لگی۔

(۵)

اِس واقع کے چند یوم بعد زبیدہ نے اپنے ایک رشتہ کے بھائی اختر
کو اپنے ہاں بُلا لیا اور اُسکی ذات میں غیر معمولی انہماک سے دلچسپی لینے لگی۔ اختر
عمر میں زبیدہ سے کچھ بڑا تھا اور تعلیم ختم کرکے اب کسی معقول ملازمت کی تلاش
میں تھا۔ زبیدہ اختر کے ساتھ بہت خوش رہتی اور دن کا بیشتر حصّہ وہ ایک
ساتھ ہی گزارتے مگر مجھے اُنکی دلچسپیوں سے کوئی سروکار نہ تھا، کیونکہ میں خوش تھا
کہ زبیدہ میرے حالات میں دخل نہ دیتی تھی۔ اور نہ ہی اُس نے زہرہ کے
متعلق مجھ سے کچھ دریافت کیا تھا۔

زہرہ اپنے کام میں نہایت ہوشیار اور محنتی ثابت ہوئی، دفتر کے دیگر
کلرکوں سے وہ بہت کم میل ملاپ رکھتی اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتی
میں بھی اُسکے کام سے نہایت مطمئن اور خوش تھا۔ چند دنوں سے میں دیکھ رہا
تھا کہ شام کے وقت دفتر کے باہر ناصر نامی ایک نوجوان زہرہ کا منتظر رہتا۔ وہ
ایک معمولی تاجر کا بیٹا تھا اور پرلے درجے کا شرابی۔ اپنی سخت گیری اور درشت
مزاجی کے باعث وہ لوگوں میں خاصا بدنام ہو چکا تھا۔ شراب کے نشہ میں وہ
نہایت خطرناک ہوتا۔ اور عموماً دنگا فساد کر بیٹھتا، اِسی عادتِ بد کی بدولت
میں نے اُسے چند مرتبہ بحیثیت مُلزم پیش ہوتے دیکھا تھا لیکن ہر بار اُسکی
خوبصورتی و جوانی سے متاثر ہو کر حاکم عدالت نے معمولی سزائے جرمانہ دیکر
اُسے چھوڑ دیا تھا۔

ناصر سے زہرہ کے بڑھتے ہوئے رابطہ اتحاد کو دیکھکر مجھے سخت افسوس
ہوا، مگر اُسکے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ بدیکے
انتخابات میں ایک ماہ باقی تھا کہ اچانک میرا سکرٹری بیمار ہو گیا۔ دفتر میں اور
کوئی کلرک اِس قابل نہ تھا کہ اُس کام کو بجا لاسکے۔ لہذا میں نے عارضی طور پر سکرٹری
کی خدمات زہرہ کے سپرد کر دیں۔

اپنے "حلقۂ انتخاب" میں میری مقبولیت روز بروز عام ہو رہی تھی اور میرا
بڑھتا ہوا اثر و اقتدار دیکھکر میرے حریفوں نے مجھے بدنام کرنے کی ناپاک کوششیں
شروع کیں۔ اپنی شکست کو یقینی تصور کرتے ہوئے وہ میرے خلاف بے بنیاد
اور خلاف تہذیب خبریں مشہور کرنے لگے۔ ایکدن شام کے وقت جب کہ میں
دفتر میں تنہا تھا ایک مقامی افسر جو میرے عزیز دوست تھے مجھ سے ملاقات
کرنے آئے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے میرے حریفوں کی مکارانہ چالوں
کا تذکرہ کیا کس طرح وہ میری عزت و شہرت کو بگاڑنا چاہتے تھے، اُنہوں نے

مشہور کر رکھا تھا کہ زہرہ سے میرے ناجائز تعلقات ہیں۔ میں نے چوری کے مقدمہ میں اُسکی مدد کی تھی، اور اُسے دفتر میں ملازمت دی تھی، اور اب اُسے سکرٹیری کے ممتاز عہدے پر فائز رکھا تھا۔ اگرچہ مجھے اِن بے بنیاد افواہوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا کہ کم از کم زبیدہ اور زہرہ کو ان باتوں کا علم نہ ہونے پائے۔

اس شام کو جب میں گھر پہونچا تو زبیدہ اختر کے ہمراہ سینما دیکھنے چلی گئی تھی میں تھکا ہُوا تھا۔ اِسلئے ان کے واپس آنے سے پیشتر ہی سو گیا، اگلے دن صبح سویرے میں دفتر چلا گیا زبیدہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اِس لئے مجھے اُس سے ملنے کا اِتفاق نہ ہوا۔

میں دفتر میں بیٹھا ہُوا تھا کہ زہرہ نے صبح کی ڈاک لاکر میری میز پر رکھدی۔ مجھے ایک ضروری چٹھی موصول ہونے کی اُمید تھی۔ اِس لئے میں خطوط کا بنڈل اُٹھا کر جلدی جلدی خط چھانٹنے لگا۔ ایک چٹھی زہرہ کے نام تھی میں نے سرنامہ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے لفافہ زہرہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ اُس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر بہ سرعت پڑھنے لگی۔ یکدم گھبراہٹ سے اسکے چہرے پر زردی چھاگئی اور ایک ہلکی سی چیخ اُسکے مُنہ سے نکلی۔ اُسکے لرزتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط درخت کے کسی خشک پتّے کی طرح ہل رہا تھا۔ زہرہ نے خط میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "اِسے پڑھیئے یہ آپکی بیوی کی تحریر ہے"

ایک ہی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ خط میں اُسی فرضی اور بیہودہ قصے کو دُہرایا گیا تھا جو میرے اور زہرہ کے متعلق میرے دُشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ آخر میں زہرہ کو اِس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً میری ملازمت سے علیحدہ ہو جائے کیونکہ وہ زندگی کو تباہ کر رہی تھی اور اُسی کی بدولت میری عزّت و شُہرت کو بٹہ لگ رہا تھا۔

تحریر فی الحقیقت زبیدہ کی تھی میں اپنی بیوی کی اِس نازیبا حرکت پر سخت متحیّر و آزردہ ہُوا۔

زہرہ اسی وقت سر کے درد کا بہانہ کرکے دفتر سے چلی گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اِس واقعہ نے اسکے دِل کو سخت قلق پہونچایا تھا۔ اگلے دن وہ دفتر میں مُطلق نہیں آئی اور دوپہر کے وقت اُس نے ایک مختصر سا نوٹ بدیں مضمون بھیجا "میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کی ازدواجی زندگی پُر آلام بنے اور آپکی شہرت کو گزند پہونچے۔ میں کل ہی ناصر سے شادی کرنے والی ہوں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اِس صورت میں اُن تمام افواہوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو مجھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اب آپکے ہاں میری ملازمت کا جاری رہنا ناممکن ہے"

جب میں نے زبیدہ سے اِس بات کا ذکر کیا کہ زہرہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی ہے اور ناصر جیسے اوباش سے شادی کرنے والی ہے۔ تو اُس نے کسی قدر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے سرد مہری سے کہا "زبیدہ اسکی تمام ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ تم نے اُسے ملازمت چھوڑ دینے کو خط لکھا تھا"

وہ ندامت سے نگاہیں نیچی کرتے ہُوئے بولی "میں نہیں سمجھتی تھی کہ اُس کا یہ انجام ہوگا"

"تم کاہے کو جانتیں"۔ غصہ میں میرے مُنہ سے نکلا "کیا تم احمقانہ جذبۂ رقابت کو اپنے دل سے کبھی نہیں نکال سکوگی"

"آہ! میں کہہ نہیں سکتی"۔ زہرہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ "یہ جذبہ میری رُوح کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا ہے"

(۶)

زندگی کے ہر شور ہنگامے ایک ہی رفتار پر ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور انسان کشمکشِ حیات میں محو ہو کر گزشتہ واقعات کو بھول جاتا ہے میں بھی بدستور اپنے پیشہ کی مصروفیتوں میں منہمک ہو گیا۔ زبیدہ دن بدن اختر کی صحبت میں خوشی محسوس کرنے لگی اور اب وہ زیادہ تر سیر و تفریح اور تماشاگاہوں میں گزارنے لگے۔ اسی طرح میری کتاب زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ گیا۔

زہرہ کی یاد قریب قریب میرے دل سے نکل چکی تھی۔ ایک شب کو میں کسی پبلک جلسہ میں تقریر کر رہا تھا کہ پچھلی نشستوں سے کچھ شور سنائی دیا ایک مضبوط و توانا نوجوان شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر کچھ گڑبڑ مچا رہا ہے، اور جب لوگوں نے تنگ آکر اُسے جلسہ گاہ سے باہر نکالا تو میں نے اُسے پہچانا! کہ وہ زہرہ کا شرابی خاوند ناصر تھا۔ جلسہ کی کارروائی ختم ہوتے ہی میں نے ناصر کی بابت دریافت کیا۔ اُس وقت وہ بدمستی کی حالت میں ایک بنچ پر بیہوش پڑا تھا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ اسکی بیوی اچانک بیمار ہو گئی تھی، اور وہ ڈاکٹر کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ مگر راستے میں شراب کے نشہ سے چُور ہو کر سب کچھ بھُول چکا تھا۔ مجھے زہرہ کی بدقسمتی پر افسوس ہُوا مگر ساتھ ہی اپنی بیوی پر بھی غصہ آیا جسکی بدولت وہ ناصر سے شادی کرنے پر مجبور ہُوئی تھی۔

ایک دوست کی مدد سے میں نے ناصر کو اپنی موٹر میں بٹھایا اور اسکے گھر کا رُخ کیا۔ راستہ میں زہرہ کے علاج کے لئے میں نے ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ لے لیا اور قریباً آدھ گھنٹہ میں ہم ناصر کے مکان پر پہونچ گئے۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں نے ایک حسرت آمیز منظر دیکھا۔ سبز لیمپ کی مدھم روشنی کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور زہرہ شدت بُخار سے بسترِ علالت پر پڑی ہُوئی کراہ رہی تھی، اُسکے چہرے کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور پسینہ کے قطرات اُسکی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز پر رُوئی کے چند

ٹکڑے اور ایک بڑا سا چاقو پڑا تھا۔ مکان سے باہر موسم بہار کا کوئی خوشنوا پرندہ زندگی کے پُرمسرت نغمے گا رہا تھا اور اُسکی شیریں آواز کھڑکی کے راستے اندر سُنائی دے رہی تھی۔

ہم دوڑ کر زہرؔہ کی چارپائی کے قریب جا کھڑے ہُوئے اور ڈاکٹر نے اُسکی نبض و دل کی حرکت کا معائنہ کرکے اُسے دوا پلائی۔ ناصرؔاب قدرے ہوش میں آچکا تھا اور دروازہ میں کھڑا ہمیں غصہ و نفرت سے گھُور رہا تھا۔ یکدم وہ غُصّہ میں گرجتا ہُوا ڈاکٹر کی جانب بڑھا اور اُسے دھکّا دیکر فرش پر لُڑھکا دیا۔ پھر زہرؔہ کے قریب آکر درشتی سے کہنے لگا "اُٹھو۔ تم یہاں لیٹی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ میرے لئے کھانا تیار کرو۔" میں دوڑ کر اُسکے سامنے کھڑا ہُوا اور اُسے پیچھے ہٹاتے ہُوئے زہرؔہ کے قریب سے چلے جانیکا حکم دیا۔ ناصرؔ نے غصّہ سے منہ کھولکر میری طرف دیکھا اور ایک خونخوار درندے کی مانند اُسکی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ یک لخت میز پر سے چاقو اُٹھاکر ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ بھُوکے شیر کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا ―― زہرؔہ کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی۔

میں فوراً جست کرکے ایک طرف ہٹ گیا اور پھُرتی سے ناصرؔ کے منہ پر اس زور سے مُکا رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آرہا۔ گرتے وقت اسکا سر اس زور سے آتشدان سے ٹکرایا کہ اس سے خون بہنے لگا۔ اور وہ بیہوش ہوگیا۔ اس اچانک حادثہ سے میں سخت گھبرایا۔ ڈاکٹر نے ناصرؔ کے سر پر پٹی باندھنی شروع کی۔ اور میں نے ٹیلیفون پر پولیس کو موقع واردات پر پہونچنے کی اطلاع کی۔

جب میں واپس ہونے لگا تو رات نصف کے قریب گزر چکی تھی زہرؔہ کا بخار ہلکا ہوگیا تھا۔ مگر ناصرؔ کی حالت بدستور تشویشناک تھی اگرچہ اس کا سانس برابر چل رہا تھا۔ تاہم شدتِ زخم سے وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پولس فوراً موقع پر پہونچ گئی۔ اور انسپکٹر پولس نے مجھے بتایا کہ میں گھر پہونچ کر مزید اطلاع کا انتظار کروں۔

وہ رات میں تمام عُمر نہیں بھُولونگا۔ میں تیزی سے گھر کی طرف موٹر دوڑا رہا تھا آسمان پر ماہ مئی کا چاند دم بخود تھا۔ سڑک کے دونوں جانب سفید و گلابی پھُولوں سے لدے ہوئے سیب کے درخت تیزی سے میرے قریب سے گزر رہے تھے اور فضا میں ایک ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی، تھوڑی دیر بعد ہوا کا کوئی گستاخ جھونکا کھڑکی کے راستے موٹر میں داخل ہوکر میرے جسم میں تھر تھراہٹ پیدا کر دیتا۔ رات کی خاموشی میں کسی پرندے کی اچانک آواز نہایت خوف آمیز معلوم ہوتی۔ اُسوقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے موت کا بھیانک فرشتہ ایک سائے کی طرح میرے گرد منڈلا رہا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدانخواستہ اگر ناصرؔ کی موت واقع ہوگئی تو اُسکی تمام ذمہ داری میرے سر تھوپ دی جائیگی۔ زہرؔہ کے بارے میں لوگ مجھ سے بدظن ہوچکے تھے اور اب اُن کے لئے یہ سمجھنا نہایت آسان تھا کہ زہرؔہ کو حاصل کرنیکے لئے میں نے اُسکے خاوند کو ہلاک کر دیا ہو۔ اگرچہ ڈاکٹر کی شہادت میرے حق میں اس باتؔ کا کافی ثبوت تھی کہ میں نے حفاظتِ خود اختیاری میں ناصرؔ کو ضرب لگائی تھی۔ تاہم سابقہ حالات کو پیشِ نظر میں خود کو ایک ایسی خطرناک چوٹی پر کھڑا دیکھ رہا تھا جہاں سے پھسل کر میرا قعرِ مذلت میں گرنا لازمی امر تھا۔ مجھے زبیدؔہ سے بھی کسی خاص مدد کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنے حاسدانہ جذبات کی آگ میں جلتے ہوئے کئی مرتبہ مجھے بھی چھوڑ جانیکی دھمکی دے چکی تھی۔ اگر سچ مچ اُس نے مجھے اِس مصیبت میں چھوڑ دیا تو لوگ مجھے اور بھی مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں گے ―― اسی قسم کے خیالات رہ رہ کر میرے دل کو مضطرب بنا رہے تھے۔

(۷)

جب میں گھر پہونچا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مکان میں ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ میں فوراً اپنی خوابگاہ میں داخل ہُوا۔ کمرہ میں ابھی تک لیمپ روشن تھا۔ اور میز پر ایک لفافہ پڑا ہوا تھا میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ تحریر زبیدہ کی تھی۔ اور خط پر یہ عبارت درج تھی۔

"میں اخترؔ کیساتھ جا رہی ہوں وہ مجھے از حد محبت کرتا ہے جسطرح تم نے مجھے آتشِ حسد میں جلایا ہے اب خود بھی جلنے کا مزہ چکھو۔"

میری آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے، اور مجھے پیشانی پر خون کے قطرات ٹپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رقابت و حسد کی ایک تیز و تند لہر نے میرے تن بدن میں آگ لگادی۔ ایک ہی وار میں مَیں زبیدہ اور اخترؔ دونوں کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اُٹھایا کہ ریلوے اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے کا وقت دریافت کروں۔ مگر اس خیال سے رُک گیا کہ شاید وہ ٹرین پر سوار ہی نہ ہوئے ہوں، کیونکہ اخترؔ کے پاس موٹر موجود تھی نیز مجھے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔ ایک تیر خوردہ جانور کی طرح میں حالتِ اضطراب میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا غصّہ سے میرا جسم اور روح بُری طرح لرز رہے تھے۔ محبت کی بجائے اب رقابت و حسد کا وحشیانہ جذبہ مجھ پر تسلط جما چکا تھا۔

کئی گھنٹے بعد کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو پولیس سب انسپکٹر دروازہ میں کھڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ زبیدہ کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہے۔ کیونکہ اُسکی بیوی زبیدہ کی دوست تھی۔ مگر وہ مجھے انسپکٹر پولیس کی طرف سے اطلاع دینے آیا تھا۔ کہ ناصرؔ ابھی تک زندہ تھا اور ڈاکٹر کی رائے تھی کہ صبح ہونے تک وہ یقیناً ہوش میں آجائیگا۔

اسکے جانیکے بعد مجھے قدرے اطمینان ہُوا مگر اس وقت میرے پیشِ نظر میری زندگی کا دوسرا پہلو تھا۔ مجھے سوائے زبیدہ کے اور کسی چیز کا خیال نہ تھا

تعمیرِ جنوں

کالج میں اندرا سب سے حسین لڑکی شمار کی جاتی تھی، اسکے چہرہ کا اگر تشریحی جائزہ لیا جاتا تو اس کا حسن کسی طرح غیر معمولی نہ معلوم ہوتا، لیکن اس کا مجموعی اثر ایک خاص دلکشی و جاذبیت پیدا کرتا تھا جس سے کالج کی دوسری لڑکیاں قطعاً محروم تھیں اور پھر اُسکی دلاویزی کا راز صرف اُسکی ظاہری صورت میں نہ تھا بلکہ اسکی سادہ بے بناوٹی فطرت بھی بڑی حد تک اسکی دلکشی کا موجب تھی، اسکی بات چیت لباس وضع طور طریقہ سے کسی طرح ظاہر نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کی اکلوتی بیٹی تھی وہ اپنے سب ساتھیوں سے ایک طرح ملتی۔ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے ملنے میں وہ کبھی اس سے زیادہ شرم و حجاب کا اظہار نہ کرتی، جتنا کہ اُسکی جنس کا فطری تقاضہ ہوتا، لیکن ساتھ ہی وہ کسی سے ملنے جلنے میں اپنا نسوانی وقار بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ان خصوصیات نے اندرا کو کالج کے طلبا کا مرکزِ توجہ بنا دیا تھا۔ اندرا بھی سبھوں سے ملتی اور پھر کسی سے شیر و شکر بھی نہ ہوتی۔ لیکن شیام سندر کے ساتھ بہ نسبت اور ساتھیوں کے وہ زیادہ آزاد تھی، اسکی وجہ صرف اتفاقی تھی یعنی یہ کہ اندرا اور شیام سندر نے ایک ساتھ ایک اسکول میں تعلیم شروع کی، ساتھ ہی میٹرک پاس کیا، اور کالج میں بھی ساتھ تھے، صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایک ہی محلّے میں رہتے تھے اور ان کے والدین کے درمیان عرصہ سے کافی تعلقات تھے۔ غالباً یہی قدیم لگاؤ کے سبب شیام سندر اندرا سے اس طرح نہ ملتا تھا جس طرح اسکے دوسرے ساتھی ملتے تھے۔ وہ جب اندرا سے باتیں کرتے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جذبۂ شوق اپنی تکمیل کے لئے بیچین ہو رہا ہے۔ لیکن اظہار نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہے بس کسی مناسب موقع کا منتظر ہے۔ انکی نگاہیں یوں تو دوسری طرف لگی ہوئی معلوم ہوتیں لیکن اس سے آنکھیں بچا کر وہ کبھی کبھی اسے للچائی نظروں سے دیکھ لیتے۔ انکے انداز میں مبالغہ آمیز متانت و سنجیدگی ہوتی جو بجائے انکی دلی کیفیات پر پردہ ڈالنے کے اسکی مضحکہ خیز پردہ دری کرنے لگتی وہ اندرا کو چاہتے تھے اور اپنے دلوں میں اس سے محبت کرنیکا دعویٰ رکھتے تھے۔ کامل احساس کے ساتھ اسلئے کہ انکی ملاقات اندرا سے اس وقت شروع ہوئی تھی جب انکا محبت کرنے کا جذبہ اپنا بچپن ختم کر کے علم پسند آدیسے امتزاج حاصل کر چکا تھا اور محبت کا مفہوم اُنکے لئے صرف محبوب کی موجودگی انبساط و مسرت کے چند سیدھے سادے تاثرات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں محبوب کے حصول کی خواہش بھی شامل ہو چکی تھی اس خواہش کا علم اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے غور و تفکر کی جولانی۔ اس کے برعکس شیام سندر کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ اُسے اندرا سے محبت تھی۔ وہ بچپن سے ایکدوسرے سے ملتے جلتے آئے تھے اور آج بھی ان کے باہمی اختلاط میں اُسی معصومیت اور سادگی کی روش باقی تھی۔ گو ان کے دوسرے ساتھی انکی راہ و رسم میں اپنی کیفیات کا عکس دیکھ کر اسمیں مختلف معنی بھر دیا کرتے تھے، دُنیا کا ہر انسان اپنی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک لگائے پھرتا ہے جسکی وجہ سے اُسے کائنات کی ہر شے اُسی رنگ کی نظر آتی ہے اور اس طرح وہ کسی چیز کو اسکی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مجبوری شاید انسانی فطرت کی تعمیر کا ایک لازمی جزو ہے۔

اندرا آئی، اے پاس کر کے بی۔ اے میں داخل ہوئی، اُسکے نئے ساتھیوں میں کانپور کے مشہور تاجر، بابو گوپال سرن، کا بیٹا پرکاش بھی تھا جو بنارس ہندو یونیورسٹی سے آئی، اے پاس کر کے بی، اے میں داخل ہوا تھا۔ پرکاش کا مردانہ حسن اور تناسبِ اعضا بہت جلد اُسکے ساتھیوں کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ بنارس یونیورسٹی میں اس نے یونیورسٹی میں اول انعام حاصل کیا تھا۔ سارے ساتھیوں کو اسکی تقریر سننے کا شوق تھا۔ "وہ جب اپنی اس مقناطیسی شخصیت کیساتھ تقریر کرتا ہوگا تو ساری فضا سحر آگین ہو جاتی ہوگی" وہ آپس میں گفتگو کرتے اور اس دن کے بیچینی سے منتظر تھے جب کالج ڈیبٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے سالانہ جلسہ میں پرکاش مباحثہ کی افتتاح کرنیوالا تھا۔ آخر وہ دن آ پہونچا۔ پرکاش نے مباحثہ شروع کیا۔ پرکاش کی جاذبیت اس وقت قابلِ رشک ہو رہی تھی، اسلئے کہ وہ صرف ایک حسین شخصیت کا حامل نہ تھا بلکہ ایک بلند دماغ اور مسحور کر دینے والے الفاظ و بیان بھی اُسکے حصہ میں آئے تھے۔ ساری نگاہیں صرف اسی کو تک رہی تھیں۔ اندرا بھی ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہی تھی "کتنا حسین مقرر ہے" اس نے دلمیں سوچا اور نیم مدہوشی کی حالت میں پرکاش کی جادو بھری تقریر سنتی رہی، تقریر ختم ہوئی تو اسکی تالیوں کی آواز دوسروں سے زیادہ بلند تھی۔ اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ تالیاں بجاتے وقت وہ اپنی جگہ سے

کچھ کھڑکی بھی ہو گئی تھی۔

دوسرے دن اندرا شیام سندر سے بار بار پرکاش کی تعریف کر رہی تھی۔ شیام سندر خود بھی پرکاش کی شخصیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ وہ بھی اندرا کی تائید کرتا جا رہا تھا۔

"کیوں نہ اُسے ہم اپنے ساتھ چائے پر مدعو کریں؟ ہم اسکی عالمانہ اور پُر از معلومات گفتگو سے ضرور فائدہ اُٹھا سکیں گے"

"کہاں؟"

"اپنے مکان پر"

"کیوں نہیں!" اندرا کی کالج کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنے گھر پر بُلانیکا خیال ظاہر کر رہی تھی۔ شیام سندر کو اسکی اس خلاف وضع حرکت پر تعجب ضرور ہُوا "لیکن پرکاش کی شخصیت واقعی اس خصوصیت کی مُستحق ہے" اس نے خیال کیا

"تو پھر پرکاش کو تم میری طرف سے مدعو کرو"

"کیوں تم اس سے خود کیوں نہیں کہتیں"

"تم ہی کہدو گے تو کیا ہو گا؟"

"میں تو اُسے مدعو نہیں کر رہا ہوں"

"تو میں یہ تھوڑی ہی کہتی ہوں کہ تم اُسے مدعو کرو۔ صرف میری طرف سے اُسے کہدو۔ مجھے خود کہتے ہوئے ذرا بے تکا سا معلوم ہوتا ہے"

"لیکن بے تکا پن تو زیادہ میرے کہنے میں ہے"

"تو تم نہیں کہو گے؟"

"میں تو نہیں کہتا۔ تمہارا اصرار ہے تو کہدونگا"

شیام سندر کو اندرا کی یہ ضد کچھ ایسی انوکھی سی معلوم ہوئی۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے گفتگو کرنے میں بلا وجہ شرم و حجاب کی عادی نہ تھی۔ اور پھر اُسے پرکاش سے کچھ ایسی زیادہ باتیں بھی نہیں کرنی تھیں۔ صرف چاء پر بُلانے کے لئے کہنے میں اُسے تامل کیوں ہو رہا تھا؟ "وہ پرکاش کی شخصیت سے بہت زیادہ مرعوب ہو گئی ہے" اس نے دل میں سوچا اور پرکاش کو اندرا کی طرف سے مدعو کرنیکے لئے اسکے قریب جانے لگا۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا کہ قدم آگے بڑھانے میں اسے کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی دشوار مُہم پر جا رہا ہو۔ "اندرا نے تمہیں آج یہاں چاء پر بُلایا ہے"۔ اُس نے پرکاش کے قریب پہونچتے ہی تیزی سے یہ الفاظ کہہ ڈالے۔ جیسے وہ کسی زبانی یاد کئے ہوئے جملہ کو دُہرا رہا ہو۔

"یعنی؟ مجھکو؟ کب؟" پرکاش نے شیام سندر کے اندازِ گفتگو سے متحیر ہوتے ہوئے یہ سوال کیا۔

"آج شام کو" شیام سندر نے جواب دیا۔ وہ اپنی گفتگو کا بے تکا پن محسوس کر کے شرما گیا "یہ اندرا نے مجھ سے بے موقع یہ کام لیا، اسے خود پرکاش سے کہنا چاہیئے تھا" اس نے خیال کیا۔

"اور کون ہو گا؟"

"میں تم اور اندرا"

"اچھی بات ہے مجھے کوئی عذر نہیں"

اندرا پرکاش کی دعوت کے انتظام میں مُنہمک تھی۔ شیام سندر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اندرا کا یہ انہماک اُس پر ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کر رہا تھا جس کی وہ خود اپنے دماغ میں بھی کوئی تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کسی خوف کا اتنا ہلکا احساس کہ اُسے کسی دوسرے جذبہ سے تمیز کرنا مشکل ہو۔ رہ رہ کر اُسکے دماغ میں وہاں سے چلے جانیکی ایک مُبہم سی خواہش پیدا ہوتی تھی لیکن اپنی ناموزونیت کی وجہ سے اس خواہش کو قرار حاصل نہ ہوتا۔ شیام سندر اپنے اندر ایک اضطراب آگین کیفیت کا عمل محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ میں اس طربناک انتظار کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسے پرکاش کی فلسفیانہ اور دلاویز گفتگو سے لُطف اندوزی کے تصور کا نتیجہ ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ اس کوشش میں ناکام ہو رہا تھا۔ کیوں؟ اس کے سبب کے سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔

پرکاش وقت مُقررہ پر اندرا کے مکان پر پہونچ گیا اور تینوں ایک ٹیبل کے تین طرف بیٹھ گئے۔

"آپ نے اتنا تکلف ناحق کیا۔ اس قسم کی صحبتیں کھانے پینے کی غرض سے تھوڑی ہی ہوتی ہیں کہ انکے لئے اتنا اہتمام کیا جائے۔"

"نہیں کوئی خاص تکلف تو نہیں ہے" اندرا نے کیک کی رکابی پرکاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں جس میں زیادہ گفتگو پرکاش کر رہا تھا، شیام سندر اور اندرا خموشی سے سُن رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع موجودہ ادبی رجحان۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں، ہندوستان کا مستقبل دُنیا کا مذہب، ان سبھوں سے بدلتا ہُوا سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) پر آ پہونچا تھا۔

"سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) نے ہمارے سامنے ایک نئی دُنیا پیش کر دی ہے جسکی وسعتیں بھی بے پناہ ہیں اور گہرائیاں بھی انتہاء۔ ینگ (Jung) نے تو اپنے کلکٹو انکونشنس (لاشعور ذہن اجتماعی)

کو حیات کے سارے منازل تجربات و مشاہدات کا مکمل ریکارڈ قرار دے رکھا ہے۔ گویا ہمارے روزمرہ کے کردار پر صرف انہیں جذبات و محرکات کا اثر نہیں پڑتا جنکی بنا ہماری انفرادی زندگی میں ہوتی ہے بلکہ اُن سارے ترغیبات و رجحانات کا جو ابتدائے آفرینش سے نسلاً بعد نسل ہماری وراثت میں آتی جا رہی ہیں اور جن کا مخزن ہمارا ذہن لاشعوری ہے۔ واقعی یہ نظریہ نہایت صحیح ہے ورنہ ہم باوجود اتنے متمدن ہو چکنے کے اکثر حالات میں اُن حرکتوں کے کیوں مرتکب ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک غیر متمدن قوم بھی شرما جائے؟ آپ اسپین کی سول وار کو دیکھیے کیا اسکے اندر وہی خون آشامی و غارتگری کا وحشیانہ جذبہ عمل پیرا نہیں ہے جو ہمارے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے آباؤ اجداد کی روزمرہ زندگی کا جزوِ لاینفک تھا؟ کیا اسپین کا کوئی ذی فہم باشندہ اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کی خون کی ندیاں بہانا، بیگناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو تہ تیغ اور بے خانماں کر دینا، خوبصورت شہروں اور دلکش عمارتوں کو جنکے کمالِ صنعت پر وہ دُنیا کے سامنے فخر کیا کرتا تھا اس طرح اپنے ہی ہاتھوں سے ویران و برباد کر دینا انسانی اُولوالعزمی و سربلندی فرزانگی و وسعت نظری کی ہنسی اُڑانا ہے؟ وہ اگر تنہائی میں بیٹھ کر اپنی حرکتوں کا جائزہ لے تو کیا سب سے پہلے اپنے ہی کو گولی مار دینے کے قابل نہ تصور کرے؟ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ذہن اجتماعی (Group mind) جسکے وجود و نشوونما کا راز حیات کی مکمل تاریخ میں ملتا ہے اس پر مسلط ہے اور اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا۔"

پرکاش اپنی گفتگو میں منہمک تھا۔ اندرا نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی جیسے وہ گفتگو سے زیادہ کھانے کی چیزوں سے دلچسپی لے رہی ہو۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ پرکاش پر ڈال لیا کرتی تھی۔ شیام سندر اندرا کے انداز میں ایک انوکھا پن محسوس کر رہا تھا۔ اُسکی نگاہوں میں اُسے اُن ساقیوں کی نظروں کی جھلک دکھلائی دے رہی تھی جنہیں اندرا کی محبت کا دعوٰی تھا۔ ویسی ہی چرائی ہوئی سی نگاہیں۔ وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطے مارنے لگا۔ "اندرا پرکاش کو چاہنے لگی ہے" اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُسکے کان میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ "تو پھر اس میں حرج بھی کیا ہے؟" جیسے اُس نے ان الفاظ کا جواب دیا۔ "کیا پرکاش اندرا کی محبت کا حقیقی معنی میں اہل نہیں ہے؟ لیکن پھر اسکے دماغ میں خوف کا سا دُھندلا پن کیوں پھیل گیا؟" "اندرا سے اُسکی راہ و رسم ختم ہو جائیگی" اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُسکے دماغ پر ٹھوکروں سے یہ آواز پیدا ہوئی۔ "کیوں؟ ایسا کیوں ہونے لگا؟ پرکاش سے اُسکی دوستی کچھ کم نہیں ہے وہ اسکے بعد بھی اندرا سے اسی طرح مل جُل سکتا ہے۔" "کس کے بعد؟" جیسے کسی نے اُس سے اس جملہ کی توجیہ کی فرمائش کی۔ "اندرا کی پرکاش سے شادی کے بعد۔ کیا یہ ایک بہترین جوڑا نہ ہوگا ان دونوں کے ملاپ پر خود فطرت اپنی حسن آفرینی و موزونیت پر ناز کریگی" "لیکن وہ کیا کریگا؟" یہ سوال اُسے بالکل بے معنی سا معلوم ہوا، وہ اندرا اور پرکاش سے اپنی دوستی اور مضبوط کر کے انکی صحبتوں سے ویسے ہی لطف اندوز ہوتا رہیگا۔"

شیام سندر کا دماغ ایک مستقل مکالمہ کا سین بنا ہوا تھا۔ پرکاش کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ "آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کریں گے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے، اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں۔ بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل و کردار کی کوئی غرض و غایت نہیں۔ اگرچہ آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا، اور اسکی آزادی قطعاً بے معنی۔ میں اس احسان کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں جو علمائے نفسیات نے انسانیت پر" دفعتاً چاء کی پیالی جو شیام سندر کے لبوں سے قریب ہو رہی تھی، اس کے مرتعش ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور میز پر چاء دانی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور چاء کی چھینٹیں تینوں کے کپڑوں پر گریں۔ اندرا اور پرکاش یکبارگی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیام سندر کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اُسکی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُسکی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں گھر جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے علیحدہ ہونے لگا۔

اندرا گھبرا گئی۔ پرکاش پر بھی حیرت و استعجاب طاری ہو گیا۔

"شیام! تمہیں یہ یک بیک کیا ہو گیا۔ گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ، گھر جا کر کیا کروگے۔ فوراً طبیعت ٹھیک ہو جائیگی" اندرا نے شیام سندر کے قریب آ کر کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اندرا مجھے اب یہاں ٹھیرنے دو۔ میرا سر بُری طرح گھوم رہا ہے۔ میں ایک منٹ بیٹھ نہیں سکتا۔ پرکاش مجھے سخت ندامت ہے کہ میری وجہ سے یہ دلچسپ صحبت بے لطف ہو گئی۔ تم مجھے معاف کروگے"

"توبہ! کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو کہتا ہوں تھوڑی دیر بیٹھ

جاؤ، طبیعت سنبھل جائیگی

"نہیں مجھے جانا ہی چاہئے"۔ کیوں؟ اس کا سبب خود شیام سندر کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندرا کے مکان سے باہر نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی اُس نے محسوس کیا کہ اُسکے دماغ کا توازن قائم ہوگیا تھا اور اس کے خیالات کا دُھندلا پن مفقود۔ اب وہ ہر بات صحیح طور سے سوچ سکتا تھا۔ "وہ کتنی لطیف صحبت آج میری وجہ سے کرکری ہوگئی۔ نہ جانے مجھے یک بیک کیا ہوگیا تھا۔ پرکاش جانے کیا سمجھتا ہوگا۔ مگر وہ ان سطحی باتوں سے بہت بلند ہے اُسے اتنی اتنی باتوں کا خیال نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک قابل قدر شخص ہے۔ کتنا خوبصورت کتنا ذی علم اور ساتھ ہی کتنا عمدہ انسان۔ خدا کرے وہ بھی اندرا کو پسند کرے، اور دونوں کی شادی ہوجائے"۔ دل میں اس طرح باتیں کرتا شیام سندر گھر آکر کرسی پر دراز ہوگیا اور دیر تک اسی طرح مختلف خیالات میں اُلجھتا سو گیا۔

شیام سندر دن بدن اپنی دوستی پرکاش سے بڑھا رہا تھا۔ وہ پرکاش کی عدیم المثال شخصیت کی پرستش کرنے لگا تھا پرکاش اس کی اس عقیدتمندی کا جواب اس خلوص ومحبت سے دے رہا تھا جو اسکی اعلیٰ شخصیت کی متقاضی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے قلوب میں ایک مستقل رابطہ پیدا ہوگیا تھا جس کے اثر سے ایک کی کیفیات کا صحیح عکس دوسرے پر پڑ جاتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ذہن وشعور کے عمل میں بھی ایسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ سوچنے یا سمجھنے سے معذور ہو رہے تھے۔

کالج ڈبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے نائب صدر کا سالانہ انتخاب نزدیک تھا۔ شیام سندر نے پرکاش کو اُمیدوار بننے کے لئے آمادہ کیا۔ پرکاش اپنی جانب سے اسکے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ اسلئے کہ اسکے دماغ میں ایسے ایسے اعزازوں کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن شیام سندر کی خاطر اسے منظور تھی، مگر اس وعدہ کیساتھ کہ وہ کسی کے سامنے بھی اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے زبان نہ کھولیگا۔ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش اُسکے خیال میں اُصولِ نمایندگی کی بدترین توہین تھی۔ جس نے ڈیماکریسی (جمہوریت) کو ایک بے معنی وکھوکھلا لفظ بنادیا ہے۔ ساری کنویسنگ شیام سندر کو کرنی تھی۔ شیام سندر اسکے لئے آمادہ تھا۔ اپنے اعلیٰ کیرکٹر کی وجہ سے اُسکے ساتھیوں میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اسلئے اسے یقین تھا کہ پرکاش کی بلند صلاحیتیں اور اس کی کوشش ان دونوں کی موجودگی کے بعد کسی اُمیدوار کا پرکاش کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دشوار تھا۔

پرکاش کے مقابلہ میں چندر شیکھر، جو پرکاش کے کالج میں داخلہ کے قبل تک کالج کا سب سے اچھا مقرر سمجھا جاتا تھا، پرکاش کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ اِدہر شیام سندر بھی پرکاش کے لئے زوردار کنویسنگ کر رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے اپنی ذات پرکاش کی شخصیت میں مدغم کردی تھی اور اس میں اور پرکاش میں کوئی فرق باقی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی کامیابی کے لئے بھی اس سے زیادہ کوشش نہ کرسکتا تھا۔

الکشن کے دن شیام سندر بستر سے بہت سویرے اُٹھ گیا۔ وہ عموماً اتنے سویرے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔ لیکن اس دن اسے پرکاش کے کام سے باہر جانا تھا جسکی اہمیت اسکے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ اس نے ابتک باہر کے درمیان کنویسنگ کی تھی۔ آج اسے ہوسٹلوں میں ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے جانا تھا۔ الکشن ۳ بجے شام کو ہونے والا تھا۔ وہ اسوقت تک اپنا وقت وہیں گذارنے والا تھا۔ اس صبح کی ضرورتوں سے جلد فراغت حاصل کرلی اور سائیکل لے کر گھر سے باہر جانے لگا "اسکی برک ڈھیلی ہوگئی ہے، دُرست کرالیجئگا" اسکے چھوٹے بھائی نے اس سے کہا۔ لیکن اس نے صرف الفاظ سُنے۔ انکے مطلب کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہوا جیسے وہ کسی غیر زبان کے الفاظ تھے۔ اور سائیکل پر گھر سے روانہ ہوگیا۔ وہ تیزی سے سائیکل چلائے جا رہا تھا۔ ایک ٹرم ٹرم اسکی طرف آرہی تھی۔ سڑک وہاں پر تنگ تھی، پھر بھی وہ ٹرم ٹرم کے بغل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ لیکن اس نے یکبارگی سائیکل کا رُخ اپنے بائیں جانب پھیر دیا جیسے کوئی نوآمیز سائیکل باز جسے گھبراہٹ میں اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا۔ سڑک کے کنارہ سے میونسپلٹی کا نالہ بہتا تھا، سائیکل کا بریک ڈھیلا تھا سائیکل نالہ کے اندر جا گری۔ شیام سندر کے سر میں شدید چوٹ آئی اور وہ بیہوش ہوگیا۔ اسکی آنکھیں کُھلیں تو اس نے اپنے کو اسپتال میں ایک بستر پر پڑا پایا۔ اسکے سر میں بینڈیج بندھا ہوا تھا اور اُسکے جسم پر جابجا مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ وہ اپنی اس حالت کا جائزہ لے کر افسردہ ہو رہا تھا۔ گھڑی نے شام کے پانچ بجائے۔ اور اس کا خیال دفعتاً پرکاش کے الکشن کی طرف منتقل ہوگیا "الکشن ختم ہوگیا ہوگا جانے پرکاش کا کیا ہوا ہوگا"۔ اس نے سوچا لیکن اس خیال سے جو اضطراب وہزیمت کی کیفیت اس پر پیدا ہونی چاہئے تھی نہ ہوئی۔ بلکہ اسکے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا قلب مطمئن تھا۔ گو اس طمانیت پر استعجاب وحیرت کی کیفیت غالب تھی۔ اس اچانک حادثہ کا کوئی معقول سبب اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ کافی مشاق سائیکلسٹ تھا۔ پھر اُسے ہو کیا گیا تھا؟ اس نے بریک کی مرمت کیوں نہ کرالی جب کہ اسکے بھائی نے اسے مطلع کردیا تھا۔ اُسے اپنی اس حماقت پر غصہ آنے لگا۔

پرکاش کو الکشن میں ناکامیابی ہوگئی۔ ہوسٹل کے سارے لڑکے اس وجہ سے اسکے مخالف ہوگئے کہ اسے اپنی قابلیت پر گھمنڈ تھا جب ہی تو اُس نے ان سے ووٹ کی درخواست نہ کی تھی! ایک جینیس (Genius) کی زندگی اکثر دُوبھر ہوجاتی ہے، اسلئے کہ اسکی مافوق الفطرت صلاحیت کی تہ تک پہونچنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر لوگوں میں اس صلاحیت کے فقدان کا احساس اسکی فوقیت کو انکی کم مائگی و کوتاہی کے تلخ تجربہ کی ذمہ دار ٹھیرا دیتا ہے۔ اُن کے دلوں میں اسکی طرف سے جذبۂ انتقام اُبھر آتا ہے جسکی تسکین وہ اُسے نیچا دکھا کر کرسکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ایک جینیس کی زندگی ایسے مشکل اور ناموافق احول و اثرات سے گھری ہوتی ہے جن کے مقابلہ کے لئے اسے عمومیت سے کہیں زیادہ ذہنی جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک جینیس کی زندگی قبل از وقت ختم ہوجاتی ہے اسکی بے پناہ سرگرمیاں بہت جلد اسکی صلاحیت کا ذخیرہ مختصر کردیتی ہیں اور اس طرح آپس میں۔ زندگی کے آفات و حوادث کی مُدافعت کی قوت باقی نہیں رہتی۔ اور وہ اس کا شکار ہوجاتا ہے۔

پرکاش کو اپنی ناکامیابی کا صدمہ ضرور ہوا لیکن اس کا احساس اس استعجاب میں کھو گیا جو شیام سندر کے کالج نہ آنے پر اسے ہو رہا تھا۔ الکشن ختم ہوتے ہی وہ سیدھا اندرا کے پاس آیا اور دونوں شیام سندر کے گھر پہونچے۔ شیام سندر کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتے وہ آخر ہسپتال پہونچ گئے۔ اسوقت شیام سندر کو ہوش میں آئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ ان سے مُلاقات ہوئی تو انہوں نے اسکے چہرہ پر غایت اضمحلال اور پراگندگی کے آثار دیکھے اور ڈاکٹر سے مل کر اسکی صحت یابی کے تیقن کا اطمینان کرکے اُسے آرام کرنے کے لئے چھوڑ کر واپس ہوگئے۔ اس کمرہ کی نرس کو تعجب ہو رہا تھا کہ شیام سندر جو اس سے پہلے کافی بشاش نظر آرہا تھا۔ اس نوجوان حسینہ کو دیکھکر اسکے چہرہ کی رنگت کیوں پھیکی پڑ گئی۔ اُسے تو زیادہ خوش نظر آنا چاہئے تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین عورت تھی جو مردوں کی ہوسناکیوں کے آگے اپنا سب سے بیش قیمت جوہر قربان کرکے انکی نفسیات کا حقیقی مطالعہ کر رہی تھی، اور اس طرح ایک مرد کے چہرہ کے رنگوں میں وہ کچھہ دیکھہ سکتی تھی جو دوسروں کو مشکل سے نظر آسکتا تھا۔ پھر شیام سندر کی یہ غیر معمولی کیفیت اسے متعجب کئے بغیر کیوں کر رہ سکتی تھی۔

شیام سندر اسپتال سے بہت جلد صحت یاب ہوکر واپس آگیا اور اس کی زندگی کالج کی مصروفیتوں میں حسب دستور گذرنے لگی۔ اسکی کتابوں کی طرف پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی "میں نے اب تک اپنے ساتھیوں میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن بی، اے کے امتحان میں ضرور اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوں گا" وہ اکثر سوچا کرتا اور آنے والے امتحان کی تیاری میں اور زیادہ مصروف ہوجاتا۔ بی۔ اے کے امتحان میں اُس نے تواریخ میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ پرکاش یونیورسٹی میں اول رہا۔ اور اندرا کو بھی شاندار کامیابی ہوئی، پرکاش اور اندرا کے تعلقات اب اس منزل پر آپہونچے تھے۔ جب محبت تمثیلی (Platonic) حدود سے گذر کر اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور ہمارا جذبۂ خلوص و مقبوضیت کا صرف ایک رومانی نام بن کر رہ جاتا ہے۔ پرکاش اور اندرا کے تعلقات کی خبر اندرا کے باپ کو بھی ہوچکی تھی، اور وہ بہت جلد اس رشتہ کو قوی کردینا چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں طرف سے بات پختہ ہوگئی، اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی، اندرا کے باپ نے شادی کا سارا انتظام شیام سندر کو سونپ دیا۔ شیام سندر نے بخوشی اسے قبول کرلیا۔ شادی کے ایک ہفتہ پہلے سے وہ اندرا کے مکان پر مستقل طور پر منتقل ہوجانے والا تھا، تاکہ سارے انتظام کی پوری نگہداشت کرسکے۔

اندرا کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ پر شیام سندر شب کے ۹ بجے اندرا کے باپ سے دوسرے دن سے مستقل آکر رہنے کا وعدہ کرکے گھر واپس آیا اور آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ دن کے کام سے وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ اُسے بہت جلد نیند آگئی۔ رات کے ۲ بجے وہ یکایک ایک بھیانک خواب سے چونک گیا۔ اسکی گود میں ایک لمبے بالوں والی گُدار بلّی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کھیل رہا تھا۔ یکایک اُسے سامنے ایک عجیب صورت دکھائی دی، جسکے جسم کا آدھا حصہ نہایت خوبصورت اور دلکش تھا۔ لیکن آدھا حصہ زیادہ کریہ اور ڈراؤنا ایسا معلوم ہوتا کہ دو متضاد صورتوں کو الگ الگ بیچ سے سیدھا کاٹ کر دونوں کا نصف جوڑ کر ایک کردیا گیا ہو۔ یہ حیرت انگیز شکل تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی شیام سندر کے قریب آئی اور بلّی کو اس کی گود سے چھین کر اسے اپنے سینہ سے لگالیا۔ شیام سندر کے جسم سے مزاحمت کی قوت غائب ہوگئی تھی وہ چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی آواز بند ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن اسکے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے تھے۔ بلّی اس عجیب شخصیت کے سینہ سے چمٹی ہوئی اسکے خوبصورت گال کو چومنے لگی۔ بلّی کو اپنے قبضہ میں کرکے وہ تیزی سے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اسکے جانے سے فضا میں ایک ہل چل پیدا ہوگئی چاروں طرف سے چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ وہ سارے عالم پر ظلم و ستم ڈھاتا چلا

تھا۔ اسی شور و ہنگامہ سے شیام سندر کی نیند ٹوٹ گئی۔ باہر ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ زور زور سے ٹکرا رہے تھے، تیز و تند ہوا مختلف قسم کی سیٹیاں اور آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شیام سندر نے اُٹھ کر کھڑکی کے سارے کواڑ بند کر دیئے اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔ وہ اپنے سر میں بھاری پن محسوس کر رہا تھا اور اعضا میں درد۔ اسکے قلب کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ کتنا ہیبت ناک خواب تھا" اس نے سوچا اور سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اُسے نیند نہ آئی، صبح ہوتے ہوتے اُسکے سر کا بوجھ اور اعضا کا درد تیز ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے بخار چڑھ رہا ہے۔ اُس نے چاہا کہ اسی حالت میں اندرا کے گھر چلا جائے۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے جسم کی طاقت کسی نے یکبارگی سلب کر لی تھی اور وہ بستر سے اُٹھ تک نہ سکتا تھا۔

شیام سندر ایک ہفتہ سے زیادہ بیمار پڑا رہا۔ اسے تھوڑا تھوڑا بخار رہتا، سر میں شدت کا درد اور اعضا میں اضمحلال جسکے سبب سے وہ نقل و حرکت سے قاصر ہو رہا تھا۔ لیکن باوجود اس بیماری و تکلیف کے اسکے چہرہ پر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نہ ملتے تھے۔ جیسے وہ اس عارضہ کو کوئی اہمیت نہ دے رہا تھا۔ مگر اُسکی بیماری اُسکے معالج کے دماغ میں اُلجھنیں پیدا کرنے کو کافی تھی۔ اس لئے کہ اُسکی علامتیں اس کی پڑھی ہوئی کتابوں کے وضع کردہ اقسام مرض سے موافقت نہ کرتی تھیں۔ وہ کبھی اس کی بیماری کو انفلوئنزا کہتا، کبھی میعادی بخار کبھی اسکے دماغ میں ٹی۔ بی کا شبہ ہوتا، کبھی گنٹھیا کا۔ اس طرح وہ روزانہ نئے فیصلہ میں ترمیم کی گنجائش محسوس کر کے نسخہ میں اسی مناسبت سے تبدیلیاں واقع کر دیتا۔ لیکن شیام سندر کو کوئی افاقہ نہ معلوم ہوتا۔ چنانچہ اسکی بیماری ہی کی حالت میں پرکاش بارات لیکر آیا اور اندرا کو اپنے ساتھ کانپور لے گیا۔ اور شیام سندر اندرا کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس روز دن بھر اسے اُسکا صدمہ رہا۔ اندرا اور وہ ساتھ کے کھیلے تھے۔ دوسرے دن سے اُسے یک بیک افاقہ ہونا شروع ہو گیا، اور وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔

شیام سندر نے بی اے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی، اُسکو دل میں ایک کامیاب وکیل بننے کی خواہش تھی اور اُس نے اس خواہش کی تکمیل میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی، وہ بہت جلد ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔ اندرا اور پرکاش سے اسکی دوستی جاری تھی۔ بلکہ اُسکے ملاقاتیوں میں یہی دونوں تھے۔ جن سے وہ حقیقی معنی میں خلوص اور محبت رکھتا تھا۔ پرکاش اور اندرا دُنیا سے قطعاً بے نیاز فردوسی زندگی گذار رہے تھے۔ کاروبار کا انتظام سارا پرکاش کا باپ کرتا۔ پرکاش قطعاً آزاد تھا، اُسکے اوقات کتب بینی یا مختلف ممالک کی سیر میں گذرتے، اندرا بھی باپ کے مرنیکے بعد سے اپنے آبائی گھر سے بالکل بے تعلق ہو چکی تھی۔ لیکن انکی یہ سکون پرور زندگی فطرت کے دستور کے خلاف تھی۔ فطرت سکون نہیں پسند کرتی وہ خود ہر ساعت مضطرب اور بےچین رہتی ہے اور حیات کو اضطراب و ہنگامہ کی شراب سے سرشاری بخشتی رہتی ہے۔ زندگی کے ساز میں بلا زیر و بم کے نغمہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ پرکاش زندگی کے مضراب کو، اسکی ٹھوکروں کو مگر دور دو ناکارہ بنا رہا تھا، زندگی کے ساتھ اس کا یہ سلوک فطرت کی برداشت سے باہر تھا وہ اس سے اس کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کا باپ یک بیک قلب کی حرکت بند ہو جانیکی وجہ سے مر گیا۔ پرکاش اندرا کے ساتھ کشمیر میں تھا۔ اُسے یکایک تار ملا اور آدم و حوا کی جنت سے نکالے جانے کی داستان تاریخ کے صفحہ پر دوبارہ مرتسم ہو گئی۔ پرکاش کے سر پر ایک ناگہانی عذاب نازل ہو گیا۔ سارے کاروبار کا بوجھ اسے تنہا سنبھالنا تھا۔ وہ اس کام سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اسکی ناتجربہ کاری دوسروں کی کامگاری کا ذریعہ بن گئی۔ کارخانہ کے مُلازموں نے حرام خوری شروع کی۔ الہ آباد کے ایک بڑے دُکاندار نے جو اسکے کارخانہ سے برابر مال خرید اکرتا تھا، اسکے مُلازموں کو ملا کر اُس پر کئی لاکھ کی نالش کر دی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ رقم کارخانہ کو بطور پیشگی قیمت مال ادا کی گئی تھی لیکن اسکے عوض مال وصول نہ ہوا تھا اُس نے جعلی کاغذات مقدمہ کی حمایت میں تیار کر لئے، اور پرکاش کے مُلازموں کو رشوت دیکر اپنے حسب خواہ گواہی کے لئے آمادہ کر لیا۔ پرکاش نے مقدمہ کی پوری کارروائی شیام سندر کے حوالے کر دی اور خود مطمئن ہو کر کارخانے کے دوسرے معاملات کی دُرستی میں مصروف ہو گیا۔ شیام سندر نے پرکاش کے مقدمہ میں اَن تھک محنت اور کوشش سے کام کیا۔ شاید اپنے خاص کام کو بھی وہ اتنی توجہ نہ دیتا۔ اسے کامل یقین تھا کہ مقدمہ پرکاش کے حق میں فیصلہ ہو کر رہیگا۔ مقدمہ کی سماعت کے دن وہ پورے طور پر تیار ہو کر کچہری پہونچا اور مخالف وکیل کی جرح کے جواب میں بحث کرنے کو کھڑا ہوا۔ وہ اپنی خداداد قانونی قابلیت کا سکہ جما چکا تھا اس دن اسکی بحث سُننے کے لئے وکلا کثیر تعداد میں جمع تھے۔ اسلئے کہ انہیں معلوم تھا کہ پرکاش سے گہرے تعلقات کی بنا پر وہ پرکاش کے مقدمہ میں اپنی ساری قانونی صلاحیت کو بروئے کار لائیگا۔ لیکن وہ بہت جلد حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شیام سندر اُس وکیل کی طرح بحث

کر رہا تھا جس نے پہلی دفعہ کچہری میں قدم رکھا ہو اور اپنی گھبراہٹ اور سراسیمگی پر قابو پانے کی ناکام کوشش طفلِ مکتب کی طرح اصل مطلب سے دُور بہکا پھر رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مخالف وکیل اسے ہپنوٹائز کرکے اسکے مُنہ سے اپنے حسبِ مرضی باتیں کہلوا رہا تھا۔ ایسی خام بحث کا نتیجہ ظاہر تھا۔ پرکاش مقدمہ ہار گیا اور اسے اکیسال کی سزا ہوگئی۔

بحث ختم کرتے ہی شیام سندر سیدھا گھر واپس آیا۔ وہ اپنے اندر ایک مجنونانہ کیفیت محسوس کر رہا تھا، اسلئے کہ اسے باوجود اتنی سخت ناکامیابی کے ایک گہری لذّت اور طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے دل و دماغ سے کسی نے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہو۔ لیکن وہ اپنے دماغ کی اس کیفیت کا مفہوم جاننا چاہتا تھا اُس نے پرکاش کی زندگی خاک میں ملادی۔ آخر کیوں! وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا جس کی صحبت کا ایک ایک لمحہ اُسے اپنی ساری کمائی سے زیادہ قیمتی تھا لیکن پھر وہ اُسکی بربادی کا سبب کیوں بنا؟ وہ اپنے دماغ سے ان سوالوں کا جواب مانگ رہا تھا لیکن اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا "بتاؤ مجھکو بتاؤ" وہ بڑبڑانے لگا "مجھکو کیا ہوگیا ہے؟ کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ میرا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ ہاں ہاں! میں پاگل ہوں۔ دیوانہ جسے اپنی حرکات و سکنات پر کوئی قابو نہیں رہتا۔ پھر میری باتوں پر نکتہ چینی خود پاگل پن ہے۔ لیکن نہیں! میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل کیوں ہونے لگا؟ آخر مجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ پرکاش تم بتاؤ۔ میں اندرا سے پوچھونگا! اپنی اندرا سے۔ اندرا صرف میری ہے۔ پرکاش کی نہیں۔ پرکاش! چور! بدمعاش! فریبی! دغاباز! میں تجھے زندہ نہ چھوڑونگا" اُس نے اپنے کپڑے نوچ ڈالے اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا گھر سے نکل گیا۔ وہ اب تک شہر شہر بڑبڑاتا پھرتا ہے۔ اُسکی باتیں بے ربط ہیں لیکن اُسکے ہر مُہمل اور بے معنی جملہ کیساتھ یہ ٹکڑا ضرور شامل رہتا ہے "بدمعاش فریبی مکّار! میں تجھے کبھی زندہ نہ چھوڑونگا"

سیّد محمد محسن، ایم اے عظیم آبادی

"اسرار و معارف"

تو رازِ ہستی سے بیخبر ہے تری نظر حق نگر نہیں ہے | وگرنہ وہ رات کونسی ہے جو غیرتِ صد سحر نہیں ہے
حقیر ذرّات کی جبینیں شعاعِ رفعت سے ضَو فگن ہیں | تجلّیوں کی کشاکشیں ہیں طلسمِ رقصِ شرر نہیں ہے
یہ برق کا اضطرابِ پیہم یہ نبضِ خس کی دھمک کا عالم | حقیقت آمیز ہیں مناظر، فریبِ بینش و نظر نہیں ہے
یہ آگ پانی کا میل باہم، یہ اتحادِ نظامِ برہم | تری نظر دیکھتی ہے سب کچھ یقین تجھ کو مگر نہیں ہے
نہیں ہے گلگوں جبینِ شفق کی، یہ رنگ ہے خونِ آرزو کا | عیاں ہیں کچھ داغِ حسرتوں کے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے
نہ دیکھ ذرّوں کو بے رُخی سے، سمجھ کہ کیا اِن میں ضَو فشاں ہے | تو جسم کا صرف ہے پجاری، تری نظر رُوح پر نہیں ہے
بہارِ گلشن کی کوششوں کا مآل کچھ خشک پتّیاں ہیں | شباب پر آگئی ہے ظلمت، طلوعِ نورِ سحر نہیں ہے
نہیں نفس پہ مدارِ ہستی، یہ وہم ہے اک جنوں پرستی | فضا محبت کی سرمدی ہے، جہاں فنا کا گزر نہیں ہے

خدا کے فضل و کرم سے ماہرؔ میں اس نتیجہ پہ آگیا ہوں
بجز محبت کے دردِ دل کا یہاں کوئی چارہ گر نہیں ہے

ماہر القادری

جُرعات

اعجازِ تجلّی ہے کہ نیرنگِ تماشا   آئینۂ کثرت میں ہے اک جوہرِ یکتا
شعلہ ہو کہ لالہ ہو شرارہ ہو کہ تارا   ہر جلوۂ رنگیں میں مجھے وہ نظر آیا

دردِ بے بینشِ دُنیا سے تڑپ اُٹھتا ہوں   کوئی تو میری طرح دیکھنے والا ہوتا
بزمِ ہم جنس میں ہوں سب سے جُدا سب سے الگ   اِس سے بہتر تھا کسی دشت میں تنہا ہوتا

کہاں وہ لحن کہاں نغمۂ سرود و ستار   وہ کوئی نشّہ ہے جس میں ہو التزامِ خُمار
زمانے بیت گئے مدّتیں ہوئیں لیکن   ہنوز رُوح فزا ہے وہ لذّتِ گفتار

کیا جانے کس خیال میں محوِ سکوت ہوں   ورنہ بیانِ شوق سے قاصر زباں نہیں
اے چشمِ التفات نہ کر منفعل مجھے   جو کچھ ہے میرے دل میں وہ تجھ سے نہاں نہیں

کبھی سینہ میں پنہاں ہے کبھی منظر سے پیدا ہے   جمالِ یار کہتے ہیں جسے حُسنِ تمنّا ہے
نہیں لازم کہ موسیٰ کی طرح سب طورِ پر دیکھیں   بحمد اللہ اپنا شعلۂ دل برقِ سینا ہے

پینے دیں یونہی عشق میں خونِ جگر مجھے   اب چھوڑ دیں کبھی یہ مرے چارہ گر مجھے
یہ دردِ خوشگوار ہے سرمایۂ حیات   راس آگئی ہے کاوشِ تیرِ نظر مجھے

اہلِ ہوس کی تنگیِ دل ما و من میں ہے   دُنیا اسیرِ لذّتِ کام و دہن میں ہے
گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں   نام و نمودِ فطرتِ اہلِ چمن میں ہے

دامن میں تار ہے نہ گریباں میں تار ہے   لے دیکھئے ایک تارِ نفس ہے وہ خار ہے
پیراہنِ وجود سے بھی ہوں خفا و تنگ   جس روز سے سُنا ہے کہ وہ مستعار ہے

کچھ دیر کی بس کشمکشِ یاس و یقین ہے   اب رخصتِ بیمار میں تاخیر نہیں ہے
آنا ہو تو جلد آؤ کہ ہے ساعتِ آخر   ہر دم یہ گُمانِ نفسِ بازپسیں ہے

نورِ ایماں سے دل و جاں کو فروزاں کر دے   شمعِ کشتہ ہے مسلماں کو مسلماں کر دے
پرتوِ حُسنِ جہاں تاب سے او "حسنِ تمام"   ذرّۂ خاک کو خورشیدِ درخشاں کر دے

لحۂ شوق کو پھر شمعِ شبستاں کر دے   عالمِ یاس کو معمورۂ ایقاں کر دے
مستی و کیف عطا کر دلِ افسردہ کو   خار کو پھول بیاباں کو گلستاں کر دے

کوکب شاہجہاں پوری

نتیجۂ بحث

(پروفیسر محمد مُسلم کا مضمون "جوابِ طلب" (مطبوعہ ساقی نومبر ۴۴ء) اتنا مقبول ہوا کہ اس کے پانچ جواب شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ "عمرِ جاوداں" کی طرح دراز ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر مُسلم کی طرف سے "نتیجۂ بحث" شائع کیا جا رہا ہے ــ اہلِ قلم حضرات آئندہ اس سلسلہ میں زحمتِ خامہ فرسائی نہ فرمائیں اور اسے "مرگِ ناگہاں" سمجھیں۔)

شاہد

عزیز۔ عزیز۔

تم نے میرے نجی خطوط کو بلا اجازت مُشتہر کر دیا یا تشہیر کر دی۔ مجھے شکایت ہونا چاہیئے تھی مگر نہیں ہے۔ اپنی رسوائی سے کوئی سماجی یا اخلاقی گتھی سُلجھ جائے اور اُس سے سماج کا بھلا ہو تو مجھے یہ رسوائی گوارا ہے۔

معلوم نہیں ان جوابات میں سے کون واقعی تمہارا ہے اور کون تمہارے فرضی نام سے؟ یا ایک بھی تمہارا نہیں؟ یا تمہیں کس سے اتفاقِ رائے ہے؟ جوابات زیادہ تر مجیب کی عمر اور طبعی اُفتاد کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً انصار ناصری صاحب ایک منچلے ہنسوڑ نوجوان معلوم ہوتے ہیں جو شاید کندھے پر جنازہ لئے جا رہے ہوں جب بھی کسی ٹھنگنے رفیق کی طرف تابوت کے جھک جانے پر ہنسے بغیر نہ رہیں۔ اِسی طرح "احمد" صاحب کا ٹھٹول اور پھبتیاں بھی شاید تقاضائے شباب ہیں یا طباعی اس سے لائقِ اعتنا نہیں۔ "ایک خاتون" نے جواب الجواب میں وہ کیا جس سے میں نے تمہیں روکا تھا یعنی ان خطوط کو افسانہ بنا چھوڑا۔ وسیع معنی میں مجھے ان کے افسانہ ہونے سے انکار نہیں مگر کیا ضرور ہے کہ ہر افسانہ شادی یا موت ہی پر کامل سمجھا جائے۔ ایسے دُم چھلوں کے بغیر بھی افسانہ ہوتا ہے اور زیادہ تر فطری۔ اگر میرا مقصد ایک افسانہ کی ترتیب و تکمیل ہوتا تو اب مجھے خاموش بیٹھ جانا چاہیئے تھا کیونکہ کہانی ختم ہو گئی۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب سو جایئے یا اپنے اپنے گھر سدھاریئے۔ مگر میرا مدعا اخلاقیات کی ایسی گتھی سُلجھانا ہے جو میری طرح اوروں کو پریشان کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے میں دو اصحاب کے جواب سے بہت مُتاثر و ممنون ہوا۔ ایک تو مسعود جاوید صاحب کی نفسیاتی تحلیل سے۔ دوسرے مُحسن صاحب کے اجتماعی مطمحِ نظر سے۔ یہ دونوں تحلیل مل ملا کر مجموعی حیثیت سے اس عقدہ کی کشائیش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

دونوں کی تقریروں سے اس مسئلہ کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک حیاتیاتی یا نفسیاتی، دوسرا روحانی۔ پہلے نقطہ نظر سے للی کی خواہش پوری کرنا ایک ایسا فعل ہوگا جس میں نہ عقل کو دخل ہے نہ ارادے کو نہ ضمیر سے استصواب کی ضرورت۔ ایک قدرتی اضطراری فنومنن (ظہور) ہوگا۔ جس طرح آئے دن حیوانات میں ہم ایسے افعال دیکھتے ہیں اور کوئی اچنبھا نہیں ہوتا بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس فعل پر حیوانی یا حیاتیاتی نگاہ سے دیکھنے والا کوئی تعجب کریگا نہ مزاحمت۔ دوسرے پہلو پر محسن صاحب نے زیادہ صاف روشنی ڈالی ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے جس کی حیثیت اس سنسار میں دوگانہ ہے۔ ایک ذاتی و انفرادی

دوسری ہیئت اجتماعی کے ایک رُکن کی۔ پہلی حیثیت سے صرف ممکن و ناممکن کا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ جائز و ناجائز، خطا و صواب یا اخلاق و مذہب کے سوال ہیئت اجتماعی کے رُکن کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ موجودہ مسئلہ انہیں دو حیثیتوں اور انکے فرائض کے تصادم کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ انصار ناصری صاحب پہلی حیثیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ محسن صاحب فرماتے ہیں:۔

"تمہیں کیا خبر کہ جس مقصد کو تم نے عالی مقصد سمجھ لیا ہے وہ اُس مقصد کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جس کے حصول کا ذریعہ فطرت نے مذہب و اخلاق کو بنایا ہے .... میرے نزدیک ان کا وجود ایک نظام سے بڑھکر نہیں، جو انفرادی ضروریات و خواہشات سے قطع نظر، اجتماعی ضروریات کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن اس نظام کا بانی کوئی انفرادی شخصیت نہیں بلکہ خود فطرتِ انسانی ہے ....

"اگر تم میں سے ہر شخص کو اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی جانچ پرتال کی قدرت حاصل ہوجائے بلکہ ان کے وضع کرنے کا حق بھی حاصل ہو تو کیا اس مقصد کا حصول کبھی ممکن ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں اپنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو کام تمہاری عقل کو مفید معلوم ہوتا ہے، میری عقل کے نزدیک ناکارہ ثابت ہوسکتا ہے..... .....اس لئے میرے دوست تمہارا یہ خیال کہ جو ذرائع تمہارے اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ہوں، تمہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے، خواہ وہ مذہب و اخلاق کے قوانین سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں، قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مقصد کو ہم اعلیٰ مقصد سمجھتے ہوں، ممکن ہے اس عالمگیر مقصد کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتا ہو جس کی توسیع (یا تکمیل) فطرت کر رہی ہے۔ رہ گئے ذرائع۔ ان کے صحیح انتخاب پر تمہیں کوئی دسترس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے پاس جو عقل کی کسوٹی ہے وہ سونا اور تانبا میں کوئی تمیز نہیں کرسکتی۔ اب تمہارے لئے سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ اُن قوانین پر عمل کرو جو حیات اجتماعی کے بنا کردہ ہیں، اور یقینی حیات کی ارتقاء و بہبود میں معاون رہے ہیں، ورنہ کب کے مفقود ہوگئے ہوتے.....

....

"مذہب و قانون کے قوانین کی نوعیتیں اتنی مختصر نہیں کہ تمہاری عقل میں سما سکیں۔ ان کی وسعتیں انتہا ہیں۔ تب تو ابتدائے آفرینش سے وہ حیات کی نشوونما و ارتقا میں معاون ہوتے رہے ہیں۔ تمہاری عقل زیادہ سے زیادہ تمہاری اپنی انفرادی زندگی کے چند سطحی معاملات کے لئے قوانین بنا سکتی ہے۔ لیکن وہ قوانین جنکا اثر انسانیت ہی نہیں بلکہ حیات کی مکمل تاریخ پر رہا ہے کسی انسان کی عقل کا نتیجہ کس طرح ہوسکتے ہیں؟ وہ خود فطرت کے وضع کردہ ہیں اور اُنکی نوعیت و مقاصد کا علم خود فطرت کو ہوسکتا ہے۔"

اگرچہ میں تمام مروجہ مذاہب سے اتنا خوش عقیدہ تو نہیں کہ ان سب کو قوانین فطرت کا درجہ دوں۔ مذاہب کے نافذ کردہ یا مصدقہ کتنے قوانین ہیں جو نظام اجتماعی کے لئے مضرت رساں ہوئے ہیں اور آج تک ہیں۔ بہرحال جزئیات و فروعات میں مجھے اکثر مذاہب یا ان کے بعض قوانین سے جو کچھ بھی اختلاف ہو، اصولاً محسن صاحب کی منطق ٹھوس اور تشفی بخش ہے۔ اور مسعود جاوید صاحب کی تحریر اسی کا مجمل متن ہے۔

ؔللی سے پھر ملنے کی میں نے اپنے آپ میں جرأت نہ پائی۔ اسے جو خط لکھا ہے اس میں زیادہ تر دلائل بالا سے ہی استدلال کیا۔ اس کے علاوہ خط کے بعض اجزا کا اقتباس اپنے حافظ کی مدد سے پیش کرتا ہوں:۔

کم سے کم ہندوستان میں فطرت کا منشائے افزائش آبادی میرے جیسے حیوانی انسانوں کے ہاتھوں مبالغہ کے ساتھ پورا ہو رہا ہے۔ یہ افراط بجائے خود ایک دردناک صورت حال ہے ....

بحالتِ موجودہ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا کہ خدا نے تمہیں ایک مسرت نفسانی سے محروم رکھا ہے تو اس کے عوض دوسری مسرت، یعنی روحانی کا موقع دیا ہے۔ طوفانی جوانی تم بسار چکیں۔ اس ہولناک منزل کی طرف لوٹنے کے عوض آگے کی منزل کی طرف بڑھ چلو، جہاں ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی۔ نصیبوں ہی سے کوئی پہنچ پاتا ہے۔ وہ قربانی اور سیوا ہے۔ تم ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ہمدردی کی محتاج دکھی بہنوں کے دکھ بٹا سکتی اور ان کی زندگی کے کانٹوں کو آنند سے بدل سکتی ہو۔ شاید قدرت نے تم کو اسی خدمت کے لئے چُن لیا ہو تو تمہاری خوش نصیبی قابل رشک ہے۔ اور تم لائق عزت و احترام ہو۔ امید ہے کہ اب میں تم سے ملونگا تو عقیدت کے پھول تم پر نثار کرونگا اور پاک روحانی محبت کا وہ ہدیہ پیش کرسکونگا جو لازوال ہوگا۔ تمہاری جلائی ہوئی روشنی میں میرے جیسے دُنیا کے قیدی بھی چند قدم تمہارے پیچھے چل سکیں گے ....

ؔللی کا جواب تمہارے سُنانے کے قابل ہے مگر خط طویل ہو جائیگا۔ لہٰذا اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

"اُس روز آپ کو رخصت کرنے کے بعد میں خود عجب الجھنوں میں مبتلا ہو گئی۔ کئی راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ فرض اور غرض، ضمیر اور نفس کی جنگ چھڑی رہی۔ کل جو آپ کا خط ملا ہے تو اس جنگ میں ضمیر کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ آپ کے خط نے اسے کامل جیت دلا دی۔ لطیف صاحب شاید آپ میری مایوسی کی شرم سے مجھ سے نہ ملے۔ سمجھے ہونگے میں آپ پر بے وفائیوں اور بے دردیوں کے الزامات کی بوچھاڑ لگا دونگی مگر ایسا نہ ہوتا.......

..... میرے دل میں آپ کی عزت زیادہ ہو گئی۔ محبت عقیدت سے بدل گئی .... آپ نفس کے بندے؟ توبہ کیجئے فطرت کسی کو کسی کام کے لئے انتخاب کرتی ہے اور کسی کو کسی کام کے لئے۔ سب اپنی جگہ پر یکساں اہم ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں صاحب اولاد سماج کی بہتر اور سب سے مشکل خدمت انجام دیتے اور زیادہ قیمتی قربانیاں کرتے ہیں۔ اپنی ادنیٰ اور ناچیز خدمت سے بقول آپ کے کوئی بتی روشن کرونگی تو اس کا تیل آپ ہی ہوں گے..

.... لطیف صاحب میں عرض نہیں کر سکتی کہ ہردے میں کتنا حسن اور من کتنا آنند محسوس کر رہی ہوں ..

..... معلوم ہوتا ہے عورت قربانی کیلئے خاص طور پر پیدا کی گئی ہے اسکا نفسانی جذبہ جتنا تیز ہوتا ہے اتنی ہی نفس کشی کی قابلیت زبردست۔ مگر قربانی ہر حال میں اس کی فطرت کا نمایاں حصہ ہوتی ہے۔ اگر اسکی قربانی کا مرکز اعلیٰ تر مقصد ہوتا ہے تو وہ اس میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہتی بلکہ شاید آگے ہی نکل جائے۔. ..... دُعا کیجئے کہ خدا اس راہ میں میری رہنمائی کرے اور آپکی توقعات پوری ہوں ...."

تمہارا لطیف!

محمد مسلم!

سروشِ غیب کا پیغام
شاعرِ ہندوستان کے نام

(۱)

کب سے ہی تیرا چمن آلودۂ جورِ خزاں
چاہیئے فکرِ بہار اے شاعرِ ہندوستاں

دعویٰ عشقِ وطن ہی تو وطن کے کام آ
تو ہے بلبل جس چمن کا اُس چمن کے کام آ

وصل و ہجراں کے ترے لب پہ فسانے تا بکے
رندی و مستی کے کیف آور ترانے تا بکے

بس چکا ہی جسمیں تو اُس آشیاں کا حال دیکھ
دیدۂ نمناک سے ہندوستاں کا حال دیکھ

دل جو اُمیدوں بھرا تھا اب ہی عالم یاس کا
کہتے ہیں بھارت جسے معمورہ ہی افلاس کا

جسکو لطفِ زیست کہتی ہیں یہاں معدوم ہی
ساز و برگِ عیش سی یہ سرزمیں محروم ہی

لالہ رخسار دنکے بھی چہرے ہیں کمہلائے ہوئے
ہر قدم پہ ہی فلاکت چھاؤنی چھائے ہوئے

روزِ روشن میں بھی ہی عالم شبِ دیجور کا
وقفِ ظلمت غمکدہ ہی کس قدر مزدور کا

زندہ کیا کہیئے انہیں بیجاں رہتے ہیں یہاں
مختصر یہ فاقہ کش انسان رہتے ہیں یہاں

دیکھتی ہی آنکھ جسکو تن دہی میں طاق ہی
منعموں کی کسقدر یہ پستیِ اخلاق ہی

خندہ زن ہی ایک عالم جس پہ اُس عالم کو دیکھ
مسلم و کافر کی رزم آرائیِ باہم کو دیکھ

(۲)

یہ وہی خطہ ہی جو تھا ایکدن جنت نشاں
خلق کہتی تھی جسے عظمت نشاں راحت نشاں

سنگریزوں سی یہاں کے لعل و گوہر ماند تھے
جس قدر ذرّے تھے وہ فرشِ زمیں کے چاند تھے

پرچمِ رنگیں بہار اپنا اُڑاتی تھی یہاں
نکہتِ باغِ جناں کانٹوں سے آتی تھی بہار،

چل نہ سکتی تھی یہاں کچھ شیطنت ابلیس کی ‖ پھونکدیتی تھیں شعاعیں نیّرِ تقدیس کی
تھا یہاں پیری میں بھی رنگِ جوانی آشکار ‖ تھی جبینوں سے ضیائے کامرانی آشکار
جنکے آگے کوہ کی سطوت کی ہستی کاہ تھی ‖ سرزمینِ ہند اُن لوگونکی جولانگاہ تھی
دوش پر اُنکی کمانیں، چٹکیوں میں تیر تھے ‖ بھیم اور ارجن سے اس اقلیم میں رن بیر تھے
جانکنی کی سختیوں کو بھی یہ ہنسکر جھیلتی ‖ زندگانی تھی حقیقت میں اجل سے کھیلتی
خلعتِ ہستی مرادف تھا لباسِ مرگ کا ‖ زور ہی مطلق نہ چلتا تھا ہراسِ مرگ کا
دورِ گردوں نام مردوں کا مٹا سکتا نہیں ‖ "وقت" اُنکے کارناموں کو بھلا سکتا نہیں

(۴)

اے نوا سنجِ وطن اے شاعرِ شیریں بیاں ‖ پا شکستہ کارواں کا تو ہے میرِ کارواں
تجھکو شایاں ہے جو کہیے درسِ آموزِ حیات ‖ اپنے نغموں سے عطا کر قوم کو سوزِ حیات
کوئی روشن جادہ کر پیدا نگاہوں کیلئے ‖ رہبرِ منزل ہو تو گم کردہ راہوں کیلئے
راہ پیما سوئے منزل کاروانِ شوق کر ‖ از سرِ نو یعنی عزمِ امتحانِ شوق کر
بادۂ ہمت سے ہو سرشار ہر پیر و جواں ‖ اپنی تاریخِ کہن دہرائے پھر ہندوستاں
موسمِ گل صورتِ ماضی چمن میں لوٹ آئے ‖ یوسفِ گم گشتہ پھر اپنے وطن میں لوٹ آئے
ارتقا کا راز سمجھا، درسِ خودداری سکھا ‖ فطرتِ مجبور کو آئینِ مختاری سکھا
سربلندی کی جہانِ عجز میں تجدید کر ‖ ذرّۂ بے مایہ کو ہمپایۂ خورشید کر
زندگی ذوقِ عمل کا نام ہے یہ جان لیں ‖ کاش اہلِ ہند اپنی منزلت پہچان لیں

ایکہ باشی ملتِ درماندہ را پیغمبرے
از نوائے خویش پیدا کن جہانِ دیگرے

سہیلؔ رودی

باون پتّے

بند کمرے میں ایک دُھلی ہوئی چادر پر سُرخ رنگ کے تاش کے پتّے بکھر رہے تھے ـــــــ

یہ ایک پُرانی وضع کا کمرہ تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی میز کی چھاتی پر دو ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں، جن کے کُھلے اوراق پر آتش نفس انسانوں کے افکار سلگ رہے تھے۔ کمرے کی وزنی چھت کو ایک بُوڑھا شہتیر اپنے سینہ کے زور سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اپنی اس مظلوم حالت میں، احتجاج کے طور پر وہ کبھی کبھی کڑ کڑ کی صدا بلند کر دیتا۔ درمیان سے اس کی کمر بھی جُھک گئی تھی، اور اس خلا میں ایک بوڑھے چڑے چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ کہنہ دیوار کے ایک روشندان سے وہ روزانہ دانہ دُنکا چُگنے کے لئے اڑ جاتے۔ ان ننّھے مُنّے پردار ذی رُوحوں کو جنگل کے بڑی چونچ والے پرندوں نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ان کی ہم نوا چڑیوں کو بھی انہوں نے پَر نوچ کر گنجا کر دیا۔ انہیں سر چُھپانے کو جگہ نہ تھی ـــ اپنی چرچوں میں محو یہ بُوڑھا جوڑا اس ٹیڑھے گھونسلے میں موت کے لئے چھلاوا بن کر زندگی کی شام اس کمرے کی بند فضا میں بسر کر رہا تھا ـــ

عموماً دوپہر کو جب ایک دُبلا پتلا لڑکا بالائی منزل سے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے لئے کمرے میں آتا تو یہ دونوں اُن کے کھیل کو گہری نظروں سے دیکھتے ـــــ شاید انہیں ان سُرخ و سیاہ اشکال سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔

ـــــ چادر پر بکھرے ہوئے پتّوں نے آج خود بخود حرکت کرنا شروع کر دی۔ چڑے چڑیا نے کبھی یہ کھیل نہ دیکھا تھا۔ اپنے گھونسلے سے گردنیں لٹکائے انہوں نے غور سے اس طلسم کو دیکھنا شروع کیا ـــــ

ایک مختصر سی حرکت کے بعد یہ پتّے کچھ اور بکھر گئے۔ یکایک اینٹ کا بادشاہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے نخوت پسندی سے اینٹ کے غلام کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ بڑبڑایا اور اپنے ہم جنسوں کے قریب تر ہو کر ایک بار پھر آواز دی، لیکن اس کی پُکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ غصّہ سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اُس نے پتّوں میں سے اس غلام کو جبراً کھینچ کر باہر نکال لیا ـــــ

اوندھے مُنہ پڑے ہوئے پتّے یکایک ہوشیار ہو گئے۔ حکم، پان اور چڑیا کا بادشاہ بھی اُٹھ کر اپنے ہم مرتبہ کی صف میں کھڑے ہو گئے ـــــ

"تم آواز کا جواب کیوں نہیں دیتے ـــــ بہرے ہو گئے ہو کیا؟"

دفعتہً غلام کی آنکھیں اپنے غضب ناک آقا کی طرف اُٹھیں۔ وہ ارادتاً ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اینٹ کے بادشاہ نے بڑھ کر اُس کے ایک زبردست چپت رسید کیا ـــــ آقا عموماً آپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔

غلام نے اپنا ہاتھ سُرخ گال پر رکھ لیا۔ خونناب آنکھوں سے اس نے دوبارہ آقا کے ڈراؤنے چہرے کی طرف دیکھا۔ سرپھرا آقا یہ بھی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے غلام کو بُری طرح سے نوچنا شروع کیا۔ جُملہ بیگمات اس منظر کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ہلکے پتّے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ پان۔ حکم اور چڑیا کے غلام بھی آنکھیں کھولے گہرے سانس لے رہے

تھے ——— سرد آہیں ملوکیت سے خائف غلاموں کے جذبۂ احتجاج کی گرمی کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کر دیتی ہیں ———

یکایک پان کے غلام نے بڑھکر بادشاہ کے ظالم ہاتھ کو روک لیا۔

"ٹھہریئے اب آپ کو ظلم وتشدّد سے ہاتھ کھینچنا ہوگا؟"

پان کا غلام غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُسے زور سے ایک جھٹکا دیا اور وہ بے تحاشا گر پڑا۔ زمین سے ٹکراتے ہی اس کے سر سے خون کی دھار بہنے لگی۔

"ہائیں آپ کیا کر رہے ہیں!" ——— اینٹ کی بیگم بے خود ہوکر آگے کو بڑھنے لگی لیکن بادشاہ کی خونی نگاہوں نے اس کی جرأت کو لپسپا کر دیا۔

حکم کے بادشاہ نے جو اپنے ساتھیوں سمیت تماشا دیکھنے میں مصروف تھا، حکم کے یکّہ کو اشارہ سے بُلاکر پان کے غلام کی گرفتاری کے لئے حکم دیا۔

"لے جاؤ اس غلام کو جیل خانہ میں۔ کمینہ کہیں کا، آقا کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے!" ——— حکم کا بادشاہ ملوکیت کا خُدا نظر آتا تھا۔

تاش کے ہلکے پتّے جذبات کے انتہائی اشتعال سے کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بغاوت کی روح سما رہی ہے۔

"ہم آپ کے غلام سہی لیکن ہم اپنا جسم وجاں آپ کے حوالے نہیں کرسکتے۔ مجھے قید کیوں کرتے ہو۔ میں کُھلی فضا میں جینا چاہتا ہوں۔

——— مجموعی طاقت کے خوف سے ڈرو۔ تمہارا تشدّد ہماری ضمیر کو ہرگز مُردہ نہیں کرسکتا!" پان کا غلام گرفتاری کے وقت چلاّ چلاّ کر آقاؤں کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس دلیری پر حکم کے یکّہ نے اس کے چانٹا رسید کیا ———

مُشتعل پتّے بیدھڑک ہوچکے تھے۔ حکم کا غلام اپنے ساتھی کی یہ بے قدری نہ دیکھ سکا۔ اُس نے بڑھکر یکّہ کو اپنے سیاہ بازوؤں کی گرفت میں لے کر پان کے غلام کو آزاد کرانے کے لئے جھٹکا دیا۔ چڑیا کا غلام بھی، سامنے تن گیا ———

——— اب شاہوں کے پاسبان یکّوں نے غصّہ میں آکر ہنٹر برسانا شروع کر دیئے۔ وہ تشدّد سے غلاموں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ ہلکے پتّوں کا مُشتعل مجمع تُند بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ مجموعی طاقت کے سیلاب کے آگے یکّے اور بادشاہ جو اس کھلبلی میں اب بیگمات کو سنبھال رہے تھے خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے ——— ملوکیت، جس کے رُعب نے ان کی زندگی کو پاؤں تلے دبا رکھا تھا آج ان کے کندھوں پر جنازہ بن کر موت کی کڑوی نیند سو رہی تھی ——— غلاموں کی آزادی اس کے تابوت کا آخری کھیل تھی۔

غلاموں اور آقاؤں کی اِس مڈبھیڑ میں پان کی تگی اور حکم کی چھکّے پنجے کے بھی معمولی چوٹیں آئیں۔

——— آزاد پتّوں نے اب اپنی ترتیب کو بالکل بدل دیا تاکہ آیندہ کوئی پتّہ کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں کٹھ پُتلی بن کر ایک دوسرے پر وار نہ کرسکے ———

یہ کھیل دیکھکر مبہوت چڑے نے چڑیا کے کان میں کچھ چڑچوں کی۔ دونوں جنگل کی کُھلی فضا کی طرف پرواز کر گئے۔

صحرائے مریخ کا ایک حادثہ

یوں تو اہلِ مریخ کی زندگی کا ہر لمحہ سرور و انبساط کا مستقل پیغام تھا، نشاط و آسودگی طمانیت و سرشاری اُن کے ایوانِ حیات کے مستقل جلوے تھے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے اپنے لالہ زاروں میں محوِ خرام رہتے۔ آئینہ تاب چشموں کے منور پانی سے کھیلتے۔ آبشاروں کی نغمہ سرائیاں سُنتے، پھولوں اور پھلوں سے لذتیں اخذ کرتے، غرض کہ ایسے ہی لطیف مشغلوں میں تمام دن گذارنے کے بعد شام ہونے سے پہلے "قصرِ نیلوفری" کے قریب جمع ہوتے۔ انتہائی ارادت و عقیدت کیساتھ اپنے سروں کو جھکاتے اور تصویرِ محویت بن کر رہ جاتے۔

جب سُورج کی آخری کرنیں مریخ کے سبزہ زاروں کو الوداعی بوسہ دیتی ہوتیں، شفق کی رنگ سامانیاں نگارخانۂ فطرت کے اچھوتے شاہکار نظرنواز کررہی ہوتیں، اور شام کے طائر اپنا آخری نغمہ ختم کرکے بسیرے کی فکر میں ہوتے "قصرِ نیلوفری" سے ایک نغمہ بلند ہوتا، سحرآفریں اور ہوشربا ساز کی دلنشین اور دل نواز آواز تمام فضا پر محیط ہوجاتی۔ نغمے کی لطافتوں سے اہلِ مریخ جھومنے لگتے۔ اُن پر وجدان و سرور، کیف و مستی اور سرشاری کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ وہ جھومتے جھومتے بالکل غافل ہوجاتے اور اسی عالم میں اُنہیں نیند آجاتی، پھر وہ اُس وقت سے پہلے بیدار نہ ہوتے، جب صبح کی نورآفرینیاں اُن کی جبینوں کو اپنی شعاعوں سے نہ چھوتیں، اور انہیں بیداری کی دعوت نہ دیتیں، یہ تھا ان کا نظامِ حیات و طریقِ زندگی جس پر وہ ایک زمانے سے کاربند تھے۔ اُنکی زندگیاں یکسر شراب و نغمہ تھیں اور وہ بڑی معصوم و پاکیزہ زندگی بسر کررہے تھے۔ لیکن اگر ان میں کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ اُن کے دل محبت کی گرمی سے بالکل خالی تھے۔

مریخ کی شہزادیوں اور کنواریوں کا نصب العین حیات مردوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ نہ لالہ زاروں میں جاتی تھیں نہ صحراؤں میں۔ البتہ اپنی گل پوش وادیوں میں صبح سے شام تک اپنے سیمیں جلووں سے جنتیں بناتی رہتیں۔ اُن کے ستاروں کے بربط، اُنکی پھولوں سے مرصع شہنائیاں اُن کی زندگی کی رفیق تھیں۔ یہاں کی مخلوق میں ازدواجی زندگی کا دستور ضرور تھا۔ مگر نہ ہونے کی طرح وہ اس رشتے کے بعد بھی ایک دوسرے سے اسی طرح بیگانہ رہتے تھے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ "محبت" کی لذتوں روحانی بلندیوں اور بے پناہ سرشاریوں سے بالکل ناآشنا تھے، یہاں ابھی تک کسی کنواری کے پیکر میں ساقی نمودار نہیں ہوئی تھی، ورنہ کسی مرد پر کیوپڈ نے اپنے تیروں کو آزمایا تھا۔

(۲)

قصرِ نیلوفری کا بیرونی منظر اس قدر دلچسپ اور دلنشین تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد بارہا اہلِ مریخ کے دلوں میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوجائیں کہ اسکے اندر کیسے کیسے مناظر ہیں اور اس میں کون رہتا ہے۔ لیکن باوجود کوشش کے انہیں اس کا کوئی راستہ نہیں معلوم ہوسکا اور کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ شام کے اوقات کی مسلسل نغمہ باریوں سے صرف یہ سمجھ سکے کہ یہ قصر کسی مقدس دیوی یا دیوتا کا مسکن ہے جسکا تعلق براہِ راست عرشِ الٰہی سے ہے۔ نہ اُنہیں اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریوں کو اپنے لئے ایک روحانی پیغام اور نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس سے لطف اندوز ہونا ان کے لئے عبادت سے کسی طرح کم نہ تھا اور عقیدتاً وہ اسے عبادت سے بھی کچھ زیادہ درجہ دیتے تھے۔

لیکن کئی دن سے قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریاں بند تھیں۔ وہ روزانہ شام کو اسی خلوص و عقیدت کیساتھ وہاں جمع ہوتے جو ایک زمانے سے اُن رُوحوں اور دلوں پر مسلط تھا، بڑی نیازمندی کیساتھ سجدہ ریز ہوتے اور ساری ساری رات اسی حالت میں گذار دیتے مگر نہ اُنہیں کوئی نغمہ سُنائی دیتا نہ کسی ساز کی آواز آتی۔ وہ اس انقلاب سے سخت پریشان تھے۔ اُن کا سکون زندگی تباہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اُن کا اطمینان اضطراب کے گُرزوں سے کچلا جارہا تھا۔ وہ اِس ناگہانی تغیر سے اپنی زندگیوں میں بڑا زبردست خلا محسوس کررہے تھے۔ نہ اُنھیں اب پھولوں سے دلچسپی رہی تھی اور نہ پھلوں سے۔ صحرائے مریخ کے تمام مناظر اُن کی نگاہوں میں ویران ہوکر رہ گئے تھے وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اب کیا کریں اور اپنے روٹھے ہوئے دیوتاؤں کو کس طرح منائیں۔ وہ صدیوں سے ساز و نغمہ کی کیف باریوں سے لطف اندوز ہونیکے عادی ہوچکے تھے۔ لیکن اِس فوری تغیر نے اُنہیں بے حد آزردہ کردیا تھا۔ اُن میں سے اکثر تو اِس عذاب کو برداشت نہ کرسکے، اور موت سے ہم آغوش ہوگئے۔ اکثر دن رات قصرِ نیلوفری کے دامنوں میں بیٹھے ہوئے رویا کرتے اور اسی حالت میں جان دیدیتے۔ بہت

زیادہ غور کرنیکے بعد یہ طے ہُوا کہ مریخ کی کنواریوں کو نغمہ باری پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی طرح زندہ تو رہ سکیں۔ چنانچہ وہ گل پوش وادیوں میں رہنے والی مقدس کنواریوں اور مغنیہ شہزادیوں سے ملے۔ بڑی التجاؤں کے ساتھ اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے مطلق مانوس نہ تھیں اور نہ وہ ان میں اپنے لئے کوئی کشش پاتی تھیں۔ اسلئے وہ انکے کام نہ آسکیں اُنہوں نے روزانہ ایک معینہ وقت پر نغمہ باری سے انکار کر دیا، پھر مردوں کے لالہ زار میں جانا انکے اصول کے بھی خلاف تھا اور وہ انکے احکامات کی تعمیل کو اپنے لئے لعنت، ورتوہین سمجھتی تھیں۔ اس ناکامی نے انکے دلوں کو بالکل توڑ دیا۔ وہ مرجھائے پھولوں کی طرح اپنے اپنے لالہ زاروں میں واپس ہوئے اب وہ سمجھ گئے کہ قصرِ نیلوفری کے دیوتا اِن سے سچ مچ ناراض ہیں۔ اور ہم سب اُنکے عتاب کا شکار ہو کر رہیں گے، وہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں تھے انہیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اسی حالت میں تڑپتے تڑپتے ایکدن ہم سب فنا ہو جائیں گے اور سطحِ مریخ پر ہم میں سے ایک متنفس بھی باقی نہ رہیگا۔

(۳)

عین اُس وقت جب اہلِ مریخ کی مایوسیاں ناقابلِ برداشت ہو کر اپنی حدود سے گذر چکی تھیں اور وہ موت کے خیر مقدم کے لئے بالکل تیار تھے کہ ایک دن قصرِ نیلوفری سے دفعتاً ایک نغمہ بلند ہُوا جسے سنتے ہی تمام عقیدتمندوں میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ گویا مٹی کے پتلوں میں جان پڑ گئی اپنی اپنی جگہ سب ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر اُدھر متوجہ ہوئے لیکن آج نغمہ بھی بدلا ہُوا تھا اور ساز بھی۔ جو کچھ اُنہوں نے سُنا وہ ایک پیغام تھا، جو نغمے کے روپ میں انکی سماعتوں میں گونج گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک ہی گیت تین مرتبہ انہیں سُنائی دیا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اے مریخ کے خاکی پتلو! قصرِ نیلوفری محبت کے دیوتاؤں کا مسکن ہے، وہ تمہیں ایک زمانے سے محبت کا پیام دیرہے ہیں، محبت کے نغمے سُنا رہے ہیں، لیکن تم آجتک محبت کے مفہوم، محبت کی لذت اور محبت کی لطافتوں سے بیگانہ ہو اس لئے تم پر محبت کی نغمہ باریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیگئی ہیں، لیکن اگر تم محبت آشنا ہو سکے، محبت کرنا سیکھ گئے تو ایکدن محبت کے دیوتا تم پر مہربان ہو جائینگے۔ اور تم اسی آسودگی کے ساتھ زندہ رہ سکو گے، ورنہ اپنی موت یقینی سمجھو۔"

اِس پیغام کا ایک ایک لفظ اہلِ مریخ کے لئے جادو کا اثر ثابت ہُوا وہ اپنے انجام کی اطلاع سے لرز کر رہ گئے، ذرا سی دیر میں محبت کے دیوتاؤں

[illegible]

تھا کہ ——— محبت کیا ہے؟ ——— اِس سوال کا پیدا ہونا اہلِ مریخ کے لئے بیحد انقلاب انگیز ثابت ہُوا، وہ اپنے مقاصدِ حیات کو بالکل بھول گئے اور سوائے محبت کے انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ بہت سے دلدادگانِ محبت بے اختیاری اِدھر اُدھر خوفناک جنگلوں میں نکل گئے، اور پھر واپس نہ آئے۔ بہت سے پھولوں، چشموں، پہاڑوں اور آبشاروں میں محبت کو تلاش کرتے کرتے برباد ہو گئے۔ لیکن اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ محبت کیا ہے؟۔

اہلِ مریخ کے لئے یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، انکی تعداد بڑی حد تک کم ہو چکی تھی۔ مگر وہ اپنے دیوتاؤں کے پیغام کا عملی ثبوت دینے کیلئے اب بھی ہر وقت کوشاں تھے۔ لیکن اسکے بعد بھی محبت کا حصول انکی سمجھ سے بالاتر نظر آ رہا تھا۔ اِن حالات کے بعد انکی مکمل بربادی یقینی تھی مگر کیوپڈ اور سائکی کو ان کے حال پر رحم آ گیا، وہ سمجھ گئے کہ اب یہاں محبت کی حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا آزادی کیساتھ محبت کی تبلیغ شروع کر دی گئی کیوپڈ نے اپنا ترکش سنبھالا۔ تیراندازی شروع کی اور نوجوانانِ مریخ کے دلوں میں محبت کے جذبات کی چنگاریاں بھر کر زندگی کی ایک جدید شاہراہ کھولدی۔

اور سائکی بھی اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل نہ تھی۔ وہ مریخ کی صاحب جمال کنواریوں کے دلوں کو محبت کے رنگ میں رنگتی ہوئی موسم بہار کی مشعلہ رنگ تیتری کی طرح ادھر سے اُدھر اڑتی پھرتی تھی۔ اس نے گل پوش وادیوں میں رہنے والیوں کو ایک نئے درد، ایک نئی لذت اور ایک نئی خلش میں مبتلا کر کے نوجوانانِ مریخ کے لئے انکے دلوں میں ایک کشش پیدا کر دی تھی۔ اب صرف ایک مرحلہ باقی تھا اور اسکی تکمیل بھی کیوپڈ اور سائکی ہی کے سپرد تھی۔

(۴)

مریخ کے لالہ زاروں اور وادیوں میں محبت کی گلکاریاں ذرے ذرے پر مرتسم نظر آ رہی تھیں اور وہ خطۂ گلریز جہاں محبت کے سوا سب کچھ تھا اب کچھ اور ہی ہو گیا تھا۔ نوجوانانِ مریخ دن رات ایک محویت کے عالم میں مصروفِ گل گشت رہے، انکی نگاہوں میں محبت کی مسکراہٹ اور طلبِ محبت تشنگی پائی جانے لگی تھی اِس وقت وہ گلپوش وادیوں میں رہنے والی کنواریوں کی طرف کھنچتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ محبت کے دیوتاؤں کے پیام نے ان پر کیا اثر کیا ہے۔

قصرِ نیلوفری کے نشیب میں بہنے والے ایک شفاف چشمے کے

[illegible]

سی محسوس ہوئی ۔ اُنہوں نے دیکھا کہ قصرِ نیلوفری کے ایک بیرونی گوشہ میں ایک حسین مرد رعنا اور ایک دوشیزہ کنواری رازِ و نیازِ محبت میں مصروف ہیں وہ انہیں بہت دیر تک دیکھتے رہے ، اُن کے دلوں میں بھی ایسی ہی خواہش پیدا ہوئی اور یہ آرزو اُنکی رُوحوں میں چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوکر رہگئی کہ اے کاش مریخ کی کنواریاں اُن کی دعوتِ محبت پر لبیک کہہ سکیں اور وہ بھی محبت کے رازِ و نیاز کا صحیح لُطف اُٹھا سکیں وہ چاہتے تھے کہ دوڑکر گُل پوش وادیوں میں پہونچ جائیں اور اپنی التجائیں پیش کریں کہ انہیں ایک نغمہ سُنائی دیا ۔

"محبت کرنے والوں کو حیرت سے نہ دیکھو ، بلکہ محبت کے احترام اور مریخ کی کنواریوں کے استقبال کے لئے تیار ہو جاؤ اور محبت کی فردوسی لذتوں ، غیر فانی مسرتوں اور اَبدی لطافتوں میں گُم ہو جاؤ"

یہ نغمہ اُن کے لئے آبحیات سے کم نہ تھا جو شراب کے گھونٹوں کی طرح اُن کے قلوب میں سماگیا ۔ بدمستی و سرشاری کی مکمل کیفیتوں کے ساتھ اُن پر طاری ہُوا اور وہ بے اختیار سجدہ ریز ہوگئے ابھی سجدے سے اُن کے سر نہ اُٹھے تھے کہ بہت سے بربط اور شہنائیاں ایک ساتھ بجنے لگیں اور اُن سے بہت قریب نغمات کا سمندر اُبل پڑا ، جیسے ہی وُہ اُٹھے ایک دلنشین نظارہ سے اُنکی آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا ہوگئی ، اُنہوں نے دیکھا کہ مریخ کی کنواریوں کا ایک گروہ رنگا رنگ پھُولوں کے لباس پہنے ہُوئے محبت کے گیت گاتا ہُوا رقص کی ہزاروں شانیں لئے ہُوئے اور دوشیزگی و برنائی کی جادُو طرازیوں کو بے نقاب کئے ہوئے اُنکی طرف بڑھا چلا آرہا ہے وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر صف بستہ ہوکر کھڑے ہوگئے ، اسوقت اُنکی رُوحیں ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں ڈُوبی ہُوئی تھیں ، وہ اپنے جسموں میں پرواز کی قوت محسوس کر رہے تھے اور اُن کے دل جذباتِ محبت کی گرمیوں سے پگھلے جا رہے تھے ۔ آج اُن کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ گُل پوش وادیوں کی رہنے والیاں اُن کے پاس اِس شان و اہتمام سے آرہی تھیں ورنہ یہ واقعہ تھا کہ کنواریاں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوچکی تھیں وہ بھی مردوں سے کوئی خصوصی اُنسیت نہ رکھتی تھیں اور نہ وُہ ہمیشہ اُنکے پاس رہ سکتے تھے ۔

یہ چلتے پھرتے ہوئے پھولوں کا گُلدستہ چشمے کے قریب آکر رُک گیا سب نے پھولوں کے ہار اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور محبت کا ساز چھیڑ دیا ۔ اس درجہ التفات آگینیوں اور دعوتِ محبت کے بعد نوجوانانِ مریخ سے ضبط نہ ہوسکا وہ بے اختیار پانی میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہونچکر اپنے سروں کو حُسن کی دیویوں کے قدموں پر جھکا دیا ، مریخ کی کنواریوں نے اُنکی پزیرائی کی ، پھولوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈالدیئے اور بہت ہی لطیف انتخاب کے بعد حُسن و عشق کی وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "جشنِ نوروزِ محبت" کی ابتدائی رسم انتہائی خلوص و عقیدت کیساتھ ادا کی ، آپس میں معانقہ کیا گیا اور ایک ایسے رقص کے بعد جس سے تمام کرۂ مریخ وجد کرنے لگا محبت کی بنیاد ڈالدی گئی ۔

محبت کے دیوتاؤں نے اُن پر پھُول برسائے اور شام ہوتے ہی قصرِ نیلوفری سے نغموں کی بارش شروع ہوگئی اب اہلِ مریخ کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے اور اُنکی محبت حاصل کر لینے میں کسی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں ۔ اسی تقریب سعید کی خوشی میں تمام مریخ پر چراغان کیا گیا اور تمام مریخ میں محبت کے مذہب کا اعلانِ عام کر دیا گیا ۔

قصرِ نیلوفری جو قدرت کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا ، کیوپڈ اور سائکی کا مامن و مسکن تھا جن کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ ہر ذی حیات سیارے میں محبت کا صُور پھونکتے رہیں ۔ ابھی تک مریخ کی دُنیا محبت سے بیگانہ تھی وہ ایک عرصہ کی کوشش کے بعد اُنہیں محبت کی طرف مائل کر کے رہے اور اُنکی کوششیں کامیاب ثابت ہوکر رہیں ۔ سُنا گیا ہے کہ مریخ میں کیوپڈ اور سائکی کی کامیابی کے دو یادگار مجسمے اب تک پائے جاتے ہیں جو قصرِ نیلوفری کے شق ہوجانے کے بعد دستیاب ہُوئے تھے اور آجتک وہیں نصب ہیں ۔ ہر سال اہلِ مریخ "جشنِ محبت" بڑے اہتمام سے مناتے ہیں محققین کا بیان ہے کہ ہماری دُنیا کا موسمِ بہار اسی جشنِ محبت کا ایک عکس رنگیں ہوتا ہے ۔

محبت کا مفہوم سمجھنے اور اس غیر فانی لذت سے آشنا ہونے کے بعد مریخ ایک نئے سانچے میں ڈھل کر رہ گیا ہے ۔ وہاں کے لالہ زار اور گُل پوش وادیاں پہلے سے زیادہ شاداب نظر آتی ہیں اور محبت کرنے والے فردوسی پیکر اپنے اپنے خطے میں فردوسی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ محبت ہی اُن کا مذہب ہے ۔ محبت ہی کو وہ خُدا سمجھتے ہیں ۔ وہ محبت کے ماحول میں جاگتے ہیں محبت کے ماحول میں سوتے ہیں ۔ غرض کہ وہ سراپا محبت ہیں ، وہ محبت پر ناز کرتے ہیں اور محبت کے دیوتاؤں کو اُن پر ناز ہے ۔

مریخ میں نہ ہماری دُنیا کی طرح ہوس پرستیاں ہیں نہ خود غرضیاں ۔ نہ وہاں انسان درندگی کے مظاہرے ہوتے ہیں نہ ایک دوسرے کو کچلا جاتا ہے ۔ نہ وہاں قتل و غارت کی گرم بازاری ہے ، نہ

: فریب وریاکاری کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اہل مریخ آپس میں کبھی نہیں لڑتے وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ ان میں رشک ضرور ہے لیکن حسد نہیں ان میں محبت کی تشنگی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے پر سبقت لیجانے یا ذلیل کرنیکے جذبات ان کے دلوں میں کبھی پیدا نہیں ہوتے جب وہاں چودھویں رات کا چاند اپنی کجکلاہی اور شباب کی بے پناہیوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے جب تارے اپنے اپنے ساز چھیڑ دیتے ہیں تو مریخ کی گلپوش و گلریز وادیاں نور و سرور میں ڈوب جاتی ہیں۔ محبت کے پجاری ایک خطۂ گلزار میں جمع ہوتے ہیں محبت کے نام پر سجدے کرتے ہیں۔ محبت کے گیت ہیں اور تمام رات خوشی شب ماہ مناتے رہتے ہیں۔ ہرچند کہ محبت کے لیے اہل مریخ کو بڑے زبردست حادثے سے دوچار ہونا پڑا اور قر پیش کرنا پڑیں لیکن اس حادثے کے بعد محبت کی جو زندگی انہیں نصیب وہ کبھی سیارے کے مکینوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ اے کاش کہ دنیا میں محبت مذہب عام ہو جائے +

حاجی نبی احمد، بریلوی

آلِ تیمور سے!

اُٹھ کہ دل میں سجدہ گاہِ عرشیاں پیدا کریں
اپنی مرضی کے زمین و آسماں پیدا کریں

یہ جہانِ کہنہ و دیرینہ باطل ہو چکا
آرزو ہائے مسلسل کا جہاں پیدا کریں

اُٹھ کہ اس کون و مکاں کو نورِ جاں سے غسل دیں
دین و دل میں سوادِ لامکاں پیدا کریں

محنتِ آدم کا ورثہ قوم پر قسمت کریں
ساکنانِ ہند میں سوزِ نہاں پیدا کریں

ہیبتِ چنگیز و فرد شوکتِ تیمور سے
اس جہاں کو روندنے اک کارواں پیدا کریں

تیز تر شہباز سے ہر نوجواں کی ہو نظر
پائے آزاد و سرِ دیوانگاں پیدا کریں

صید خود بے تابِ تیرِ بے کماں کھانے کو ہو
اُٹھ کہ ان تیروں سے زخمِ بے نشاں پیدا کریں

ہیں پرستارِ نشیمن سارے مُرغانِ چمن
اس چمن سے طائرِ بے آشیاں پیدا کریں

ہند کے راگوں میں بھی پستیٔ فطرت ہے شریک
اُٹھ کہ جیتی جاگتی طرزِ فغاں پیدا کریں

اِن پرندوں کو سکھائیں رسم و آئینِ شہی
اس غلامستان سے شیرِ ژیاں پیدا کریں

اِس نیستاں سے بجائے نے و برگ و شاخِ نخل
دشنۂ خونریز و دست جانستاں پیدا کریں

ہر تنِ آسانی کا ہوتا ہے بلاؤں سے علاج
اُٹھ کہ اپنے واسطے خود امتحاں پیدا کریں

اُٹھ کہ عالمگیر و اکبر اور بابر کی طرح
نامور اجداد کا نام و نشاں پیدا کریں

بوریائے فقر کو تختِ شہنشاہی بنائیں
آنے والوں کے لئے اک ارمغاں پیدا کریں

دولتِ بیدار حاصل محنت و قوت کی ہے
اُٹھ کہ اپنے بل پہ گنجِ شائگاں پیدا کریں

عرش ممکن ہے خدائی بھی اگر حق ساتھ ہے
اُٹھ کہ خاکِ مُردہ میں جان و رواں پیدا کریں

عرش تیموری

بچوں کے متعلق ٹیگور کی منظوم کہانیاں

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ بچپن کے تاثرات پائدار اور دوامی ہوتے ہیں، اور آئندہ زندگی میں ہمارے کردار، مزاج، رجحانات، پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں کی انفرادی خصوصیات اِن ہی دُھندلے نقوش کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'ورڈزورتھ' نے بچہ کو "انسان کا باپ" کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ماہرینِ نفسیات، جو پہلے بچے اور اُس کی نشوونما سے بے پرواہ رہتے تھے اور اس کو محض عمر رسیدہ انسان کا ایک چھوٹا سا مجسمہ "تصور کرتے تھے، اب بچے کے ذہن کے مطالعہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ مرد اور عورت کی لازوال اہمیت کے باوجود بھی ہندوستان کے کلاسیکی شعراء نے جذباتی اور غنائی شاعری میں بچپن کے زمانے پر قرار واقعی توجہ نہیں کی، حتیٰ کہ سنسکرت کے ادب میں بھی سوائے چند مقامات کے ہم کو "بچے کے ذہن" کے تخیلی اور باقاعدہ مطالعہ کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

سحر ٹیگور کے سرزمینِ ادب پر قدم رکھتے ہی "بچپن" پہلی بار رومانی شاعری کے اہم ترین موضوعات میں شمار کیا جانے لگا۔

[illegible] میں ٹیگور اپنے ایک بیٹے کے ساتھ، جو تپ دق کا مریض تھا، الموڑہ گئے، جہاں اُس کا انتقال ہو گیا۔ [illegible] میں اُن کا دوسرا بیٹا داغِ مفارقت دے گیا۔ اِن صدمات کا یہ اثر ہوا کہ غم غلط کرنے کے لئے "شاعر" نے اپنا وقت اور زورِ تخیل "بچہ کے ذہن کے اسرارِ سربستہ" کے مطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ بچہ کے خیالات اور جذبات کی سادگی اور انوکھا پن اور طرفگی اُن کی توجہ کی مرکز بن گئیں، اور اس وقت سے اُنہوں نے "بچپن" پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔

رابندر ناتھ کو پورا احساس ہے کہ بچہ محض اپنی سادگی کی بنا پر، ایک پُر اسرار چیز ہے۔ وہ خُوب جانتے ہیں کہ "ذہنِ طفلی کا راز" ایک ایسا گہرا راز ہے جو صرف نفسیات کی کتابوں کے مطالعہ سے سمجھ میں نہیں آسکتا اور اسی کو سمجھنے کے لئے انسان کو خود بچہ بن جانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جلیل القدر شاعر بچہ کا ہمراز اور ہم آہنگ بن جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اِن منظوم کہانیوں میں اُن کے خیالات اور احساسات وُہی ہوتے ہیں جو ایک خُرد سال بچے کے ہو سکتے ہیں۔ اِن کہانیوں کو لکھتے وقت وہ اتنا زیادہ "از خود رفتہ" ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک انسان یا شاعر یا فلسفی کی حیثیت سے اپنی انفرادی شخصیت کو بھول جاتے ہیں اور خود "بچہ" بن جاتے ہیں۔ یہ آرٹ کا منتہائے کمال ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:۔

"اے کاش، میں اپنے بچے کی دل کی دُنیا میں ایک خاموش گوشہ حاصل کر لیتا۔ . . . . . . میری آرزو ہے کہ میں اُس راہ پر گامزن ہوں جو بچے کے ذہن کو طے کرتی ہوئی زمان و مکان کی تمام حدود سے گذر جاتی ہے۔" ("ماہِ نو" صفحہ ۱۷)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے بچے کو سمجھنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔

ٹیگور کے تخیل نے جس بچے کو پیدا کیا وہ کوئی "خیالی مخلوق" نہیں بلکہ اِسی دُنیا کا ایک جیتا جاگتا انسانی بچہ ہے، جس کی تصویر اُنہوں نے کمال شفقت اور ہمدردی سے کھینچی ہے۔

"شاعر" اپنے بچپن کے تلخ تجربات بھول نہیں سکتا۔ اس کی بعد کی زندگی کے تلخ تر تاثرات اور ذمہ داریاں اُن ابتدائی نقوش کو مٹا نہیں سکیں۔ وہ بار بار اُن تکالیف کا تذکرہ کرتا ہے جو اُسے اپنے اسکول میں پیش آیا کرتی تھیں۔ موجودہ طرزِ تعلیم کے خلاف اس کو جتنی شکایتیں ہیں اُن کو اس نے "مراجعتِ وطن" میں تمام و کمال ادا کر دیا ہے۔ اس کہانی میں وہ ایک خود سر، مضبوط قویٰ والے، "پروردہ فطرت" بچے کا تذکرہ کرتا ہے:۔

قصہ کا ہیرو (فاٹک) گاؤں کے تمام بچوں کا تسلیم شدہ لیڈر ہے۔ اپنی زندگی کے آغاز ہی سے وہ فطرت سے ہم کنار اور ہم آہنگ رہا ہے۔ گھر میں اسکو جو زدوکوب کی جاتی ہے وہ اس کے اثر کو وسیع میدانوں میں دوڑ کر یا دریا میں تیر کر بھلا دیتا ہے ——— اُس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اُس کا چچا اُسے اس کے ماحول سے چھڑا کر شہر میں لے جاتا ہے، جہاں پہونچ کر وہ "وہاں کی خیرہ کُن روشنیوں

اور بے معنی شور و شغب سے بھاگ جانے کی تمنا کرتا ہے اور ایک بار پھر شہر کے باہر کی آزاد فضاؤں ——— پہاڑوں اور دریاؤں ——— کا جویا ہے !"

("فلسفۂ ٹیگور" از ایس۔ رادھا کرشنان صفحہ ۲۲)

فاتک جیسے "پروردۂ فطرت" بچوں سے شاعر کو جو دلی تعلق اور دلچسپی ہے وہ دنیا سے، خصوصاً وشوا بھارتی کے طالبعلموں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ نہایت خلوص اور دیانتداری سے اپنے ان جذبات کو جو بچے کے متعلق اپنے دل میں موجزن پاتا ہے من و عن ظاہر کر دیتا ہے اُسے اس کا مطلق احساس نہیں رہتا کہ ایک فلسفی یا نوبل پرائز پانیوالے شاعر کی حیثیت سے اُسے سنجیدگی کی قبا پہن لینی چاہیے۔ وہ نہایت آزادی اور مسرت کے ساتھ بے معنی طفلانہ باتیں کرتا چلا جاتا ہے جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں ——— یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان بھولی بھولی معصوم باتوں پر ہزاروں فرزانگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ کیا انسان خود ایک "بڑا بچہ" نہیں ہے ؟

جو لوگ عقل ستیزہ کار کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ گئے ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کو آرام دینا چاہتے ہوں اُنہیں "ماہِ نو" کے صفحات میں پناہ ڈھونڈنی چاہیئے۔ وہاں ٹیگور کا بچہ اُنکو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایک ایسی دُنیا میں لے جائے گا جہاں "عقل کی استبدادیت" کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اور وہاں ہر نووارد ایک ایسی طاقت حکمران دیکھے گا جو عقل سے کہیں زیادہ فرزانہ تر ہوتی ہے۔

وہاں وہ بچے کو یہ کہتے ہوئے سُنے گا :-

"امّاں، میرے خیال میں پھول بھی زمین کے نیچے اسکول جاتے ہیں۔ وہ بند کواڑوں والے کمروں میں سبق حاصل کرتے ہیں، اور اگر وہ وقت سے پہلے باہر آنا چاہتے ہیں تو اُن کے ماسٹر صاحب اُنہیں کونے میں کھڑا کر دیتے ہیں" ("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

یا :-

"چونکہ میں بچہ ہوں اس لئے چھوٹا خیال کیا جاتا ہوں جب میں ابا کے برابر ہو جاؤنگا تو میں بھی بڑا ہو جاؤں گا" ("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

ایک دوسری جگہ بچہ اپنی ماں سے اپنی چھوٹی بہن کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے "بیوقوف اور بے عقل بچی" کہتا ہے :-

"امّاں، تمہاری بچی تو بڑی بیوقوف ہے۔ وہ کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہے! وہ تو سڑک پر کی روشنیوں اور ستاروں میں بھی تمیز نہیں کر سکتی۔ تمہاری بچی چاند کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ کتنی مضحکہ

خیز ہے! وہ تو "گنیش" کو "گانوش" کہتی ہے !"

("ماہِ نو"۔ صفحہ ۵۲-۵۳)

بچے کے ذہن کا تجزیۂ نفسی کرنے میں شاعر کو جو قدرت حاصل ہے اُس کا راز اس بدیہی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے بچوں کو خوب اچھی طرح سمجھا ہے۔ کسی اور شاعر میں ہم کو یہ خصوصیت نہیں ملتی ٹیگور اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے بچے کے دل کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے اور کمال بصیرت اور تفہیم کے ساتھ اپنے بچے سے کہلواتا ہے :-

"امّاں، اب میرے جانے کا وقت آ گیا ——— میں جاتا ہوں .... میں ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا بن جاؤں گا اور تمہیں تھپکی دونگا۔ میں پانی کی چھوٹی چھوٹی لہریں بن جاؤں گا اور جب تم نہاؤ گی تو تم کو بار بار بوسہ دونگا .... "خالہ جان" پوجا کے موقع پر تحفے لیکر آئیں گی اور پوچھیں گی "بہن، بچہ کہاں ہے ؟" امّاں، تم اُن سے کہدینا،

"وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہے۔ وہ میرے جسم اور میری رُوح میں ہے۔ !" ("ماہ نو" صفحہ ۶۶)

ان نظموں کا ایک خوشگوار نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ وہ صرف بچہ ہی کا تجزیہ نفسی نہیں کرتیں بلکہ ماں کے احساسات اور جذبات کی نفسیاتی تفسیر بھی پیش کرتی ہیں۔ بچے کی ماں نہ صرف اپنے لطیف اور پراسرار ارمانوں اور تلوّنات کو سمجھتی ہے بلکہ وہ بچہ کے ہر لحہ بدلنے والے مزاج اور خواہشات سے بھی واقف ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے :-

"جب میں نے شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا اور میرے دل کی کلی میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں تو تم اُس کے چاروں طرف خوشبو کے مانند رقصاں تھے۔ تمہاری نرمی اور نزاکت میرے جوان اعضا میں پھول رہی تھی، جیسے سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے .... اس ڈر سے کہ کہیں میں تمہیں کھو نہ دوں میں تم کو ہر وقت مضبوطی سے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتی ہوں"

("ماہِ نو" صفحہ ۶۰-۶۱)

جب بچہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اُس نے اُسے کہاں پایا تو وہ اشک ریز تبسم کے ساتھ اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیتی ہے اور کہتی ہے :-

"تم میرے دل میں اسی طرح پوشیدہ تھے، جیسے میرے ارمان!"

اُس نفسیاتی اُصول کے مطابق جس کو شاعر نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے، بچہ اپنی ماں سے حد درجہ مانوس ہے۔ گو وہ اتنا

چھوٹا اور نارسیدہ ہے کہ اپنی ماں کے خیالات کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا، پھر بھی وہ اپنی ماں کو رنجیدہ دیکھ کر متفکر ہو جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے :-

"تمہیں کیا ہو گیا جو ایسی عجیب نظر آ رہی ہو؟ کیا آج ابا کا خط نہیں آیا؟"

پھر خود ہی کہتا ہے :-

"مگر پیاری امّاں، تم اس کی فکر نہ کرو۔ کل دو سے کر گاؤں یار بازار لگے گا۔ تم خادمہ سے کہدو کہ مجھے قلم اور کاغذ لائے۔ مَیں خود ابا کے سامنے خط لکھ دوں گا .... اور کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ابا کی طرح بیوقوفی کر کے اپنے خط اُس ڈراونے ڈاکیہ کے تھیلے میں ڈال دونگا؟ نہیں ——— مَیں ذرا سا توقف بھی نہ کروں گا، بلکہ خود اُنہیں تمہارے پاس لاؤں گا۔ اور باری باری ہر خط خود پڑھکر تمہیں سُناؤں گا۔" ("ماہِ نو" صفحہ ۶۱-۶۲)

بچے کے تمام خیالوں اور خوابوں کا مرکز اُس کی ماں ہے۔ وُہ اُسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ اُن لوگوں کے پاس بھی نہیں جاتا جو "بادلوں میں رہتے ہیں اور اُسے بُلایا کرتے ہیں" ——— کیونکہ اُس کی ماں گھر پر اُس کی منتظر ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"امّاں، میں ایک اس سے بھی اچھا کھیل جانتا ہوں۔ میں بادل بن جاؤں گا اور تم چاند بن جاؤگی۔ مَیں تمہیں اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپالوں گا اور ہمارے گھر کی چھت بن جائیگی .... میں موجوں میں تبدیل ہو جاؤں گا اور تم ایک نامعلوم 'ساحل' ہوگی ——— مَیں بہہ بہہ کر آؤں گا اور تمہاری گود میں ہنس ہنس کر ٹکراؤں گا۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۲۷-۲۸)

اِن نظموں میں شاعر کی خود پسندی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اُس کے بچے کی خود پسندی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وُہ صرف اپنی ہی بنائی ہوئی دُنیا میں رہتا ہے۔ اور اپنی اِس "طفلی کی بادشاہت" کو بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کا "شاہی محل" کہاں ہے تو وہ محل ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔ مگر وہ، سرگوشیوں میں، اپنی ماں سے بتائے بغیر نہیں رہ سکتا :-

"امّاں، تمہیں معلوم ہے میرا شاہی محل کہاں ہے؟ وہ ہماری چھت کے کونے پر ہے جہاں تُلسی کے پودے کا گملہ رکھا ہوا ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۱)

اپنے موہوم تصورات سے چھوٹا سا بچہ مادّی اشیا بناتا ہے اور اُن محسوسات کو انسانی زندگی کے جزئیہ اور طربیہ پہلوؤں سے متصف کر دیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اُس کا بڑا بھائی اُس پر کیوں ہنستا ہے اور کیوں اُسے (بچے کو) صرف یہ کہنے پر "احمق ترین لڑکا" بتاتا ہے کہ :- "جب شام کے وقت پورا چاند سامنے والے 'کدم' کے درخت کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے تو کوئی اُسے پکڑ کیوں نہیں لیتا؟" وہ اپنے "دادا" (بھائی) کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتا کہ "چاند کا پکڑ لینا ناممکن ہے" اور بحث کئے جاتا ہے :- "جب امّاں کھڑکی میں سے جھانکتی ہیں اور ہم کو کھیلتے ہوئے دیکھکر مُسکراتی ہیں تو کیا اُس وقت تم اُنہیں بہت دُور کہو گے؟" پھر جب اس کا بھائی اُسے بتاتا ہے کہ چاند اتنا بڑا ہے کہ بڑے سے بڑے جال میں بھی نہیں پکڑا جا سکتا تو چھوٹا بچہ اس مہمل گفتگو پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"دادا، تمہارے اسکول میں کیسا ردی سبق پڑھاتے ہیں! جب امّاں ہمیں پیار کرنے کو اپنا چہرہ جُھکاتی ہیں تو کیا وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے!" ("ماہِ نو" صفحہ ۲۵-۲۶)

خالص تخیلی نظموں میں ٹیگور کا بچہ بے معنی اور بے تُکی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے اور ہر اُس مادّی چیز کو جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتی پیارے پیارے ہنسانے والے انداز میں تعبیر کیا کرتا ہے۔ وُہ "حقیقت" کے متعلق اپنے اِن خام خیالات کی خیالی تفسیرات پیش کیا کرتا ہے جن کی بُنیاد یا تو اُس کے گہوارے کے گیت ہوتے ہیں یا وُہ کہانیاں جو اُس نے اپنی دادی سے سُنی ہیں۔ اِن سے اور ہندی علم الاصنام کی دوسری روایتی کہانیوں سے بچّہ کا تخیل زور پکڑتا ہے۔ وہ عجیب عجیب سمندروں اور نئی نئی سرزمینوں میں یکہ و تنہا خیالی سفر کرتا ہے۔ یا کاغذی کشتیاں بنایا کرتا ہے اور ان کو ایک ایک کر کے دریا میں چھوڑ دیتا ہے، اس اُمید پر کہ "کوئی نہ کوئی ..... کبھی نہ کبھی ...... کسی نہ کسی عجیب و غریب مُلک میں اِن کو پائے گا اور یہ سمجھ جائیگا کہ وہ (بچہ) کون ہے۔" ("ماہِ نو" صفحہ ۳۸)

تخیل کی مدد سے وہ اپنی دُنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ اب وُہ اپنی قلمرو میں ایک بچہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا تخلیقی فن کار بن جاتا ہے جو اپنی "شہزادی" کے گرد اپنے خوش آئند خوابوں کا جالا سا تن دیتا ہے :-

"شہزادی سات سمندروں کے اُس پار ایک دُور دراز ساحل،

پر سوتی ہوتی ہے۔ "دنیا میں میرے سوائے کوئی نہیں جو اُسے پا سکے"
("ماہِ نو" صفحہ ۱۳)

اس کا تخیل غیر محدود ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے آپ کو "چمپا کا پھول" تصوّر کرتا ہے اور دوسرے مقام پر وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر وہ "کتّے کا پلّہ" بن جائے تو اُس کی ماں کا برتاؤ اس سے کیسا ہوگا۔ وہ "بادل" بن جانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اُس کی ماں "چاند" بن جائے۔ وہ لہروں میں تبدیل ہو جائیگا۔ اگر اس کی ماں ایک عجیب و غریب سمندر بن جائے۔ ("بادل اور موجیں")

جُوں جُوں ہم "ماہِ نو" کی اصل نظمیں پڑھتے ہیں وہ ہمارے کانوں میں "بھولی ہوئی صداؤں" کی طرح گونجنے لگتی ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے سامنے گہوارہ میں ایک بنگالی بچّہ لیٹا ہوا اپنی ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ احساس اتنا تیز ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا خیال بھی نہیں رہتا کہ شاعر ان آسان، سیدھی سادی، شیریں نظموں میں کوئی فلسفہ پیش کر رہا ہے۔

رابندرناتھ آئے دن کی زندگی کے معمولی سے معمولی اقعات کو لیتا ہے اور اپنے بے مثل طرزِ بیان کی مدد سے ان کو غیر معمولی بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی دوسرا شاعر اس کا مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔

اس کی زبان آسان اور عام فہم ہونے کے علاوہ موسیقی اور پاکیزگی سے بھی لبریز ہے۔ ان ہی خصائص کی بنا پر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاعر ان کہانیوں میں صرف اپنے دلی جذبات ادا کر رہا ہے اور ان کے لکھنے کا مقصد صرف "اپنے بچپن کے زمانے کی یاد تازہ کرنا ہے":

پہلی نظر میں شاید کوئی اخلاقی اہمیت نظر نہ آئے مگر بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ان کہانیوں میں بھی وہی پرانا مگر دلکش مضمون نظر آنے لگتا ہے جو ٹیگور کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے ——— یعنی "رُوح کی آزادی!"

یہیں شاعر کی بزرگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی "فردِ واحد" نہیں، بلکہ تین حیثیتیں رکھتا ہے ——— وہ "شاعر" "فلسفی" اور "آرٹسٹ" تینوں کا مجموعہ ہے ——— "شاعر" بچے کی طرف کشش محسوس کرتا ہے۔ "آرٹسٹ" اپنے رُوحانی تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے، اور "فلسفی" "آزادیٔ رُوح" کی اہمیت جتانے پر مجبور ہے۔ یہ ہی وہ بنیادی اُصول جس پر ان خیالی نظموں کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے، گو شاعر ہمیشہ فلسفہ کا پابند نہیں رہتا۔

اُس کا "بچّہ" "دُنیائے عمل کے شور و شغب اور زندگی کی مشین سے نجات پانے کا متمنّی ہوتا ہے اور "آزادی" کا خواہاں!

"مشست، میکانکی دُنیا انسان کو پست تر اور بہائم صفت بنا دیتی ہے" ("فلسفۂ ٹیگور" از ایس۔ رادھاکرشنان صفحہ)

——— یہ ہے وہ عام مضمون جس سے ہم ٹیگور کی ہر تصنیف میں دوچار ہوتے ہیں۔

جس بچے سے ٹیگور ہمیں روشناس کراتا ہے وہ بچّہ "پریوں کے ملک کے سات سمندروں اور تیرہ دریاؤں کو عبور کرنا چاہتا ہے"
("ماہِ نو" صفحہ ۱۹)

یا پھر وہ ایک پھیری والا بن کر، یہ آواز لگاتے ہوئے، سڑکوں پر دن گذارنا چاہتا ہے ——— "چوڑیاں لے لو، کانچ کی چوڑیاں!"

یا پھر وہ ایک مالی بننا چاہتا ہے، جو باغ میں زمین کھودتا رہے اور اسے کوئی منع کرنے والا نہ ہو۔ یا پھر وہ ایک چوکیدار بننا پسند کرتا ہے جو راتوں کو اپنی لالٹین کی پرچھائیوں کا تعاقب کرتے ہوئے سڑکوں پر گشت لگایا کرے۔ ("پیشہ")

شاعر کے نزدیک ماں کی سماوی محبت، "آزادی"، اور نیچر کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے مسرت اور شادمانی اخذ کرنے کا فطری رجحان اور جذبہ (جیسا کہ "برسات کے دن" میں پایا جاتا ہے) ——— ——— زندگی میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے اسباب ہیں ———!

مکانیِ زندگی سے متنفر ہوتے ہوئے بغیر، بچہ "آزادی کی راہ" پر نرم رفتاری اور سُبک پائی سے چلا جاتا ہے۔

"لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچّے جمع ہوتے ہیں؛ بے پیدا کنار آسمان سروں پر ساکت ہے اور بیقرار سمندر شورانگیز ——— لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچّے شور مچاتے ہوئے آپس میں ملتے ہیں۔......

وہ نہ تیرنا جانتے ہیں نہ جال پھینکنا۔ موتی نکالنے والے غوّاص موتیوں کے واسطے غوطے لگاتے رہتے ہیں۔ سوداگر اپنے جہازوں میں تیرتے پھرتے ہیں۔ مگر بچے کنکریاں جمع کرتے ہیں اور پھر انہیں پھینک دیتے ہیں۔ وہ پوشیدہ خزانے تلاش نہیں کرتے۔ وہ جال پھینکنا

نہیں جانتے.........

سمندر قہقہوں کے ساتھ اُبھرا چلا آتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے۔ "فنا اور آغوش "موجیں"، اُس ماں کی طرح جو اپنے بچے کا گہوارہ ہلاتی ہو، بچوں کو بے معنی منظوم کہانیاں گا گا کر سناتی ہیں۔ سمندر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے.......

لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچے جمع ہوتے ہیں۔
بے راہ "آسمان کی پہنائیوں میں طوفان چکّر لگاتے رہتے ہیں۔
بحرِ زخار میں جہاز تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ موت، بلا کسی روک ٹوک کے، کھلی پھرتی ہے۔ اور بچے کھیلتے رہتے ہیں۔
لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے"۔
("ماہِ نو" صفحہ ۳-۱۴)۔

کیا آپ اِن نظموں کو پڑھکر تھوڑی دیر کے لئے اپنی مصروف آلام "زندگی کو بھول نہیں جاتے، اور کیا آپ کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ "موت، بھی "زندگی کی موجوں" میں ڈوب کر مرگئی ہے اور تمام نقصانات کی تلافی ہوگئی ہے؟" اور کیا یہ عظیم الشان "کارخانۂ قدرت آپ کو ایک "بازیچۂ اطفال" نظر نہیں آنے لگتا!۔

* * *

"ماضی" دہلی

دُنیا کا مختصر ترین افسانہ:

یتیمی!

چاند دیکھکر لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا "عید مُبارک"

اور مَیں رو پڑا!

آہ، ابّا جان!!

غلام عباس (مولوی)۔